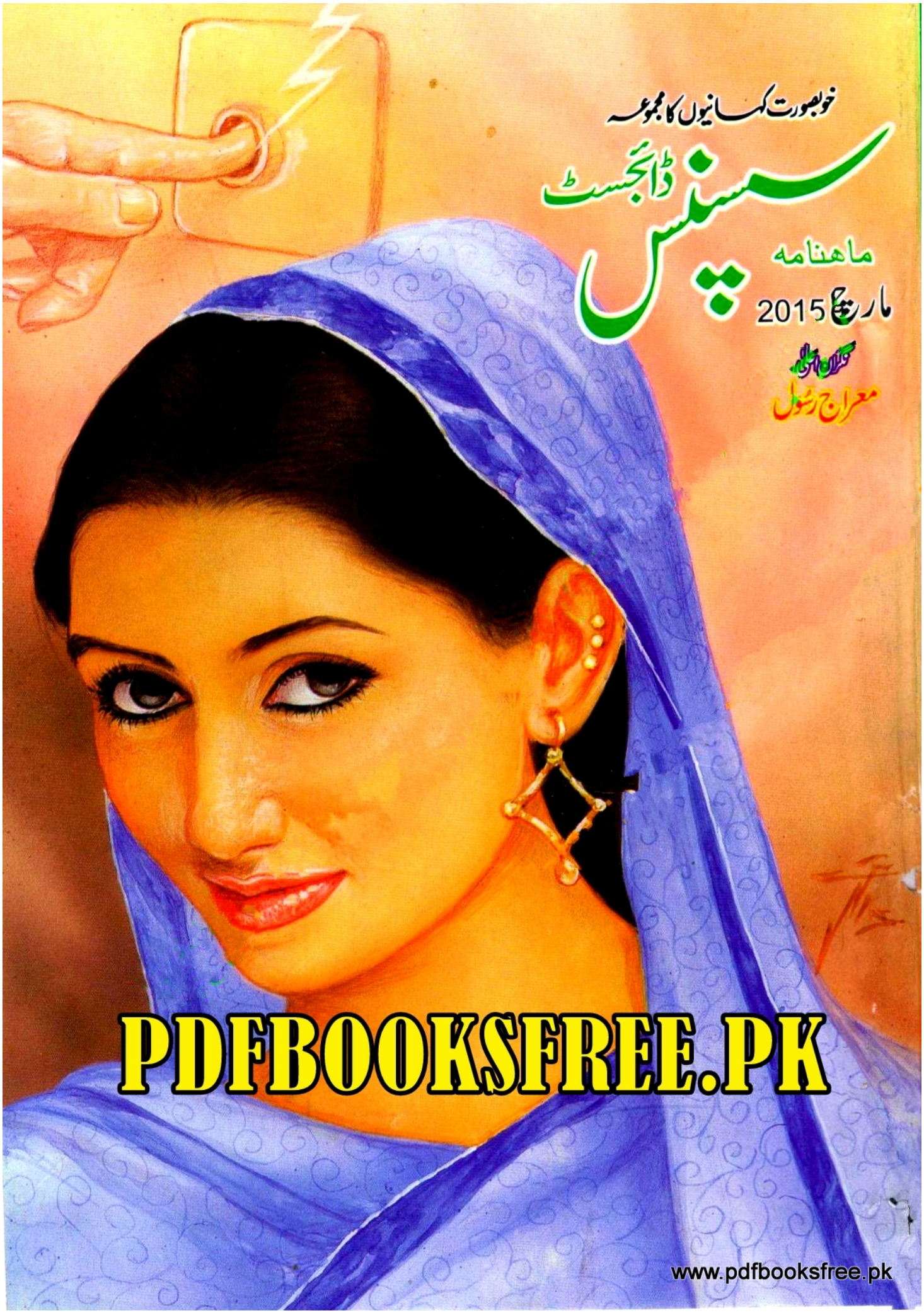

PDFBOOKSFREE.PK
www.pdfbooksfree.pk

گیسٹوفل

قرشی ®

گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی کا حل

ٹیبلٹس اور سیرپ میں دستیاب

قرشی گیسٹوفل 100% قدرتی اور انتہائی مفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سیرپ اور ٹیبلٹس ہیں جو گیس، سینے کی جلن، تیزابیت اور بدہضمی کی حالت میں فوری اثر دکھائے اور منٹوں میں آرام پہنچائے۔

قرشی گیسٹوفل کے فوائد:

- 100 فیصد قدرتی اجزاء سے تیار کردہ قرشی گیسٹوفل فوری اثر دکھا کر منٹوں میں آرام پہنچاتا ہے۔
- تیزابیت، گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی میں مفید ہے۔
- معدہ، جگر اور آنتوں کی اصلاح کرتا ہے۔
- بھوک بڑھاتا ہے اور قبض میں بھی مفید ہے۔
- آپ کی صحت اور تندرستی کا ضامن ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رؤف

سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

07
انشائیہ
جون ایلیا
آفات و حادثات کی نذر ہوجانے والوں
کی یاد میں ایک صاحب دانش کا مرثیہ

مدیر اعلیٰ
آپ کے خط
08

16
درماندہ عشق
الیاس سیتاپوری
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

دھلی رنگت اور مکروہ چہروں والی
شیطانی قوتوں کی برابریت کا لرزہ خیز منظر

67
مقابلہ
کاشف زبیر
دوست نما دشمن کی محبتوں
کا بے باک حساب کتاب

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
سودائے جنوں
84

119
رشتہ
تنویر ریاض
مہذب دنیا میں خود
غرض انسانوں کی بے باکیاں

حیرت انگیز ایجادات
کے فوائد اور فسادات کا قصہ

128
دیمک
مرزا مجید بیگ
صنف نازک کے شر اور
بداعمالیوں کا عبرت اثر ماجرا

ابو ضیا اقبال
دھماکا خیز
155

159
شعبدہ باز
سلیم انور
آنکھوں میں دھول جھونکنے والے
ایک شعبدہ باز کی فنکاریاں

جلد45 • شمارہ03 مارچ 2015 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

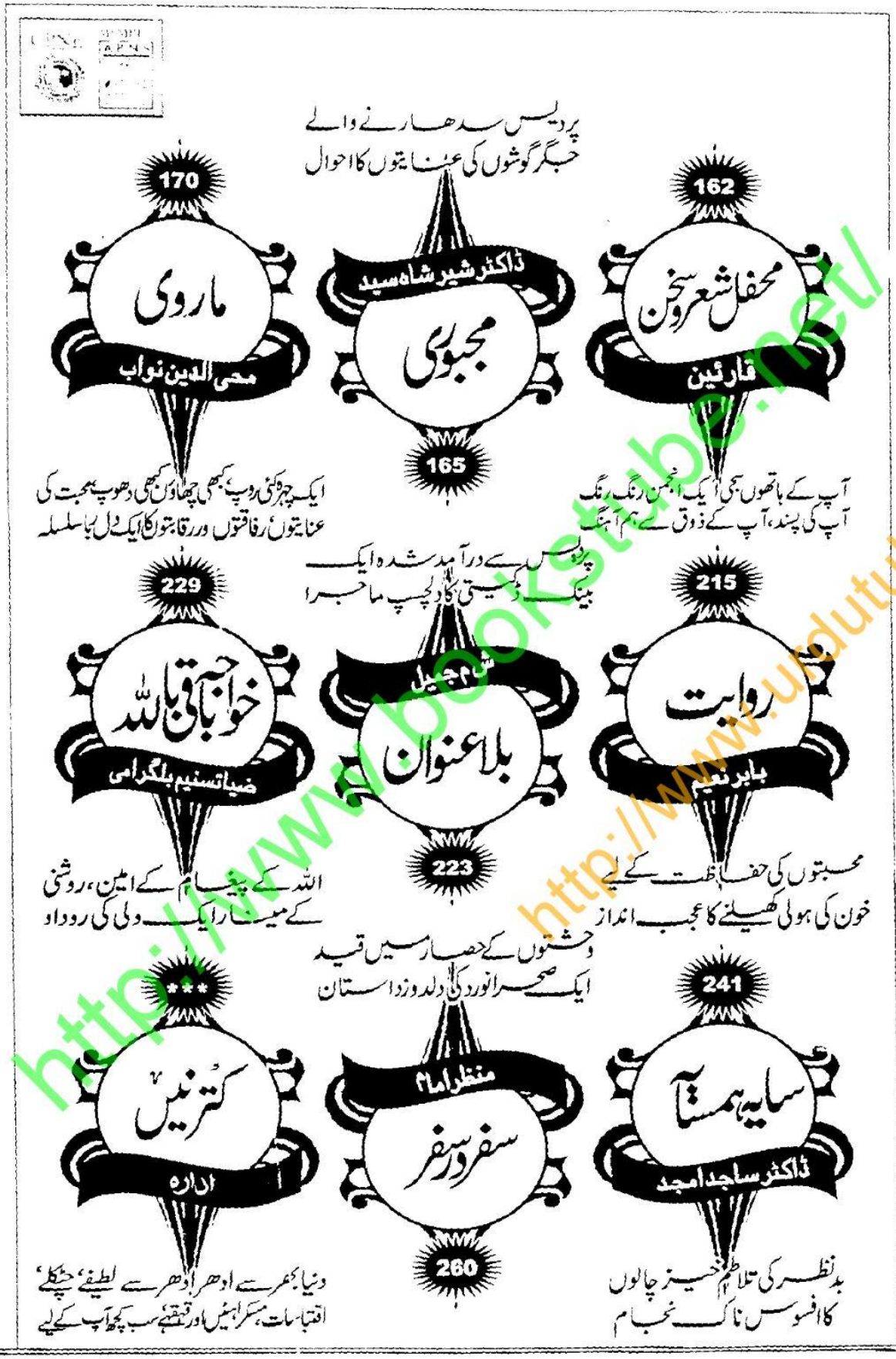

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
ایڈیٹر: ابن حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

Medora

Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بھائے

تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish

میڈورا پرفیومڈ ٹالک
کی تازگی جگاتی
خوشبوئیں آپ
ملیں آپ کو مہکتا فریش
احساس جو رہے دن بھر
آپ کے ساتھ

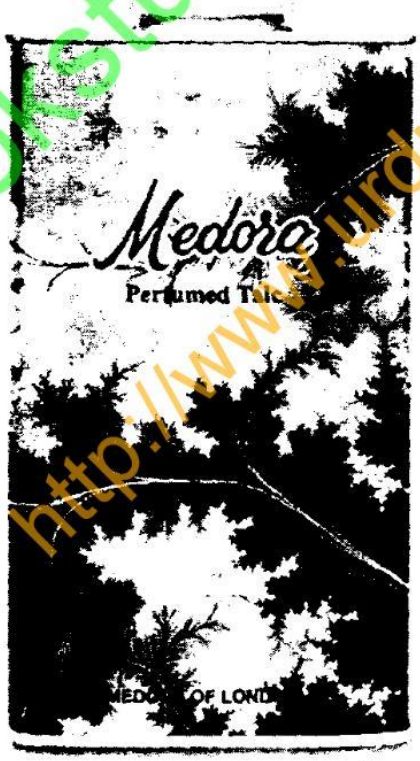

8 مختلف دلفریب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Chersih, Joy, Season, Passion جن میں

Salute اور Dignity, Greetings شامل ہیں

MEDORA OF LONDON

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

انشائیہ

جون ایلیا

تم کمال ئی نہیں ہو!

کائنات اپنی قہاری کے ساتھ زندہ اور انسان جو وجود کا سرمایہ اور کائنات کا شرف ہے، زخم کاری کی اذیت سے سسک رہا ہے۔ فنا، پھول جیسے بچوں سے لے کر کہکشاؤں تک سب کا مقسوم ہے۔ وہ ماں جس نے بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ اپنی گود میں اپنی بچی کی آخری ہچکی سنی۔ اس بچی کی آخری ہچکی سنی، جس کے لب اپنی اذیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسے ابھی بولنا نہیں آتا تھا۔ بس اس کی اذیت زدہ اور اذیت ناک آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ میں اذیت کی حدوں سے گزر رہی ہوں۔ کوئی ڈراؤنی چیز ہے جو مجھے نگلنے کے لیے میری طرف بڑھ رہی ہے۔

آہ! وہ باپ جس نے بے کسی کے ساتھ اپنی لختِ جگر، اپنی مہکتی ہوئی بچی کو اپنے ہاتھوں سے تہ خاک سلایا، جسے وہ اپنے سینے پر لٹاتا تھا تو اس کی روح معطر ہو جاتی تھی۔ وائے قسمت، وائے نصیب کہ جن ماں باپ کے دل اپنی بچی، اپنی معصوم خوب صورتی کو دیکھ کر گنگنا اٹھتے تھے، وہی اب اس کے لیے نوحہ کناں ہیں، ان کی سوگوار آنکھیں کہتی ہیں۔

ہائے مرا پھول لے گیا کون
ہائے مجھے داغ دے گیا کون

وہ جن کی آنکھوں میں اس سے روشنی تھی، جن کے ہونٹوں پر اس کے معصوم اشاروں سے مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی، انہوں نے، ہاں ان ماں باپ نے اپنی، رنگ و نکہت' بچی کا پرسا لیا، موت سے کس کو رستگاری ہے۔

رستگاری، کیسی رستگاری! زمین سے لے کر آسمانوں تک کہاں ہے رستگاری؟ کائنات کے ہر گوشے میں مرگ، ہلاکت اور فنا کا نقارہ بجتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان، زندگی 'الامان..... الامان' پکارتی ہے مگر کہیں بھی امان نہیں ہے۔ یہاں تو عالم پناہوں کو بھی پناہ نہیں ملتی۔ تو کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے، زندگی اور زندگی کا عیش؟ زندگی اور زندگی کی اذیتیں؟ وہ سارے دکھ جو زندگی کی خاطر جھیلے جاتے ہیں۔ وہ ساری شان و شوکت جس کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ہر داؤ چلتا ہے۔ جب ہر چیز بے معنی تو پھر زندگی کے آخر کیا معنی ہیں؟ ہزاروں سال کی تاریخ، ہزاروں سال کی تہذیب اور ہزاروں سال کا تمدن، کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے؟

ہاں، یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اس قدر بے معنی کہ اگر انسان حقیقت پر غور کرے، چیزوں کی اصلیت اور ماہیت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ ہر شے میں گھاٹا ہی گھاٹا پائے گا اور صرف پشیمانی کمائے گا۔

''اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو آخر معنی کے کیا معنی ہیں؟''

''بے معنی ہونا، یکسر بے معنی ہونا؟''

''یکسر بے معنی ہونا!''

''ہاں، یکسر بے معنی ہونا..... مگر ایک حقیقت ایسی ہے جو اس ساری گفتگو کے برعکس ہے، اور بس وہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی ساری باتوں کی ایک بات ہے اور وہی رمزِ حیات ہے اور وہ ہے چیزوں کو بامعنی بنانا۔ ورنہ زندگی اور وہ سب جو زندگی کا حاصل ہے، وہ از خود بے معنی ہے۔ انسان اسے بامعنی بناتا ہے۔''

یہ سب کچھ تو درست ہے مگر کیا وہ کھلونے بھی بے معنی ہیں جن سے کھیلتے کھیلتے ہماری ننھی منی گڑیا ثنا عدم کے اندھیرے میں جا چھپی ہے؟

نہیں، وہ کھلونے بے معنی نہیں ہیں۔ وہ کھلونے بے معنی نہیں ہو سکتے..... اس لیے کہ وہ کھلونے ہیں اور انہیں ان سے کھیلنے والی ایک معصومیت نے بامعنی بنایا تھا۔ ان کھلونوں کو پیار کرو اور انہیں اپنے سینے سے لگا لو۔ ہم ان کھلونوں کو پیار کرتے ہیں اور انہیں' اپنی ثنا کے کھلونوں کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اس ثنا کے کھلونوں کو جو مرجھا گئی ہے۔

ثنا! ہم تمہیں آواز دیتے ہیں۔ تم ہماری آواز کا جواب دو۔ تم مرجھائی نہیں ہو۔ ثنا، تم ہماری یادوں کے گلدستے میں، ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو۔ تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو، دل میں..... ہمارے دل میں!

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

محترم قارئین
السلام علیکم!

مارچ 2015ء کا سسپنس آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس ماہ سے ایک تاریخی یادوابستہ ہے جسے منائے ہوئے بہت سے ایسے عہد ہمارے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں جو اگر پورے کر لیے جاتے تو آج ہمارے ملک کا یہ حال نہ ہوتا۔ دھرنوں، ریلیوں اور لانگ مارچ کی افراتفری میں 23 مارچ کا حوالہ ہر بار سوئے ہوئے بااختیار طبقے کو جگانے کی کوشش کرتا ہے مگر ہنوز دلی دور است کے مصداق کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی، اگر ایسا ہوتا تو حکومت کی جانب سے چند اچھے اقدامات اٹھانے کے باوجود عوام اب تک ثمرات سے محروم نہ رہتے..... حال ہی میں پیٹرول کی قیمتوں میں ایک بار پھر کمی کے باوجود مہنگائی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ ہمیں منہ چڑا رہا ہے جبکہ دوسری جانب روشنی کے اس شہر کی گلیوں میں دن دہاڑے ڈکیتیوں کی دلیرانہ وارداتیں اندھیر نگری چوپٹ راج کا اظہار کر رہی ہیں..... چند مخصوص راستوں سے گزرتے ہوئے معصوم شہری بے پناہ دہشت کا شکار ہو جاتے ہیں اور بخیریت نکل جانے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات لوٹ مار کی یہ کارروائیاں خونی وارداتوں میں بدل جاتی ہیں۔ موسم سرما کی تعطیلات کے بعد درس گاہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے کھل تو گئی ہیں لیکن والدین سانحۂ پشاور کے پس منظر میں آج بھی بچوں کو اسکول روانہ کرتے ہوئے ایک انجانے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف حفاظتی انتظامات کے دعوے ہیں تو دوسری طرف دہشت گرجب اور جہاں موقع پاتے ہیں، کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی واردات کر گزرتے ہیں۔ کوئی گرفت میں نہیں آتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو تمام ناگہانی آفات سے محفوظ رکھے (آمین)۔ پرچے کی تیاری کے دوران افسردہ ماحول سے فرار کے لیے آج کل ورلڈ کپ کے متعلق خبریں گرم ہیں۔ کرکٹ کے شیدائی بے شمار دعائیں اور اچھی امیدیں لیے منتظر ہیں اور جناب ہماری توجہ کے لیے محوِ انتظار تو قارئین کے سندیسے بھی ہیں تو چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، لاہور سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ''سخت جاڑے'' کا موسم اور آنکھوں میں لمبے انتظار کے سائے خزاں رسیدہ درختوں کے بیچ لکڑی کے بنچ کا پراسرار ماحول، تخیل میں ورق ورق بکھرتا تصور، لیٹی ہوئی روشیزہ کا بال بکھرائے اداس چہرہ خوب صورت سرورق میں اداسی کا غالب عنصر سسپنس کی بھرپور تائید کر رہا تھا۔ انشائیہ جب تک قانون بنانے والے اس کا احترام نہیں کریں گے تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آباد ہوں گے۔ کاش کہ جون ایلیا کی یہ تحریر قانون کی دھجیاں بکھیرنے والوں کی نظر سے بھی گزرے۔ تو اس بستی کی حرمت برقرار رہ جائے۔ تبھی جا کر ملک کا نظام بھی درست ہوگا اور آئے روز ہونے والے خونی واقعات سے بھی نجات ملے گی۔ نٹ کھٹ قارئین کی محفل میں درشہوار سبقت لے گئیں اور حج کے فرائض انجام دیتے ہوئے 2015ء کے پہلے شمارے کو فرسٹ پوزیشن دے دی۔ زبردست ہو گیا جی، دوسرے نمبر پہ شبانہ حسن نے دھنک کے رنگ بکھیر دیے۔ واہ جی واہ آپ بھی سوہنی کڑیوں میں شامل ہو گئیں۔ ویلکم ندیم عباس ڈھکو آپ کی محفل شعروسخن کے صفحات بڑھانے پہ اتفاق کرتا ہوں۔ احمد خان توحیدی 24 گھنٹوں میں شمارہ ختم پھر تو بس نظر گھمانے والی بات ہوگی خیر۔ رانا حبیب الرحمٰن خوش بخت الرحمٰن خدا آپ کو آزادی نصیب کرے۔ ملکی حالات کے لیے آپ کے ساتھ دعا گو ہیں۔ طاہرہ گلزار ابھی بھی آپ پیاز کا سہارا لیتی ہیں آنسو چھپانے کے لیے..... ہاہاہا آپ کا تبصرہ بھی ایک دم جاندار ہوتا ہے۔ توصیف احمد اور محمد زریان کی انٹری بھی خوب رہی۔ اطہر حسین یادِ ماضی تو ساتھ ساتھ ہی چلتا ہے، نظریں کہاں تک چرائیں گے۔ آپ کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ محفل شعروسخن میں سید نعیم الحسن، شبانہ حسن اور حنا عروج کے اشعار ٹاپ پر تھے۔ کہانیوں کی طرف آتے ہیں تو جرم کی عجیب گورکھ دھندوں اور پیچیدہ گڑیوں سے نکل کر سامنے آتا ہے۔ کہاں بے چارہ انور جٹ اور کہاں مقتول لالی اور قاتل نکلا ڈاکو ملنگی اور کسی کہانی میں صنفِ نازک نہ ہو شریک جرم یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یوں زاہدہ بھی جیل جا کر ''کاش'' کی آہ بھر کر رہ گئی اور ملک صاحب کی ڈائری سے یہ تفتیش بھی مکمل ہوئی۔ ناب اور جمی کی لڑائی تو حیوانیت پرستی تھی ہی مگر بارہ کے لیے جیت اسی کی ہوئی جو اس میں ہارا تھا۔ صنفِ نازک کا انوکھا فیصلہ طاہر جاوید مغل کی کامیاب مفتوح کی صورت ٹھہرا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے آگے کسی وقت بھی سجدہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ مراد نماز کے لیے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے بعد دعا مانگتا ہے تو ورشا جو محبت کا دم بھرتے اس کے ساتھ ہوتی ہے' اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور ماروی مراد کو خواب میں دیکھ کے جھوم اٹھتی ہے۔ یوں زبردست سنسنی خیزی کے ساتھ جاری ہے محی الدین نواب کی ''ماروی'' جب دل پتھر ہو جائے تو کسی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ کارلا کو بچپن میں ماں نے چھوڑ دیا تو آج کارلا نے ماں کو۔ کون جانے ایسا گہرا زخم جب ملے نہ کوئی مرہم، رشتوں کو جھنجوڑنے والی تحریر ڈاکٹر شیر شاہ سید کے قلم سے اچھی رہی۔ اعتماد کرنا اچھی بات ہے اور اعتماد نہ کرنا اس سے بھی زیادہ اچھی بات ہے۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی درماندہ عشق ایک دم سے زبردست ہے بہت زیادہ پسند آئی۔ گلنار نے حمدو کو اعتماد میں لے کر بے مثال بنایا تو اپنی عزت مجروح کر بیٹھی اور فیروز بخت کے لیے جو سازش تیار کی تو مقابلے میں ستار اور اتالیق نے کامیاب سازش سے فیروز بخت کو بچا لیا۔ آخر میں حمدو کا کردار تو درماندہ ہوا اس نے گلنار کے لیے موت کو گلے لگا لیا۔ اس میں تو بے انتہا تجسس ہے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ طالب علمی کے دوران

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net

میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا تو مجھے ان سب سے زیادہ پائیدار امن پسند اور مکمل دین ..... دین اسلام ہی نظر آیا اور سچائی کی متلاشی بازغہ کامیاب منصوبہ بندی سے حریت پسند محسن کو نکال لے گئی۔ صیہونی قوتوں اور امتِ مسلمہ کے درمیان معرکے کی عظیم داستان سودائے جنوں اپنے جنوں کے ساتھ زبردست جا رہی ہے۔ حجرے میں نہ تکیہ نہ بستر، جسم پہ بے شمار پیوند لگا خرقہ سر تکیے کی لذت سے نا آشنا یادِ حق میں شب بیداری، تلاش فضل اور طلبِ علم کی پیاس میں لمبے سفر کرنا، یہ ہیں اللہ کے پیارے بندوں کی عبادتیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی عارفِ حق سطر سطر موتیوں سے گزری گہری ولایت کی باتیں اولیا اللہ کی زندگی کے ایمان افروز واقعات جیسے جیسے پڑھتے جائیں دل میں روشنی کی کرنیں پھوٹتی جاتی ہیں۔ تحریر ایسی کہ بار بار پڑھنے کو دل کرے۔ ویری نائس۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کوئی کسی کے کیے کا ذمے دار نہیں ہے لیکن کامی اور ندا اپنی اپنی جگہ قصوروار تھے اور اپنی حالت کے ذمے دار بھی ..... آہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچے اور اپنی نشانی سہیل اور رعنا کو دے کر انہیں ملا گئے ہاں یہ ہمارا بچہ ہے ہم اسے پالیں گے۔ اتفاقات سے معمور اور ایک دوسرے کے برعکس کاشف زبیر صاحب نے تو خوب صورت تحریر دے کر کہانی کے عکس ملا دیے بہت اچھی رہی۔ مجبوری یہ ہے کہ حکیم صاحب میرے ابو ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں اور اس بیٹی کو تایا ابو بیاہ لائے اور دل کے مریض جمیلہ کے لیے ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ پر کیا کہوں اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔ قطعہ کہانی میں منظر امام نے بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔ ہاں وہ جمبی چاہیے ہے جو میں صرف ان لوگوں کو پیش کرتی ہوں جو مجھے پسند آتے ہیں اور تم بھی مجھے پسند آ گئی ہو۔ مجرم پکڑنے کے لیے زندہ بھوت کا سوانگ زبردست رہا۔ بہت پسند آئی۔ تنویر ریاض کی تحریر مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی زبردست رہا۔ ہر کہانی سسپنس کی روایت کے مطابق اپنے اندر کرداروں کے حوالے سے بھرپور تجسس لیے ہوئی تھی۔''

✠ **محمد صفدر معاویہ**، سرور بیس، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں ''فروری کا شمارہ زندگی میں پہلی مرتبہ 15 تاریخ کو سرور بیس کراچی میں ملا۔ اتنی جلدی ملنے کی خوشی نہ پوچھیے اور جلد ختم ہونے کا غم بھی۔ سرورق کو ایک خوب صورت دل نشین آنکھوں والی، خوب صورت چہرے اور کسی قدر حیران ماڈل سے سجایا گیا۔ بہت ہی پرفیکٹ سرورق تھا۔ کہانیوں کی فہرست کو بھی اعلیٰ طریقے سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم بہت ہی عمدہ الفاظ میں قانون کا نکتہ سمجھاتے نظر آئے کہ اعلیٰ طبقہ قانون کی پاسداری کرے تو چھوٹا طبقہ خود بخود کرے گا۔ آپ کے اداریہ کا ایک ایک لفظ بیش بہا اور قیمتی ہوتا ہے۔ اپنی محفل میں آئے تو محترمہ ورشہوار پیرزادہ کو نائس تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک ہو جی شبانہ جی، یہ بے وفائی والی بات مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ محمد قاسم رحمان آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ ادریس احمد خان اگر ہم مسلم اکٹھے ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اعجاز بھائی بھی اعلیٰ تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بڑھاتے ہوئے نظر آئے۔ توحیدی صاحب پاکستان کے لیے کی گئی آپ کی دعا اللہ پاک قبول فرمائے۔ نادر سیال میانوالی اور وسیم احمد خانیوال سے اچھا تبصرہ لے کر آئے۔ مہرین ناز اور طاہرہ گلزار بہنا بھی بہترین تبصرے لے کر حاضر ہوئیں۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب آپ کیا تبصرہ لے کر آئے ہیں، بہت ہی عمدہ ہے۔ توصیف احمد محمد زریان سلطان اور اطہر حسین کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ باقی تمام نئے لکھاریوں کو سسپنس میں ویلکم کہتے ہیں۔ بھٹی صاحب کی سودائے جنوں سب سے پہلے پڑھی۔ کہانی پہلے سے زیادہ عمدہ اور دل گرفتہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہودیوں کے مظالم بڑھ گئے ہیں۔ ہٹلر نے کہا تھا لوگ مجھے ظالم کہتے ہیں، میں چاہتا تو سارے یہودی مار دیتا لیکن کچھ اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ دنیا کو پتا چلے کہ یہ کتنی ظالم قوم ہے۔ الیاس سیتاپوری درماندہ عشق لے کر آئے۔ پہلے تو کہانی بوری لگی لیکن آخر میں کچھ رنگ نمایاں ہوا۔ اگلی قسط تک انتظار میں ہیں۔ کپل ماروی پڑھی۔ دس بارہ بندے جان سے گئے۔ اس اسٹوری میں قتل بہت ہو رہے ہیں۔ مراد لندن پہنچ چکا اور اب پاکستان پہنچے گا تو کہانی کا ایڈونچر بڑھ جائے گا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی کامیاب مفتوح کیا کہانی ہے۔ بابرہ نے ساری چال ہی الٹی کر دی، تاب جیتی ہوئی بازی ہار گیا۔ بابر نعیم کی مہمان کہانی گزارے لائق تھی لیکن حقائق سے زیادہ دور ایسا کہ ہر چیز آپ سے چھین لی جائے۔ ملک صفدر حیات کی کاش بلقی نے لائی قتل کر کے برا کام کیا اور اللہ کی سزا کا حق دار ٹھہرا اور زاہدہ کو طلاق بھی ملی اور ساتھ میں جیل بھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ دنیا کے پیچیدہ مسائل پر اسٹوری لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ محفل شعر و سخن رنگ برنگے اشعار سے مزین تھی۔ اظہر حسین پچار کا شعر بہت پسند آیا۔ واپسی کا سوال تشیل حیدر کی بہت عمدہ اور دکھ اور غم سے بھرپور کہانی تھی۔ ش م جمیل کی تہ نشین چار لی نے جس چالاکی سے اپنا اور اپنے دوست کا بدلہ لیا، وہ قابلِ تحسین ہے بغیر کچھ کیے دشمن کا خاتمہ۔ منظر امام کی قطعہ کہانی لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ بلگرامی صاحب، کی عارفِ حق احمد عبدالحق دل کو منور کر گئی۔ سلیم انور کی باتدبیر ایویں ہی تھی۔ تنویر ریاض کی زندہ بھوت میں کیا طریقہ اپنایا، ڈون کو اقرار کروائے گا۔ کاشف۔ بیر کی برعکس موجودہ حالات کی عکاسی کرتی بہترین تحریر تھی۔ والدین ہمیں اتنی محنت سے پالتے ہیں۔ ہمارا حق ہے کہ ان کو کسی موڑ پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ہماری وجہ سے والدین کا بھی حق ہے کہ وہ صحیح تعلیم و تربیت کریں اپنی اولاد کی باقی کتر نیں بھی بہت اعلیٰ تھیں۔'' (بہت شکریہ)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے چلے آ رہے ہیں ''فروری کا شمارہ محبت کے خاص مہینے کا شمارہ یقیناً سرورق کی دوشیزہ محبت کی ماری لگتی ہے۔ کچھ تصاویر بتاں ایک اداس کا نیچ جو امید بہاراں لیے ہوئے۔ بالکل ہماری قوم کی طرح۔ گزشتہ برس ہم ترقی کی آس لیے بیٹھے۔ تھے مگر ترقی کیا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ اے خدا نئے سال میں ہماری امیدوں کی لاج رکھنا۔ (آمین) جون ایلیا نے قانون پر کیا خوب پیرائے میں یہ پیغام دیا کہ مادر پاکستان ہی غیر محفوظ ہو گیا۔ قانون تو بہت ہیں لیکن عوام و خاص کو کسی قانون کی پاسداری نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں لیکن سب بھگت رہے ہیں۔ ایک مسلسل اور نہ ختم ہونے والا عذاب۔ پھول جیسے معصوم بچے شہید کر دیے گئے۔ کیا اب کوئی عذاب اور باقی ہے۔ ترقی یافتہ مہذب قوموں نے ہمیں کس جہنم میں دھکیس دیا۔ بس کر دو، آنسو تو خشک ہونے دو۔ دوستوں کی محفل میں ورشہوار پیرزادہ اس دفعہ میر کارواں ہیں، مبارک ہو۔ مہرین ناز حیدر آباد سے خطوط کی محفل کی مستقل ممبر ہیں۔ اشعار بھی خوب چھانٹ کر نکالتی ہیں اور تبصرہ بھی بہت جامع انداز میں کرتی ہیں۔ زرمین نیازی پہلی مرتبہ شامل ہوئے اور تبصروں پر چھا گئے۔ عبدالجبار رومی بڑے بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہیں۔ اچھا تبصرہ لگا۔ باقی محفل کے شرکا نے کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے تجزیہ نگاری کی، بہت خوب۔ درماندہ عشق، الیاس سیتاپوری نے انتہائی دلچسپ اور دل کو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

چھو لینے والی داستان چھیڑی۔ کہانی ایک معصوم اور ستم رسیدہ بچہ کی ہے لیکن اس میں دلچسپی کا ہر پہلو سمو دیا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ کامیاب منتوح، طاہر جاوید مغل نے ایک تحیر خیز کہانی لکھی۔ مختصر لیکن انجام کیسا عجیب کہ ہار بھی ایک جیت بن گئی۔ سودائے جنوں، فلسطین اسلام کی نامور اور دینی شخصیات کی سرزمین جہاں یہودیوں کے ظلم و جبر کی داستان اور مسلمان جرأت مندوں اور دلیر جانبازوں کی عمدہ کہانی۔ پڑھنے والے پر اضطراب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ بلڈ پریشر اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ ملک صفدر نے اس دفعہ بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس اپنی دانش مندی اور عمدہ ذہانت سے حل کر ڈالا۔ لاکھ یا پڑ بیلنے پڑے۔ بہت ذہانت اور باریک بینی سے قاتل پکڑا گیا اور انجام انوکھا اور ڈرامائی سچویشن پیدا ہوئی۔ بہت دلچسپ اور روانگٹے کھڑی کر دینے والی کہانی۔ واپسی کا سوال، مکافاتِ عمل اور قہر خداوندی کی بے مثال کہانی۔ چودھریوں کی دولت اور عیاشی لیکن ان کو یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے کمزور ہیں۔ خدا کی ہدایت سے نافرمانی اسی لیے جب ان کی بہنوں کی عزت کی بات آئی تو سارا کھیل موت کے کھیل میں تبدیل ہو گیا۔ قدرت کا قانون جیت گیا اور چودھریوں کی طاقت ریزہ ریزہ ہو گئی۔ تہ نشین، ش م جمیل نے ایک مختصر لیکن دلچسپ کہانی کا چناؤ کیا۔ چارلی کی کہانی میں ایک زبردست چال تھی۔ ایک جھوٹ جس نے مجرم کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ مارے خوف اور ندامت کے خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ قطعہ کہانی، ایک بودہ کہانی، پڑھ کر احساس ہوا کہ کہانی میں بڑے جھول تھے۔ عارف حق، بلخ کے شیخ احمد عرف عبدالحق کی ایمان افروز داستانِ حق، کیا عمدہ تحریر ہے۔ بندگانِ خدا کو بچپن سے آخری عمر تک عبادت، ریاضت نے ولی کے درجے پر فائز کیا۔ سبحان اللہ۔ زندہ بھوت، تنویر ریاض نے اس دفعہ جرم و سزا پر ایک دل آویز کہانی کا انتخاب کیا۔ ایک مجرم کے گرد انتہائی چالاکی سے ایسا جال بچھایا گیا کہ وہ نفسیاتی اور اعصابی مریض بن کر اپنے گناہ کا اعتراف کر بیٹھا۔ برعکس، شمارہ کی آخری کہانی کا شف زبیر نے خوب رنگ جمایا۔ ابتدا تو ایسے کی کہ کوئی غم زدہ، ستم رسیدہ کی کہانی کی حد تک ہے لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھی دلچسپ ترین ہوتی گئی۔ ایک عورت نے بے پناہ دکھ جھیلے لیکن وہ دنیا تو دنیا، اولاد سے بھی فریب کھا گئی۔ بہرحال اتنی آزمائشوں کے بعد اس عورت رعنا کی جستجو رنگ لائی۔ قدرت نے اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ بہت عمدہ کہانی سے اختتام پذیر ہوا۔ اس ماہ فروری کا شمارہ بہت عمدہ اور چنیدہ کہانیوں کا شاہکار تھا۔ کترنیں بھی بہت عمدہ اور اب اگلے شمارے کا انتظار شروع۔''

✠ **محمد قاسم رحمان**، ابرار کالونی، ہری پور سے شریکِ محفل ہیں ''لگتا ہے کہ زرد رنگ ذاکرہ صاحب کا فیورٹ ہے۔ درشہوار فرام بہاولپور کرسیِ صدارت ایک ماہ کے لیے آپ کی ہوئی مبارک باد قبول کریں۔ شبانہ حسن آپ کے تبصرے پڑھ کر میرا دل و دماغ جھوم جاتا ہے۔ نادر سیال ٹائٹل گرل آپ سے باتیں بھی کرتی ہے کیا۔ وسیم احمد خان مبارک ہو۔ سسپنس پڑھتے ہوئے آپ کا ایک سال مکمل ہو گیا۔ باقی طاہرہ گلزار، مہرین ناز، عبدالجبار اور توصیف احمد کے تبصرے جاندار تھے۔ قدرت اللہ نیازی آپ کہاں گم ہیں جی۔ کہانیوں کی ابتدا ماروی سے کی۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد کو چاہیے تھا کہ مرینہ کو جہنم واصل کرتا۔ نہ رہتا بانس اور نہ بجتی بانسری۔ اب مرینہ کے ساتھ ساتھ درشاہ بھی مراد پر فریفتہ ہو گئی مجھے لگ رہا ہے کہ اگلی قسط آخری ہے۔ سودائے جنوں واہ کیا اسٹوری ہے۔ اتنا مشکل ٹاپک اور اس پر اتنا اچھا لکھا۔ لیلیٰ کا کریکٹر بہت زبردست ہے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی برعکس زبردست رہی۔ رعنا کو کاکی کی نگرانی بھی کرنی چاہیے تھی۔ آخر میں سہیل احمد اور رعنا کے ملن نے کہانی کی اینڈنگ زبردست کر دی۔ باتدبیر میں سمپسن غفلت میں دھوکا دیتے دیتے خود دھوکا کھا گیا۔ قطعہ کہانی نے واقعی بہت انٹرٹین کیا۔ باقی کہانیاں نہیں پڑھ سکا کیونکہ اسٹڈیز لف ہو گئی ہیں اور ایگزامز بھی سر پر ہیں۔'' (جی پہلے تعلیم پر بھرپور توجہ ہونی چاہیے)

✠ **رضوان تنولی کریڑوی**، اورنگی ٹاؤن، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''3 ماہ کے غیاب کے بعد خوشگوار حاضری۔ بدلتے موسم بہار کے سرورق کی خوبرو دوشیزہ گل بہار، رخ گلنار، لب پنکھڑی گلاب، مست بلوری نین، زلف عنبریں دراز، مہ بریں کلائی میں سرخ چوڑیاں، مصور باکمال کا حسین شاہکار۔ سادہ انداز میں سجی خوب صورت فہرست..... منفرد و نایاب الفاظ سے مرقع جون ایلیا کا انشائیہ ''قانون'' شاندار..... اداریہ میں ''نظام'' کی مختصر مگر کامل تشریح..... محفل لالہ زار میں کامیابی کامرانی کے دنگل سجاتی خوب صورت تبصرے کی خالق درشہوار ملکۂ تاجدار کو منصب صدارت کی مبارک باد..... تختِ لاہور سے شبانہ حسن کی بہترین وزارت..... برادر محمد صفدر معاویہ کی عمدہ مشاورت..... محمد قاسم رحمٰن کا منفرد انداز..... محمد وسیم احمد خان کا اچھا انداز..... یار دلدار رانا حبیب الرحمٰن گلوں کی ناری سعدیہ بخاری کی تعریف میں کرتے رہے عہد و پیماں۔ کہانیوں کی ابتدا محبوب، تاریخی صفحات الیاس سیتاپوری کی درماندہ عشق سے کی۔ جلال الدین اکبر کا شرفا کی بہن، بیٹیوں کو اپنے حرم کی زینت بنا دینا سراسر ظلم اور زیادتی..... محبتوں کے سفیر، محبتوں کے منتوح طاہر جاوید مغل انگریزی ادب سے لاجواب تحریر کے ساتھ نمایاں رہے۔ خوبرو بابرہ جمی کے ساتھ جزیرے سے اڑن چھو اور اب دھکے کھانے پر مجبور..... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''سودائے جنوں'' خوش اسلوبی سے رواں دواں..... بابر نعیم کی ''مہمان'' شہباز اسمتھ مہمان بلائے جان ہنستے بستے گھرانے تباہ کرنے والا ابلیس صفت اسمتھ..... ملک صفدر حیات کی ''کاش'' سبق آموز کہانی..... محفل شعر و سخن میں شازیہ کمال اور جنید احمد ملک کا انتخاب عمدگی کی سند پا گیا..... مکافاتِ عمل کے تناظر میں لکھی گئی تمثیل حیدر کی ''واپسی کا سوال'' چودھری فاخر اور چودھری شہزاد نے جو بویا وہ کاٹا، تحریر مقام عبرت..... محی الدین کی ماروی کافی نکھرتی جا رہی ہے۔ گدھا گاڑی والا مراد جتنی کمانڈو بنتا جا رہا ہے..... ش م جمیل کی ''تہ نشین'' واجبی سی رہی..... منظر امام کی قطعہ کہانی متاثر نہ کر سکی..... تصوف کے نادر اوراق سے ضیا تسنیم بلگرامی نے مردانِ حق عارفِ حق، کے عمدہ انتخاب کے ساتھ ممتاز نگینہ پیش کیا..... سلیم انور کی ''باتدبیر'' مختصر مگر پُراثر رہی۔ سمپسن اپنی بیوی کو قتل کرنے کے خواب دیکھتا ہوا دوافروش سے زہر لینے پہنچا۔ واہ بہت خوب، ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ جب تک بے وقوف زندہ ہے عقلمند بھوکا نہیں مر سکتا..... تنویر ریاض کی ''زندہ بھوت'' پُرلطف کہانی مرینہ نے جمی چائے کا خوب شوشا چھوڑا۔ جان۔ یلے نے مرحوم رچرڈ کا عمدگی کے ساتھ رول ادا کیا اور دہی قاتل ڈون پکڑا گیا۔ سچے موتیوں کی جھوٹی وفاداری کا پرفریب منظر کاشف زبیر کی ''برعکس'' آخری صفحات کے لیے بہترین چٹخارہ رہی۔ اس کے ساتھ فروری کا خوب صورت شمارہ اختتام پذیر ہوا، کستوری لگا کے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تشریف لا رہے ہیں ''خزاں کے پس منظر سے جنوری 2015ء کا شمارہ بروقت موصول ہوگیا۔ ذاکر انکل کی حسینہ گرمی کے موسم کا استقبال کرتی نظر آئی۔ جون ایلیا کا انشائیہ ''قانون'' ایک سادہ سے اصول کی تائید کرتا نظر آیا کہ اگر حکمران طبقہ قانون کی پاسداری کرے تو عوام کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ قانون کی پامالی کا سوچے۔ حالیہ دنوں میں پیٹرول کی بلیک میں فروخت کے آگے عوام کا جو حال ہے، وہ ڈھکا چھپا نہیں۔ کھلم کھلا زیادہ نرخوں پر پیٹرول فروخت ہو رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اداریہ بہترین رہا۔ سانحہ پشاور سے سیاسی زعما میں اتحاد و یگانگت واقعی خوش آئند ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ پائیدار بھی ثابت ہو۔ درشہوار اول تبصرے کے ساتھ موجود تھیں، مبارک قبول فرمائیں۔ تاہم آپ کی توپوں کا رخ الٹا دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ شبانہ حسن! اپنی غلط فہمیوں کی اصلاح کرلیں۔ محمد صفدر معاویہ خانیوال! میرے تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ خیال رہے اقربا پروری کا الزام نہ لگ جائے۔ محمد قاسم رحمان! ویلکم آگین یار! اور یس احمد خان! آپ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے مزید کہنا چاہوں گا کہ صبر و شکر کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضرور ہونا چاہیے تاکہ آئندہ ایسے واقعات سے بچا جاسکے۔ احمد خان تو بیدی! نواب صاحب اتنی جلدی مراد اور ماروی کو ہرگز نہیں ملائیں گے۔ ابھی تو آگ کے کئی دریا عبور کروائیں گے۔ مہرین ناز! آپ پھر حیدر آباد آگئی ہیں؟ لاہور والے مکان کا کیا ہوا؟ سیدہ مینا نقوی! رجسٹریشن مبارک ہو، مفصل تبصرے کے منتظر ہیں۔ عبدالجبار رومی! بھئی ہم تو ہر ماہ ہی تبصرہ لکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کیونکہ سسپنس سے رشتہ ہی ایسا ہے۔ توصیف احمد! آپ کا مختصر سا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اطہر حسین! آپ کیا اس کی ٹافیاں کھا جاتے تھے کہ نظر یہ چرانی پڑیں؟ انعم کمال! حادثے ایسے ہی ہوتے ہیں اور نئے رشتے اچانک ہی بنتے ہیں۔ ویلکم ان سسپنس فیملی! اس بار سب سے پہلے غیر متوقع طور پر الیاس سیتاپوری کی درماندہ عشق پڑھی۔ دلچسپ اور غیر متوقع ٹوئسٹ کی حامل تحریر رہی۔ گلنار کا حمدو کو رازدار بنانا حلق میں پھنسی ہڈی بن گیا تاہم آخر میں (حمدو) کردار میں مثبت طرزِ عمل کی جھلک نظر آئی۔ خادم عبدالستار کی وفاداری نے خوب متاثر کیا۔ ماروی میں ڈاکٹر نے پلاسٹک سرجری سے مراد کو ایمان علی بنا دیا تاہم دشمن بھی کم چالاک نہیں۔ نواب صاحب ماروی کو اپنے روایتی طرزِ تحریر میں ڈھال کر دلچسپ بنا رہے ہیں جس سے تحریر قابلِ مطالعہ بن گئی ہے۔ سودائے جنوں، سر پہ کفن باندھ کے نکلنے والوں کے جنوں کی داستاں ہے جن کی جدوجہد عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اللہ انہیں جلد کامیاب و کامران کرے۔ آمین۔ ماہر جاوید مغل، روایت شکن مصنف کی ایک اور روایت شکن تحریر کامیاب مفتوح شمارہ کی زینت بنی بارہ کے فیصلے نے دل خوش کردیا۔ جمی اور ناب کی دیوانگی بھی حیران کن رہی ورنہ آج کل تو محبت بھی ''ممی ڈیڈی'' ٹائپ ہوگئی ہے۔ چند فون کالز پر ہی نمٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ''گہرا زخم'' میں مغربی معاشرے کے بہت قریبی رشتوں میں موجود خود غرضی اور سفاکانہ پن کو اجاگر کرتے دکھائی دیے۔ ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے کی برائیوں کو ضمناً ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا۔ ش م جمیل کی تہ نشین میں چار لی آخر کار اپنا سالوں پرانا حساب بے باق کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ منظر امام کی قطعہ کہانی ہمیشہ کی طرح ہونٹوں پر تبسم بکھیر گئی۔ تنویر ریاض کی زندہ بھوت میں ڈون سے اعترافِ جرم کروانے کے لیے جولی اینڈ کمپنی نے خاصا کھٹ راگ پھیلایا۔ بابر نعیم کی مہمان میں مہمان بلائے جان ثابت ہوا۔ الیگزلیر جیسی تنظیم کا وجود مغربی ممالک میں ہی ممکن ہے۔ مشرق میں تو ایسے مہمان کے حصے میں سب سے پہلے ''گولی'' آتی ہے۔ واپسی کا سوال، تنسیل حیدر کی ایک سبق آموز اور عبرت اثر تحریر تھی۔ ایسی لڑکیاں جو کسی اجنبی کی خاطر ماں باپ کی عزت کے ساتھ خود کو بھی رول دیتی ہیں اور وہ حضرات، جو خود پر سب کچھ واجب سمجھتے ہیں، ان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ سب ان کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ آخری صفحات پر برعکس کاشف زبیر کی تحریر نے بھی اچھی تفریح فراہم کی۔ کامی کے اس دنیا سے جانے کے بعد رعنا کی حقیقت جاننے کی خواہش نے عجب رنگ دکھلائے۔ محفل شعر و سخن میں موبائل میسج زیادہ نظر آئے۔''

✠ **محمد یوسف سانول**، نور پور تھل ضلع خوشاب سے حاضر ہیں ''ماہ فروری کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بک اسٹال کی جب زینت بنا تو کئی حاسد رسالے سے جل گئے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ہمارے پیارے سسپنس کو اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے (بہت شکریہ) سب سے پہلے محترم ایلیا صاحب کا انشائیہ قانون پڑھا، سچ کہہ رہے ہیں سچ کہ دامی کے یہ ملکی حالات قانون کی شکست ہے کیونکہ جب قانون بنانے والے ہی قانون کا احترام نہ کریں تو عام آدمی خاک احترام کرے گا۔ جب محفل میں انٹری دی تو تمام اراکین محفل اشک بار تھے۔ سانحہ پشاور کی..... پاکستانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ سانحہ پشاور کیونکہ معصوم بچوں کی شہادت اور بزدل دشمن کی کارروائی... ایسی المناک حرکت ہے کہ دل بے اختیار رو پڑتا ہے۔ میں بوجہ کام کی کثرت فروری کے شمارے میں شرکت نہ کرسکا اس لیے افسوس ہے۔ کرسیِ صدارت پر درشہوار پیرزادہ کو بہت بہت دل مبارک۔ اچھا تبصرہ لکھا۔ سیدہ مینا نقوی بھکر سے تشریف لائیں جو کہ میرا پڑوسی ضلع ہے، خوشی ہوئی اچھا لکھا۔ عبدالجبار رومی انصاری تھینک یو کہ آپ کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں۔ سب سے پہلے سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے واقعی لکھنے کا حق ادا کردیا۔ ان اجلی رنگت والے چہروں سے پردہ ہٹایا ہے دل تڑپ جاتا ہے جب انسان حقیقت سے آشکار ہوتا ہے کہ کتنے ظالم ہیں یہ یہودی جو امتِ مسلمہ کا اتحاد نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے بعد ملک صفدر حیات کی کاش پڑھی جہاں ملک صاحب نے ایک بار پھر مجرم کو ڈھونڈ نکالا۔ واقعی سچ کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ تیز ہے۔ زاہدہ اور منگی نے تو انورجٹ کا پورا انتظام کرلیا تھا مگر خدا نے اسے بچالیا جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اس کے بعد برعکس پڑھی۔ کاشف زبیر صاحب کی ایسا لگتا تھا کہ یہ کہانی کاشف صاحب کی لکھی ہوئی نہیں، کہانی میں کافی جھول تھے۔ درماندہ عشق تاریخی کہانی پر تبصرہ اگلے ماہ مکمل پڑھ کر دیں گے۔ ویسے یہ حصہ اچھا تھا۔ محی الدین صاحب ماروی کو صحیح طریقے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی۔ سمیرا کو معاف کردیا، بہت اچھا لگا۔ واقعی محبت کرنے والوں کے دل وسیع ہوتے ہیں۔ عارف حق، ضیا تسنیم بلگرامی ہر ماہ ایمان کو تازہ کرنے والا سچا واقعہ لے کر آتے ہیں۔ خدا ان کے قلم میں برکت فرمائے۔ واپسی کا سوال تنسیل حیدر نے، کیا خوب لکھا۔ واقعی عورت کانچ کے مانند ہوتی ہے۔ حرا اور ثنا کا انجام ہمارے لیے عبرت کا سبق ہے اور بدکاری کے حوالے سے لکھا گیا فرمانِ خدا پڑھ کر دل لرز گیا کہ جو زنا کرے گا وہ اپنے گھر کو راستہ دیتا ہے اور اس کی ادائیگی اس کے گھر والے کرتے ہیں، الامان۔ باقی کترنیں اچھی تھیں۔ شارٹ کہانیوں پر تبصرہ محفوظ ہے۔ محفل شعر و سخن میں تمام دوستوں کا انتخاب اچھا لگا۔ آخر میں کترنیں اچھی تھیں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

✠ **عبدالغفور خان ساغری خٹک** ضلع اٹک سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس ماہ سسپنس کا دیدار 19 کو بھائی گیٹ لاہور سے ہوا۔ قیمت ادا کر کے فوراً اپنا نام دیکھا لیکن نہیں تھا معصوم بچوں کی موت کا سن کر دکھ لگا کہ ان بچوں کا قصور کیا تھا نہ تو ان کے، پاس بندوق تھی اور نہ ہتھیار۔ یہ اپنی معصومیت میں گھروں سے چلے تھے اور ان کافروں نے ان کو شہید کر دیا۔ تمام بچوں کو جنت میں اعلیٰ مقام دے (آمین) کہانیوں میں سب سے پہلے سودائے جنوں پڑھی۔ ابھی تک قلم کی گرفت ٹھیک جا رہی ہے۔ ماروی بھی ٹھیک ہے لیکن کچھ کردار ہٹ گئے، کہانی سے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ ذاکر صاحب کے ٹائٹل کے کیا ہی کہنے، اچھا ہے لیکن کچھ خوش زیادہ لگ رہی ہے۔ خطوط کی محفل میں انٹر ہوئے درشہوار بہن کو صدر رت مبارک ہو۔ ویسے اچھا لگا کہ اس دفعہ صنف نازک کو صدارت کا موقع دے دیا گیا۔ گل مروت بہن اور سعدیہ بخاری اٹک کو میرا اسلام، محمد قاسم رحمان آپ کو سالگرہ مبارک ہو اور عمر دراز ہو (آمین) ندیم عباس ڈھکو، بھائی صاحب آپ کو کس نے ڈھکا ہے کھل کر اظہار خیال کیا کرو محفل میں خوش آمدید۔ نادر سیال میانوالی بھائی ہم اس غم کی گھڑی میں آپ کے ساتھ ہیں اور خدا ان کی والدہ محترمہ کے درجات بلند کرے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے (آمین) اسما عبدالغفار انصاری بہن کو محفل میں خوش آمدید۔ سیدہ مینا نقوی کو خوش آمدید۔ زرمین نیازی، طاہرہ گلزار بہن جی آپ لوگوں کو عنقریب خوشخبری دوں گا۔ مقفل شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔ بہترین۔ شازیہ کمال، محمد امجد ریاض، احمد خان توحیدی، رضوان تنولی کا نمبر 105 والی کترنیں اچھی تھیں۔''

✠ **بشیر احمد بھٹی**، فوجی بستی بہاولپور سے محفل میں آئے ہیں ''سسپنس فروری 2015ء کا دوسرا شمارہ سامنے ہے تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ کہانیوں کا معیار ماہ بہ ماہ بلند ہو رہا ہے۔ سسپنس نام ہے معیار کا۔ آج انیس جنوری ہے اور دن ہے سوموار کا۔ ٹائٹل کے معاملے میں کوتاہی سے پرہیز کیا کریں۔ ویسے بھی یہ ڈائجسٹ خواتین کا تو ہے نہیں۔ مرد و زن، سب کے لیے ہے یہ سسپنس۔''

✠ **البیلی**، کراچی سے چلی آ رہی ہیں ''اپنا جگ بھاتا جیون جوگا سسپنس ڈائجسٹ 16 کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل 'اراز راز ہی رہنے دیتے ہیں۔ جون ایلیا جی کراچی کے حالاتِ حاضرہ کے ساتھ نظر آئے۔ فرقہ واریت زوروں پر ہے۔ ادارہ یہ ماہ فروری کیا پورا سال محبت سے منسوب ہونا چاہیے۔ یہ دعا ہے ہماری۔ محفل دوستاں میں درشہوار پیرزادہ، نام بھی اچھا کام بھی اچھا صدارت تو ملنی ہی تھی مبارک باد۔ وزارت شبانہ حسن کے حصے میں آئی۔ تبصرہ واقعی شاندار تھا آپ کو بھی مبارک ہو۔ فروری کے شمارے میں 6 تبصرے کراچی سے تھے تو البیلی بھی کراچی کا پانی پیتی ہے۔ پھر ایک بھائی نادر سیال نے یاد بھی دل سے کیا تو ہم حاضر ہیں۔ اس بار ٹیمیل کا پلڑا بھاری رہا۔ صدارت ہماری وزارت ہماری اور گارڈ انعم کمال ہماری، واہ کیا کہنے جسے اللہ رکھے ان کو کون چکھے۔ محمد زریان سلطان بیکل بسٹ والوں کی حوصلہ افزائی کی، اچھا لگا۔ عبدالجبار روی کے پاس وقت ہی وقت ہے، تین تبصروں کی جگہ یک ہی تبصرے نے لے لی۔ حبیب الرحمٰن یہ خوش بخت الرحمٰن آپ کے لیے خوش بخت ہی ثابت ہو۔ یہ ناز پری والا معاملہ کرو۔ اس بار تو طاہرہ گلزار کے قلم سے شکوے کے بجائے دعا نکلی۔ انقلاب زندہ باد ساتھیو! آغا فرید بھی محفل میں حاضر ہوں ورنہ؟ ہم کچھ نرالے البیلے لوگ ہیں تو اسٹوریز کی ابتدا ہی لاسٹ 'صفحات سے کاشف زبیر کی برعکس سے کی۔ لاجواب کر دیا کاشف برادر، اس کو پڑھ کر والدین سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت کس طرح کر رہے ہیں۔ رعنا اور سہیل کی طرح تو نہیں۔ منظر امام کی قطعہ کہانی بے اختیار ہونٹوں پر قہقہہ نمودار ہوا۔ ہم سسپنس ریڈر بھی اندازہ نہ لگا سکے کہ اینڈ یہ ہوگا۔ بابر نعیم کا مہمان نئے انداز سے گھر میں داخل ہوا اور گھر کے سربراہ کو نکال باہر کیا۔ یہ زیادتی ہے بیچارہ اسمتھ مشکلات کا شکار ہوا۔ کامیاب مفتوح طاہر جاوید مغل صاحب آج کل عورتوں کی نفسیات پر ریسرچ کر رہے ہیں اور ان کی نازک سوچ و احساسات کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرتے ہیں۔ بابرہ کی سوچ بہترین تھی وہ کوئی تحفہ نہیں ہے۔ زندہ بھوت میں تنویر ریاض، جولی کی محبت اپنے شوہر کے لیے سچی اور شدید تھی جو مرینہ کی مدد سے ڈون کو پشن چائے پلا کر نقلی بھوت سے ڈرا کر مجرم ثابت کیا۔ فی الحال اتنی کہانیاں ہی پڑھ پائے۔ محفل شعر و سخن میں ہر شعر لاجواب ہے۔ ہمارے تمام قارئین اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ایم خلیل، مینا نقوی، سید نعیم، خوش بخت، وقاص آمین، مدحت اور نرمین کے اشعار زیادہ پسند آئے۔''

✠ **رمضان پاشا** گلشن اقبال، کراچی سے حاضر محفل ہیں ''فروری 2015ء کا سسپنس اپنی مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے ہی مارکیٹ میں آ گیا، یہ ایک خوش آئند ابتدا ہے۔ تازہ شمارے کا سرورق حسبِ روایت دلکش اور جاذبِ نظر تھا۔ فہرست کی تزئین کاری اور ترتیب دینے والے کلاکار کو داد دیتا ہوں۔ انشائیہ حسبِ معمول کھرا سچ تھا۔ محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ درشہوار کو مبارکباد، موصوفہ نے حقیر فقیر کے تبصرے کو اچھا کہا ہے، ان کا شکریہ۔ کہانیوں میں سودائے جنوں ٹاپ پر چل رہی ہے۔ ماروی نے بھی تہلکہ مچا رکھا ہے اور برعکس تو دی اسٹوری آف دی سنتھ رہی۔ مہمان وہ بھی بن بلائے کہانی پُرلطف تھی۔ اختتام تو بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ کاش ملک صاحب اس کی ایک اور قسط لکھ دیتے، اے کاش کہانی گہرا زخم چھوڑ نہیں گئی جبکہ زندہ بھوت کافی دلچسپ کہانی تھی۔ واپسی کا سوال ارے یہ تو عبدالرب بھٹی کی لائن ہے۔ اب یہ نئے قلم کار نے اپنائی، کہانی جاندار تھی۔ دل دہلانے والی کہانی نہ نشین بھی خوب تھی۔ قطعہ کہانی منظر امام نے حسبِ عادت قاری کو خوب ہنسایا۔ باتدبیر میں مزہ نہیں آیا۔ اشعار کی محفل میں اس بار اتفاق سے تین خواتین کے اشعار مجھے پسند آئے۔ مہرین ناز، سیدہ مینا نقوی، سیدہ اسما بخاری ان سب کی خدمت میں بے شمار داد پیش کرتا ہوں۔''

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے تشریف لا رہے ہیں ''کچھ عرصے غائب ہونے کے بعد پھر نمودار ہیں ہم۔ دو تین دن سے موسم کے تیور بڑے خطرناک ہیں اور میرپور خاص والوں کو مری اور سوات یاد آتے ہیں، ہمیں بھی سسپنس میں جون ایلیا یاد آئے۔ ان کی تحریر بھی خوب رہی۔ آپ کے خط میں رنگ برنگے خطوط لکھے ہیں۔ طاہرہ گلزار، شبانہ حسن، مہرین ناز کس کس کا ذکر کریں، سب ہی نے لاجواب لکھا ہے۔ خاص طور پر درشہوار بہت زبردست تبصرہ کر گئیں اس لیے صفِ اول پر بہت بہت مبارک باد۔ دیسی اور بدیسی کہانیوں کا حسین سنگم فروری کا سسپنس بہت ہی خوب رہا۔ منظر امام صاحب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

اپنے ہی رنگ میں لاجواب قطعہ کہانی لے کر آئے اور بہت خوب رہے ایسی ہی ایک کہانی کچھ عرصہ قبل شائع ہوئی تھی۔ تنویر ریاض زندہ بھوت لے کر آئے اور بڑی ہی منفرد کہانی کا انتخاب کیا اور خوب تحریر کیا۔ الیاس سیتاپوری درماندہ عشق کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔ فیروز بخت اور گلنار کا کردار پھر گلنار کا انجام اور داؤد کا کردار۔ بہت زبردست رہا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جلن حسد اسی لیے بدترین ہے۔ گلنار نے اپنے آپ کو تباہ کرلیا۔ آگے اس کا انجام کس طرح سامنے آتا ہے کیا بھائی بہن کی ملاقات ہوگی مگر کس موڑ پر، سب کو شدت سے انتظار ہوگا۔ ملک صاحب کا کارنامہ بھی بہت زبردست رہا۔ کھوجی کی مدد سے قاتل کو جا پکڑا مگر اندر سے نکلا کون۔ یہاں بھی ایک عورت کا کردار، انتقام کی آگ میں کس طرح برباد ہوئی اور کس طرح کاش منہ سے نکلا یہ کاش پہلے نکل جاتا۔ بڑی عبرت انگیز کہانی۔ اسی طرح گہرا زخم بھی ہم پڑھنے والوں کو زخمی کر گیا ماں اور بیٹی کا کردار اور انجام سسپنس زندہ باد۔''

ایم اے فاضل فریدی، نیو مزنگ سے چلے آرہے ہیں ''عرصہ دراز سے محفل یاراں میں جگہ حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کررہا ہوں اسی امید کے ساتھ کہ ناچیز کو مایوس نہیں کیا جائے گا اس سے پہلے بھی دو تبصرے ارسال کرچکا ہوں مگر لگتا ہے کہ نامہ بر بھی رقیبوں سے جاملا جیسی کوئی بات ہوگی (ارے نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ محفل میں خوش آمدید) کچھ پرانے ساتھی گاہے بگاہے محفل میں نظر آتے رہتے ہیں ساتھ ساتھ کئی نئے دوستوں کا بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ محفل کے نئے ساتھیوں کو خوش آمدید اور مادام درشہوار پیرزادہ کو سند خاص پر براجمان پایا۔ ہماری طرف سے مبارک قبول فرمایئے۔ شبانہ حسن، اعجاز احمد راحیل، سیدہ مینا نقوی، مہرین ناز، طاہرہ گلزار کے تبصرے دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح ٹھیک ہی تھے۔ محفل یاراں سے فارغ ہوئے تو سب سے پہلے ماروی (از محی الدین نواب) کے حالات وواقعات سے آگاہ ہوئے۔ پتا چلا کہ مراد بھی بے مراد نہیں رہنا چاہتا تو بوب چانڈیو بھی اپنی محبوبیت پر قائم ہے۔ ماروی بے چاری تو ان دو پاٹوں کے بیچ پس ہی رہی ہے لیکن محبوب کے اعصاب پر ماروی ایسی چھائی ہے کہ اسے سمیرا جیسی پیار کرنے والی کا یکسر احساس نہیں۔ اسی طرح سمیرا بھی دھن کی پکی ہے، سوچتی ہوگی کہ شاید کوئی معجزہ ہوجائے۔ الیاس سیتاپوری درماندہ عشق لے کر۔ اولین صفحات پر ایک خوب صورت تاریخی تحریر لیے آئے درماندہ عشق بہت پسند آئی۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر صاحب برعکس کے ساتھ نظر آئے مگر گستاخی معاف ان کی تحریر کوئی بھی عکس دل ودماغ میں بنانے سے قاصر رہی۔ باقی زیر مطالعہ انشاء اللہ اگلی مرتبہ ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ پھر حاضری دیں گے۔''

ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ''سرورق کی حسینہ نازنین زلفیں بکھرائے ایک منفرد انداز سے ادائے مستانہ لیے ہوئے خوابوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔ پس منظر میں نامۂ محبت بکھرے ہوئے ہیں۔ اندر انشائیہ میں حکمت کے موتی چنے جس میں قانون کی عملداری کا المیہ بیان کیا گیا۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ قانون موجود ہے مگر اس پر عمل نہیں ہوتا نتیجتاً ہر طرف بے چینی افراتفری نفسانفسی انسانی رویوں میں تبدیلی ہے۔ قانون بنانے والے خود ہی قانون بناتے اور خود ہی قانون توڑتے ہیں۔ اس کے برعکس عوام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ قانون کی پابندی کریں۔ اس کے بعد اندرادارہ سے مستفید ہوئے۔ سرفہرست درشہوار ہیں مبارک باد۔ دیگر نئے پرانے دوستوں کی حاضری بھی بھرپور تھی۔ تاریخ کے جھروکوں سے الیاس سیتاپوری درماندہ عشق لے کر آئے۔ جس کے سحر میں آخر تک محصور رہے۔ دوسری قسط کا انتظار ہے؟ طاہر جاوید مغل کی کامیاب مفتوح تھی۔ تاب جیت کر بھی ہار گیا محبت کے انداز نرالے ہیں۔ تیسری کہانی عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں تھی۔ جس میں فلسطینیوں کے حب الوطنی اور حریت پسندی کی کہانیاں ہیں۔ اسرائیلیوں کی متعصبانہ کارروائیاں فلسطینیوں کو ان کے کاز سے پیچھے نہیں ہٹا سکتیں۔ مہمان، گہرا زخم بھی اچھی لگیں۔ واپسی کا سوال نس میں ہوس نے عقل پر پردے ڈال دیے۔ نتیجتاً بھڑکتے ہوئے شعلوں میں دو گھر تباہ ہوئے۔ ناکام حسرتیں لیے ہوئے چار جوانیاں اپنی لگائی ہوئی آگ میں جل گئیں۔ افسوس صد افسوس کہ بنا سوچے سمجھے جو بھی کام کیا جائے، وہ تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ ماروی بھی پڑھی جارہی ہے مگر وہ انداز نہیں کہ ایک بار تحریر شروع کرو تو آخر تک تحریر سے نظر نہ اٹھے۔ کترنیں بھی خوب تر تھیں اور محفل شعر وسخن کے کیا کہنے کہ منتخب اشعار پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ تہ نشین بھی بہتر تھی۔ البتہ قطعہ کہانی یہ انداز مزاح بہت اچھی لگی جس نے خندہ زنی پر مجبور کیا۔ منظر امام کا منفرد ہی انداز ہے جن کی کہانیاں ہلکی پھلکی پیغام رساں ہوتی ہیں۔ دلوں کو روحانی روشنی سے منور کرنے والی ولیوں کی کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں مگر اس کے لیے اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے (آمین) باتدبیر اور زندہ بھوت بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھیں۔ کاشف زبیر کی برعکس جس نے آخری صفحات کی مناسبت سے بہت متاثر کیا۔ یہ آج کے معاشرے کی سچی عکاسی کرنے والی کہانی تھی۔ شاید یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ دنیا کے کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کے لیے برا نہیں چاہیں گے اولاد کے سلسلے میں اپنی ذمے داری بنانے کی کوشش ہر اولاد کے لیے ماں باپ کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ رخصت اور دعا کہ اللہ نیا سال ہر انسان کے لیے نیک ساعتیں لائے'' (آمین)

احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے حاضر ہورہے ہیں ''شمارہ فروری چار دن لیٹ 20 جنوری کو ملا۔ درشہوار پیرزادہ، گڈ تبصرہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار نظر آئیں۔ مبارکباد۔ سسٹر طاہرہ گلزار، مہرین ناز، عبدالجبار انصاری، شبانہ حسن، اعجاز راحیل اچھے تبصرے۔ بھاگ کر ماروی پر جال پھینکا۔ آخر مراد کیا بلا ہے جو ماروی، مرینہ ورشاسب از دواجی تعلق چاہتی ہیں۔ اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں۔ کاش میں ملک صاحب منگی تک پہنچ گئے۔ زاہدہ کو بے وفائی کی اچھی سزا ملی۔ زاہد چودھری، شبانہ حسن، اسما انصاری، اعجاز راحیل، زریاں سلطان، امین گلبہار، اقبال کورنگی، حمد حسن عرضی اچھے اشعار ہیں۔ تنسیل حیدر، واپسی کا سوال، اچھی اسٹوری لائے۔ جاگیردار ٹولہ میں یہ عام بات ہے۔ عیاشی کرنے والوں کا انجام شہزاد جیسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر جاگیردار نے خود کو گولی مار کر جہنم واصل کردیا۔ تمام قارئین ساتھیوں سے التجا ہے کہ محترم علی سفیان آفاقی صاحب کے لیے خصوصی تلاوت برائے ایصال ثواب ضرور کریں۔''

وسیم احمد خان، خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ''فروری کا شمارہ حسب دستور 18 تاریخ کو مل گیا، ٹائٹل پر اپنے محبوب کی تصویریں بکھرائے دراز حسینہ منہ کھولے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ذرا اچھی نہ لگی۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں حاضری دی، جہاں پر عہدۂ وزارت سے مستفید ہوتی ہوئی درشہوار صاحبہ سے ملاقات ہوئی، ان کا تبصرہ اچھا لگا۔ صفدر معاویہ بھائی اب آپ کی کیسی طبیعت ہے۔ اللہ آپ کو صحت عطا کرے۔ نادر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

سیال صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی امی جان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے آپ کو صبر دے۔ اپنا خط دیکھ کر اور پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے تنویر ریاض کی زندہ بھوت پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ مرینہ کی لپٹن چائے نے واقعی کمال کر دکھایا۔ منظر امام حسب دستور قطعہ کہانی میں بھی طبیعت باغ و بہار کر گئے، واپسی کا سوال تنثیل حیدر کی سبق آموز کہانی ہے مگر موضوع پرانا تھا۔ انکل طاہر جاوید کی کامیاب مفتوح بہت زبردست کہانی رہی جس میں بابرہ نے اچھا فیصلہ کیا۔ طاہر انکل، پس زنداں اور ستاروں پر کمند جیسی نسط وار کہانیاں لے کر آئیں جلدی پلیز، محفل شعر و سخن حسب روایت خوب صورت اشعار سے مزین تھی۔ فرسٹ، سیکنڈ، تھرڈ تینوں شعر زبردست تھے۔ مسٹر اینڈ مسز صفدر معاویہ، خانیوال، احمد خان توحیدی، زریان سلطان، کراچی، ایم خلیل ساحل، شبانہ حسن، درشہوار کے اشعار بھی قابل ستائش ہیں۔ نگران اعلیٰ معراج رسول، عذرا رسول کے صاحبزادے ذیشان رسول کی شادی کے بارے میں پاکیزہ میں پڑھا تھا۔ ہماری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ سانحہ پشاور کے بعد سانحہ شکارپور نے ایک بار پھر دل غم سے بوجھل کر دیا، اللہ پاک دہشت گردوں کو غارت کرے۔ ہم سب پر اپنا رحم و کرم کرے اپنا فضل عطا کرے۔'' (آمین)

✠ **سما گر تلوکر**، چشمہ بیراج سے چلے آرہے ہیں ''سسپنس نے بہت انتظار کروایا۔ سرورق عین سسپنس کے مطابق تھا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کے قیمتی موتیوں کو دل میں سمیٹا۔ ابتدائیہ میں واقعی درست کہا گیا ہے کہ قیمتی جانوں کے نقصان کو پورا نہیں کیا جا سکے گا۔ اہل جمال کی بزم میں درشہوار اول ٹھہریں مبارک ہو۔ شبانہ حسن معاویہ اعجاز مہرین اور ڈھکو صاحب کے خطوط شاندار رہے۔ زرمین نیازی اور طاہرہ گلزار کے طویل محبت نامے دل کو لگے۔ کامیاب مفتوح طاہر صاحب نے ہمیشہ کی طرح لازوال لکھی۔ سودائے جنوں دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی کہانی ہے۔ مہمان، واپسی کا سوال اور تہ نشیں بہترین کہانیاں تھیں۔ کاش کاش ہماری زندگی میں نہ ہوتا۔ گہرا زخم واقعی گہرا زخم تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جیسا لکھتے ہیں، ویسا سچ کوئی نہیں لکھ سکتا۔ قطعہ کہانی، منظر امام ایک لفظ ایک اشارے یا ایک سطر میں پوری داستان سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی مختصر نویسی کا یہ کمال ہے کہ ہر منظر مکمل لگتا ہے۔ ہر بات مفصل ہوتی ہے۔ تاثرات کی ابتدا کسی معمولی بات سے ہوتی ہے۔ جو آخر تک پہنچتے ہی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ پڑھنے والا چونک اٹھتا ہے کہ غیر اہم اور اہم کا درمیانی سفر اتنا شارٹ کیسے ہو گیا۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔''

✠ **ماریہ خان**، اسلام آباد سے شرکت کر رہی ہیں ''دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ..... سچ میں اگر ہمیں فرصت مل جائے ایسے ایسے تاریخی خطوط لکھیں کہ بس۔ ہمارا سسپنس ڈائجسٹ کے لیے پہلا خط ہے لہٰذا اس کو ردی کی ٹوکری میں نشان عبرت مت بنایئے گا (ارے نہیں بھئی خوش آمدید) فروری کا سسپنس ڈائجسٹ بیس جنوری کو موصول ہوا، دیوانہ وار مطالعہ کیا تاکہ اگلے شمارے کے نزول سے قبل تبصرہ تحریر کیا جا سکے۔ اس بار تو سرورق کو دیکھ کر صنف سخت ضرور ریشہ خطمی بلکہ ڈانواں ڈول ہوئے ہوں گے۔ جون ایلیا کا انشائیہ بعنوان قانون پڑھا..... ہماری ناقص عقل مرحوم کے انشائیے کی معنویت تو سمجھ نہیں پاتی، تاہم اتنا سمجھ آتا ہے کہ خوابیدہ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں، ادارہ پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کیونکہ سانحہ پشاور ہم پر قیامت بن کر ٹوٹا ہے۔ بہت سے پھولوں کے بیچ ہمارے گلشن کے دو پھولوں کے جنازے بھی تھے، جی ہاں ہمارے دو کزن اس سانحے میں شہید ہوئے ہیں ..... اللہ پاک شہید ہونے والے تمام بچوں کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ خطوط میں پہلا خط درشہوار پیرزادہ کا اعزازی قرار پایا۔ واہ کیا ظریفانہ انداز پایا ہے۔ ویلڈن جی، باقی تبصرہ نگاروں نے اچھا لکھا۔ ابتدا، ابتدائی صفحات کی کہانی درماندہ عشق سے کی ..... کہانی کے مندرجات پر تبصرہ کرنے کے لیے ہمارے لفظ بہت چھوٹے ہیں ہمیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہے۔ تاہم اتنا کہیں گے کہ فیروز بخت، داؤد اور گلنار کی اس تاریخی داستان کے بقیہ حصے کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ان تحریروں میں سے ایک ہے جس نے پہلی قسط سے ہی ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ مجاہد کے بعد یہ دوسری کہانی ہے جس میں صیہونی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کو منظر عام پر لایا گیا۔ اسرائیلی سازشوں کو بے نقاب کرتی یہ داستان قابل ستائش ہے، ملک صفدر حیات کی کہانی کاش ہمارے معاشرے کے ان مکروہ کرداروں کی روداد تھی جن کے روشن چہروں کے پیچھے تاریک ذہن ہوتے ہیں، زاہدہ نے منگی کے ساتھ ساز باز کر کے لالی کے قتل میں اپنے شوہر انور جٹ کو پھنسانے کی کوشش کی مگر ملک صاحب کی محنت رنگ لائی۔ طاہر جاوید مغل، محبتوں کی کہانیاں لکھنے والے ایسے قلم کار، جن کی تحاریر ہماری ترجیحات میں شامل رہتی ہیں۔ زیر نظر تحریر کامیاب مفتوح ..... تین دلوں کی تال پر دھڑکتی اس کہانی میں اکیسویں صدی کی عورت نے سب پر جی کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے تئیں دانش مندانہ فیصلہ کیا، طویل عرصے بعد آخری صفحات پر متمکن ہونے والے قلم کار، کاشف زبیر کا نام ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ برمکس ..... سچے موتیوں کی جھوٹی وفاداری کا پرفریب عکس، ممتا کی ماری کا دلخراش ماجرہ..... کہانی پڑھنے کے بعد رعنا کے حوالے سے ہم نے بے عنوان ساجدیہ محسوس کیا، اپنے دل میں۔ سچ کہتے ہیں کچھ لوگوں کی عارضی رفاقت دائمی یادیں چھوڑ جاتی ہیں۔''

✠ **اسماء عبدالغفار انصاری**، لاہور سے محفل کی زینت بنی ہیں ''سرورق خیالوں سے بھرپور اداس اداس سا لگ رہا تھا۔ جون ایلیا کی قانونی باتیں اور انوا کا خوف ہائے اتنی گہری باتیں اور پھر اپنے پیارے ملک کے حالات بھی ایسے کہ جون ایلیا نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو امن و آشتی کا گہوارہ بنائے۔ آمین۔ بے صبری سے اپنی محفل میں پہنچے تو اپنا خط دیکھ کر میری ساری تھکان ہی دور ہو گئی۔ تبھی تو اگلے شمارے کے لیے ہمت اور بڑھ گئی اور یہ خط بھی لکھ ڈالا۔ محفل میں سب لوگوں کے خط بہت اچھے لگے۔ آپی درشہوار تو صدارتی فرائض پورے کر کے زبردست تبصرہ پیش کر رہی تھیں۔ شبانہ حسن کا مراسلہ بھی اچھا لگا۔ رانا حبیب الرحمٰن اللہ آپ کی مصیبتیں دور کرے۔ آمین۔ آپی طاہرہ گلزار ہنستی ہوئی آپ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اطہر حسین صاحب آپ محفل میں آ ہی گئے ہیں تو نظریں کیوں چرا رہے ہیں۔ انعم کمال آپ تو بہت حساس ہیں آپ کا خط پڑھ کے تو میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پہلے ماردی کے درشن لیے مراد نے مرینہ کو جھٹکے کا مریض بنا دیا، وہ بھی نارمل تو کبھی ابنارمل۔ آخر مراد سب کو بچا دے کر پاکستان نکل گیا، درماندہ عشق تو بہت پسند آئی، تاریخی کہانی ایک دوسرے کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.pdfbooksfree.net/
http://www.urdutube.net/

ساتھ سازشیں کرتے ہوئے دلچسپ پہلو نظر آئے۔ گلنار کے ساتھ تو بہت برا ہوا کچھ اسے اپنے کیے کی سزا بھی ملی، ہر لحاظ سے بہترین کہانی ہے۔ کاش تو کاش ہی رہ جاتی زاہدہ بھی اپنے کیے کی بھینٹ چڑھ گئی اور لالی بے چارہ بے موت ہی مارا گیا۔ ملک صفدر صاحب کی سچی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں جن معاشرے کے اچھے برے پہلو سے پردہ اٹھایا ہوتا ہے اور فلسطین کے مسلمانوں کی جاں فزا داستان سودائے جنوں بھی بہت اچھی لگی۔ بازغہ اور محسن کا ہوشیاری سے بچ نکلنا اور بازغہ کا غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی ساتھ دینا آفرین انگیز تھا۔ عارف حق میں ولی شیخ احمد کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ان کے ایمان افروز واقعات پڑھ کے دل روشن ہوگیا۔ اس دفعہ بہت اچھی اور پیاری کہانیاں پڑھنے کو ملیں، باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

بشریٰ افضل، بہاولپور سے شریک محفل ہیں "20 جنوری کو سسپنس ملا۔ پورے ٹائٹل پر صنف نازک براجمان تھی۔ بیک پر ویران حویلی نظر آرہی ہے۔ انشائیہ ایک سرگزشت پڑھی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے انکل کی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ درشہوار پیرزادہ بہاولپور سے کرسی صدارت پر آپ کو دیکھا، واقعی دلی خوشی ہوئی۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ 16 جنوری کو میری محبت کرنے والی بہن ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔ ان کے بغیر زندگی ادھوری سی لگتی ہے ہم سے بہت محبت کرتی تھیں، جلدی چھوڑ گئیں ہمیں۔ ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ درشہوار ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ باقی رسالہ پر تبصرہ اگلے ماہ کروں گی۔" (اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے)

احسان سحر، میانوالی سے حاضر ہورہے ہیں "اللہ پاک سے دعا ہے کہ تمام مسلمان پاک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ عادتیں بھی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ انسان ہمیشہ اچھی عادتوں کی ہی وجہ سے بلند مقام پاتا ہے۔ حسب معمول سسپنس وقت پر ہی مل گیا۔ چاہو یا نہ چاہو وقت گزر ہی جاتا ہے اور اسی گزرے وقت میں ہی ہم نے سسپنس ختم بھی کرلیا۔ چیزیں ہوتی ہی ختم کرنے کے لیے ہیں۔ پھول بکھرنے کے لیے ہی کھلتا ہے۔ سسپنس بھی ختم کرہی لیا۔ ٹائٹل کو دیکھا۔ ٹائٹل کی صنف نازک ہمیں ہی دیکھے جارہی تھی اور اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ شاید ہم پہلے بھی ایک دوسرے کو مل اور دیکھ چکے ہیں..... کب، یہ یاد نہیں۔ خیر آگے بڑھے کیونکہ آگے بڑھنا ہی دانش مندی ہے، جون ایلیا سے اسٹارٹ لیا۔ جون ایلیا اس وقت تو ہم میں زندہ نہیں..... لیکن اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ قانون، جو اندھا ہوتا ہے پھر یہاں تو کوئی قانون نہیں ہے، پھر کیسے پتا چلے گا کہ اندھا ہے یا بہرا۔ جس چیز کا وجود ہی نہ ہو اس کا رونا کیا۔ آگے بڑھے، ٹھنڈی مورتیں ہیں..... دل میں صدائیں ہیں، آگئے ہم اپنی محفل میں ..... یہی تو ہماری روانیں ہیں۔ خواہشیں دل میں ہی پیدا ہوکر دل میں ہی مرجاتی ہیں۔ ہماری خواہش بھی ہمیں ہر ماہ یہاں کھینچ لاتی ہے اور اس بھیڑ میں ہم ایسے گم ہوجاتے ہیں جیسے سورج نکلتے ہی ستارے۔ درشہوار کافی عرصے بعد نظر آئیں اور آتے ہی سب سے آگے اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ مبارک ہو بندۂ ناچیز کی طرف سے۔ کامیاب مفتوح، طاہر جاوید صاحب عورت نما پہیلی کے حوالے سے قلم چلایا۔ پہیلی تو خیر سمجھ میں آجاتی ہے..... پر یہ عورت ذات بھلا کب سمجھ میں آتی ہے۔ ہمان، عجیب اور ناسمجھ میں آنے والی صورت حال کا سامنا رہا۔ مغرب والوں کے انداز مغرب والے ہی جانیں۔ ہمارے ہاں ایسی صورت حال بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کاش، ملک صاحب اس دفعہ بھی ایک قتل کی گتھی سلجھانے میں کامیاب رہے۔ بات انور جٹ سے ہوتی ہوتی ملنگی پر ختم ہوتی..... نہیں بات پھر ایک عورت پر ہی ختم ہوئی جو کسی کی بھی نہ ہوتی۔ کسی کی ہوکر بھی بے گھر ہی رہی۔ گہرا زخم، زخم، زخم ہی ہوتا ہے۔ غیروں کا دیا ہوا زخم تو انسان بھول جاتا ہے۔ پر اپنوں کے دیے ہوئے زخم ہمیشہ تازے ہی رہتے ہیں۔ واپسی کا سوال، وہی چودھریوں اور وڈیروں کی عیاشیوں اور بے عزتیوں کا احوال، انہیں کسی غریب کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھر میں بیٹھی اپنی عزت کا خیال نہیں رہتا۔ انیس نے کافی اچھا سبق دیا۔ چوٹ لگانے والے کو ایسی ہی چوٹ لگائی جائے تو اسے احساس ہوگا درد کا۔ ماروی، لگتا ہے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ مراد لگتا ہے صاف بچ کر نکل جائے گا انڈیا سے۔ مرینہ کے ساتھ کافی کچھ ہوتا رہا..... محبوب کی بے تابیاں عروج پر ہیں۔ تہ نشیں، چارلی نے کافی مہارت سے اپنا انتقام لیا۔ قطعہ کہانی، اس بار بھی منظر امام صاحب مات کھا گئے۔ ایسی باتیں کبھی کبھی اپنوں سے بھی بیان نہیں کرنی چاہئیں خاص کر بوڑھے اور غیر شادی شدہ سے ..... کیا پتا کب جوان ہوجائیں اور ہماری پسند ہی چوری کرلیں۔ با تدبیر بھی اچھی کاوش تھی، میار خود ہی پھنس گیا۔ زندہ بھوت، مرینہ اینڈ پارٹی کی کامیاب حکمت عملی سے ڈون بیکسٹر شکار ہوہی گیا۔ بزدلوں کو پھنسانے کا یہی طریقہ کامیاب ہے۔ آخری صفحات کے لیے کاشف زبیر کی برعکس کا مطالعہ کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں بھی سکھاتی ہے بچے کو..... پر معاشرہ بھی سکھاتا ہے۔ ماں ہمیشہ بچے کو اچھا اچھا ہی سکھاتی ہے۔ پر معاشرہ زیادہ برا ہی سکھاتا ہے۔ کامی کے ساتھ بھی یہی ہوا..... جوانی کے جذبات کے ریلے میں ماں کے دیے ہوئے سبق سب بہہ گئے۔ آلی دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ ندا اور کامی کے بھرکیلے جذبات دونوں کو ہی لے ڈوبے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

ابرار دارث، سندیلیانوالی۔ شبانہ حسن، لاہور۔ محمد اسحاق انجم، گنگن پور، قصور۔ فاروق احمد قریشی، حیدرآباد۔ محبوب مصور سومرو، لاڑکانہ۔ اعجاز احمد راحیل، ساہیوال۔ مہرین ناز، حیدرآباد۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔

سانحہ ارتحال

کئی عشروں سے اس ادارے سے مسلسل قلمی اور قلبی وابستگی کے بعد معروف قلم کار، فلم ساز اور ہدایت کار جناب علی سفیان آفاقی 27 جنوری کی شام خالق حقیقی سے جاملے۔ رب العالمین ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔۔۔ ادارے کے جملہ اراکین مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

درماندہ عشق

دوسرا حصہ

الیس ایس سیتاپوری

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کو بہ خوبی ہوتا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین... جو اپنی اولاد کو زمانے کی تپتی دھوپ اور راہ میں بچھے کانٹوں سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جارہا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس پر ظلم ڈھاتے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذاب الٰہی کا خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام تر کم مائیگی کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا بھی تسخیر کرلی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر لفظ ایک الگ ہی معنی میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز سب سے جدا تھے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

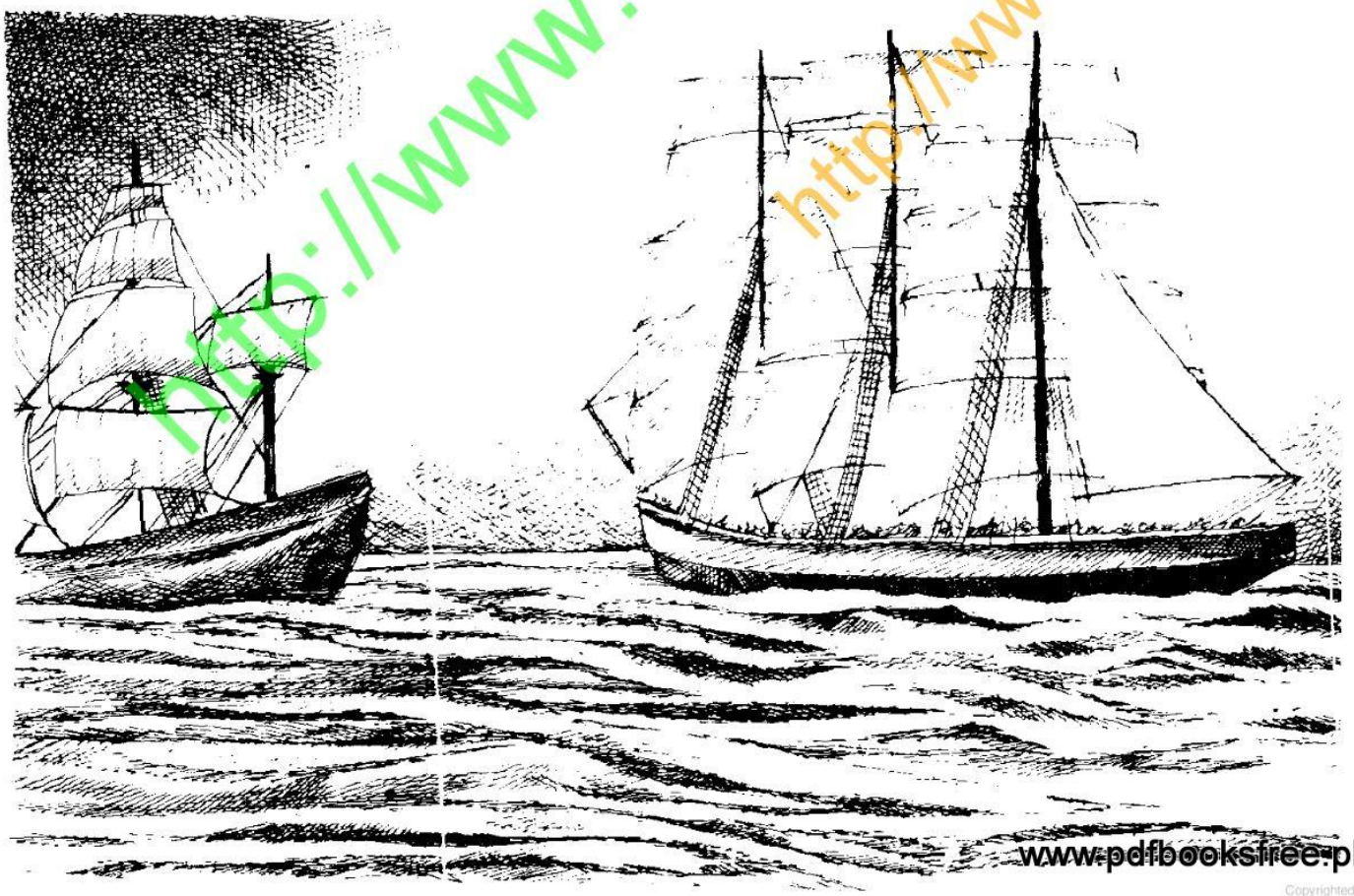

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

داؤد نے فیروز بخت کو ساتھ لیا اور احمد آباد روانہ ہوگیا۔ احمد آباد میں بھی اس کی شاندار حویلی تھی اور اس میں خدمت گاروں کی بھرمار تھی۔ راستے میں داؤد نے فیروز بخت کو بار بار یہی سمجھایا۔ ''فیروز بخت! تو ایک گمنام خاندان اور نامعلوم والدین کا بیٹا ہے۔ تیرے ماں باپ سے بھی واقف نہیں اور تیری یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے میں نے تجھ کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔''

فیروز بخت اس کی باتیں بے دلی سے سن رہا تھا۔

داؤد نے کہا۔ ''تو مجھ سے پوچھ سکتا ہے کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے دولت اور جائداد کی وجہ سے شادی نہیں کی۔ اگر میں شادی کرلیتا تو آج میں صاحب اولاد بھی ہوتا اور اگر اولاد میں ایک آدھ کے سوا باقی ساری نالائق نکل جاتیں تو میری ساری دولت اور جائداد بھاپ بن کر اڑ جاتی اور میں یہ حشر گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں نے شادی نہیں کی۔ میں نے تجھ کو لاوارث سمجھ کر اپنا بیٹا بنالیا۔ اس طرح میں نے اپنی دولت اور کاروبار کا ایک صحیح وارث تلاش کرلیا ہے۔ جو ایک تنہا انسان ہے۔ اب میں تجھے یہ ہدایت اور وصیت کروں گا کہ میری طرح تو بھی شادی نہیں کرے گا اور اپنی ہی طرح تو بھی کسی لاوارث بچے کو پال پوس کر یہی تعلیم و تربیت دلائے گا اور اس کو اپنا بیٹا بنا کر میرے اس تجربے اور اس عمل کو جاری رکھے گا۔''

فیروز بخت نے وعدہ کرلیا کہ وہ داؤد کی وصیت پر ضرور عمل کرے گا۔ ان کا قافلہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف اڑا چلا جارہا تھا۔

☆☆☆

فیروز بخت کی جو عزت کی جارہی تھی، وہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔ ستار خوش تھا کہ وہ اپنی وفاداری میں کامیاب رہا تھا۔ داؤد بھی اس پر بہت مہربان تھا۔ دورانِ سفر ستار کو ایک ہی تکلیف تھی۔ اس کا آبائی وطن دہلی کوسوں پیچھے رہ گیا تھا۔ فیروز بخت بھی دہلی سے انس رکھتا تھا۔ خود اس کو بھی دہلی چھوٹ جانے کا گہرا ملال تھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

داؤد کے دل پر اپنی بہن گلنار کی جدائی کا بڑا اثر تھا۔ اکثر اس کی آنکھیں بھر آتیں اور آواز بھرا جاتی۔ جب بیانہ سے آگے قافلے نے قیام کیا تو سورج مغرب میں اتر رہا تھا۔ سرخ، نارنجی اور سرمئی رنگوں سے آسمان نگارخانہ بنا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کو ان رنگوں میں مختلف شبیہیں نظر آرہی تھیں۔

ستار اس دلچسپ منظر سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا

اس نے... نمازِ مغرب کے بعد داؤد کو اداس دیکھا تو کہا۔ ''میں نے آپ کو بے حد خوش و خرم دیکھا ہے لیکن اب میں اداس دیکھ کر بہت غم زدہ ہوجاتا ہوں۔ اگر میں کسی بھی طرح آپ کا غم دور کرسکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ آپ مجھے حکم دے کر دیکھیے۔''

داؤد نے کہا۔ ''ستار! تیری غم خواری کا شکریہ۔ میرے دل پر جو زخم لگے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں جو بہ آسانی مندمل ہوجائیں۔ ممکن ہے احمد آباد اور سورت کی مصروفیات میرا غم غلط کردیں ورنہ بظاہر تو یہی نظر آرہا ہے کہ یہ زخم زندگی بھر ہرے رہیں گے۔''

فیروز بخت، داؤد کے سامنے کھڑا تھا۔ داؤد نے اسے پاس بٹھالیا بولا۔ ''فیروز بخت! یہ سارے تماشے جنہیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے، نئے نہیں ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میں نے بڑے زخم کھائے ہیں لیکن یہ آخری دو زخم ایسے ملے ہیں جو شاید میری جان لے کر ہی ٹلیں۔''

فیروز بخت تو خاموش رہا، ستار نے پوچھ لیا۔ ''دو زخم کون کون سے؟''

داؤد نے نظریں نیچی کرلیں۔ جواب دیا۔ ''گلنار کا حرم سرا میں زبردستی داخلہ اور دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا۔''

دہلی چھوٹنے کی چوٹ ستار کے دل پر بھی تھی۔ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''کہتے ہیں، رسول مقبول ﷺ نے جب اپنے وطن مکے کو چھوڑا تھا تو مدینے کی طرف جاتے ہوئے بار بار مکے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔''

خیمے میں داؤد نے آنکھیں بند کرلیں اور اوندھے منہ لیٹ گیا۔ ستار کچھ دیر کھڑا داؤد کی اس عجیب و غریب حرکت کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد آہستہ سے کہا۔ ''میں آپ کی اداسی کا ایک علاج بتاتا ہوں۔ اگر آپ اس پر عمل کریں گے تو سارے غم بھلا دیں گے۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''کون سا علاج؟ اگر وہ میرے بس کا ہوا تو ضرور کروں گا۔''

ستار کچھ دیر متامل کھڑا رہا پھر بمشکل کہہ ہی دیا۔ ''آپ شادی کرلیں کیونکہ بیوی یہ سارے غم بھلا دے گی۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''بیوی غم بھلائے گی تو خاک، ہاں چند غم اور لگا دے گی۔''

ستار نے بے دلی سے کہا۔ ''آپ ایسا سمجھتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شادی انسانی زندگی میں بڑی تبدیلیاں لاتی ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

داؤد نے کہا۔ ''ممکن ہے تیری بات درست ہو لیکن میں یہ تجربہ نہیں کرسکتا۔'' پھر فیروز بخت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''میں نے شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا ہے اس لیے اب شادی کی کیا ضرورت ہے۔''

فیروز بخت، ستار کے مشورے سے گھبرا گیا تھا لیکن داؤد کے جواب نے اسے مطمئن کردیا۔ رات کے سناٹے میں داؤد، فیروز بخت کو ساتھ لے کر پڑاؤ سے ذرا دور ٹہلانے لے گیا اور ٹہل ٹہل کر دیر تک یہی درس دیتا رہا کہ شادی ہرگز نہ کرنا۔ اس نے ازدواجی زندگی کا اتنا بھیانک نقشہ کھینچا کہ فیروز بخت لرز گیا۔

دوسرے دن قافلہ روانہ ہوگیا۔

احمد آباد کے قریب تقریباً بیس پچیس میل دور قافلے نے آخری پڑاؤ کیا۔ یہاں سے احمد آباد کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ فیروز بخت کی نظریں احمد آباد کے آثار دور سے دیکھ رہی تھیں۔ داؤد نے کھپریل کے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فیروز بخت! تو اپنے آس پاس کھپریلوں کے مکانات دیکھ رہا تھا یہی مکانات احمد آباد میں بھی ملیں گے۔ اب ہم لوگ احمد آباد کے دروازے تک پہنچ چکے ہیں۔''

نئی جگہ دیکھنے کی خوشی میں فیروز بخت کے چہرے پر تازگی آگئی تھی، داؤد کی بات سن کر وہ پھولا نہ سمایا۔

داؤد نے مزید کہا۔ ''فیروز بخت! میں نے تیری تعلیم و تربیت پر خاص توجہ اس لیے دی ہے کہ تجھ کو میری ہی طرح کاروبار کرنا ہے۔ اب تو میرے ساتھ میرے کاروبار کی دیکھ بھال کرے گا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ میں لوگوں سے کس طرح معاملات کرتا ہوں۔ اگر تو ان باتوں میں ماہر ہوگیا تو مار نہیں کھائے گا۔''

داؤد کی باتوں کا فیروز بخت پر گہرا اثر ہو رہا تھا کیونکہ داؤد اس کی نظر میں ایک مثالی انسان تھا۔ داؤد کی تعلیمات ستار کے علم میں بھی آرہی تھیں لیکن ستار ان سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ دل ہی میں دل میں داؤد کی تعلیمات کی مذمت کررہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ داؤد اپنی طرح فیروز بخت کو بھی تباہ کررہا ہے۔ اس لیے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ فیروز بخت کو یہ سمجھائے کہ اس دنیا میں کاروبار اور دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، دوسری حقیقتیں بھی ہیں لیکن اچھا موقع نہیں مل رہا تھا۔ قافلے کو اس جگہ دو دن رکنا تھا۔ احمد آباد کا قلعہ دار معلوم نہیں کیوں ان کی سخت پڑتال کررہا تھا اور ان کے فوری داخلے کا مخالف تھا۔ یہاں کے مضافات میں بھی داؤد کے نمائندے اور گماشتے کام میں مصروف رہتے تھے اور یہیں ان نمائندوں اور گماشتوں کے مکانات بھی تھے۔

داؤد نے قافلے کے ساتھ پڑاؤ پر رکنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے ایک گماشتے کے گھر چلا گیا جو کھپریل کی چھتوں والے دو کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔ اس گماشتے کا نام نظام تھا اور یہ داؤد کے لیے نیل اکٹھا کرتا تھا۔ داؤد اپنے سامان اور فیروز بخت کو ساتھ لے کر نظام کے گھر چلا گیا۔ نظام، داؤد کو دیکھتے ہی خوش ہوا۔

نظام نے داؤد کی طرف دیکھ کر فیروز بخت کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''بزرگ محترم! ان صاحبزادے کی تعریف؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نظام! یہ میرا بیٹا فیروز بخت ہے۔ کیوں کیا تجھے اچھا نہیں لگا؟''

نظام نے کہا۔ ''اچھا تو لگا لیکن جب آپ نے شادی نہیں کی تو یہ بیٹا.....''

داؤد زور سے ہنسا، بولا۔ ''میں نے شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا ہے۔''

نظام نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا، خوب لیکن میں آپ کو ان صاحبزادے کے سامنے ہی مشورہ دوں گا کہ آپ کو شادی ضرور کرنی چاہیے کیونکہ اپنی اولاد کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

نظام کے مشورے نے فیروز بخت کو پریشان کردیا۔ اس کو ہر شخص اپنا دشمن ہی نظر آتا تھا۔ داؤد نے نظام کی بات کا کیا جواب دیا۔ وہ الجھنوں میں ٹھیک سے سن نہ سکا لیکن آخری بات سن لی تھی، داؤد کہہ رہا تھا۔ ''بہرحال اب فیروز بخت ہی میرا بیٹا ہے۔''

نظام نے اس موضوع کو ترک کردیا اور کاروباری باتیں کرنے لگا۔

رات کو داؤد کے اعزاز میں شاندار دعوت ہوئی۔ داؤد نے فیروز بخت کو اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ ستار کو بھی کھانے میں شریک کرلیا گیا اور ستار کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ نظام کے خاندان کی ساری عورتیں داؤد کے سامنے آگئیں۔ نظام نے ان سب کا تعارف کروایا۔ ان عورتوں میں اس کی ماں کے علاوہ بہنیں بھی تھیں، سعدیہ اور کیفیہ۔ دو لڑکے اسماعیل اور ابراہیم اور ایک لڑکی شازیہ بھی تھی۔ اسماعیل پانچ سال کا تھا اور ابراہیم تین سال کا، شازیہ دونوں سے بڑی تھی، وہ آٹھ سال کی تھی۔ ان عورتوں میں نظام کی سوتیلی بہن نرجس بھی تھی۔ نرجس پچیس چھبیس سال کی تھی لیکن ان عورتوں میں نظام کی بیوی نہیں تھی۔ داؤد نے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بچوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''نظام! تیری بیوی کہاں ہے؟ کہیں خدانخواستہ.....''

نظام نے سوال کے جواب سے بچنے کی کوشش کی۔ اپنے غم کو چھپاتے ہوئے بولا۔ ''وہ بھی موجود ہے اسے بھی بلالوں گا۔''

داؤد کو شبہ گزرا کہ شاید نظام سچ نہیں بول رہا ہے۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہیں فوت تو نہیں.....؟''

نظام نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ مری نہیں زندہ ہے لیکن شاید میرے لیے وہ مر ہی چکی ہے کیونکہ وہ دو سال سے اپنے والدین کے پاس ہے اور میرے پاس آنے کا نام نہیں لیتی۔'' پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''شاید وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے کیونکہ اس کے موجودہ رویّے سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔''

داؤد کو بڑا دکھ ہوا، بولا۔ ''نظام! جب تو بیوی کا زخم خوردہ ہے، تو مجھے شادی کرنے کا مشورہ کیوں دے رہا تھا؟''

نظام کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ کھیلنے لگی، بولا۔ ''حضرت! اگر بیوی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میری اصل کمائی تو میرے پاس میرے گھر ہی میں ہے یعنی میری اولاد..... میں بیوی کی عدم موجودگی محسوس ہی نہیں کرتا۔''

داؤد نے سعدیہ اور کیفیہ کی طرف سرسری نظر ڈالی۔ سعدیہ بیس سال کی ہوگی اور کیفیہ بائیس تئیس سال کی۔ داؤد کو حیرت تھی کہ نظام کی بیٹی شازیہ میں کیفیہ کی بڑی مشابہت پائی جاتی تھی اور اسماعیل اور ابراہیم میں سعدیہ کی جھلک موجود تھی۔ داؤد نے کہا۔ ''نظام! بچوں میں پھوپیوں کی مشابہت بہت زیادہ پائی جاتی ہے، یہ کیا بات ہوئی؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ یہ میرے بچے ہیں اور ان پر وہیال کا اثر غالب ہے۔''

داؤد نے نظام کی سوتیلی بہن نرجس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تو یہ تیری سوتیلی بہن ہے؟''

نظام نے کہا۔ ''اسے سوتیلی بھی نہ کہیے کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔''

داؤد نے شک و شبہے سے سوال کیا۔ ''کیا ابھی تک ان تینوں کی شادی نہیں ہوئی؟''

نظام نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''نہیں، ابھی تک کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ میں اپنی بہنوں کی شادیاں زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے گھر میں ہر شخص کو غیر معمولی آزادیاں حاصل ہیں۔ بہنیں شادی سے گریزاں ہیں تو میں اس پر اصرار کیوں کروں۔''

کھانا کھاتے کھاتے داؤد نے ہاتھ جو اٹھایا تو فوراً کیفیہ اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ ''نصیبِ دشمناں کوئی خاص بات؟''

داؤد کو کیفیہ کی مترنم آواز بہت اچھی لگی، بولا۔ ''تیرا کیا نام بتایا تھا تیرے بھائی نے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیفیہ۔''

داؤد نے کیفیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ ''جیسا نام ویسا ہی سراپا۔ اگر شاعر تجھے دیکھ لیں تو سراپا پر بے شمار اشعار کہہ ڈالیں اور پھر بھی سیر نہ ہو۔''

کیفیہ نے شرما کر منہ پھیر لیا اور بولی۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟''

داؤد کو اچانک نظام کی موجودگی کا احساس ہوگیا، شرمندگی سے کہا۔ ''کیفیہ! مجھے معاف کرنا، میں معلوم نہیں کن خیالوں میں تھا جو دل آزاری کی باتیں کر گیا۔ بہرحال میں معافی چاہتا ہوں۔''

نظام اندر چلا گیا اور اس طرح اندر گیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ کچھ دیر بعد سعدیہ بھی اندر چلی گئی اور پھر بچے بھی لیکن نرجس اور کیفیہ اب بھی وہیں موجود تھیں۔

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''تو کیوں چپ ہے؟ تیرا بھائی نظام تجھے ستاتا تو نہیں ہے؟''

نرجس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''نہیں، نظام مجھے نہیں ستاتا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔''

داؤد پھر کیفیہ سے مخاطب ہوا۔ ''اور کیفیہ! یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''اندر..... کیوں، کیا ان سے کوئی کام ہے؟''

داؤد، فیروز بخت اور ستار کی موجودگی میں تکلف سے کام لے رہا تھا۔ فیروز بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا بیٹا فیروز بخت ہے اور چونکہ اس کی کوئی ماں نہیں ہے اس لیے میں اس کے لیے، ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کر سکے۔'' پھر افسوس سے کہا۔ ''مثالی عورت شاید ہی ملے۔''

نرجس نے کہا۔ ''یہ ذمے داری میں قبول کر سکتی ہوں اگر آپ پسند کریں تو۔''

کیفیہ نے بھی ہامی بھر لی۔ ''اگر آپ چاہیں تو اس کو ہمارے ہاں چھوڑ دیں۔ اللہ نے چاہا تو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

لیکن فیروز بخت نے ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔''

داؤد کو جیسے ایک دم ہوش آ گیا، بولا۔ ''لاحول ولا قوۃ، میں بھی کن خیالوں کا شکار ہو گیا تھا۔ الا باللہ العظیم۔''

نرجس نے فیروز بخت سے کہا۔ ''بیٹے! میں ہر وقت حاضر ہوں اگر ضرورت محسوس ہو تو مجھے ضرور یاد کر لینا۔''

دوسرے دن صبح نظام داؤد کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس کی سوتیلی بہن نرجس کی خواہش ہے کہ وہ فیروز بخت کے ساتھ رہ کر اس کی دیکھ بھال اور تربیت کے فرائض انجام دے۔ اس لیے احمد آباد کی حویلی میں اس کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

داؤد کو درخواست قبول کرنے میں تامل تھا، بولا۔ ''جب میں خود موجود ہوں تو فیروز بخت کی تربیت اور دیکھ بھال کی ذمے داریاں مجھ سے زیادہ اچھی طرح کوئی اور نہیں انجام دے سکتا۔''

نظام نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ کی مرضی ورنہ میری ناقص رائے میں آپ کی عظیم الشان حویلی میں کسی عورت کی موجودگی بہت ضروری ہے۔''

ستار کو نرجس اچھی لگی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ داؤد اس سے شادی کر لے۔ اس نے داؤد کو رائے دی۔ ''میرے آقا! آپ کا گماشتہ نظام صحیح کہتا ہے کہ حویلی میں ایک عورت کی موجودگی ضروری ہے۔''

نظام کے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو گئی۔ امید افزا نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا۔

داؤد نے جواب دیا۔ ''ستار! تیرا یہ کام نہیں ہے کہ تو مجھے مشورے دے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے میں عورتوں کی قربت سے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔''

نظام نے کان کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔ ''توبہ توبہ باللہ میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا کہ آپ میری بہن نرجس سے شادی کر لیں اور میں یہ بات کیونکر کہہ سکتا ہوں۔ نرجس کو آپ کی حویلی میں داخل کرنے سے دو مقصد پورے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ نرجس کی طبیعت عبادت و ریاضت پر مائل رہتی ہے۔ اسی لیے اس نے شادی سے مستقل انکار کر رکھا ہے۔ آپ کی حویلی میں اس کو یک سوئی سے عبادت کرنے کا موقع ملے گا اور چونکہ آپ خود مجرد زندگی گزارنے کا عہد کر چکے ہیں اس لیے نرجس کو آپ سے بڑی تقویت حاصل رہے گی۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ فیروز بخت میری بہن نرجس کی شفقت اور محبت کا مرکز بنا رہے گا جس سے نرجس کو ایک گونہ سکون حاصل رہے گا۔''

داؤد نے نظام کی باتوں پر غور کیا، بولا۔ ''مجھے سوچنے کا موقع دے کیونکہ میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو سوچنے کا موقع دینے والا کون؟ محض آپ کا ایک معمولی کارندہ، میں تو درخواست ہی کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ کو حکم دیں گے، میں تعمیل کروں گا۔''

فیروز بخت دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان کی ساری باتیں نہیں سن سکا۔ داؤد نے کہا۔ ''اچھا نظام، اس وقت تو تو چلا جا۔ میں احمد آباد میں داخل ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

نظام چلا گیا۔ داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ''تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کہیں گھوم پھر لے، میں تنہائی چاہتا ہوں۔''

فیروز بخت بے چون و چرا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ستار بھی چلا لیکن ستار کو داؤد نے روک لیا۔ ''تو رک، میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

ستار سہم گیا، واپس آ کر پاس ہی آ کھڑا ہوا۔

داؤد نے پوچھا۔ ''کیا میں نظام کی درخواست قبول کر لوں؟''

ستار نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں آپ کو مشورے دوں پھر میں کیا کروں؟''

داؤد نے تیکھی نظروں سے ستار کو گھورا، مسکرا کر بولا۔ ''خوب! میری ہی بات مجھے واپس کر دی لیکن تو یہ بھول گیا کہ میں خود تجھ سے مشورہ طلب کر رہا ہوں۔''

ستار نے کہا۔ ''میرے پاس آپ کے اس سوال کا ایک ہی جواب ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ فیروز بخت بھی آپ ہی کی طرح شادی نہ کرے تو ضروری ہے کہ آپ کا کردار بھی مثالی ہو۔ آپ نرجس کو حویلی میں رکھیں اور اس سے بے تعلق اور بے اثر رہ کر یہ ثابت کر دیں کہ آپ کو اپنے آپ پر کامل اعتماد ہے۔ فیروز بخت آپ کی تقلید کرے گا لیکن اگر آپ نرجس یا کسی بھی عورت سے خوف زدہ رہیں اور آپ کا یہ خوف فیروز بخت بھی محسوس کر لے تو اس کا فیروز بخت پر لازمی اثر پڑے گا کہ جب اس ادھیڑ عمری میں آپ کو عورت

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے معاملے میں خود پر اعتماد نہیں تو کل نوجوانی میں قدم رکھنے والے فیروز بخت کو خود پر اعتماد کیوں ہونے لگا۔''

داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے نرجس کو حویلی میں رہنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''یہ فیصلہ آپ کریں گے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اچھا اب تو جا، میں مزید غور کروں گا۔''

ستار چلا گیا اور داؤد غور و فکر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دوپہر کو کھانے سے تھوڑی دیر پہلے نظام نے حاضری دی اور پوچھا۔ ''کیا کھانا حاضر کیا جائے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نظام! کھانا تو میں بعد میں کھاؤں گا، پہلے میں اس مسئلے پر چند باتیں کروں گا جو نرجس سے تعلق رکھتا ہے۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''اب اس ذکر کو ختم کر دیجیے کیونکہ میں بے عزتی محسوس کرنے لگا ہوں۔''

داؤد نے کوئی پروا کیے بغیر کہا۔ ''میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ نرجس کو اپنی حویلی میں رہنے کی اجازت دے دوں۔''

نظام نے دوپہر کا کھانا لگوایا۔ سفید چاندنی پر دسترخوان بچھا دیا گیا۔ کئی قسم کے کھانوں کی قابیں بیچ میں رکھ دی گئیں۔ نظام نے از راہِ مہمان نوازی سلفچی میں داؤد کے ہاتھ دھلوائے، فیروز بخت اور ستار کا کہیں پتا نہ تھا۔ داؤد نے پوچھا۔ ''کیا میں تنہا کھانا کھاؤں گا؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''آپ کے ساتھ میں بھی کھاؤں گا۔''

داؤد نے کہا۔ ''اور وہ نرجس، سعدیہ، کیفیہ وغیرہ؟''

نظام نے سکوت اختیار کیا، داؤد کو غصہ آ گیا بولا۔ ''نظام! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے کہتا گیا۔ ''نظام! میں آج ہی احمد آباد چلا جاؤں گا، قلعہ دار مجھے نہیں روکے گا اور جاتے جاتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ اب تو میرا گماشتہ نہیں رہے گا۔ تیری جگہ میں کسی اور کو مقرر کر دوں گا۔''

نظام کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ داؤد کے پیچھے دوڑا۔ ''جناب! سنیے تو، میری بات تو سنیے۔ یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

لیکن داؤد رکا نہیں، وہ سیدھا قلعہ دار کے پاس پہنچا اور اس سے داخلے کی اجازت چاہی۔ قلعہ دار نے معذرت کی کہ داخلے کی اجازت عام تو نہیں ہے لیکن آپ کے لیے بطورِ خاص فصیل کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔

داؤد نے جواب دیا۔ ''آج ہی میرا داخلہ بہت ضروری ہے۔ میں احمد آباد ہی کا نہیں پورے ملک کا بہت بڑا تاجر ہوں۔ اس لیے یہ رعایت تو ملنی ہی چاہیے۔''

قلعہ دار نے اجازت دی۔ ''آپ اندر جا سکتے ہیں۔''

لیکن داؤد چند ساعتوں کی مہلت لے کر نظام کے گھر واپس آ گیا۔ وہاں فیروز بخت اور ستار کھانے سے فارغ ہو کر داؤد کا انتظار کر رہے تھے۔

داؤد نے دونوں کو حکم دیا۔ ''میں نے قلعہ دار سے بات کر لی ہے۔ ہمیں اسی وقت احمد آباد میں داخل ہو جانا ہے۔ اس لیے اپنا سامان سمیٹ لو۔''

دونوں اپنا اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ نظام چوروں کی طرح داؤد کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ برا مان گئے؟''

داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت پہلو کا دروازہ کھلا اور اس سے نرجس نمودار ہوئی اور بڑی ملائمت سے پوچھا۔ ''کیا آپ جا رہے ہیں؟''

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھا، اس کے بعد نظام کی طرف لیکن نظام کہیں جا چکا تھا۔

نرجس، داؤد کے سامنے بالکل پاس آ گئی۔ ریشمی لباس پر ململ کا باریک دوپٹا قیامت ڈھا رہا تھا۔ داؤد نے نرجس کی طرف بے تکلفی سے دیکھا تو لڑکھڑا گیا، بولا۔ ''مجھ سے کوئی کام؟''

نرجس نے پوچھا۔ ''کیا آپ جا رہے ہیں؟''

داؤد نے گم صم ہو کر جواب دیا۔ ''ہاں، میں جا رہا ہوں۔''

''ناراض ہو کر؟''

''نہیں، ہنسی خوشی۔''

نرجس نے کہا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ آپ دروغ بیانی سے کام لے رہے ہیں۔''

داؤد نے نرجس کے مقابل کھڑے ہو کر کہا۔ ''نرجس! میں اس ملک کا اور احمد آباد کا بہت بڑا تاجر ہوں پھر میں یہ کس طرح برداشت کروں گا کہ میرے معمولی گماشتے اور کمتر درجے کے کارندے میری بے عزتی کریں، میری توہین کریں۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، اگر آپ جا رہے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

جاسوسی ڈائجسٹ میں

انگارے

ایک نیا شاہکار سلسلہ

آپ کے محبوب مصنف کے قلم سے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر خود کو مجبور پائیں گے

اس دلچسپ داستان کے مصنف کا صحیح نام

بھیجنے والے قارئین کے نام اگلے شمارے میں شائع

کیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے

دس کامیاب قارئین کو مئی 15 کا شمارہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مفت ارسال کیا جائے گا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہیں تو شوق سے جائیں لیکن میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے نظام کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا ہے، اب وہ میرا کارندہ نہیں رہا۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں نے یہ بھی سن لیا اور میں بھی آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ نظام کی بہن کی حیثیت سے نہیں جاؤں گی۔ اس وقت تو میں محض نرجس ہوں اور اس حیثیت سے ساتھ بھی جاؤں گی۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''لیکن آپ کی اس حیثیت کا مجھ پر کوئی رعب بھی نہ پڑے گا۔''

نرجس اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''میں اس وقت تک آپ کو جانے نہیں دوں گی جب تک آپ میرے بھائی کو بحال نہیں کر دیں گے۔''

داؤد نے نرجس کے تیور دیکھ کر اسے اپنے سامنے بٹھالیا، بولا۔ ''اگر میں اس کو بحال کر دوں تو کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''ساتھ چلنے کی درخواست تو خود میں نے کی تھی۔''

داؤد پر اضطراری کیفیت طاری تھی، نہایت محتاط ہو کر بولا۔ ''لیکن آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گی؟''

نرجس نے پوچھا۔ ''کیسا وعدہ؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نرجس! آپ کو معلوم ہوگا کہ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔ آپ حویلی میں رہیں لیکن ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کریں گی۔''

نرجس نے کہا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں خود آپ سے یہ درخواست کروں گی کہ آپ مجھ سے دور دور اور نظروں سے اوجھل رہیں۔''

داؤد نے بے خیالی میں نرجس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تب پھر آپ میری حویلی میں میرے ساتھ ہی چلیں۔''

نرجس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر معاہدے کی خلاف ورزی کر دی ہے۔''

داؤد نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا، بولا۔ ''میں اپنی اس حرکت پر معذرت خواہ ہوں بلکہ بہت زیادہ شرمندہ بھی۔''

نرجس نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں، آئندہ خیال رکھیے گا۔''

داؤد نے کہا۔ ''نظام کو بتا دیجیے کہ وہ اپنی سابقہ خدمات پر بحال کر دیا گیا ہے اور اپنے ساتھ چلنے کی خبر بھی سنا دیجیے۔''

نرجس خوش خوش اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سعدیہ اور کیفیہ بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ ہی نظام بھی آ گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے داؤد کے سامنے آتے ہی اس کا شکریہ ادا کیا بولا۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ نرجس کو آپ اپنے ساتھ لے جائیے۔''

دو گھنٹے بعد یہ مختصر قافلہ احمد آباد میں داخل ہوگیا۔ شہر کے وسط میں داؤد کی شاندار حویلی تھی۔ اس حویلی کے پھاٹک کے دونوں طرف دو خوب صورت موروں کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لائٹ مورتیوں کے درمیان سے گزر کر پھاٹک تک پہنچ گئے۔ پھاٹک پر دو دربان پہلے سے ہی تعینات تھے۔ انہوں نے سر و قد کھڑے ہو کر داؤد کو سلام کیا۔ داؤد نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور پھاٹک میں داخل ہوگیا۔

اندر حویلی کے آخری سرے کا کمرا نرجس کو دے دیا گیا۔ اس سے ملحق دو کمرے فیروز بخت کے حصے میں آئے۔ ستار کو خدام کی کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری دے دی گئی۔ حویلی کو خوب اچھی طرح صاف کیا گیا۔ داؤد کا کمرا حویلی کے اگلے حصے میں تھا اور اس حویلی میں چوحدی کی دیواروں سے متصل گودام تھا جس میں داؤد کا سامانِ تجارت بھرا ہوا تھا۔ داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ''میں نرجس کو محض تیری خاطر یہاں لایا ہوں۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ تو اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کرے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری دلی خواہش یہ ہے کہ میں کاروبار کو سنبھالوں اور اس سلسلے میں آپ سے خاص تربیت حاصل کروں اور رہا نرجس کا مسئلہ تو میں ان سے.....''

داؤد نے قطع کلام کیا بولا۔ ''محض نرجس نہیں، نرجس بہن۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''جیسا آپ کا حکم۔''

رات کا کھانا سب نے مل کر ایک ساتھ کھایا۔ نرجس بہت چپ چپ ہوگئی تھی۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی اور کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ داؤد کے دل میں کسک سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے نرجس کو جاتے ہوئے دیکھا مگر روکا نہیں۔ فیروز بخت سے کہا۔ ''فیروز بخت! دیکھ میں کتنے صبر اور برداشت سے کام لے رہا ہوں۔ نرجس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی حالانکہ اسے مجھ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

سے بات کرنی چاہیے تھی۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''نرجس بہن نے مجھ سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اس حویلی میں بڑا سکون ہے اور انہیں عبادت اور ریاضت کے لیے بڑی طمانیت حاصل رہتی ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''لیکن میں یہ کب کہتا ہوں کہ وہ عبادت و ریاضت نہ کرے یا اپنے سکون اور طمانیت کو تباہ و برباد کردے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب وہ اس حویلی میں آئی ہے تو کچھ مصروف بھی رہے۔ ورنہ خالی ذہن پر شیطان اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔''

فیروز بخت نے داؤد کا ایما پا کر دریافت کیا۔ ''کیا میں نرجس بہن کو بلواؤں؟ آپ یہ باتیں انہی سے کرلیجیے۔''

''نہیں، اس وقت نہیں میں پھر کروں گا باتیں۔ اس وقت تو میرے ساتھ چل۔ میں اپنے کاروباری گماشتوں اور کارندوں سے تیری ملاقاتیں کرواؤں گا اور کاروبار کے نشیب و فراز پر درس دوں گا۔''

وہ فیروز بخت کو ساتھ لے کر شہر کے مغربی حصے میں گیا۔ یہاں بھی ایک حویلی تھی اور یہ اس سے بھی بڑی تھی جس میں یہ لوگ سکونت رکھتے تھے۔ اس حویلی میں گودام زیادہ تھے جن میں نیل اور کپڑوں کے تھان بھرے ہوئے تھے۔ اس حویلی میں ہال نما ایک کمرا تھا۔ اس کمرے میں کاروباری دستاویزات اور کاغذات تھے اور یہیں وہ ساری چیزیں تھیں جو آلاتِ کاروبار کہلاتی ہیں اور دفتری ساز و سامان بھی اسی کمرے میں تھا۔ اس نے فیروز بخت کو اپنے سامنے بٹھا کر درس دیا۔ ''جانتے ہو کاروبار میں بنیادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

داؤد کے سامنے چند خادم ہاتھ باندھے ادب سے، حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ داؤد نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کرکے خدام سے کہا۔ ''یہ فیروز بخت میرا بیٹا اور تم سب کا مالک ہے۔ تم لوگ اس کے ہر حکم کی اس طرح تعمیل کروگے، جس طرح میرے احکام کی کرتے ہو۔''

خدام سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے اور پھر سیدھے ہوکر عرض کیا۔ ''بہت خوب! ہم آپ دونوں کے تابعدار ہیں۔''

داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ''فیروز بخت! تو انہیں حکم دے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں اور دروازے پر موجود رہیں پھر جب طلب کیا جائے تو حاضر ہوں۔''

فیروز بخت نے انہیں حکم دیا۔ ''تم سب باہر کے در پر موجود رہو اور جب بلایا جائے تو حاضر ہوجانا۔''

خدام باہر چلے گئے۔ داؤد نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خوب، ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''آپ نے پوچھا تھا کہ کاروبار میں بنیادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟''

داؤد نے کہا۔ ''تو تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں؟''

فیروز بخت نے کہا۔ ''نہیں، میں تو شاگرد ہوں اور یہی سب سیکھنا چاہتا ہوں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''مردم شناسی، موقع شناسی، بہترین منصوبہ بندی، کام کرنے اور کام لینے کی صلاحیت، دوسروں پر اعتماد اور اعتبار نہ کرنا، یہ بنیادی باتیں ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ان باتوں کا خیال رکھا تو کہیں بھی مار نہ کھاؤ گے۔ امانت اور دیانت کے ساتھ ساتھ دولت کو سنبھالنا قائم رکھنا مشکل کام ہے کیونکہ ... دولت کی بربادی بے جا اسراف سے ہوتی ہے۔ بے جا اسراف کی حدیں کیا ہوتی ہیں، جانتے ہو؟''

فیروز بخت نے کہا۔ ''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''جوا، لہو و لعب اور عورت جو سب سے خطرناک بلا ہے۔ جس سے مفر کی کوئی راہ نہیں۔ جوان ہوتے ہوتے اور بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے عورت ہی وہ شے ہے جس کے حملے جاری رہیں گے۔ جس کی گھاتیں باقی رہیں گی۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''میں زندگی بھر یوں بچوں گا جس طرح کوئی مریض مضر چیزوں سے بچتا ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں نے آج جو درس دیا ہے اسے خوب اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔ بقیہ باتیں پھر بتاؤں گا۔''

اس کے بعد داؤد نے فیروز بخت کو گودام دکھائے جن میں کاروباری مال اٹا پڑا تھا۔ اس دوران جب فیروز بخت نے یہ سوچا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، اس کا اپنا ہے اور اس پر اسے مالکانہ حق تصرف اور اختیار حاصل ہے تو بن پیے ہی نشہ چڑھ گیا۔

کئی دن بعد رات کو داؤد، فیروز بخت اور نرجس ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو داؤد کی نظریں بار بار غیر ارادی طور پر نرجس پر پڑتی رہیں۔ نرجس حسب سابق خاموش رہی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جب نرجس جانے لگی تو کچھ دیر داؤد نرجس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ کافی دور نکل گئی تو داؤد نے مسکرا کر اسے آواز دی۔ ''نرجس! ادھر آؤ۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نرجس واپس آ گئی، بولی۔ ''فرمایئے؟''

داؤد نے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر بیٹھ جاؤ۔ ابھی کرتا ہوں باتیں۔''

نرجس مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ داؤد کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ منہ صاف کرنے چلا گیا پھر واپس آ کر نرجس کے مقابل دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ فیروز بخت جانے لگا تو داؤد نے کہا۔ ''فیروز بخت! تو کہیں جائے گا نہیں، یہیں ہم دونوں کے پاس بیٹھ کیونکہ ان باتوں سے تجھے بہت کچھ معلوم ہوگا۔''

فیروز بخت تیسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

داؤد نے نرجس سے پوچھا۔ ''نرجس! اس حویلی میں آپ کو آئے ہوئے کتنے دن گزر گئے؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''یاد نہیں، دو یا تین ہفتے تو گزر ہی گئے ہوں گے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر میں تم سے ان دو تین ہفتوں کی کارکردگی پوچھوں تو شاید تم کوئی جواب نہ دے سکو۔''

نرجس نے گھبرا کر کہا۔ ''کارکردگی..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟''

داؤد نے کہا۔ ''ہاں کارکردگی، تم مجھ سے یہی سوال کرو تو میں اس کا شاندار جواب دے سکتا ہوں۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ نے میرے ذمے کوئی کام تو نہیں کیا پھر میں اپنی کارکردگی کیا بتاؤں گی؟''

داؤد نے کہا۔ ''کارکردگی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ تم سے اس کاموں کی بابت دریافت کر رہا ہوں جو میں نے تمہارے ذمے کیے ہیں۔''

نرجس نے کہا۔ ''پھر کون سی کارکردگی؟''

داؤد نے کہا۔ ''ہر وہ کام جو ان دو تین ہفتوں میں تم نے کیا ہو، وہ کارکردگی میں شمار ہوگا۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں نے نمازیں پڑھیں، تلاوت کی اور درود وظائف پڑھے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اور خوب خوب سوئیں، خوب خوب سوچتی رہیں، خواب دیکھے، جاگتے میں بھی اور سوتے میں بھی۔''

نرجس شرمندہ ہوگئی۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسان کو کچھ نہ کچھ کر کے خود کو مصروف اور مشغول رکھنا چاہیے ورنہ یکسانیت اسے غیر معمولی سنجیدہ اور بوڑھا کر دے گی اور بڑھاپے کا مطلب میرے نزدیک موت جیسا جمود ہے۔''

نرجس نے کہا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ یہاں آنے سے پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ فیروز بخت کو اپنے پاس رکھ کر بہت زیادہ مصروف رہ سکوں گی لیکن فیروز بخت بھی آپ ہی کے ساتھ چلا جاتا ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اس حویلی کا کھانا باورچی پکاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس کی نگرانی کرو اور دونوں وقت پکنے والا کھانا تمہارے حکم اور مرضی سے پکے اور یہ کہ گھرداری کے جملہ امور بھی تمہاری نگرانی میں سرانجام پانا چاہئیں۔''

نرجس نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں دوسرے امور بھی سمجھنے اور انجام دینے پر غور کروں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''اور کبھی کبھی مجھ سے بھی صلاح و مشورہ کر لیا کرو۔''

نرجس نے کراہیت سے کہا۔ ''یہ ضروری ہے؟''

''ہاں یہ ضروری ہے۔ میں اس حویلی کا مالک ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کا نظم و نسق کس طرح چلنا چاہیے۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں اس پر بھی عمل کروں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''تم نے شادی کیوں نہیں کی حالانکہ اگر تم چاہو تو تمہاری شادی ہو سکتی ہے۔''

نرجس نے گھبرائے ہوئے انداز میں داؤد کو دیکھا اور بولی۔ ''دوسری باتیں کیجیے۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں دوسری باتیں بھی کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں یہی باتیں کروں گا۔''

نرجس نے ناگواری سے کہا۔ ''میں چلی جاؤں گی، میں آپ کے پاس بیٹھوں گی نہیں۔''

داؤد نے کہا۔ ''یہ حویلی میری ہے اور یہ مت بھولو کہ جہاں تم جاؤ گی، میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔''

نرجس نے پوچھا۔ ''لیکن ان باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ میں نے شادی نہیں کی اور شادی نہ کرنے کا مستحکم ارادہ کر رکھا ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد اور ایک خاص پس منظر ہے لیکن تمہارے شادی نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں؟''

نرجس نے سر پکڑ لیا، بولی۔ ''خدا کے لیے مجھے ان سوال جواب سے تنگ نہ کیجیے۔ میں یوں بھی کیا کم پریشان ہوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''جب تک تم اپنی پریشانیاں نہیں بتاؤ گی ان کا علاج بھی نہیں ہو سکتا۔''

نرجس نے ایک دم کھڑے ہو کر پوچھا۔ ''کیا اب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں جاسکتی ہوں؟''

''نہیں، ابھی تم نہیں جاسکتیں۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔ اس کے بعد چلی جانا۔''

نرجس نے اکتا کر کہا۔'' کیا جواب دوں آپ کی باتوں کا۔''

داؤد نے کہا۔''نرجس! تیرا بھائی نظام ممکن ہے مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو لیکن اب تو میرے پاس رہ رہی ہے اور اگر میں چاہوں تو تیری شادی کہیں اچھی جگہ کروا سکتا ہوں۔ ابھی تیری شادی کی عمر ہے۔ اشارہ کر، میں کہیں نہ کہیں انتظام کردوں گا۔''

نرجس نے بیزاری سے کہا۔''میں شادی نہیں کروں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار یہی کہوں گی۔ آپ مجھے پریشان نہ کیجیے۔''

داؤد نے بھی کچھ سوچ کر کہا۔''اچھا اس وقت تو تم جاسکتی ہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچ لو پھر بات کروں گا۔ اور ہاں ایک بات اور.....'' نرجس سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

داؤد نے کہا۔''میں تمہیں تم اور تو سے مخاطب کرتا ہوں، تم اس کا برا نہ مان جانا۔''

نرجس کوئی جواب دیے بغیر چلی گئی۔ فیروز بخت ان دونوں کی باتیں غور سے سنتا رہا تھا۔ داؤد نے نرجس سے اس قسم کی باتیں کیوں کیں، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید داؤد کو بھی فیروز بخت کی ذہنی کشمکش کا اندازہ ہوگیا تھا۔ مسکرا کر پوچھا۔''تو نے میری باتیں سنیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''ہاں سنیں۔''

داؤد نے کہا۔''میں کافی دنوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہوں کہ نرجس پر قنوطیت اور یاسیت کیوں طاری ہے۔ آج میں نے اپنی اس بے چینی کو سوال و جواب سے دور کرنا چاہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات پر صبر و ضبط اور برداشت کا زبردست خول چڑھا رکھا ہے۔ بڑی مشکلوں اور بڑی کوششوں سے باہر نکلے گی۔''

فیروز بخت ہوں، ہاں کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا لیکن اس نے اس طرح داؤد کو دیکھا گویا یہ ساری باتیں اس کی سمجھ سے بالا تھیں۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔''فیروز بخت! جستجو بہت ضروری ہے۔''

فیروز بخت نے گردن ہلائی۔''ہاں جستجو واقعی یہ بڑی اہم چیز ہے۔''

داؤد، فیروز بخت کو نادان سمجھ کر کھڑا ہوگیا۔''یہ باتیں ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

اس کے بعد داؤد کئی دن خاموش اور کھویا کھویا رہا پھر کئی ماہ کے لیے اس کو سورت جانا پڑ گیا کیونکہ سورت کی بندرگاہ پر اس کا مال جہاز پر چڑھایا جارہا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں فیروز بخت کو نیابت ملی اور وہ اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق چھوٹے موٹے فیصلے کرتا رہا۔ سارے ملازمین اس کے اشاروں پر حرکت کرتے رہے۔ ستار کو سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔ نرجس اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہوچکی تھی وہ بڑی بہن کی محبت دے رہی تھی۔

فیروز بخت کو داؤد کی عدم موجودگی میں داؤد کی چند ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے اس کی عزت اور عظمت کا احساس کچھ زیادہ ہی شدید ہوگیا۔ داؤد بیواؤں، یتیموں اور دوسرے حاجت مندوں کی ماہانہ امداد کیا کرتا تھا۔

کئی ماہ بعد جب داؤد گھر واپس آیا تو وہ اپنے کاروبار اور گھر بار کے نظم و نسق کو دیکھ کر فیروز بخت سے بہت خوش ہوا۔ داؤد کو پھر واپس جانا تھا کیونکہ اس کو چھینٹ اور لٹھے کے کئی سو تھان باہر روانہ کرنا تھے، اور اس فرمائش کی تعمیل اس وقت تک صحیح طرح نہیں ہوسکتی تھی جب تک خود داؤد دوڑ دھوپ نہ کرتا۔

اس کے واپس آنے پر نرجس اس کے سامنے نہیں گئی۔ معلوم نہیں کیوں وہ داؤد سے دور دور رہنے لگی تھی۔

داؤد نے جب یہ دیکھا کہ نرجس کسی طور سامنے نہیں آرہی تو فیروز بخت سے پوچھا۔''فیروز بخت! کیا بات ہے؟ نرجس منہ کیوں چھپا رہی ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''میری سمجھ میں تو آتا نہیں، وہ یہاں کچھ بیزار بیزار سی نظر آتی ہیں۔''

''اچھا۔'' داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''تو میری عدم موجودگی میں پریشان تو نہیں ہوا؟''

اس نے جواب دیا۔''میں بہت خوش رہا کیونکہ ملازمین اور خدام نے میرا ساتھ دیا۔''

داؤد نے کہا۔''اچھا، پھر تو ہی کاروبار کی دیکھ بھال کر۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ چند دن آرام کرنا چاہتا ہوں تو اپنے دستور العمل کا پابند رہ۔''

چنانچہ فیروز بخت دوسری حویلی میں چلا گیا۔ داؤد اقامتی حویلی میں ہی رہا اور اس نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کرلیے اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دیر تک سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر اٹھا اور حویلی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ سیدھا نرجس کے کمرے میں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پہنچا۔ کمرا خالی تھا اور نرجس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کمرے سے ملحق حمام تھا، وہاں سے پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ داؤد سمجھ گیا کہ نرجس نہا رہی ہے۔ وہ پنجوں کے بل چل کر حمام کے دروازے پر پہنچا اور کچھ دیر کھڑے رہ کر اندر کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر دروازے کی جھری سے آنکھ لگادی۔ اندر اندھیرا تھا اس لیے اندر کی چیزیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ دھندلا دھندلا اس کا جسم دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کو پوری طرح یہ اندازہ ہوگیا کہ نرجس نکلنے ہی والی ہے تو وہاں سے ہٹ کر نرجس کے کمرے میں جاکر دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔

نرجس اپنے کمرے میں چلی گئی اور خلافِ توقع وہ ابھی صحیح طرح سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ ایک دم داؤد سامنے آگیا۔ نرجس لجائی، شرمائی اور پوچھا۔ ''آپ کہاں تھے؟ یہاں کیسے آگئے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نرجس! میں یہاں نہ آتا لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ تم مجھ سے نہیں ملیں تو میں خود یہاں آگیا۔ کیا یہاں آکر میں نے غلطی کی ہے؟''

نرجس نے کہا۔ ''ہاں، غلطی کی ہے اور محض غلطی ہی نہیں زیادتی کی ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر میں نے غلطی یا زیادتی کی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔''

نرجس نے منہ بنا کر کہا۔ ''مانا کہ یہ حویلی آپ کی ہے لیکن میں آپ کے لیے.....''

داؤد نے تلخی سے کہا۔ ''بس بس، میں یہ فضول باتیں سننا نہیں چاہتا۔ اس وقت میں خاص کر اس لیے آیا ہوں کہ میری نظر میں ایک رشتہ ہے۔ اگر تم پسند کرو تو اس سے تمہاری شادی ہوسکتی ہے۔''

نرجس نے سختی سے کہا۔ ''میں نہیں کروں گی شادی۔ اگر آپ نے دو ایک بار پھر یہی بات کی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

داؤد نرجس کی برہمی سے ڈر گیا، بولا۔ ''نرجس! زیادہ برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

اس کے بعد وہ جانے لگا تو نرجس نے کہا۔ ''سنیے تو۔''

داؤد رک گیا۔ نرجس نے نظریں نیچی رکھیں اور پوچھا۔ ''فیروز بخت کہاں ہے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''وہ کاروباری حویلی میں گیا ہوا ہے اور شام تک واپسی ہوگی۔''

نرجس نے اطمینان کی سانس لی، بولی۔ ''میں تو فیروز بخت سے ڈرتی ہوں۔ کہیں اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی حرکت کردی تو ہم دونوں کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نرجس! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔''

نرجس خاموش ہوگئی پھر بولی۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

داؤد نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ بس تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

نرجس نے چڑ کر کہا۔ ''باتوں میں کیا رکھا ہے کبھی باتیں کرلیتے ہیں۔''

داؤد نرجس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے لگا۔

نرجس نے خلافِ توقع کہا۔ ''یہ آپ مجھ سے شادی کی بات کیوں کرتے رہتے ہیں آخر؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری عمر شادی کی ہے۔ تمہیں شادی کرلینا چاہیے۔''

نرجس نے طنزیہ پوچھا۔ ''اور آپ کی عمر؟ کیا ابھی تک شادی کی عمر نہیں ہوئی آپ کی؟''

داؤد چکرا گیا۔ ''واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے ایک خاص مقصد سے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔''

نرجس نے کہا۔ ''پھر میں نے بھی شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے اور کم از کم آپ تو مجھے شادی پر نہیں مجبور کرسکتے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اچھا تم شادی کرو یا نہ کرو لیکن مجھ سے باتیں ضرور کرلیا کرو۔ اس طرح میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں خود پر کتنا بھروسا رکھتا ہوں اور اس میں تمہارا کوئی حرج بھی نہیں۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''حرج تو کوئی نہیں مگر آپ یہ خطرناک کام کریں ہی کیوں؟''

داؤد اس کے قریب جا بیٹھا۔ ''یہ خطرناک کام نہیں ہے۔ میں خود کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں اور یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''اس طرح آپ خود کو تنہا آزمائش میں نہیں ڈالیں گے۔ ساتھ میں مجھے بھی پریشان کریں گے اور میں پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

خدمت گار نے مطلع کیا کہ نظام آیا ہوا ہے اور آپ دونوں سے ملنا چاہتا ہے۔

نرجس اور داؤد نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر داؤد نے خدمت گار سے کہا۔ ''نظام کو دارالضیافت میں ٹھہراؤ، میں ابھی آتا ہوں۔''

خدمت گار چلا گیا تو نرجس نے داؤد سے کہا۔ ''اگر بھائی نظام کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم دونوں تخلیے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے تو معلوم نہیں کیا کیا سوچیں گے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اس کو یہ بات معلوم کیوں ہونے لگی؟''

داؤد باہر جانے لگا تو نرجس نے پوچھا۔ ''بھائی نظام یہیں آجائیں گے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑے گا؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم کہاں ملنا پسند کروگی۔''

نرجس نے کہا۔ ''اگر یہیں بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

داؤد ''بہتر ہے'' کہہ کر باہر چلا گیا۔ نظام دارالضیافت میں اس کا انتظار کررہا تھا اور داؤد کو دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہوگیا اور نہایت ادب سے سلام کیا۔ داؤد نے پوچھا۔ ''کہو کیسے آنا ہوا؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''میں نیل کا بہت بڑا ذخیرہ لایا ہوں۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''گودام میں رکھوادیا ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اچھا، اب تجھے فیروز بخت کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پہنچنا ہے۔ تو نیل کا جو ذخیرہ لایا ہے وہ اور اس کے علاوہ جو میرے پاس پہلے سے موجود ہے، وہ دونوں سورت کی بندرگاہ پر لے جاکر جہاز پر بار کروانا ہے۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' پھر اپنی درخواست پیش کردی۔ ''اگر میں سورت چلا جاؤں گا تو میرے گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''کیا مطلب؟ میں تیری بات نہیں سمجھا؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''گھر میں میرے علاوہ کوئی اور مرد نہیں ہے پھر سعدیہ اور کیفیہ تنہا کس طرح رہیں گی؟''

داؤد نے کہا۔ ''تو اپنی عدم موجودگی میں اپنی بہنوں اور بچوں کو میری حویلی میں رکھ سکتا ہے۔'' پھر سوچ کر سوال کیا۔ ''میں نے ایک سوال تو تجھ سے آج تک نہیں کیا شاید۔''

نظام نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ جو سوال چاہیں کریں، میں جواب دوں گا۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''تیرے، دونوں بہنوئی کہاں ہیں اور تو نے اپنی بہنوں کو اپنے گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟''

نظام نے دکھ سے کہا۔ ''اگر آپ یہ سوال نہ کریں تو اچھا ہوگا۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر کوئی ایسی ہی ناگفتنی بات ہے تو میں سوال نہیں کروں گا۔''

نظام نے اچانک دل سے پوچھا۔ ''کیا میں نرجس بہن سے مل سکتا ہوں؟''

''بالکل جب چاہو مل سکتے ہو۔ تمہیں کس نے منع کیا ہے۔''

''میں بہن نرجس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔''

''اس وقت..... ابھی مل لو، چل کر۔''

داؤد، نظام کو اندر لے کر چلا گیا۔ وہاں نرجس اپنے بھائی کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہی تھی۔ بھائی کو دیکھتے ہی دوڑی اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ داؤد یہ رقت انگیز منظر دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر بھائی بہن کو تخلیہ میں باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

داؤد نے نظام اور فیروز بخت کو سورت بھیج دیا تاکہ وہ نیل کا ذخیرہ جہاز پر بار کروادیں۔ یہ نیل خلیج فارس کے راستے مشرق وسطیٰ، عرب اور ایران وغیرہ بھیجا جارہا تھا۔ نظام نے سعدیہ، کیفیہ اور ان کے بچوں کو حویلی میں چھوڑ دیا تھا۔ ان کی آمد سے نرجس کا دل بہلنے لگا۔ داؤد کو ان کی آمد سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ وہ عورتوں سے دور رہنا چاہتا تھا مگر ان سے دور رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کو افسوس اس بات کا تھا کہ کہیں وہ بہک نہ جائے لیکن پھر وہ یہ سوچتا کہ وہ ان سے ڈرے کیوں۔ ڈرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے دل میں چور ہے۔ ان کی وجہ سے وہ نرجس سے دور اور بے خبر ہوگیا تھا۔ لیکن ایک دن صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ رات کے سناٹے میں نرجس کے پاس چل دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں اس کا یہ فعل بدنامی کا باعث نہ بن جائے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف واپس آگیا لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے کمرے کے اندر سے ایک سایہ سا نکلتے دیکھا۔ داؤد ٹھٹکا لیکن پھر دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔

''تو کون ہے اور میرے کمرے میں کیا لینے گیا تھا؟''

دوسری طرف سے نرم و نحیف آواز میں جواب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ملا۔ ''میں ہوں نرجس۔ آپ سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں۔''

داؤد نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن تم آئیں کدھر سے؟ میں نے تو تمہیں آتے دیکھا نہیں؟''

''میں چھپتی چھپاتی آئی تھی آپ کے پاس۔'' نرجس بوکھلا گئی، بدحواس ہوگئی، گھبراہٹ میں وہ اپنا ہاتھ بھی نہیں چھڑا سکی۔ داؤد نے اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگالیا۔ نرجس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑالیا۔ ناگواری سے پوچھا۔ ''یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟''

داؤد نے راستہ روک لیا بولا۔ ''یہاں سے یوں نہ جانا کیونکہ میرے دروازے پر خدام پہرا دے رہے ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ لیں گے۔''

نرجس ٹھٹک گئی، بولی۔ ''پھر آپ مجھ سے دور رہیں۔''

لیکن داؤد بے قابو ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''تمہیں اپنی طاقت پر ناز ہے شاید..... اب چھڑاؤ اپنا ہاتھ۔''

نرجس نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی، بولی۔ ''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

داؤد نے کہا۔ ''تم اتنی رات گئے میرے پاس کیا لینے آئی تھیں؟ تم کیا چاہتی ہو؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں چاہتی، میں صرف بات کرنے آئی تھی۔''

داؤد نے کہا۔ ''اور میں خود کو آزمائش میں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں ضبط و برداشت میں کیا مقام رکھتا ہوں۔''

نرجس نے کہا۔ ''آپ بہک رہے ہیں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں بہک نہیں رہا ہوں۔''

نرجس نے کہا۔ ''اگر واقعی ایسا ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ خدارا سنبھل جائیں۔''

داؤد نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب تم یہ بتاؤ کہ اس وقت تم پوری طرح میرے قابو میں ہو یا نہیں؟''

داؤد اس حد تک اس کے چہرے پر جھکا کہ دونوں ایک دوسرے کی گرم گرم سانسیں اپنے اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگے۔ داؤد بڑی محبت اور دلچسپی سے نرجس کی صورت دیکھتا رہا اور نرجس بڑی کسمپرسی اور بے بسی سے داؤد کو تکتی رہی۔

داؤد نے پس و پیش سے کہا۔ ''تو چلو میرے کمرے میں، وہیں باتیں بھی ہو جائیں گی۔''

نرجس کچھ جھجکی مگر دوسرے ہی لمحے داؤد کے کمرے میں چلی گئی۔ داؤد نے کمرے میں داخلے کے بعد پوچھا۔ ''کیا خیال ہے کیا کمرے کو اندر سے بند کرلیا جائے؟''

نرجس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، دروازہ بند نہ کیجیے گا۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر دروازہ کھلا رہے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی خدمت گار کسی کام کے بہانے اندر نہ آجائے۔''

نرجس نے ڈر کر کہا۔ ''پھر بند کردیجیے۔''

داؤد نے دروازہ بند کردیا۔ نرجس ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ داؤد نے اپنی مسہری کی طرف اشارہ کیا۔ ''کھڑی کیوں ہو؟ اس پر بیٹھ کیوں نہیں جاتیں..... کیا اس کی بھی اجازت دینا پڑے گی؟''

نرجس مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔ ''تکلف سے اس طرح بیٹھی ہو گویا بھاگنے والی ہو۔''

نرجس خجل ہو کر ٹھیک سے بیٹھ گئی۔ داؤد نے تپائی کھینچ کر اس کے قریب کرلی اور اس پر بیٹھ گیا۔

داؤد نے پوچھا۔ ''ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے؟''

نرجس نے کہا۔ ''سعدیہ اور کیفیہ یہ پوچھ رہی تھیں کہ بھائی نظام کب تک واپس آئیں گے؟''

داؤد نے پوچھا۔ ''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

داؤد نے کہا۔ ''ان سے کہہ دینا نظام کی واپسی میں تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔''

نرجس نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ ''اور یہ کہ سعدیہ اور کیفیہ پوچھ رہی تھیں کہ کیا آپ ہم سب سے ناراض ہیں؟''

داؤد نے کہا۔ ''میں کیوں ناراض ہونے لگا۔ ان دونوں کے دل میں یہ خیال کیوں آیا؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ بھائی نظام کی عدم موجودگی میں آپ نے ایک دن بھی ہماری خیریت نہیں معلوم کی۔''

داؤد نے کہا۔ ''نرجس! بات دراصل یہ ہے کہ میں عورتوں اور بچوں سے ذرا گھبراتا ہوں۔''

نرجس نے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کیوں گھبراتے ہیں؟''

داؤد نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''اس لیے کہ کہیں میں بہک نہ جاؤں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نرجس نے مسکرا کر کہا۔ ''خوب، بہک کیوں جائیں گے؟''

داؤد نے کہا۔ ''نرجس! میں ایک بہت بڑا تاجر ہوں اور جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں ابھی تک عورتوں سے ذرا دور دور رہا ہوں۔''

نرجس نے تنک مزاجی سے جواب دیا۔ ''اگر آپ عورتوں سے دور دور رہنا چاہتے ہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتے تو آپ غلط فہمی یا خوش فہمی سے یہ کیوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ عورتیں زبردستی آپ سے شادی کرلیں گی؟''

داؤد نے کھسیا کر کہا۔ ''یہ بات نہیں ہے نرجس بلکہ میں احتیاط کرتا ہوں۔ میرا مطلب احتیاط سے ہے۔''

داؤد کے دل میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ رات کا سناٹا، تنہائی، حویلی پر مالکانہ اختیار، بے اندازہ مال و دولت ہونے کا احساس، نرجس کی قربت..... کئی بار بے اختیار جی چاہا کہ نرجس کا ہاتھ پکڑ لے لیکن ہر بار سنبھل گیا۔ بے اختیار غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔ ''اچھا نرجس! سچ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ معصوم..... کسی بچے کی طرح۔''

داؤد نے کہا۔ ''لیکن میں بچہ تو نہیں ہوں۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ بچے ہیں، میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ کسی بچے کی طرح معصوم نظر آتے ہیں۔''

داؤد نے بے اختیار نرجس کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''لیکن میں بچے کی طرح معصوم کیوں نظر آتا ہوں جبکہ میں بچہ نہیں ہوں۔ میرے سینے میں ایک مرد کا دل دھڑک رہا ہے، اس دل میں جذبات ہیں، احساسات ہیں.....''

☆☆☆

پھر نرجس نے داؤد کا منہ نوچ لیا۔ اس کے ناخن داؤد کی ناک اور رخسار کو زخمی کر گئے۔ اس نے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں کے نیچے دبا لیا اور خود جبر اور سختی پر اتر آیا۔

نرجس نے یکا یک مسکرا کر شوخی سے داؤد کی طرف دیکھا، بولی۔ ''تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''کس سے کروں شادی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''کسی سے بھی کرلو شادی۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''تو کرے گی مجھ سے شادی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''تم سے ہر عورت کر سکتی ہے شادی۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں کسی اور عورت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ تو مجھ سے کرے گی شادی؟''

نرجس نے کہا۔ ''اگر بھائی نظام نے مجھے مجبور کیا تو میں کیا کروں گی؟''

داؤد نے سہل انگاری میں کہا۔ ''تو اس کی فکر کیوں کرے، یہ تو میرا مسئلہ ہے۔ میں ہی اس مسئلے کو حل بھی کروں گا۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں کس طرح اطمینان کروں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، کیا میری بات کا بھی تو اعتبار نہیں کرے گی؟''

نرجس نے داؤد کو باتوں میں لگا کر اچانک اس کو دھکا جو دیا تو وہ ایک طرف پھسل گیا۔ نرجس اٹھی اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن داؤد نے اسے پکڑ لیا۔ نرجس زمین ہی پر بیٹھ گئی۔

داؤد نے کہا۔ ''اچھا نرجس یہ تو بتا کہ تو کس طرح راضی ہوگی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتی، اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میرے بھائی نظام کو آلینے دو۔ وہی تم سے اس رشتے کی بات کریں گے۔''

داؤد نے حقارت سے کہا۔ ''وہ میری مخالفت کر سکتا ہے بھلا؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''تم یہ مت کہو کہ وہ میری مخالفت کر سکتا ہے بھلا۔ میں جانتی ہوں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں شادی کروں گی تو تم سے ورنہ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔''

داؤد نے اسے دوبارہ پکڑنا چاہا لیکن وہ چھلاوے کی طرح ادھر چکر لگاتی رہی۔ داؤد کو ایک دم غصہ آگیا۔ وہ تیزی سے نرجس پر جھپٹا اور پکڑ لیا، بولا۔ ''نرجس! بولو اب کیا کرو گی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں کچھ بھی نہیں کروں گی بلکہ میں کوشش کروں گی کہ بھائی نظام شادی کی بات مان لیں پھر.....''

داؤد نے کہا۔ ''دیکھو نرجس! مجھے پھسلانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ میں زیادہ سخت ہو جاؤں گا۔''

نرجس نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن داؤد بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، بولا۔ ''دیکھو نرجس! تم بلاوجہ ذلیل و خوار ہو جاؤ گی۔''

داؤد نے ایک بار پھر نرجس کو پکڑ لیا اور بڑے جوش

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وخروش میں کہا۔ ''اب تو کہاں جائے گی بھاگ کر۔ اب میں تیرے اور اپنے پندار کو ایک ساتھ خاک میں ملادوں گا۔ میں اس جھوٹے پندار سے تنگ آچکا ہوں۔''

نرجس بلک بلک کر رونے لگی۔ ''مجھے معاف کردو داؤد خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔''

☆☆☆

کچھ دیر بعد پورے کمرے میں سناٹا طاری ہوگیا۔ نرجس مسہری پر اواس آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ داؤد نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کمرے میں پنج شاخہ فانوس روشن تھا اور داؤد کی نظریں اس فانوس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی حرکت پر نادم تھا، اپنے پندار کی شکست کا بڑا قلق تھا۔ اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ وہ سوچتا اے کاش لمحات گزشتہ واپس مل جائیں۔

دوسری طرف نرجس زاروقطار رو رہی تھی۔ اسے اپنے پندار کے خاتمے کا داؤد سے زیادہ ملال تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس نے ایک دم داؤد کی طرف کروٹ بدلی اور شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ ''یہ تم نے کیا کردیا داؤد..... بولو یہ تم نے کیا کردیا؟''

داؤد دم سادھے پڑا رہا۔ نرجس کی سسکیاں اس کا دل دہلائے دے رہی تھیں۔

نرجس اٹھ کر بیٹھ گئی اور دیوانگی میں داؤد کے چٹکیاں کاٹنے لگی۔ ''اب میں کیا کروں داؤد..... بولو اب میں کیا کروں؟ میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔ میں برباد ہوگئی۔ تم نے مجھے تباہ و برباد کردیا۔ مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔''

داؤد بھی بیٹھ گیا۔ نرجس کے سامنے چہرہ کرلیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر دل جوئی کرنے لگا۔ ''تو خوامخواہ پریشان ہورہی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، اس پر میں خود بھی نادم ہوں کیا مجھے اپنے پندار کی شکست کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔''

نرجس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ہوگا دکھ لیکن یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے، میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔''

داؤد نے اس کی زلفوں کی لٹکی ہوئی لٹ کو بوسہ دیا، بولا۔ ''جو کچھ ہوا ہے، اس کا ہم دونوں میں سے کوئی ذمے دار نہیں۔ اس کے ذمے دار وہ خاص حالات تھے جن میں ہم دونوں رہ رہے تھے۔ میرا خیال ہے، اب ہمیں لمحاتِ گزشتہ کا ملال نہیں کرنا چاہیے۔''

نرجس نے بلک کر کہا۔ ''میں اپنے دل کو کس طرح تسلی دوں؟''

داؤد نے نرجس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ''میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں تو بلاوجہ پریشان ہورہی ہے۔''

نرجس نے ڈبڈبائی آنکھیں اوپر اٹھائیں پوچھا۔ ''تم اس کی کس طرح تلافی کروگے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تو جس طرح چاہے گی۔''

نرجس نے داؤد کو رحم طلب نظروں سے دیکھا اور ایک دم چمٹ گئی، بولی۔ ''داؤد! مجھ سے شادی کرلو۔''

داؤد نے اس کے بالوں کو بوسہ دیا اور پشت تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''مت گھبرا نرجس میں تجھ سے شادی بھی کرلوں گا۔ تو جو کہے گی میں وہی کروں گا۔''

نرجس نے کہا۔ ''لیکن میں اس پر کس طرح یقین کروں؟''

داؤد نے پوچھا۔ ''یقین نہ کرنے کی وجہ؟''

نرجس نے کہا۔ ''یقین نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تم نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔''

داؤد ہنسنے لگا۔ ''ہاں، بے شک میں نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا لیکن یہ عہد میں نے جب کیا تھا تو حالات کچھ اور تھے اور اب وہ حالات نہیں رہے۔ اس لیے میں تم سے شادی ضرور کروں گا۔''

نرجس کی نظروں میں بڑی بے بسی تھی، التجا تھی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

داؤد نے برجستہ کہا۔ ''تمہیں یقین آجانا چاہیے۔''

نرجس ایک بار پھر چمٹ گئی، بولی۔ ''داؤد! مجھے جدا نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھے اپنی دلہن بنالو۔''

داؤد نے پھر تسلی دی۔ ''میں کہہ جو رہا ہوں کہ تجھ سے شادی کرلوں گا، تجھے اپنی دلہن بنالوں گا۔''

نرجس کسی حد تک مطمئن ہوگئی اور داؤد کے جسم میں ایک بار پھر سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ رات کے پچھلے پہر نرجس نے اپنے کمرے میں واپس جانے کی درخواست کی۔ داؤد نے پوچھا۔ ''سعدیہ اور کیفیہ کو کیا جواب دوگی؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''اول تو وہ کمروں میں پڑی سو رہی ہوں گی۔ انہیں کچھ پتا ہی نہ ہوگا کہ رات بھر میں کہاں رہی۔''

''اگر انہیں کسی طرح یہ معلوم ہوگیا کہ تم رات بھر اپنے کمرے میں نہیں رہیں اور انہوں نے اس سلسلے میں سوالات کیے تو کیا جواب دوگی؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نرجس نے جواب دیا۔ ''جب سوال کیے جائیں گے تو میں ان کے جواب بھی دے لوں گی، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اچھا۔'' داؤد کھڑا ہوگیا۔ ''تم ذرا رکو، میں باہر نکل کر یہ دیکھ لوں کہ کہیں کوئی خدمت گار جاگ تو نہیں رہا کیونکہ اگر کسی نے تمہیں اتنی رات گئے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ تمہیں تم مجھے زیادہ۔''

''واہ یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں زیادہ اور مجھے کم کیوں؟ کیا میری عزت آبرو نہیں ہے؟''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں اس حویلی کا مالک ہوں اور اس وقت میرا شمار ملک کے بہت بڑے تاجروں میں ہوتا ہے۔ ہم دونوں کی عزت و آبرو میں بڑا فرق ہے۔''

نرجس نے کہا۔ ''اچھا ذرا باہر نکل کر دیکھو کوئی خدمت گار کہیں ٹہل تو نہیں رہا جو مجھے جاتے ہوئے دیکھ لے اور ملک التجار کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے۔''

نرجس کے جملوں میں چھپا ہوا طنز داؤد نے محسوس کرلیا لیکن برداشت کر گیا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کے باہر پوری حویلی رات کے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے داؤد نرجس کے پاس واپس آ گیا اور سرگوشی میں کہا۔ ''نرجس! آجاؤ راستہ صاف ہے۔ چلو میں تمہیں، تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔''

نرجس، داؤد کے ساتھ ہولی اور دونوں دبے قدموں حویلی کے عقبی حصے کی طرف چل پڑے۔ ابھی یہ دونوں کچھ ہی دور پہنچے ہوں گے کہ حویلی کا پہرے دار ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ ''ٹھہر جاؤ، کون ہو تم دونوں؟ اور کہاں جا رہے ہو؟''

داؤد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ داؤد نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''یہ میں ہوں، پیچھے ہٹو۔''

گرجتا ہوا پہرے دار پالتو کتے کی طرح خوشامد پر اتر آیا، بولا۔ ''حضورِ والا! خیریت تو ہے، میرے لائق کوئی خدمت؟''

داؤد نے حکم دیا۔ ''یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔''

پہرے دار بھاگ گیا۔ داؤد اس کو اس کے کمرے تک چھوڑ آیا۔

رات کے پچھلے پہر جب داؤد اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس کمرے میں اس شب کچھ دیر پہلے جو کچھ ہو چکا تھا، داؤد اس کے اچھے برے پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اس نے یک سوئی سے اپنے دل کو ٹٹولا کیا اسے نرجس سے شادی کر لینا چاہیے؟ اس سوال کا سیدھا سا جواب تھا۔

''ہاں یا نہیں۔'' لیکن اس کے ہاں اور نہیں کے نتائج سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ اگر وہ نہیں کہتا تو فوراً ہی اس کے تصور میں نرجس کا اداس اور فکر مند چہرہ آ جاتا اور یہ چہرہ اس سے گلہ کرنے لگتا تھا۔ ''داؤد! مجھے دھوکا نہ دو، مجھ سے فریب نہ کرو۔ میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔''

اور اگر ہاں کرتا تو اندر سے کوئی اسے سرزنش کرنے لگتا۔ کوئی ملامت کرتا تھا۔ ''کہتا تھا شادی نہیں کروں گا۔ ایک تجربہ کروں گا اور فیروز بخت کو وصیت کر جاؤں گا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو اس کے کاروبار اور جائداد سے محروم ہو جائے گا اور شادی نہیں کرے گا تو ان سب کا مالک رہے گا اور اب اگر وہ خود شادی کرے گا تو فیروز بخت کو کس منہ سے وصیت کرے گا اور پھر یہ کہ اگر وہ شادی کرے گا تو نرجس بھی کاروبار اور جائداد میں حصے دار ہو جائے گی۔''

یہ ساری فکریں بڑی پریشان کن تھیں اور انہوں نے اسے فجر تک ہلکان اور پریشان رکھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے کئی دن بعد تک، نرجس اور داؤد کا سامنا نہیں ہوا۔ داؤد خود بھی کھنچا کھنچا رہا کیونکہ دوسرے دن بیداری کے بعد وہ اپنے رات کے اقدام پر بہت شرمندہ ہوا تھا۔ اس کا ضمیر بار بار کچوکے لگاتا رہا۔ اسے یہ فکر بھی پریشان کر رہی تھی کہ اس نے نرجس سے شادی کا وعدہ کرلیا تھا۔ اس نے شیطان پر بار بار لاحول پڑھی جس نے اس کو کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔

دوسری طرف نرجس بھی بہت پریشان تھی کہ داؤد اس سے ملاقات کیوں نہیں کر رہا۔ وہ اس سے منہ کیوں چھپا رہا ہے؟ وہ موقع کی تاک میں تھی کہ داؤد کو پکڑے اور اس سے بات کرے۔ اس نے داؤد میں یہ حیرت انگیز تبدیلی دیکھی کہ اب وہ باقاعدگی سے نمازیں پڑھنے لگا تھا۔ پانچوں وقت کی نمازیں، رات کو تہجد بھی ادا کرتا تھا۔ داؤد نے خدمت گاروں اور پہرے داروں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کمرے میں کسی عورت کو نہ داخل ہونے دیا جائے۔ نرجس نے ایک دو بار داؤد سے ملنے کی کوشش کی لیکن خدمت گار نے اسے روک دیا اور ملنے سے باز رکھا۔ نرجس کو غصہ تو بہت آیا لیکن پی گئی۔

ایک دن نرجس نے بہت زیادہ جرأت سے کام لیا اور خلافِ توقع داؤد کی کاروباری حویلی میں پہنچ گئی۔ اس وقت داؤد کے آس پاس منشیوں اور دوسرے کارندوں کا مجمع لگا ہوا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا۔ نرجس سر سے پاؤں تک چادر سے لپٹی ہوئی تھی۔ منشیوں اور پہرے داروں کو ہٹاتی ہوئی داؤد کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سامنے اچانک نرجس کو دیکھ کر داؤد کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ بے اختیار پوچھا۔ ''نرجس! تم..... خیریت تو ہے..... یہاں کیسے آگئیں؟''

نرجس نے داؤد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، بگڑ کر بولی۔ ''یہ تم، مجھ سے منہ کیوں چھپاتے ہو، آنکھیں کیوں چراتے ہو؟''

داؤد نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''میں آنکھیں نہیں چراتا، یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں کسی کے کہنے سننے میں نہیں آتی۔ یہ بات میں نے خود محسوس کی ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر یہ بات تم نے خود محسوس کی ہے تو غلط محسوس کی ہے۔''

نرجس نے کہا۔ ''اس وقت میں تم سے فیصلہ کن باتیں کرنے آئی ہوں۔''

داؤد نے اپنے منشیوں اور دوسرے کارندوں کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو داؤد نرجس کو ساتھ لے کر برابر والے چھوٹے کمرے میں چلا گیا، پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

نرجس نے گرمی سے جواب دیا۔ ''میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ تم نے رات کے پچھلے پہر غیر اخلاقی حالات میں مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد کب ہوگا؟''

داؤد نے پوچھا۔ ''کون سا وعدہ، کیسا وعدہ؟''

نرجس مشتعل ہوگئی۔ ''تو تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد نہیں رہا؟''

داؤد نے کہا۔ ''یہ باتیں یہاں نہیں، گھر پر ہوں گی۔ یہاں سے واپس چلی جاؤ۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں یہاں سے بات کیے بغیر واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔''

داؤد نے کہا۔ ''دیکھو نرجس! تم میری حویلی میں نظام کی امانت ہو۔ نظام میرا گماشتہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے نظام کی نظر میں شرمندگی اٹھانا پڑے۔''

نرجس چیخی۔ ''لیکن تم شرمندگی سے نہیں بچ سکتے کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ اپنی شرمندگی کا تم نے خود ہی انتظام کرلیا ہے۔''

داؤد اس کی چیخ سے گھبرا گیا، بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نرجس! تم چیخ کیوں رہی ہو؟ میں ملک التجار ہوں۔ ہمارے آس پاس منشی اور کارندے موجود ہیں۔''

نرجس نے داؤد کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''میں چیخوں گی کیونکہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے، مجھ سے فریب کیا ہے۔''

داؤد نے ہاتھ ہٹالیا، بولا۔ ''چیخو! خوب چیخو اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ چیخنے چلانے سے تمہارا کام بن جائے گا تو تمہیں چیخنے چلانے کی آزادی ہے لیکن یاد رکھو کہ نرمی اور آہستگی میں جو فائدے ہیں چیخ پکار اور جوش وجھنجلاہٹ میں اتنے ہی نقصان ہیں۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھے بغیر تم سے شادی نہیں کرسکتا۔''

داؤد کو محسوس ہوا کہ کمرے کے در پر کچھ لوگ جمع ہوچکے ہیں۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔ وہاں تین منشی اور دو کارندے کھڑے تھے۔ داؤد نے انہیں ڈانٹا۔ ''تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

وہ سب گھبرا گئے۔ ایک نے کہا۔ ''ہم لوگ اپنے کاموں میں لگ جانا چاہتے ہیں، رکیں یا جائیں؟''

داؤد نے کہا۔ ''جاؤ جاؤ، خدا کے لیے یہاں سے جاؤ۔ سب کو منع کردو کہ جب تک میں خود نہ بلاؤں یہاں نہ آنا۔''

وہ لوگ چلے گئے، داؤد پھر اندر چلا گیا اور جاتے ہی نرجس سے کہا۔ ''نرجس! میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ میں چند دن دور رہ کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم پر اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے اور مجھے افسوس سے یہ بات کہنا پڑ رہی ہے کہ تم نے یہاں آکر جس قسم کی باتیں کی ہیں، ان سے میں بہت مایوس ہوا ہوں۔''

نرجس نے کہا۔ ''میں تو یہ جاننے آئی ہوں کہ تم اپنے عہد پر کس حد تک قائم ہو؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور تفصیل سے باتیں گھر پر ہی کروں گا۔''

نرجس نے نرمی اختیار کرلی۔ ''گھر میں کس وقت اور کب بات کرو گے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تمہارے پاس میں خود آجاؤں گا۔''

نرجس نے اور نرمی اختیار کی، بولی۔ ''یہ سمجھ لو فیصلہ جلدی ہی کرنا ہے کیونکہ ہر بات نظام بھائی کے آنے سے پہلے طے پا جانی چاہیے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے شکم میں تمہاری جو امانت آگئی ہے، اس کے لیے بھائی نظام کو کچھ بتانا پڑے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''خیر، تمہارے بھائی نظام

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سے تو میں ڈرتا نہیں۔ اسے تو میں نے پہلے ہی نکال دیا تھا اور تمہارے کہنے سے میں نے اسے دوبارہ رکھ لیا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اسے پھر نکال باہر کردوں۔''

نرجس نے کہا۔ ''اور اپنی امانت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نرجس! میں تاجر ہوں بلکہ ملک التجار..... حالات اور مواقع سے فائدہ اٹھانا میری گھٹی میں پڑا ہے۔ جسے تم میری امانت کہہ رہی ہو، مجھے کیا پتا کہ وہ کس کی امانت ہے۔ جو عورت میری حویلی سے یہاں تک آسکتی ہے، وہ یہ امانت کہیں سے بھی لاسکتی ہے۔'' نرجس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

داؤد نے کہا۔ ''نرجس! اب حویلی واپس جاؤ، وہیں ساری باتیں ہوں گی۔'' نرجس چپ چاپ واپس چلی گئی۔

☆☆☆

داؤد نے پھر تغافل اختیار کیا اور نرجس سے کوئی بات نہیں کی۔ نرجس پیچ وتاب کھاتی رہی۔ اس نے کئی دن انتظار کیا کہ داؤد اسے بلوائے یا اس کے کمرے میں خود آئے لیکن نہ تو وہ خود آیا اور نہ ہی نرجس کو بلوایا۔ داؤد کی یہ روش دس بارہ دن قائم رہی۔ اس کے بعد اسے نرجس کی ضرورت پھر محسوس ہونے لگی۔ وہ رات کو بستر پر جاتا تو تنہائی کا احساس شدید ہوجاتا۔ عورت کے بغیر زندگی بے کیف اور بے رنگ محسوس ہونے لگتی۔ وہ نرجس کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اس نے خدمت گاروں اور پہرے داروں کو ہدایت کردی تھی کہ اگر نرجس اس سے ملنا چاہے تو اسے نہ روکا جائے۔

وہ بستر پر دراز کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس روز فضا ابرآلود تھی اور بادلوں کے گڑگڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ نصف رات کے بعد بوندا باندی شروع ہوئی اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ داؤد نے بستر چھوڑ دیا اور برآمدے سے بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ ہوا کے ساتھ بارش کے جھونکے اسے بھی بھگو رہے تھے۔ سردی کی ہلکی سی لہر پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ ایسی دھواں دھار بارش میں اس نے دو سایوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اندھیرے میں صحیح نظر نہیں آرہا تھا۔ جب وہ دونوں قریب آگئے تو داؤد نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

لیکن جواب سے پہلے ہی دونوں داؤد کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کے سروں پر کمبل پڑے ہوئے تھے جس سے بارش کا وہ اثر نہیں ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے برآمدے میں پاؤں رکھتے ہی کمبلوں کی چھتری اتار دی اور اس نے فوراً ہی ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک تو نرجس تھی اور دوسری کو ٹھیک سے نہیں پہچان سکا تھا۔ داؤد نے اسے پہچانتے ہی مخاطب کیا۔

''ارے نرجس! یہ تم اور دوسرا کون ہے تمہارے ساتھ؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''یہ کیفیہ ہے میرے ساتھ، بڑی ضد کرکے آئی ہے۔''

داؤد برآمدے سے اپنے کمرے میں جانے لگا۔ دونوں سے کہا۔ ''آپ دونوں اندر آجائیں، یہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔''

نرجس اور کیفیہ، داؤد کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوگئیں۔ داؤد نے ان دونوں کو کرسیوں پر بٹھا کر خود مسہری پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر رکھ کر وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

اس بار نرجس کے بجائے کیفیہ نے زبان کھولی۔

داؤد بھائی! مجھے بہن نرجس کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت ہی شرمناک ہے۔''

داؤد نے شرارتاً پوچھا۔ ''نہیں کیا معلوم ہوا جو تم شرمندہ ہورہی ہو؟''

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا۔ نرجس بلک بلک کر رونے لگی۔ ''میں بھائی نظام سے کیا کہوں گی، وہ تو مجھے زندہ دفن کردیں گے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''وہ زندہ کیوں دفن کردیں گے اور پھر اس کا حل ہے میرے پاس۔''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''وہ کون سا حل ہے آپ کے پاس، میں بھی تو سنوں۔''

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ''دیکھو نرجس! میں نے جب تم سے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ شادی تم سے کروں گا تو تم اس کا چرچا کیوں کرتی پھر رہی ہو؟''

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا اور نرجس نے داؤد کو مخاطب کیا۔ ''داؤد! تم میری بات میں نہیں آرہے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، بھائی نظام کی آمد سے پہلے ہی ہوجائے۔''

داؤد نے فانوس کی روشنی میں کیفیہ اور نرجس کو بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ اس وقت کیفیہ زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ نرجس بھی بری نہیں تھی لیکن کیفیہ میں واقعی کیف سا محسوس ہورہا تھا۔ داؤد نے پوچھا۔ ''اچھا چلو، میں ایک شرط پر شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر وہ منظور ہے تو میں ہفتے کے اندر اندر شادی کرلوں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''وہ شرط بتاؤ، کون سی اور کیسی شرط؟''

داؤد نے کہا۔ ''یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ میں شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''یہ بات ساری دنیا جانتی ہوگی لیکن کم از کم میں تو نہیں جانتی کہ تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میری جائداد اور کاروبار کے حصے بخرے ہوں۔ اگر نرجس مجھے یہ یقین دلا دے کہ وہ بیوی بن جانے کے بعد بھی میری جائداد اور کاروبار سے اپنا حصہ نہیں مانگے گی تو کل ہی شادی کرلوں گا اس سے۔''

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا۔ نرجس نے کہا۔ ''میں اس شرط کو مانتی ہوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''دیکھو، خوب اچھی طرح سوچ لو۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں، میں اپنی عزت اور آبرو بچانا چاہتی ہوں، دولت جائداد نہیں چاہتی۔''

داؤد نے کہا۔ ''پھر میں بھی شادی کے لیے تیار ہوں۔''

نرجس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کمرے کے باہر فضا میں بجلی اور بادل کا شور برپا تھا۔

داؤد نے کیفیہ سے کہا۔ ''اگر تم پسند کرو تو کچھ دیر کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ میں نرجس سے چند باتیں اور کروں گا۔''

کیفیہ نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ ''میں کہاں جاؤں؟ کوئی اور جگہ ہے میرے بیٹھنے کے لیے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اپنے کمرے میں چلی جاؤ پھر آجانا۔''

کیفیہ نے بے دلی سے کمبل سنبھالا، کہا۔ ''اچھا پھر میں چلتی ہوں۔ بہن نرجس کا کام ہر قیمت پر ہوجانا چاہیے۔''

داؤد نے کہا۔ ''تم بے فکر رہو کیفیہ ..... کل تم بھی آجانا۔ تم سے بھی کچھ باتیں ہوجائیں گی۔''

کیفیہ نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''ہاں ہاں، میں بھی کرلوں گی باتیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

اس نے کمبل اپنے سر پر ڈالا اور جہاں سے آئی تھی اسی طرف واپس چلی گئی۔

نرجس اور داؤد ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی بے تکلفی سے دیکھ نہیں رہا تھا۔ داؤد ایک دم اٹھا اور اس کے برابر آبیٹھا۔ ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ ''نرجس! بارش کا پانی اور نشے و کیف میں ڈوبی ہوائیں کچھ کہہ رہی ہیں۔''

نرجس نے بات کاٹی۔ ''یہی کہ شادی میں بھی کاروبار سے نہیں چوکے اور ہونے والی بیوی کو جائداد اور دولت سے محروم رکھا۔ کیوں ہے نا یہی بات؟''

داؤد نے کھسیا کر جواب دیا۔ ''نرجس! نہ تم بے وقوف ہو اور نہ ہی میں احمق ہوں۔ کوئی شوہر اگر اپنی بیوی کو اس کا حق نہ دینا چاہے تو اس سے اس کا حق سلب نہیں ہوجاتا۔''

''کیا پتا، میں تو اس کو سچ سمجھتی ہوں جو تم کہتے ہو۔''

نرجس نے ایک بار پھر خود کو داؤد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ بجلی کی کڑک چمک، بادلوں کی گھن گرج اور بارش کے شور میں داؤد، نرجس کو اپنی ضرورت محسوس کررہا تھا، زندگی اور جوانی کی اہم ترین ضرورت جس کے بغیر مال و زر، دولت، کاروبار، املاک، جائداد سب کچھ فضول اور بے کار ہے۔ نرجس بھی داؤد کے پاس دبی، سمٹی اپنی اس غلطی اور زیادتی کی معافی مانگ رہی تھی جو چند دن پہلے اضطراری حالت میں کاروباری حویلی میں سرزد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

نرجس مطمئن تھی کہ اب داؤد سے شادی ہوکر رہے گی اور وہ ملک التجار کے مال و دولت اور کاروبار میں حق دار ہوجائے گی لیکن خود داؤد کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اب اس کا بیاؤ کھل چکا تھا، ضمیر کی آواز بھی کمزور پڑ چکی تھی۔ وہ بڑی دلیری اور بے تکلفی سے نرجس، کیفیہ اور سعدیہ کے پاس پہنچ گیا۔ داؤد کی آمد سے تینوں کو خوشی ہوئی۔ داؤد نے تینوں سے کہا۔ ''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم تینوں ایک ہی جگہ مل گئیں ورنہ مجھے باری باری تینوں کے پاس پہنچنا پڑتا۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ہر روز تم تینوں کی خیریت ضرور معلوم کرلیا کروں گا۔''

نرجس نے زیر لب مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''زہے نصیب، شکریہ۔''

کیفیہ ہنس دی۔ ''بڑی جلدی خیال آیا آپ کو۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

سعدیہ نے ہمت کی۔ ''میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ حویلی میں جہاں اور بہت سے، خدمت گار رہتے ہیں، ہم بھی رہ رہے ہیں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس طرح تو آپ لوگوں کو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔'' پھر نرجس سے کہا۔ ''آج میں تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

چیز کھانا چاہتا ہوں۔''

نرجس نے خوشی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔''ضرور، ضرور ..... ابھی لو۔'' وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

اب داؤد نے سعدیہ کو مخاطب کیا۔''آپ بھی کچھ پکالیتی ہیں؟''

''کیوں نہیں، میں کھانے پکانے میں نرجس کو شکست دے سکتی ہوں۔''

داؤد نے کہا۔''پھر آپ بھی باورچی خانے میں تشریف لے جائیں اور اپنی پسند کی کوئی اچھی سی چیز پکالائیں۔''

سعدیہ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ ملک التجار داؤد اس سے کچھ کھانے کی فرمائش کررہا تھا۔ وہ بھی اٹھی اور نرجس کے پاس باورچی خانے میں چلی گئی۔

اب کیفیہ اور داؤد تنہا رہ گئے تھے۔ کیفیہ نے سر جھکالیا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ داؤد ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔''کیفیہ! یہ بچے کہاں چلے گئے؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔''بارش کے پانی سے کھیل رہے ہیں۔''

داؤد نے لمحہ بھر کے لیے سکوت اختیار کیا پھر آہستہ سے پوچھا۔''کیفیہ! تم آئی نہیں میرے پاس؟''

کیفیہ نے اجنبی انداز میں جواب دیا۔''کیا کرتی آکر؟ کوئی خاص کام تھا مجھ سے آپ کا؟''

داؤد نے کہا۔''تم آؤ تو سہی میرے پاس، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کیفیہ نے جواب دیا۔''میں بیٹھی تو ہوں آپ کے سامنے۔ وہ باتیں کیا یہاں نہیں ہوسکتیں؟''

داؤد نے کہا۔''ہاں، وہ باتیں یہاں نہیں ہوسکتیں۔''

کیفیہ نے بے رخی سے کہا۔''تب پھر مجبوری ہے۔ یہیں کیوں نہیں کرلیتے باتیں؟''

داؤد نے کہا۔''تم اپنے شوہر سے ملاؤ تو سہی اس کا پتا تو بتاؤ؟''

کیفیہ سوچ میں پڑگئی کچھ تامل سے پوچھا۔''آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔''میں اس بے حس نوجوان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کب سے تمہارے پاس نہیں آیا؟''

کیفیہ نے آہستہ سے کہا۔''ان فضول باتوں سے حاصل؟''

داؤد نے کہا۔''اس وقت میں اس لیے آیا تھا تمہارے پاس کہ میں تم سے چند اہم باتیں کرلوں۔''

''ابھی تک تو آپ نے کوئی اہم بات کی نہیں۔''

''اہم بات یہ ہے کہ تم اپنے شوہر سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں؟''

کیفیہ نے ایک دم چونک کر داؤد کی طرف دیکھا۔''کیا مطلب، طلاق ..... طلاق کیوں لے لوں؟''

داؤد نے جواب دیا۔''جو شوہر اپنی بیوی سے دور دور اور لاپتا رہتا ہو، اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالینا ہی مناسب ہے۔''

کیفیہ نے کہا۔''آپ تاجر ہیں ملک التجار..... آپ ہر معاملے میں ہر شے کو تجارت کی کسوٹی پر کستے پرکھتے ہیں لیکن میں تو تاجر نہیں ہوں۔''

داؤد نے کہا۔''میں یہ نہیں کہتا کہ تم تاجر بن جاؤ۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم اپنے شوہر سے بلاوجہ زیادتی کرو۔ میں تو بس یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے نفع و نقصان پر نظر رکھو، اپنی بھلائی کا خیال ضرور کرو۔ اگر ایسا آج نہیں کروگی تو کل یہ ضرور کرنا پڑے گا۔ تو جو کل کرنا ہے، عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے آج ہی کرڈالو۔''

''چلیے اگر میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں تو اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اس کے بعد تیرے لیے ایک ایسا شوہر تلاش کیا جائے گا جو تجھ سے دور نہ رہے اور دولت مند بھی ہو۔''

کیفیہ نے کہا۔''بھائی نظام کی مرضی کے خلاف میں اپنے شوہر سے کس طرح طلاق لے سکتی ہوں؟''

داؤد نے جواب دیا۔''تب پھر نظام کی واپسی پر میں خود اس سے بات کرلوں گا۔''

کیفیہ نے کہا۔''میرا خیال ہے بھائی نظام آپ کی بات کا برا مان جائیں گے۔''

داؤد نے کہا۔''اس وقت تو میں اس سے زیادہ بات نہیں کروں گا لیکن اگر تو وقت نکال کر چوری سے میرے پاس آگئی کسی وقت تو میں ضرور بات کروں گا۔''

کیفیہ نے کہا۔''اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی رات کو آپ سے مل لوں گی۔''

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔''میں اس ملاقات کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

کیفیہ نے کہا۔''اس میں شکریے کی کوئی بات ہے ہی نہیں پھر یہ شکریہ کس بات کا؟''

داؤد نے گفتگو بند کردی کیونکہ سامنے سے نرجس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آرہی تھی۔ داؤد نے نرجس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”وہ آرہی ہے بقیہ باتیں پھر کروں گا تجھ سے۔ اس وقت تو تو خاموش ہوجا۔“

دونوں ہی خاموش ہوگئے۔ نرجس کھانے کا تازہ تازہ پکا ہوا سامان لے کر آرہی تھی۔ قریب آکر کھانے کی چیزیں دسترخوان پر بچھادیں۔ کچھ دیر بعد سعدیہ بھی آگئی۔ وہ بھی کھانے کا سامان لے کر آئی تھی۔ چاروں دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ داؤد ان کے کھانوں کی دل بھر کر تعریفیں کررہا تھا۔ کبھی وہ نرجس کے کھانوں کی تعریفیں کرکے اس کا دل بڑھادیتا اور کبھی سعدیہ کی تعریفیں کردیتا اور نرجس جل جاتی۔ کھانا کھاچکنے کے بعد داؤد نے کہا۔ ”اتنا مزے دار کھانا کھا کر یہی جی چاہتا ہے، کھانا پکانے والیوں کے ہاتھ کاٹ لیے جائیں۔“

نرجس نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہاتھ کاٹ لینے سے آپ کو فائدہ کیا پہنچے گا؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”یہ کہ میرے بعد کوئی اور ایسی لذیذ چیزیں نہیں کھا سکے گا۔“

نرجس نے کہا۔ ”لیکن ایک ایسی ترکیب بھی ہے کہ آپ یہ لذیذ کھانے مستقلاً کھاتے رہیں اور دوسرے لوگوں کو محض آپ کے طفیل یہ کھانے مل جایا کریں۔ جس کو چاہیں کھلائیں اور جس کو نہ چاہیں نہ کھلائیں۔“

داؤد سمجھ گیا کہ نرجس اپنی شادی کی بات کررہی ہے۔ وہ اس موضوع کو گول کرگیا۔

کیفیہ نے پوچھا۔ ”یہ آپ چپ کیوں ہوگئے؟ بولے کیوں نہیں، کیا سوچنے لگے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم لوگوں میں اپنائیت کتنی ہے۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”اپنائیت ہم میں نہیں، آپ میں ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہم لوگ اس حویلی میں نہ ہوتے۔“

داؤد نے کہا۔ ”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“

داؤد کافی وقت گزار کر اپنی دوسری حویلی میں چلا گیا۔ وہاں احمد آباد کے مضافات سے آئے ہوئے چند بیوپاری انتظار کرتے ہوئے ملے۔ یہ لوگ لنگھے اور چھینٹ کے نمونے لے کر آئے تھے اور اس سے کاروباری معاملہ کرنا چاہتے تھے۔ کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد سودا پٹ گیا اور داؤد نے ان سے کئی ہزار تھانوں کا معاملہ طے کرلیا۔ بیوپاریوں کو حویلی کے دارالضیافت میں ٹھہرادیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد داؤد نے حساب لگایا کہ اس پر متوقع منافع کتنا حاصل ہوگا؟ تقریباً بارہ ہزار کا فائدہ ہورہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سودے میں بارہ ہزار کا منافع۔ اس خوشی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کیفیہ اور نرجس میں سے کون بخت آور ہے؟ ان میں کوئی ایک خوش قسمت تھا ضرور کیونکہ ان کے پاس سے آنے کے بعد ہی اتنا بڑا معاملہ ہوا تھا۔

اس نے اس دن ایک ہرکارہ سورت بندر روانہ کردیا اور نظام اور فیروز بخت کو یہ ہدایت کی کہ وہیں رکے رہو کیونکہ ابھی لنگھے اور چھینٹوں کے تھان ایک دوسرے جہاز پر بار کرنے ہیں۔ وہ منشیوں سے بڑی دیر تک کاروباری کاغذات کی تکمیل کرواتا رہا۔ مغرب کے بعد فرصت ملی تو سیدھا گھر پہنچا۔ اپنے کمرے میں جاکر لباس بدلا اور ہاتھ منہ دھوکر کھانا طلب کیا۔ کھانا کھانے کے بعد کمرے سے باہر آیا اور چہل قدمی کرنے لگا۔ اس دوران اس نے خدام اور داروں کو ہدایت کردی کہ رات کو صدر پھاٹک پر موجود رہو لیکن اس کے سامنے پہرے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ عشا کے بعد تمام خدمت گار اور پہرے دار پھاٹک کی طرف چلے گئے۔

چہل قدمی کے بعد وہ کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بستر پر دراز ہوگیا اور مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

اس مطالعے کے دوران ایک مترنم آواز سنائی دی۔ ”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“

داؤد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کیفیہ کی آواز تھی۔ داؤد اٹھ کر بیٹھ گیا بولا۔ ”کیفیہ! آجا..... اس میں اجازت لینے کی کیا بات تھی۔“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”میں تنہائی میں آپ کے پاس آتے ہوئے خوف زدہ تھی معلوم نہیں کس طرح یہاں تک آگئی۔“

داؤد تیزی سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ کیفیہ نے گھوم کر یہ منظر دیکھا اور پریشان کن لہجے میں پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کررہے ہیں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں تیری عزت آبرو کو محفوظ کررہا ہوں۔ اب تو اطمینان سے میری مسہری پر بیٹھ جا اور مجھ سے باتیں کر۔“

کیفیہ مسہری پر بیٹھ گئی اور خود داؤد ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کیفیہ سے پوچھا۔ ”ہاں اب بتا، تیرا آنا کیونکر ہوا؟“

کیفیہ نے برا مان کر جواب دیا۔ ”یہ عجیب مہمل سوال کررہے ہیں آپ؟ کیا آپ کا حافظہ اتنا کمزور ہے کہ صبح کی باتیں رات کو بھول جائیں۔ اس لیے کہ آپ ہی نے تو مجھے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

بلایا تھا یہاں میں اپنے آپ سے ہرگز نہیں آتی۔''

داؤد مسکرانے لگا۔''چلو یہی سہی، میں نے ہی بلایا تھا تجھے۔'' پھر کچھ رک کر پوچھا۔''کیا تجھے معلوم ہے کہ میں نے تجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔''مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔''

داؤد نے کہا۔''کیفیہ! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تیرا نام کیفیہ کس نے رکھا تھا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مجھے یہ نام میری دادی نے دیا تھا کیونکہ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ تیرے چہرے اور تیری آنکھوں میں ایک خاص قسم کا نشہ پایا جاتا ہے۔ دادی کے اس قول کی تقریباً سبھی نے تائید کی تھی۔''

داؤد نے کہا۔''میرا خیال ہے تیری دادی کو شاعری ضرور آتی ہوگی کیونکہ تیرے چہرے کو دیکھ لینے کے بعد انہوں نے تجھے شاندار نام عطا کر دیا۔ تو واقعی سرتاپا کیفیہ ہے۔''

کیفیہ کے چہرے پر خوشی اور شرم سے سرخی دوڑ گئی۔

داؤد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔''میں تیرا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھے طلاق دلوا کر تجھ سے شادی کر لوں گا۔''

کیفیہ نے چونک کر داؤد کو دیکھا، بولی۔''شادی کا وعدہ آپ نے بہن نرجس سے بھی کر رکھا ہے۔''

داؤد نے جواب دیا۔''نہیں، اس سے میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ یہ اس کی خوش فہمی ہوگی۔''

کیفیہ نے کہا۔''اور اس وقت میں آپ کے پاس محض اس لیے آئی تھی کہ نرجس بہن کے معاملے میں آپ سے کوئی فیصلہ کن بات کر لوں۔''

داؤد نے پوچھا۔''کیا فیصلہ کن بات کرے گی تو؟ بتا میں تیار ہوں۔''

کیفیہ نے کہا۔''آپ نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، اس کی تلافی شادی کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ کو یہ کام فوراً کر ڈالنا چاہیے۔''

داؤد نے کہا۔''میں اس سے شادی تو کر سکتا ہوں لیکن وہ زیادہ مہر کی بات کرے گی اور مال و زر کی حصے دار بھی بننا چاہے گی اور میں یہ دونوں باتیں ناپسند کرتا ہوں۔''

کیفیہ نے کہا۔''جیسا کہ میں پہلے بھی یہ یقین دلا چکی ہوں کہ نرجس بہن ان دونوں پر اصرار نہیں کریں گی۔ اگر وہ اصرار نہ کریں تو کیا آپ اس سے شادی کر لیں گے؟''

داؤد نے جواب دیا۔''اب تو مجھے سوچنا پڑے گا

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کیونکہ اگر تو مجھے نہ ملی ہوتی تو میں نرجس سے شادی کر لیتا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو کہاں ملی ہوں، میں ایک شادی شدہ لڑکی ہوں۔'' داؤد اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کیفیہ کھڑی ہوگئی۔ ''ذرا دور رہیے مجھ سے۔''

داؤد نے اسے دھکا دے کر مسہری پر گرا دیا۔ تیوری چڑھا کر بولا۔ ''لڑکی! یہ مت بھولو کہ میں ایک تاجر بھی ہوں، میں نے اس حویلی میں تم سب کو جگہ دی ہے۔ تمہارا خرچ برداشت کیا ہے۔ اس کے عوض میں تم تینوں سے اگر کچھ طلب کروں تو کیا میرا یہ مطالبہ غلط ہوگا؟''

کیفیہ سہم گئی، خوشامد سے بولی۔ ''مجھ پر رحم کیجیے۔''

داؤد نے مزاحمت ترک کر دی۔ ''اچھا چل، میں تجھ پر رحم کر رہا ہوں۔ اب تو مجھ پر رحم کر۔''

کیفیہ نے پوچھا۔ ''میں آپ پر کیا رحم کروں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں تجھ سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ ایک عاشق جو کچھ چاہتا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔''

کیفیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اور میں بھی تجھ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ جیسے کو تیسا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''اچھا اس وقت تو مجھ کو جانے دیجیے، مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں تجھے یہیں سوچنے کا موقع دے سکتا ہوں۔''

''یہاں تو میں نہیں سوچ سکوں گی۔''

''پھر مجبوری ہے، تو بھی مجبور ہے میں بھی مجبور ہوں۔''

کیفیہ نے بے بسی سے کہا۔ ''آپ تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں کس طرح فائدہ اٹھاؤں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تو یہ فائدہ اٹھا سکتی ہے کہ مجھ سے شادی کا اقرار کرلے اور مجھ سے لمبے چوڑے مہر کا مطالبہ کر۔ اس کے علاوہ میرے مال وزر میں حصے دار بننے کی خواہش کر۔''

شاید کیفیہ کے منہ میں پانی بھر آیا، بولی۔ ''اگر میں شادی کا وعدہ کرلوں تو آپ مجھے کتنا مہر ادا کریں گے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''جتنا تو کہے گی، اتنا ہی مہر مقرر کر دیا جائے گا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''میں پچاس ہزار کی بات کروں گی۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''اور مال وزر میں سے تیرے حصے میں کیا آئے گا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ میری اولاد کا اور میرا ہوگا۔''

داؤد نے کہا۔ ''مجھے اس سے انکار ہی کب ہے۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''آپ کو ہمیشہ اس سے انکار ہی رہا ہے۔ آج معلوم نہیں کیوں آپ اتنے خوش مزاج اور ہشاش بشاش انسان نظر آ رہے ہیں۔''

داؤد نے پہلو میں گدگدی کر دی۔ ''میں ہمیشہ کا خوش مزاج اور ہشاش بشاش انسان ہوں کیونکہ میں اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہی شخص کامیاب تاجر ہے جو خوش اخلاق ہو اور مسکرانا جانتا ہو۔''

نرجس اور کیفیہ کے بعد سعدیہ باقی رہ گئی تھی۔ اب داؤد کی نظریں اس پر تھیں۔ نرجس کھسیائی ہوئی تھی اور کیفیہ مصر تھی کہ اس نے جو وعدے، کیے ہیں انہیں پورا کرے لیکن داؤد یہ کہتا تھا کہ کیفیہ پہلے اپنے شوہر سے طلاق تو لے لے، اس کے بعد وہ شادی کر لے گا۔ نرجس کو کیفیہ سے نفرت ہوگئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ شکار اس کا پھانسا تھا مگر کیفیہ نے ہتھیا لیا تھا اور داؤد کا یہ حال تھا کہ وہ دونوں ہی کو خوش رکھ کر کام نکالنا چاہتا تھا اور دونوں ہی سے الگ الگ شادی کا وعدہ کر رکھا تھا اور دونوں ہی کو منع کر دیا تھا کہ اس راز کو وہ محفوظ رکھیں اور کسی پر کھلنے نہ دیں لیکن نرجس مایوس تھی اور کیفیہ پرامید۔

دوسری طرف نظام اور فیروز بخت سورت بندرگاہ میں رکے ہوئے تھے۔ فیروز بخت کو سورت میں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں وہاں نظام کا رویہ ظالمانہ ہوگیا اور اس نے فیروز بخت سے نوکر کی طرح سلوک کیا۔ خود تو اچھے اچھے کھانا کھاتا اور فیروز بخت کو معمولی کھانے پر ٹرخا دیتا۔ فیروز بخت نے کئی بار احتجاج کیا لیکن اس کا نظام پر کوئی اثر نہ ہوا۔

نظام ملاحوں سے مل کر گھپلے بھی کر رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں تھا۔ فیروز بخت کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ آخر اس نے تین ماہ بعد بمشکل داؤد کے نام خط لکھ کر اس میں نظام کی زیادتیوں کا تفصیلی ذکر کیا اور درخواست کی کہ اسے جلد از جلد واپس بلا لیا جائے۔

داؤد کو یہ خط ملا تو کافی پریشان ہوگیا اور نظام کی جگہ کام کرنے کے لیے دو آدمی روانہ کر دیے اور نظام کے نام خط لکھ دیا کہ وہ ان دونوں کو اپنی ذمے داریاں سپرد کر کے فیروز بخت کے ساتھ واپس آ جائے۔

خط بھیجنے کے ساتھ ہی اس نے نرجس اور کیفیہ کو مجبور

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

کیا کہ وہ دونوں چند دنوں کے لیے اپنے آبائی مکان چلی جائیں کیونکہ نظام نے بطور خاص یہ ہدایت کی ہے کہ اس کی واپسی سے پہلے نرجس اور کیفیہ کو ان کے اپنے مکان پر پہنچا دیا جائے تاکہ وہ دونوں مکان کی صفائی ستھرائی کرلیں۔

نرجس اور کیفیہ کو اس تجویز سے اختلاف ہوا۔ نرجس نے کہا۔ ''اگر ہم اپنے آبائی مکان میں جائیں گے تو تینوں ساتھ جائیں گے ورنہ دو بھی نہیں جائیں گے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہا نظام نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ تم دونوں کو اس پر عمل کرنا پڑے گا۔ میرے آدمی تم دونوں کو تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''لیکن میں تنہا اس حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ میں دونوں کے ساتھ جاؤں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''سعدیہ! تو نہیں جائے گی کیونکہ نظام نے تجھے اسی حویلی میں رکنے کا حکم دیا ہے۔''

نرجس نے شک و شبہے سے پوچھا۔ ''کیا آپ سچ بول رہے ہیں؟''

کیفیہ نے سوال کیا۔ ''بھائی نظام کا خط کہاں ہے؟''

داؤد نے دونوں کو جواب دیا۔ ''تم دونوں کو یہ ناقص سوال مجھ سے نہیں کرنا چاہیے۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''تم دونوں کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔''

داؤد نے تینوں کو ڈانٹ دیا۔ ''میں زیادہ بحث میں نہیں پڑوں گا۔ سعدیہ کے علاوہ دونوں کو اپنے مکان میں جانا پڑے گا۔''

اور جاتے جاتے کہتا گیا۔ ''کل صبح تم دونوں کو یہ حویلی خالی کر دینا ہے۔ میرے دو آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

وہ چلا گیا اور تینوں عورتیں آپس میں بحث مباحثہ کرنے لگیں۔

رات کو کیفیہ داؤد کے پاس چوری سے پہنچی۔ داؤد جانتا تھا کہ اس وقت اس کے پاس کیفیہ اور نرجس میں سے کسی ایک کو پہنچنا ضرور چاہیے چنانچہ کیفیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیرت کا اظہار نہیں کیا، بولا۔ ''کیفیہ! تم آگئیں؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں میں آگئی۔''

داؤد نے طنزاً کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تو ضرور آئے گی۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے مجھ سے جو وعدے کر رکھے ہیں، وہ ایفا بھی ہوں گے یا نہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''وہ ایفا ضرور ہوں گے۔''

کیفیہ نے پوچھا۔ ''ایفا کب ہوں گے؟''

داؤد نے کہا۔ ''جب تک تو اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے لے گی، میں تجھ سے شادی کس طرح کرلوں گا۔''

کیفیہ نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔ ''لیکن مجھے اس کی صداقت پر شبہ ہے اور یوں لگتا ہے گویا آپ مجھے بہلا رہے ہیں۔''

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تیرا شبہ ہے۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''کیا میرا یہ شبہ غلط ہے کہ اب آپ سعدیہ سے بھی وہی سلوک کریں گے جو ہم دونوں سے کر چکے ہیں اور اس سے بھی اسی قسم کا وعدہ کریں گے جو ہم دونوں سے کر چکے ہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''یہ محض واہمے ہیں تم دونوں کے۔ سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ میں تیرے سوا کسی سے شادی کروں گا ہی نہیں۔ میں نے تجھ سے جو وعدے کیے ہیں، ان پر پوری دیانت داری سے قائم رہوں گا۔''

کیفیہ نے داؤد کی باتوں پر کچھ کچھ پھر یقین کرلیا۔

داؤد نے پوچھا۔ ''نرجس کیا کر رہی ہے؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''شاید نرجس بہن بھی آپ سے ملنے آئیں گی۔''

داؤد نے بے زاری سے کہا۔ ''لیکن اس وقت میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔''

''اگر نرجس بہن آپ سے ملنے آئیں گی تو انہیں روکے گا کون؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''آج کی رات میں اپنا کمرا ہی بدل دوں گا۔ ایک دوسری خواب گاہ میں بسر کروں گا۔ نرجس آئے گی اور دیکھ کر چلی جائے گی۔''

کیفیہ خاموش ہوگئی۔ داؤد نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا کمرا چھوڑ دیا اور صدر پھاٹک کے قریب والے کمرے کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ کیفیہ کے خیال کے مطابق نرجس، داؤد سے ملنے گئی لیکن کمرے کو خالی دیکھ کر واپس چلی گئی۔

رات کے پچھلے پہر کیفیہ نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے داؤد کو قسم دلائی کہ وہ اپنا وعدہ پورا ضرور کرے ورنہ وہ اپنی جان دے دے گی کیونکہ ناکامی کا صدمہ وہ نہیں برداشت کرسکے گی۔ داؤد نے اس کو آغوش میں لے کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ مطمئن رہے۔ وہ داؤد کی دلہن بن کر رہے گی۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دوسرے دن علی الصباح کیفیہ اور نرجس کو ان کے آبائی مکان روانہ کر دیا گیا۔ کیفیہ کے ساتھ ہی آٹھ سالہ شازیہ بھی چلی گئی تھی۔ اب حویلی میں سعدیہ اور دو بچے رہ گئے تھے۔ پانچ سال کا اسماعیل اور تین سال..... کا ابراہیم۔ نرجس جاتے جاتے داؤد کو دھمکی دیتی گئی تھی کہ اگر اسے دھوکا دیا گیا تو اس کا نتیجہ برا نکلے گا لیکن اس دھمکی کا داؤد پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ داؤد ایک عورت سے ڈرنے والا انسان نہیں تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد کئی دن تک داؤد نے سعدیہ سے کوئی خاص ملاقات نہیں کی۔ کھڑے کھڑے گیا اور مزاج پرسی کر کے چلا آیا۔ اس دوران اس نے سعدیہ کو بہت اداس محسوس کیا۔ وہ سعدیہ سے اتنا لاتعلق بن چکا تھا کہ سعدیہ کو شدید احساس تنہائی ستانے لگا۔ پہرے داروں اور خدمت گاروں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ سعدیہ کے کمرے کے قریب بھی نہ جائیں۔ اس طرح وہ سعدیہ کے دل میں تنہائی کا شدید احساس اور خوف پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ جب سعدیہ تنگ آجائے گی تو اس کے پاس ضرور آئے گی چنانچہ دو چار سرسری ملاقاتوں کے بعد داؤد نے سعدیہ کے پاس جانا ہی چھوڑ دیا۔ اتنی بڑی حویلی میں سعدیہ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ تنہا رہ رہی ہو۔ اس کو دونوں وقت کا کھانا پہنچا دیا جاتا اور اس کے بعد کسی کی شکل تک نہ دکھائی دیتی۔

اس طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ ایک دن، شام کو جب کھانا پہنچایا گیا تو سعدیہ نے بوڑھے خدمت گار کو روک لیا، پوچھا۔ ''بابا! کیا بات ہے، کیا داؤد کہیں گئے ہوئے ہیں؟''

بابا نے جواب دیا۔ ''گئے تو کہیں بھی نہیں، ہاں مصروفیت بہت زیادہ ہے۔''

سعدیہ نے پوچھا۔ ''وہ واپس کب آتے ہیں؟''

بابا نے جواب دیا۔ ''تقریباً عشا کے وقت۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''خاص بات تو کوئی بھی نہیں، وہ میرے پاس مزاج پرسی کو ایک ہفتے سے نہیں آئے۔''

بابا نے پوچھا۔ ''کیا انہیں بھیج دوں آپ کے پاس؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

بابا واپس چلا گیا اور سعدیہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ بڑے شش و پنج میں تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کو حویلی کے سناٹے میں ڈر لگنے لگا تھا۔ بابا سے بات کرنے کے بعد وہ دو دن اور خاموش رہی لیکن پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور مغرب کے بعد دونوں بچوں کو ساتھ لے کر داؤد کے پاس پہنچ گئی۔ داؤد نے اس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سعدیہ کو دیکھ کر مسکرایا اور رومال سے منہ پونچھنے لگا۔ سعدیہ کا خیال تھا کہ داؤد اسے دیکھتے ہی گھبرا کر کھڑا ہو جائے گا اور خیریت پوچھے گا لیکن اس نے سرد مہری سے کام لیا تو سعدیہ کے دل کو چوٹ لگی۔ وہ داؤد کے قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ داؤد نے بے رخی سے پوچھا۔ ''سعدیہ! خیریت تو ہے، کیسے آنا ہوا؟''

سعدیہ بپھری ہوئی تھی، بولی۔ ''یہ مجھے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے آخر؟''

داؤد نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیسی سزا..... کون دے رہا ہے تمہیں سزا؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''اتنی بڑی حویلی میں، میں تنہا نہیں رہ سکتی۔''

داؤد نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''تو تم تنہا ہو کب اتنی بڑی حویلی میں؟''

سعدیہ نے بگڑ کر کہا۔ ''میں بالکل تنہا ہوں، میرے کمرے میں ان دو بچوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں اور میرے کمرے کے آس پاس دور دور تک خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ تو ہے اور میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ یہ کر سکتے ہیں کہ مجھے بھی نرجس اور کیفیہ کے پاس بھیج دیجیے۔''

''لیکن میں تو وہی کروں گا جو نظام تمہارے بارے میں لکھے گا۔ اس نے تمہاری بابت یہی لکھا تھا کہ تمہیں حویلی میں روکے رکھوں چنانچہ میں اس پر عمل کر رہا ہوں۔''

سعدیہ نے بلبلا کر کہا۔ ''لیکن میں تو احساس تنہائی اور خوف سے مر جاؤں گی۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس کا علاج البتہ ہے میرے پاس اگر تم پسند کرو تو یہاں میرے کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں منتقل ہو جاؤ۔ اس طرح احساس تنہائی بھی دور ہو جائے گا اور خوف بھی مٹ جائے گا۔''

سعدیہ نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''میں ایک شرط پر آپ کے قریب آسکتی ہوں۔''

''کون سی شرط؟ کیسی شرط؟''

''یہ کہ آپ مجھے پریشان نہیں کریں گے۔''

''یہ عجیب شرط ہے تمہاری۔ میں نے تمہیں کتنی بار

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

تنگ کیا ہے آخر؟''

سعدیہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''تنگ تو ایک بار بھی نہیں کیا لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں خدشہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔''

داؤد نے طنزاً کہا۔ ''خدشہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں۔''

سعدیہ نے پوچھا۔ ''آپ کس قسم کا خدشہ محسوس کرتے ہیں؟''

''یہی کہ میرے قریب آکر کہیں تم مجھے تنگ نہ کرنے لگو۔''

سعدیہ کو ہنسی آگئی۔ ''یعنی میں آپ کو تنگ کروں گی .....یعنی میں اور آپ کو؟''

داؤد بھی ہنس دیا، بولا۔ ''کیوں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''آپ نے تو باتوں کا مزہ ہی کرکرا کر دیا۔ میں آپ کو تنگ کروں گی، یہ عجیب بات کہی آپ نے؟''

''اور میں تم کو تنگ کروں گا۔ میری بات سے زیادہ عجیب یہ بات ہے۔''

''تب پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں اپنا کمرا چھوڑ کر آپ کے ملحقہ کمرے میں چلی آؤں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''بس یہی ایک حل ہے تمہاری تنہائی کے احساس اور خوف کو دور کرنے کا۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''میں آج ہی برابر والے کمرے میں چلی آؤں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''آج ہی نہیں، اسی وقت ابھی..... آخر دیر کس بات کی؟''

سعدیہ نے درخواست کی۔ ''تب پھر دو ایک خدمت گار میرے ساتھ کر دیجیے تاکہ میں اپنا سامان یہاں لے آؤں۔''

داؤد نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یہ کام کر دوں گا، ابھی لو۔''

داؤد باہر گیا اور دو خدمت گاروں کو بلا لیا۔ انہیں حکم دیا کہ سعدیہ اور دونوں بچوں کا سامان ملحقہ کمرے میں لے آیا جائے۔ حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور ذرا سی دیر میں سعدیہ برابر والے کمرے میں آگئی۔ خدمت گاروں کے چلے جانے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے داؤد سعدیہ کے پاس گیا اور پوچھا۔ ''سعدیہ! کہو کیا حال ہے؟ اب تو خوش ہو، ڈر خوف تو نہیں لگ رہا؟''

سعدیہ نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ ''شاید اس کمرے میں، میں خوش رہوں گی۔ یہاں ڈر نہیں لگے گا۔''

داؤد نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''چلو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے یاد کر لینا۔''

سعدیہ نے داؤد کو جاتے ہوئے دیکھا اور اس کے چلے جانے کے بعد کمرے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

داؤد کو نظام اور فیروز بخت کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ رات کے سناٹے میں انتظار کی شدت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تھی۔ اس کو رہ رہ کر خیال ستا رہا تھا۔ اسے نظام پر غصہ بھی بہت آرہا تھا اور بار بار جی میں یہی آرہا تھا کہ نظام جیسے ہی سامنے آئے اس کو ذلیل و خوار کر کے نکال باہر کیا جائے۔ ابھی وہ ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سعدیہ کے کمرے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ سعدیہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ داؤد بے چینی سے اٹھا اور سعدیہ کا دروازہ تھپتھپانے لگا۔ کافی دیر بعد اندر سے سعدیہ کی آواز آئی۔

''کون ہے؟ کیا بات ہے؟''

داؤد نے کہا۔ ''دروازہ کھولو، کیا بات ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟''

سعدیہ نے دروازہ کھول دیا اور اپنے پلنگ پر کنارے دبک گئی۔

داؤد نے کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''سعدیہ! بات کیا تھی؟ تم رو کیوں رہی تھیں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی بابت بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیان کروں یا نہ کروں؟''

داؤد نے کہا۔ ''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، اپنا خواب بیان کرو۔''

سعدیہ نے داؤد کو کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کی درخواست کی۔ داؤد، سعدیہ کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور کہا۔ ''ہاں تو وہ خواب بیان کرو جو ابھی ابھی تم دیکھ چکی ہو۔''

سعدیہ نے رک رک کر کہا۔ ''میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی عورت آپ کے کھانے میں زہر ملا رہی ہے اور وہ زہر آلود کھانا آپ نے کھا لیا تو آپ کی حالت غیر ہونے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لگی۔ آپ چکرا کر ڈھیر ہوگئے اور میں نے آپ کو سہارا دے کر اٹھایا تو خود بھی لڑھک گئی۔ اس کے بعد میں نے کئی عورتوں کو بلا کر دریافت کیا کہ یہ معاملہ کیا ہے تو ان میں سے ایک عورت نے جواب دیا کہ بکواس بند کرو ہماری جو سمجھ میں آئے گا وہ کریں گے۔''

سعدیہ چپ ہوگئی، داؤد نے پوچھا۔ ''بس یا کچھ اور؟''

''بس اتنا ہی دیکھا خواب میں نے۔''

داؤد ہنسا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو میری بابت بہت کچھ سوچتی رہی ہے۔''

سعدیہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کی بابت کیوں سوچنے لگی؟''

داؤد نے سوئے ہوئے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نیند ہو تو ایسی ہو کہ تمہاری چیخ پکار سے بھی بچوں کی آنکھ نہیں کھلی۔''

سعدیہ چپ رہی۔ داؤد نے کہا۔ ''کیا تم اپنے خواب کی تعبیر جاننا چاہتی ہو؟''

سعدیہ نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس کی تعبیر بتا سکیں گے؟''

''کیوں نہیں، بتا کیوں نہیں سکوں گا۔''

''تب پھر بتائیے۔''

داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں نہیں، بچے جاگ جائیں گے۔ میرے کمرے میں چلو، وہاں تعبیر بتاؤں گا۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''نہیں، میں آپ کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ جو کچھ بتانا ہے یہیں بتا دیجیے۔''

داؤد نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔ ''سعدیہ! اتنی بے اعتباری بھی کس کام کی؟''

سعدیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''بے اعتباری کی بات نہیں، میں تو احتیاط کر رہی ہوں۔''

داؤد نے سختی سے کہا۔ ''کیسی احتیاط، کہاں کی احتیاط؟ تم میرے کمرے میں آؤ یا میں تمہارے کمرے میں چلا آؤں، بات ایک ہی ہے۔''

سعدیہ کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''بس ذرا سی دیر کے لیے آپ کے کمرے میں چل سکتی ہوں۔ چلیے، میں چلتی ہوں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''یہ ذرا سی دیر کے لیے بھی کیوں؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''آپ میری بات کا برا مان گئے شاید بے اعتباری ہمارے درمیان اس لیے موجود ہے کہ لوگوں کی زبان سے ڈر لگتا ہے۔''

''یہ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم یہاں کون لوگ ہیں جن سے تم خوف زدہ ہو؟''

سعدیہ، داؤد کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی، بولی۔ ''چلیے چلتی ہوں لیکن تعبیر ذرا جلدی بتا دیجیے گا تاکہ میں فوراً واپس آجاؤں۔''

داؤد اور سعدیہ ایک ساتھ باہر نکلے اور ایک ساتھ ہی داؤد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ داؤد نے اپنی مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں مسہری پر بیٹھ جاؤ۔''

سعدیہ نے پوچھا۔ ''اور آپ کہاں بیٹھیں گے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں تپائی پر بیٹھ جاؤں گا۔''

اور وہ فوراً ہی تپائی پر بیٹھ گیا۔ سعدیہ مسہری پر بیٹھ گئی۔ اپنی عزت افزائی پر وہ بے حد خوش تھی۔

سعدیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب کہیے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اچھا تو سنو اور میری باتوں پر غور کرو۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''ارشاد، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''تو سنو، تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ آدمی کی فطرت ہے کہ اس کو جس کام سے روکا جاتا ہے، وہ وہی کرتا ہے۔ آدم کو خدا نے منع کیا تھا کہ گندم کے قریب مت جانا لیکن آدم نے اس حکم کے خلاف کیا اور یہ گناہ کر کے چھوڑا۔''

سعدیہ پریشان تھی کہ داؤد کہنا کیا چاہتا ہے، بولی۔ ''ہاں یہ بات تو ہے لیکن اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اگر میں اپنا مطلب کسی تمہید کے بغیر بیان کروں تو شاید تم ناراض ہو جاؤ گی؟''

سعدیہ نے اطمینان دلایا۔ ''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں گی۔ آپ کو جو کہنا ہے فوراً کہہ ڈالیے۔''

داؤد نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ نرجس اور کیفیہ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''جانتی ہوں۔ وہ دونوں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

داؤد نے کہا۔ ''اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو یہ بات بھی جانتی ہوگی کہ میں اس معاملے میں کس حد تک سنجیدہ ہوں۔''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''شاید آپ ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔''

''بے شک، بے شک۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا۔ میں ان سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ وہ دونوں میرے معیار پر پوری نہیں اتریں۔''

سعدیہ خاموش ہوگئی، داؤد نے کچھ دیر تو سعدیہ کے بولنے کا انتظار کیا پھر بولا۔ ''اور سعدیہ! تم ایک بات

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksstube.net/
http://www.urdutube.net/

تو بتاؤ مجھے۔''

''پوچھیے، ایک بات تو کیا، دس باتیں بتاؤں گی۔''

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اسے تو میں نے کبھی دیکھا تک نہیں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔''اگر میں آپ کے سوال کا جواب نہ دوں تو؟''

''تو یہ کہ تم نے مجھے تنگ کرنے سے منع کیا ہے لیکن میں تمہیں تنگ کرنا شروع کردوں گا۔''

سعدیہ کھڑی ہوگئی۔''تو یہ ارادے ہیں آپ کے۔ اب میں بھی آپ کی باتوں کا اصل مطلب۔''

''اگر میری باتوں کا مطلب تمہاری سمجھ میں آگیا تو جلدی سمجھ میں آگیا۔ ہاں تو میں تم سے یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اس کی کچھ خیر خبر ہے یا نہیں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔''میرا شوہر بھی آپ ہی کی طرح کے ایک تاجر کا گماشتہ ہے اور عرصے سے پردیس گیا ہوا ہے۔''

''میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ زندہ بھی ہے یا غربت ہی میں کہیں مرکھپ گیا۔''

''نہیں، وہ زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن واپس ضرور آئے گا مگر آپ یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''سعدیہ! میں زیادہ ہیر پھیر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ذرا دیر رک کر اس نے سعدیہ کے تاثرات کا اس کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

سعدیہ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھی لیکن داؤد نے دروازے کو اندر سے مقفل کر رکھا تھا۔ سعدیہ تالا دیکھ کر غصے میں داؤد کی طرف مڑی اور سختی سے داؤد کو حکم دیا۔''تالا کھول دیجیے ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔''

داؤد نے سمجھایا۔''دیکھو سعدیہ! جذبات سے کام نہ لو اور میری پیشکش پر اچھی طرح غور کرلو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہوگا کہ میری بات مانو یا نہ مانو۔'' اور پھر اس کی پروا کیے بغیر کہ سعدیہ اس کی بات سن بھی رہی ہے یا نہیں وہ بولتا رہا۔''میں تم سے شادی کرکے مہر معجل کے پچاس ہزار فوراً ہی دے دوں گا۔ اس کے علاوہ اپنا پورا کاروبار اور املاک بھی نصف تمہیں دے دوں گا۔''

سعدیہ بھی پھسل گئی، متذبذب لہجے میں بولی۔''یہ کیسی پیشکش فرما رہے ہیں آپ؟ شاید آپ کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ میں بڑی مستغنی عورت ہوں، میں حریص یا طامع ہرگز نہیں۔''

داؤد نے جواب دیا۔''ہائے سعدیہ! یہ تم کس چکر میں پڑی ہوئی ہو۔ حریص اور طامع ہونا کوئی بری بات تو نہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں تمہیں خوش وخرم دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک شادی شدہ عورت اسی وقت خوش رہ سکتی ہے جب اس کا شوہر اس کے پاس ہو اور اللہ نے مال وزر سے بھی نواز رکھا ہو۔''

یہ کہتے کہتے داؤد نے سعدیہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔''ذرا دیر بیٹھو تو سہی، بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے؟''

سعدیہ نے کہا۔''لیکن میں شادی شدہ عورت ہوں۔''

''مت گھبراؤ سعدیہ، مت گھبراؤ..... کوئی پروا نہیں۔''

''میرے اللہ، آپ کس قسم کے انسان ہیں آخر؟''

داؤد نے کہا۔''میں تاجر ہوں، زندگی کے جملہ معاملات پر تاجرانہ نظریں رکھتا ہوں۔'' اب سعدیہ بالکل بے بس ہوچکی تھی۔

کافی دیر بعد مضمحل سعدیہ نے داؤد سے شوخ لہجے میں کہا۔''اور جناب کمال تو یہ ہے کہ آپ نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنے نفس پر قابو نہیں ہے تو شادی ضرور کرلیجیے۔ اب تجرد آپ کے بس کا نہیں رہا۔''

داؤد نے جواب دیا۔''اپنے شوہر سے طلاق لے لو، اس کے بعد اپنے تجرد کا کوئی مستقل علاج بھی تلاش کرلوں گا۔''

سعدیہ نے اوپری دل سے جو کچھ بھی کہا، وہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ جس ماحول میں آدمی پلتا بڑھتا اور زندہ رہتا ہے، اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ داؤد کی بے کیفی اور اس کے ردعمل سے اچھی طرح واقف تھی چنانچہ سعدیہ نے اس رات کے بعد داؤد سے تعاون کرنا شروع کردیا اور نرجس اور کیفیہ کی طرح شادی کی آس لگا بیٹھی۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد داؤد نے نرجس اور کیفیہ کو حویلی میں واپس بلالیا۔ اب تینوں اس امید میں تھیں کہ داؤد ان سے شادی کرلے گا اور وہ ملک التجار کی بیوی بن کر عیش کریں گی۔ یہ داؤد کا کمال تھا۔ اس نے ان تینوں کو الگ الگ کچھ اس طرح یقین دلایا تھا کہ ہر ایک کو اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ داؤد اس سے شادی کرے گا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

پچیس چھبیس دن کے بعد نظام اور فیروز بخت بھی احمد آباد پہنچ گئے۔ فیروز بخت کا خیال تھا کہ احمد آباد پہنچتے ہی نظام کی خبر لے لی جائے گی لیکن داؤد نے خوش اخلاقی سے نظام کو خوش آمدید کہا۔ فیروز بخت کو حویلی میں چھوڑا اور نظام کو فوراً ہی دوسری حویلی میں لے گیا اور اس کی سورت بندر کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ چند گھنٹے بعد اس نے نظام کو اپنے دو منشیوں کے حوالے کر دیا اور خود حویلی میں واپس آ گیا۔ یہاں فیروز بخت سے اس کی روداد سنی۔ اس نے بڑی آزردگی اور افسوس سے نظام کے ظالمانہ سلوک کی داستان سنا ڈالی۔ فیروز بخت کو یقین تھا کہ اس کی داستان کا داؤد پر اثر ضرور ہوگا لیکن داؤد نے یہ کہہ کر فیروز بخت کو بہت مایوس کیا کہ سورت میں اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، بہت ضروری تھا کیونکہ فیروز بخت کو ایک نہ ایک دن ملک التجار بننا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر قسم کے تجربوں سے گزار دیا جائے۔

اس کے بعد داؤد کیفیہ، سعدیہ اور نرجس کے پاس پہنچا اور انہیں نظام کے آ جانے کی خبر سنائی۔ اس خبر سے سعدیہ اور کیفیہ تو بہت خوش ہوئیں لیکن نرجس فکر و تردد میں پڑ گئی۔ یہاں داؤد نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے تینوں کو الگ الگ یہ درس دیا کہ خبردار جو نظام کو داؤد کی حرکات کے بارے میں کچھ بتایا۔ اس نے تینوں سے یہی کہا کہ وہ ان سے شادی ضرور کرے گا لیکن نہایت عزت اور وقار کے ساتھ۔ سعدیہ اور کیفیہ سے بات کرنے کے بعد داؤد [illegible] سب سے آخر میں اس نے نرجس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''نرجس! تیرا بھائی نظام آ چکا ہے، اب بتا تیرا کیا منصوبہ ہے؟''

نرجس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ''میرا کوئی منصوبہ نہیں۔ منصوبہ تو آپ کا ہوگا اور آپ مجھے اپنے منصوبے سے مطلع کریں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں اپنا پیغام دوں اور نظام کو مجبور کر دوں کہ وہ تمہاری شادی مجھ سے کر دے۔''

نرجس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری، بولی۔ ''آپ مجھ سے اتنا سنگین مذاق کیوں کر رہے ہیں؟''

داؤد نے حیرت سے کہا۔ ''میں مذاق کر رہا ہوں تم سے؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''ہاں، آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں، سنگین مذاق..... میں اتنی نادان اور کم عقل بھی نہیں کہ آپ کی بات ہی نہ سمجھ سکوں۔''

داؤد نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔ ''یعنی تمہارے خیال میں، میں تم سے فریب کر رہا ہوں؟''

''بالکل، صد فی صد فریب۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''اور اگر میں نے تم سے شادی کر لی تو کیا کرو گی تم؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''سو رکعت نماز شکرانہ ادا کروں گی اور کیا کروں گی۔''

داؤد نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''تب پھر نماز شکرانہ کی تیاری کرو کیونکہ میں تم سے شادی کر کے ہی رہوں گا۔''

اب داؤد کو نظام کا انتظار تھا۔ وہ مغرب کے بعد حویلی میں داخل ہوا۔ داؤد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ فیروز بخت کو نظام سے چند قدم دور لے گیا اور سمجھایا۔ ''فیروز بخت! اب تو نظام کی شکایتیں نہیں کرے گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ نظام میری کسی بات سے ناراض ہو کر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں کسی کو بھی ناراض نہیں کر سکتا، آپ مطمئن رہیں۔''

نظام نے کچھ دیر تو داؤد سے باتیں کیں، اس کے بعد نرجس، سعدیہ اور کیفیہ کے پاس جانے لگا تو داؤد نے اسے روک لیا اور کہا۔ ''نظام! جب تم اپنی بہنوں سے باتیں کر چکو تو چند باتیں مجھ سے بھی کر لینا۔''

نظام نے کہا۔ ''میں آپ سے باتیں ضرور کروں گا لیکن آپ سردست مجھے یہ بتائیں کہ لڑکیوں نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟''

داؤد نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کیا لیکن ان کی وجہ سے میں واقعی پریشان ہو گیا ہوں۔''

نظام نے بے چینی سے کہا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے آج تک سعدیہ اور کیفیہ کو خوش نہیں دیکھا اور نہ ان دونوں کے شوہروں کو دیکھا کہ ایک آدھ بار آ کر اپنی شکل ہی دکھا جاتے لیکن دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں دیکھا..... معلوم نہیں کیوں؟''

نظام نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں آپ کا غم سمجھ گیا۔ میرے آقا میں بھی اس بات سے ذرا خوش نہیں کہ شادیاں تو دونوں ہی کی کر دیں لیکن دونوں ہی بیوگی جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

نظام نے خوش ہوکر پوچھا۔ ''وہ حل مجھے بھی بتایئے تاکہ میں ان دونوں کو کرب واذیت سے نجات دلادوں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تم ان دونوں کو طلاق دلوادو۔''

نظام چونک پڑا۔ ''میں انہیں طلاق دلوا دوں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

داؤد نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ طلاق کے بعد میں ان دونوں کی شادیاں ایسی جگہ کروادوں گا کہ دونوں تاحیات مزے کریں گی، عیش کریں گی۔''

نظام نے کہا۔ ''اچھا، پہلے میں اپنی بہنوں سے مل لوں اس کے بعد اس موضوع پر آپ سے اطمینان سے باتیں کروں گا۔''

داؤد نے بھی اجازت دے دی۔ ''اچھا جاؤ، پہلے اپنی بہنوں سے باتیں کرآؤ، بقیہ باتیں بعد میں ہوجائیں گی۔''

نظام کے اندر جاتے ہی داؤد نے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرلی۔ وہ اس کے لیے پوری طرح تیار تھا کہ اگر نظام اندر سے مشتعل نکلا تو اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ اس نے اپنے تین طاقتور کارندوں کو اپنے کمرے میں چھپادیا اور انہیں ہدایت کردی کہ وہ جیسے ہی تالی کی آواز سنیں، باہر نکل آئیں اور داؤد جس کی طرف اشارہ کرے، بے خوف وخطر اس کا کام تمام کردیں۔ اس نے فیروز بخت کو اپنی کاروباری حویلی روانہ کردیا اور کہا۔ ''تجھے چند راتیں وہیں گزارنا ہوں گی۔''

داؤد نے کئی گھنٹے بڑی بے چینی میں گزارے۔ نظام کا کہیں پتا نہ تھا۔ آخر نصف شب کو وہ آیا اور داؤد سے کہا۔ ''میرے آقا! اب آرام کریں، میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یوں مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوگئی ہیں اور میں ان سب پر صبح تفصیلی بات کروں گا۔''

داؤد نے بھی اسے نہیں روکا اور یوں محسوس کیا گویا نظام اسے دھمکی دے گیا ہے۔ اس نے اپنے کارندوں کو دروازے کے قریب بلایا اور انہیں ہدایت کردی کہ رات بھر جاگتے رہیں اور جو شخص بھی چوری چھپے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے اسے ہلاک کردیا جائے۔

صبح نظام نے کارندوں سے کہا۔ ''مالک کو جگا دیا جائے تاکہ میں ان سے چند ضروری باتیں کرلوں۔''

جب داؤد کو جگایا گیا تو وہ بڑا بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نظام نے غصے میں آکر حملہ کردیا ہے اور اس کے تینوں کارندے اسے نظام کے رحم وکرم پر چھوڑ کر فرار ہوگئے ہیں۔ خوف سے داؤد کی چیخ نکل گئی اور جب آنکھ کھلی تو تینوں کارندوں کو اپنے پاس کھڑے دیکھ کر خوف سے دریافت کیا۔ ''نظام کہاں گیا؟''

نظام اپنا نام سن کر سامنے پہنچ گیا اور بولا۔ ''میں حاضر ہوں۔''

داؤد نے نیم مدہوشی میں حکم دیا۔ ''نظام کو مارو، یہ جانے نہ پائے۔''

تینوں کارندے اس حکم پر آپس میں صورتیں دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں داؤد پوری طرح ہوش میں آچکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ شرمندہ سا ہوگیا اور لاحول پڑھتے ہوئے بولا۔ ''توبہ توبہ کیسا بھیانک خواب دیکھا ہے میں نے۔''

اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا، ناشتا کیا اور ناشتے میں نظام کو بھی شریک کرلیا۔ وہ داخلی طور پر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح نظام کے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگالے لیکن ناکام رہا۔ وہ حسب معمول غیر جذباتی اور عام دنوں جیسا تھا۔ داؤد کے تینوں کارندے اب بھی قریب ہی موجود تھے۔ نظام نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے انہیں کیوں روک رکھا ہے؟''

داؤد کا دل دھڑکنے لگا، بولا۔ ''ان سے مجھے چند ضروری کام لینا ہیں بس اسی لیے انہیں روک رکھا ہے۔''

نظام نے کسی پس وپیش سے کہا۔ ''اس وقت میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، ضروری اور نہایت نازک جنہیں میں ان کارندوں کی موجودگی میں نہیں کروں گا۔''

داؤد خطرے کی بو محسوس کیے جارہا تھا، بولا۔ ''لیکن یہ کارندے یہاں موجود رہیں گے۔ تاہم تم اگر پسند کرو تو اپنی ضروری اور نازک باتیں سرگوشی میں کرسکتے ہو کیونکہ تینوں کارندے ہم سے اتنی دور ضرور ہیں کہ وہ ہماری سرگوشی نہ سن سکیں۔''

نظام نے آہستہ سے کہا۔ ''بہتر ہے، مجھے آپ کی یہ تجویز منظور ہے۔'' پھر ایک لمحے کے لیے داؤد کو ذرا غور سے دیکھ کر سر جھکالیا، بولا۔ ''میرے آقا! رات کو جب میں اپنی بہنوں سے ملا تو ان تینوں سے عجیب وغریب باتیں معلوم ہوئیں اور میں ذہنی طور پر اتنا پریشان ہوگیا کہ رات بھر سو بھی نہیں سکا۔ افسوس کہ اگر مجھے ان باتوں کا پہلے ہی سے ذرا سا بھی اندازہ ہوجاتا تو ان تینوں کو اس حویلی میں نہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لاتا اور اگر حویلی میں لایا بھی تھا تو میں انہیں یہاں چھوڑ کر سورت نہ جاتا لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کا تدارک کس طرح ہو۔ بس اس پر غور کرنا ہے اور کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہے۔''

داؤد شرم اور ندامت سے گڑا جا رہا تھا، اسے حیرت تھی کہ سب کچھ جان لینے کے بعد نظام مشتعل کیوں نہیں ہوا۔ اسے غصہ کیوں نہیں آ رہا؟ مردہ سی آواز میں پوچھا۔ ''کیا..... ہوا کیا؟ آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میری عدم موجودگی میں آپ نے معلوم نہیں کون سا جادو کر دیا ہے کہ تینوں ہی آپ کے حسن سلوک اور لطف و کرم کے قصیدے پڑھ رہی ہیں۔ تینوں آپ کی تعریف و توصیف میں ہر ایک پر سبقت لے جانا چاہتی ہیں۔''

داؤد کی جان میں جان آئی لیکن پوری بات سنے بغیر خاموش رہا۔ نظام کہتا رہا۔ ''اور میں سب سے زیادہ پریشان اس بات سے ہوا کہ سعدیہ اور کیفیہ اپنے شوہروں سے خلع لینے پر مصر ہیں۔ وہ آپ سے والہانہ عشق کرنے لگی ہیں۔''

یہ کہتے کہتے نظام شرمندہ ہو گیا اور نظریں جھکا لیں۔

''ابھی ابھی میں نے جو کچھ کہا، مجھے اندازہ ہے کہ مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن سعدیہ اور کیفیہ کی باتوں میں سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ میں نے ہر طرح سے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپ شادی نہیں کریں گے۔ آپ نے تا زندگی مجرد رہنے کا عہد کر رکھا ہے لیکن وہ نہیں مانتیں۔''

داؤد اپنی قسمت اور مردانہ وجاہت اور دلکشی پر ناز کرنے لگا، بولا۔ ''نظام! بالفرض محال اگر میں تمہاری بہنوں کے جذبات کا پاس کروں بھی اور اپنے عہد تجرد کو توڑنے پر مائل بھی ہو جاؤں گا تو شرعاً میں کسی ایک ہی بہن سے شادی کر سکتا ہوں۔''

نظام نے کسی قدر پرمسرت لہجے میں کہا۔ ''آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن جب آپ نے ہمیشہ مجرد رہنے کا عہد ہی کر لیا ہے تو شرع اور فقہ کا ذکر ہی فضول ہے۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''اگر میرا سوال گراں نہ گزرے تو میں تجھ سے کچھ معلوم کروں؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''آپ کے حسن اخلاق اور جود و سخا کا جو نقشہ میری بہنوں نے کھینچا ہے، اس کے بعد اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ کی کسی بات کا برا مانوں۔ آپ مجھ سے دس سوال کیجیے، میں خندہ پیشانی سے ان کے جواب دوں گا۔''

داؤد نے کہا۔ ''نظام! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی تیری بہنوں کی شرافت اور طور طریقوں نے بہت متاثر کیا ہے اور جب میں ان کی شرافت، اور نیک نفسی کو دیکھتے ہوئے ان کی المناک زندگی پر غور کرتا ہوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ تو نے سعدیہ اور کیفیہ کی شادیاں کر دیں لیکن بدقسمتی سے دونوں کے شوہر ان سے دور کہیں پردیس میں ہیں۔ آخر اس شادی کا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہوتا نرجس کی طرح وہ بھی غیر شادی شدہ رہتیں۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''آپ جو کچھ فرما رہے ہیں حرف بہ حرف درست ہے لیکن آپ، چونکہ میرے خاندانی پس منظر سے واقف نہیں ہیں اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی تک تو میری یہی کوشش تھی کہ میں اپنے گھر کی باتیں آپ کے علم میں نہ لاؤں لیکن اب ان کا چھپانا فضول ہے۔''

داؤد ہمہ تن گوش حیرت سے نظام کی باتیں سن رہا تھا۔ نظام سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں چنانچہ کچھ دیر بعد جب سر اوپر اٹھایا اور داؤد کی طرف دیکھا تو اس کی دونوں آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور چہرے پر اندوہ و ملال کے سائے موجود تھے۔

داؤد نے از راہ ہمدردی کہا۔ ''نظام! میں چاہتا ہوں کہ تو اپنی ہر بات مجھے بتا دے۔ میں دل کا بوجھ اتارنے کی کوشش کروں گا۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں زبان کھولنے سے پہلے اس لیے پریشان ہو رہا ہوں کہ میں نے اپنی بہنوں کے متعلق آپ کو جو کچھ بتا رکھا ہے اس میں کسی قدر دروغ بھی شامل ہے۔ لیکن اب میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گا وہ سب کچھ سچ ہوگا اور اس سچ کی وجہ سے میرے پچھلے جھوٹ سے میری حیثیت پر کیا اثر پڑے گا، میں نہیں جانتا۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ میری نظر میں تیری وقعت پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گی۔''

نظام نے کہا۔ ''یہ آپ کی عظمت ہے۔ بہرحال میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تجھے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تجھے تیری بہنوں سمیت شریف سمجھتا ہوں۔''

نظام نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔ ''میرے آقا! بات دراصل یہ ہے کہ میرے باپ کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے سات شادیاں کیں۔ تین بیویوں کا تو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM

SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو

3 Plus SHAMPOO | SHIKAKAI | ANTI DANDRUFF | AMLA | HERBAL | ANTI-LICE | EGG | KALONJI

http://www.bookstube.net

http://www.urdutube.net

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

انتقال ہوگیا۔ ان کی اولادیں بھی زندہ نہیں ہیں۔ بقیہ چار شادیاں جوانہوں نے کیں تو ان میں سے تین بیوہ تھیں اور ان تینوں سے تین اولادیں بھی تھیں۔ نرجس، سعدیہ اور کیفیہ۔ ان کے باپ بھی الگ الگ تھے اور میری سوتیلی مائیں انہیں اپنے ساتھ لے کر میرے گھر میں آئی تھیں۔ میں اپنے باپ کی چوتھی بیوی سے ہوں اور میں اپنے باپ کی سات بیویوں سے ایک کی تنہا اولاد ہوں لیکن میرے باپ نے اپنی سوتیلی اولاد کا اسی طرح خیال رکھا جس طرح میرا رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد میں نے بھی سوتیلی بہنوں کا حقیقی بہنوں کی طرح خیال رکھا اور کیفیہ اور سعدیہ کی شادیاں بھی کردیں۔ نرجس شادی کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے اس کی شادی نہیں ہوئی۔ یہ میری اور میری دونوں بہنوں کی بدقسمتی کہ دونوں کو ایسے شوہر ملے کہ کچھ عرصہ ساتھ رہ کر تلاش معاش میں ادھر ادھر نکل گئے اور پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ ہی میں خود بھی ان دونوں کی مفقود الخبری سے سخت پریشان ہوں اور ان کی خاموشی سے دو نتیجے اخذ کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یا تو ان دونوں کا غربت میں انتقال ہوگیا ہے اور اگر انتقال نہیں ہوا تو یہ دونوں کہیں دوسری شادیاں کرچکے ہیں اور اپنے بال بچوں میں مگن زندگی گزار رہے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے وہ رو دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں مزید کہا۔ ''میری تو یہ دعا ہے کہ وہ دونوں جہاں کہیں بھی ہوں خوش ہوں اور خدا انہیں ہدایت دے کہ یا تو میری بہنوں کو طلاق دے دیں اور اگر طلاق نہیں دیتے تو خود واپس آجائیں۔''

داؤد ان انکشافات سے بہت خوش ہوا، پوچھا۔ ''وہ دونوں گھر سے ایک ساتھ نکلے تھے؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''ہاں دونوں فکر معاش میں ایک ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔ مجھے ایک بزرگ نے ایک وظیفہ بتایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر اس وظیفے کو ایک ہفتہ پڑھا جائے تو انہی سات دنوں کے اندر ہی مفقود الخبر یا تو واپس آجائے گا ورنہ اس کی اطلاع ضرور مل جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو میں پرسوں اس وظیفے کو شروع کروں گا۔''

داؤد نے زور دیا۔ ''اس وظیفے کو فوراً شروع کردے اور پرسوں کا مت انتظار کر۔ اگر دونوں کو گلوخلاصی حاصل ہوجائے تو میں ان کی بابت کچھ غور کروں۔''

نظام نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''میرے آقا! یہ بات ہے تو بڑی بے شرمی کی لیکن واقعے سے روگردانی بھی ممکن نہیں۔ میری تینوں بہنیں آپ پر بری طرح والہ وشیدا ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''انہیں تم مت سمجھانا۔ میں خود سمجھالوں گا، بشرطیکہ تم مجھے اس کی اجازت دے دو۔''

نظام نے بڑی انکساری سے کہا۔ ''آپ محسن ہیں، ہمارے آقا ہیں۔ آپ جب، اور جس طرح چاہیں انہیں سمجھالیں۔ میں ان کے معاملات کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں تو کل ہی سے اعتکاف میں بیٹھ جاؤں گا اور ٹھیک ساتویں دن اعتکاف سے باہر نکلوں گا اور اپنے وظیفے کا اثر دیکھوں گا۔''

لیکن داؤد نے اسے مجبور کردیا کہ وہ اسی وقت سے اعتکاف میں بیٹھ جائے اور داؤد سات دن تک اس کی ضروریات زندگی اعتکاف کی کوٹھری میں بھیجتا رہے گا۔

نظام نے اس کا حکم مان لیا۔ حویلی کے بیرونی حصے کی ایک کوٹھری میں نظام کو معتکف کردیا گیا۔ اعتکاف کے لیے بیرونی حصے کا انتخاب یوں عمل میں آیا کہ اس طرح داؤد کو آزادی مل گئی تھی اور وہ بے دھڑک کسی روک ٹوک کے بغیر نرجس، کیفیہ اور سعدیہ سے مل کر حظ نفس اٹھا سکتا تھا۔

☆☆☆

نظام اعتکاف میں بیٹھ گیا اور داؤد نے ایک خدمت گار کو اس پر متعین کردیا کہ وہ نظام کی ضروریات کا خیال رکھے۔ خود داؤد عجیب ہی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ نظام کی زبانی معاملات جس طرح کھل کر سامنے آگئے تھے، ان کی روشنی میں وہ تینوں سے، شادی کرسکتا تھا لیکن اسے کیفیہ زیادہ پسند تھی۔ کیفیہ کے بعد سعدیہ اور سعدیہ کے بعد نرجس۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے ان تینوں میں سے جسے بھی نظر انداز کیا، وہی ایک ہنگامہ کھڑا کردے گی اور اگر وہ کسی طرح تینوں سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجائے تو کیا نظام بھی اس بات کو گوارا کرلے گا؟ شاید نہیں..... پھر وہ کس سے شادی کرے؟ یہ بڑا پریشان کن سوال تھا۔

اس نے باری باری تینوں سے ملاقات کی اور سوال وجواب سے انہیں ٹٹولا تو پتا چلا کہ تینوں ہی کسی کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یہاں یہ معاملات زیر بحث تھے اور دوسری طرف فیروز بخت کو کاروباری حویلی میں روک دیا گیا تھا تاکہ اسے ان باتوں کا علم نہ ہو۔ فیروز بخت کو اس بات کا دکھ تھا کہ جس نظام نے سورت بندر میں اس سے انتہائی ناروا اور اذیت ناک سلوک روا رکھا تھا، وہ تو داؤد کے ساتھ حویلی میں مزے کررہا تھا اور فیروز بخت جو مظلوم تھا، کاروباری حویلی میں منشیوں اور کارندوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ داؤد ہر روز صبح کاروباری حویلی میں آدھے دن کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

لیے پہنچ جاتا اور فیروز بخت کو تسلیاں دے کر واپس آجاتا۔ آخر ایک دن فیروز بخت نے پوچھ لیا۔ ''مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''بس چند ماہ اور کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تو کاروباری معاملات کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ تجھے میرے بعد کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔''

لیکن فیروز بخت اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

داؤد کاروباری حویلی سے اٹھ کر جیسے ہی اپنی رہائشی حویلی میں داخل ہوا، کیفیہ اس کے پیچھے پیچھے آن موجود ہوئی اور اس نے سختی سے کہا۔ ''دیکھیے جناب! میں آپ کو متنبہ کرتی ہوں کہ اگر آپ نے مجھے دھوکا دیا تو میں آپ سے اپنی اہانت کا سخت ترین انتقام لوں گی۔ میں معاف نہیں کروں گی اور شادی کے بعد اس حویلی میں بھی نہیں رہوں گی۔ ایک کوٹھی الگ سے میرے نام کریں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں حویلی تیرے نام کردوں گا، تو مت پریشان ہو۔''

اس کے بعد اسی دن، رات لوگوں سے چھپتی چھپاتی سعدیہ بھی داؤد کے پاس پہنچ گئی اور کہا۔

''آپ کیفیہ سے شادی کر کے ایک حویلی اس کے نام کردیں گے۔ میں پوچھتی ہوں، میرا کیا بنے گا؟ میرے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟''

داؤد نے کہا۔ ''میں نے جب ایک بار تجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں تجھ سے شادی کروں گا تو، تو یہ مایوسی کی باتیں کیوں کررہی ہے؟ اور رہی حویلی کی بات تو میں ایک حویلی خرید کر تیرے نام کردوں گا۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''اگر آپ نے یہ سب نہ کیا اور مجھے دھوکا دیا تو یاد رہے کہ میں آپ کے خلاف ایک ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ آپ کا سب کچھ خاک میں مل جائے گا کیونکہ میں نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر میں محروم رہی تو ہر کوئی محروم رہے گا۔''

داؤد اس کی دھمکی سے چکرا گیا مگر پریشانی چھپاتے ہوئے بولا۔ ''تو مت پریشان ہو سعدیہ، میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔''

اس رات داؤد نے سعدیہ کو بڑی مشکل سے اپنے کمرے سے رخصت کیا۔ وہ سعدیہ کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ اس نے تینوں سے یکساں وعدے کر کے جو غلطیاں کی ہیں، اب ان سے عہدہ برآں کس طرح ہو؟ اس نے اپنے کاروبار کی پیچیدہ ترین گتھیاں چٹکیاں بجاتے سلجھالی تھیں لیکن یہ معاملہ اتنی پیچیدگی اختیار کر گیا تھا کہ کوئی حل سمجھ میں آتا ہی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

مرغان سحر نے صبح ہونے کا اعلان کیا اور مسجدوں سے الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کی سحر انگیز صدائیں گونجنے لگیں۔ داؤد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ وضو کے لیے کمرے سے نکلا تو نرجس مل گئی اور کہا کہ اسے داؤد [illegible]

داؤد نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔ ''لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت تو تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ کیونکہ میں نماز فجر ادا کرنے جارہا ہوں، واپسی میں باتیں بھی ہوجائیں گی۔''

نرجس نے کسی لچک کے بغیر کہا۔ ''نہیں، میں اپنے کمرے میں واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ نماز پڑھ آئیں، میں اسی کمرے میں آپ کو موجود ملوں گی۔''

داؤد نے سمجھایا کہ بدنامی ہوگی لیکن وہ نہ مانی۔ نرجس نے اکڑ کر جواب دیا۔ ''میں بدنامی اور رسوائی سے نہیں ڈرتی اور جب ہم دونوں میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ شادی کرلیں گے تو کیسی رسوائی اور کہاں کی بدنامی؟''

داؤد عاجز آگیا، بولا۔ ''اگر نظام نے تمہیں اس کمرے میں دیکھ لیا تو؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''اول تو بھائی نظام یہاں

معلومات

☆ قرآن پاک کی پہلی سورۃ کھجور کے پتوں پر لکھی گئی۔

☆ قرآن پاک میں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثؓ کا نام آیا ہے۔

☆ قرآن پاک میں سب سے کم حروف ظ ہے۔

☆ کلمۂ طیبہ میں کوئی نقطہ نہیں۔

☆ قرآن پاک میں لفظ اللہ 6701 بار ہے۔

☆ سورۂ فلق اور سورۂ الناس ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آنے سے رہے کیونکہ وہ اعتکاف میں ہیں۔ دوسرے اگر وہ یہاں آ بھی گئے تو میں ان سے بالکل خوفزدہ نہیں کیونکہ وہ ہم دونوں کے عہد و پیمان سے خوش ہی ہوں گے، ناراض نہیں ہوں گے۔''

داؤد نے جب یہ محسوس کیا کہ نرجس کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں تو مجبوراً نماز پڑھنے چلا گیا اور نرجس کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

داؤد نے فجر کی چار رکعت بڑی مشکل سے ادا کیں۔ واپس آ کر عاجزی سے پوچھا۔ ''اس طرح میرے انتظار کا مقصد؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''آپ نے کیفیہ اور سعدیہ سے جس قسم کے وعدے کر رکھے ہیں، ان سے میں خوفزدہ ہوگئی ہوں۔ کیا آپ اپنے شادی والے وعدے پر اب بھی قائم ہیں؟''

داؤد نے بڑی آسانی سے ہامی بھر لی۔ ''نرجس! تو کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ میں نے تجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے تو اسے ضرور پورا کروں گا۔ تو گھبرا کیوں رہی ہے؟''

نرجس نے ہنس کر طنز کیا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ ہم تینوں سے کس طرح شادی کریں گے؟''

داؤد نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''اگر تو رازداری کا وعدہ کرے تو میں تجھ سے چند ایسی باتیں کرلوں کہ تو مطمئن ہو جائے۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں پیٹ کی ہلکی نہیں، آپ معلوم نہیں مجھے کیا سمجھتے ہیں؟''

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ میں صرف تجھ سے شادی کروں گا اور اس شرط پر کہ تو مجھ سے مال و زر کا مطالبہ نہیں کرے گی اور یہ کہ میرے کاروبار اور جائداد کی حصے دار نہیں بنے گی۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں صرف بیوی بننا چاہتی ہوں، آپ کی بیوی، ملک التجار کی بیوی۔''

داؤد نے نہایت خوشی سے کہا۔ ''تب پھر تو مطمئن رہ کہ تو میری بیوی ضرور بنے گی۔''

نرجس نے ہنس کر طنز کیا۔ ''شاید بالکل اسی طرح مطمئن ہو جاؤں جس طرح سعدیہ اور کیفیہ مطمئن ہوگئی ہیں؟''

داؤد کی دولت مندی کو چرکا لگا، ناگواری سے کہا۔ ''نرجس! ادب سے بات کر ملک التجار سے۔ میں جو چاہوں گا کروں گا تو یا کوئی اور مجھے کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں تجھ سے شادی کروں یا کیفیہ اور سعدیہ سے، تم سب میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں اگر چاہوں تو تم تینوں سے شادی نہ کروں۔ کسی چوتھی لڑکی سے شادی کرلوں۔''

نرجس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ ''بے شک، آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں لیکن ہم تینوں سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی طرح اٹک جائیں گی اور آپ اتنی آسانی سے من مانی نہیں کر سکیں گے، یہ بات ذہن نشین رہے۔''

داؤد نے سختی سے کہا۔ ''اچھا، اب اس وقت تو یہاں سے چلی جا پہلے اپنے بھائی نظام کو اعتکاف سے نکل آنے دے۔''

نرجس نے کہا۔ ''اگر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہیں تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ مجھ سے معاملہ کرلیں۔''

داؤد نے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ ''نرجس! خدا کے لیے اس وقت تو میرا پیچھا چھوڑ دے، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔''

نرجس نے جواب دیا۔ ''میں نے بھی اپنے شب و روز بڑے کرب میں گزارے ہیں، تب مجھ میں اتنی ہمت آئی ہے کہ آپ سے دوبدو صاف صاف باتیں کرلوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''صاف صاف باتیں کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں ایک بار پھر تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں شادی تجھی سے کروں گا۔''

نرجس جاتے ہوئے بولی۔ ''بہرحال آپ میرے ہونے والے شوہر ہیں، میں آپ کا حکم نہیں مانوں گی تو کس کا مانوں گی۔''

نرجس دل شکستہ آئی تھی لیکن فاتحانہ شان سے واپس گئی کیونکہ اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن داؤد نرجس کے جانے کے بعد اور زیادہ فکرمند ہوگیا۔ اب نرجس اسے بلا محسوس ہو رہی تھی۔

کئی دن بعد نظام اعتکاف سے باہر آ گیا۔ اس دن وہ بہت خوش تھا اور چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔ ''لوگو! دیکھو، میرے اعتکاف کا اثر دیکھو۔ میں نے اپنا مقصد پالیا، میں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا۔ خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔''

داؤد نے بھی اس کا شور سنا، بھاگا بھاگا نظام کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا..... کون سا مقصد پورا ہوگیا؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے دونوں بہنوئیوں کا پتا چل گیا ہے۔''

داؤد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پوچھا۔ ''کیا وہ دونوں آ گئے؟ وہ کہاں ہیں؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''وہ دونوں گوالیار میں تھے۔ گوالیار سے ایک آدمی آیا ہوا ہے اور اپنے ساتھ سعدیہ کے شوہر سعادت علی کا خط لایا ہے۔'' اس نے ایک خط داؤد کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ ''آپ خود پڑھ لیں اس میں کیا لکھا ہے۔''

http://www.pdfbooksfree.pk
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

داؤد نے کپکپاتے ہاتھ سے مذکورہ خط لے لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''بھائی نظام کو بعد از سلام، معلوم ہو کہ میں سعادت علی، شوہر سعدیہ گوالیار میں مقیم ہوں۔ کیفیہ کا شوہر شجاع الدین بھی میرے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ ہم دونوں یہاں تلاشِ معاش میں آئے تھے۔ ایک صاحب نے ہم دونوں پر بڑی مہربانیاں کیں اور گوالیار کے قلعہ دار سے ہمارا تعارف کروادیا۔ اس نے ہم دونوں کو نہ صرف ملازمتیں دیں بلکہ اس نے ہم دونوں کی اپنی بیٹیوں سے شادی بھی کروی۔ وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ ہم دونوں نے اس خوف سے کہ قلعہ دار ہمیں اپنے گھر اور ملازمت سے نکال نہ دے اپنی پہلی شادیوں کا راز مخفی رکھا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ خوب اچھی طرح کما چکنے کے بعد ایک دن یہاں سے چپ چاپ فرار ہو جائیں گے اور اپنی بیویوں اور بچوں سے آملیں گے لیکن اب مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ ایک ماہ قبل شجاع الدین، شوہر کیفیہ کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑے ہیں۔ شجاع الدین کی ناگہانی موت نے میری ہمت توڑ دی ہے اور اب میں گوالیار نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہاں مجھے بڑی آسودگی حاصل ہے اور میرے اپنے بھی دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی دوسرا لڑکا۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ کیفیہ بیوہ ہو چکی ہے، سعدیہ کو میں طلاق دے رہا ہوں تاکہ وہ زحمتِ انتظار سے بچ جائے۔ اب میں نہیں واپس آؤں گا اس لیے سعدیہ کو کیوں پریشان کروں، سعدیہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔''

اس خط کے ساتھ سعادت علی کا طلاق نامہ بھی منسلک تھا، داؤد نے طلاق نامہ دیکھا اور سناٹے میں آ گیا۔

نظام، سینہ کوبی کرنے لگا۔ ''لوگو! دیکھو، مجھ پر کیا ستم ٹوٹے ہیں۔ ایک بہن بیوہ ہو گئی، دوسری طلاق پا گئی۔ اب میں کیا کروں؟ ہائے ہائے، اب میں کیا کروں؟''

داؤد اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا اور بڑی محبت سے سمجھانا شروع کیا لیکن نظام کو کسی پہلو قرار ہی نہ تھا۔ داؤد نے کہا۔ ''نظام! جو کچھ ہو چکا ہے اس پر کسی انسان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ کیفیہ کا شوہر شجاع الدین چل بسا۔ اس لیے اس کا ماتم فضول ہے۔ رہا سعدیہ اور سعادت علی کا مسئلہ تو ان حالات میں یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کا ماتم نہ کیا جائے اور مستقبل کی فکر کی جائے۔''

نظام اپنے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور سرد آہیں بھر رہا تھا، بولا۔ ''مستقبل کی فکر کس طرح کروں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ کیفیہ اور سعدیہ کے مستقبل کے بارے میں کچھ غور کرو۔ اللہ نے چاہا تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔''

نظام نے آنکھیں موند لیں۔ گویا سر اور پیشانی میں سخت درد ہو رہا ہو، بولا۔ ''میرے آقا! میں تو تباہ و برباد ہو گیا۔ میری عقل کام نہیں کر رہی۔ میں کیفیہ اور سعدیہ کی طرف سے مطمئن تھا اور اب صرف اپنی اور نرجس کی شادی باقی رہ گئی تھی لیکن اب کیفیہ اور سعدیہ کی شادی کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اگر آپ یا کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو میری ہی طرح اس کا صدمے سے بہت برا حال ہو جاتا۔''

نظام نے فرطِ جذبات میں داؤد کے ہاتھ پکڑ لیے، بولا۔ ''میرے آقا! جو کچھ ہو چکا ہے، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان روح فرسا واقعات سے اپنی بہنوں کو مطلع کروں۔ یہ کام آپ کو کرنا ہوگا کہ نہایت ہوشیاری سے آپ سب کچھ انہیں بتا بھی دیجیے اور انہیں زیادہ غمزدہ اور فکرمند نہ ہونے دیجیے۔''

داؤد نے فوراً ہامی بھر لی۔ ''ہاں، میں تیرا یہ کام کردوں گا اور تو سردست اعتکاف میں رہ۔''

نظام کچھ دیر بعد پھر اپنے حجرے میں چلا گیا۔

داؤد بڑی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ وہ یہ منحوس خبر کس طرح نظام کی بہنوں تک پہنچائے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ فیروز بخت بھی آ گیا۔ داؤد اسے دیکھتے ہی مسکرایا اور پوچھا۔ ''فیروز بخت! خیریت تو ہے؟ تو بغیر اجازت یہاں کیوں آ گیا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میرا کاروباری حویلی میں رہتے رہتے دل گھبرایا گیا تھا اس لیے میں آپ کے پاس واپس آ گیا۔ ستارا اب بھی وہیں ہے اور بہت پریشان ہے۔ کہتا ہے دبلی بہت یاد آتی ہے۔''

داؤد نے اسے غور سے سر سے پاؤں تک دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''تجھے ہر حال میں وہیں رہنا تھا لیکن اب اگر یہاں آ گیا ہے تو چپ چاپ میرے کمرے میں پڑا رہ اور کسی بھی معاملے میں.....''

فیروز بخت نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''اگر آپ کو میری آمد گراں گزری ہے تو میں اسی وقت واپس چلا جاؤں گا۔ میں آپ کی ناراضی اور ناخوشی مول نہیں لے سکتا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

داؤد کو اس پر رحم آ گیا۔ ''نہیں جب تو آ ہی گیا ہے تو رہ۔ واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

فیروز بخت، داؤد کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔

داؤد حویلی کے ایک گوشے میں بیٹھ کر بدلے ہوئے حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ کیفیہ کو پسند کرتا تھا اور اس کے لیے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے گی تو وہ اس سے شادی کرے گا اور ایک نئی حویلی خرید کر کیفیہ کو اس میں منتقل کر دے گا لیکن اب جبکہ کیفیہ بیوہ اور سعدیہ مطلقہ ہو چکی تھی، معاملات نے زیادہ پیچیدگی اختیار کر لی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ کیفیہ اور سعدیہ کو یہ منحوس خط پڑھ کر سنائے گا اور وہ دونوں وقتی رنج و ملال سے فرصت پا کر شادی پر مصر ہوں گی تو وہ کم از کم سعدیہ سے کیا کہے گا؟

☆☆☆

داؤد نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے کیفیہ کو یہ خط پڑھ کر سنایا جائے اور اسے اعتماد میں لے کر مشورہ کیا جائے کہ اب وہ کیا کرے۔ چنانچہ جب اس نے کیفیہ کو خط پڑھ کر سنایا تو وہ سکتے میں رہ گئی اور کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد خوشی کا اظہار کیا۔ ''چلو یہ تو اچھا ہی ہوا کہ طلاق نہیں لینا پڑی۔ اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ بس عدت گزارتے ہی شادی کر لینا چاہتی ہوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''کیفیہ! تو اچھی طرح واقف ہے کہ میں صرف تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں تجھی سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

کیفیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جو کچھ آپ نے کہا، اس کی صداقت مشتبہ ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''اب میرے لیے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ سعدیہ اور نرجس بھی مجھ پر مائل ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں میں کس طرح باز رکھوں، ان دونوں سے میں کیا کہوں؟''

کیفیہ نے شکایتاً کہا۔ ''آپ نے ان دونوں پر نوازشیں کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس سلسلے میں، میں غیر جانب دار اور خاموش رہنا چاہتی ہوں کیونکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں جو مشورہ دوں گی وہ آپ کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تجھ سے مشورہ مانگا ہی اس لیے ہے کہ میں اس پر عمل بھی کر سکتا ہوں۔''

کیفیہ نے رک رک کر کہا۔ ''دنیا میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی کہ کسی عورت نے ہنسی خوشی اپنی سوت کو گوارا کر لیا ہو لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ سعدیہ اور نرجس سے بھی شادی کر لیں کیونکہ ہم تینوں سے شادیاں کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔''

داؤد سناٹے میں آ گیا، کیفیہ کی بات پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ ''کیفیہ! جو کچھ تو کہہ رہی ہے، کیا یہ قائمی ہوش و حواس میں کہہ رہی ہے؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ آپ اس بات پر ششدر رہ جائیں گے لیکن آپ مجھ سے یہ بھی تو پوچھیے کہ میں نے آپ کو یہ مشورہ کیوں دیا؟''

داؤد نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں، اب بتا کہ تو نے یہ مشورہ کیوں دیا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''مجھے سعدیہ کی بدقسمتی اور نرجس بہن کی ویران زندگی پر رونا آتا ہے۔ کسی بھی رشتے سے سہی، یہ دونوں میری بہنیں ہیں اور میں اپنی بہنوں کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ جہاں میں رہوں، وہیں میری دونوں بہنیں بھی رہیں۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ اگر میں عیش کروں تو میری دونوں بہنیں بھی عیش کریں۔''

داؤد نے جز بز ہو کر کہا۔ ''لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں تم تینوں سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟ کیفیہ! یہ بھی تو سوچ۔''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتی کہ میری دونوں بہنیں بہت دکھی ہیں اور میں ان دونوں کو خوش و خرم دیکھنا چاہتی ہوں۔''

داؤد کو اپنے کاروبار اور جائداد کی فکر لگی ہوئی تھی، بولا۔ ''دیکھ کیفیہ! شادیاں تو میں چار کر سکتا ہوں اور اپنی مرضی کا مالک و مختار بھی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھے کسی قسم کا دکھ پہنچاؤں اور سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے کاروبار اور مال و زر کی وجہ سے شادی سے بچتا رہا ہوں۔ ایک ہی شادی پر میں فکرمند ہو رہا ہوں، نہ کہ تین شادیاں کر کے اپنے مال و زر اور کاروبار کو تباہ و برباد کر دوں۔''

کیفیہ نے نرمی سے کہا۔ ''اپنے مال و زر اور کاروبار میں انہیں شریک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اگر آپ نہیں تو میں اس موضوع پر ان دونوں سے بات بھی کر لوں گی۔ خیال ہے کہ وہ دونوں میری یہ بات مان لیں گی۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

داؤد نے جواب دیا۔ ''تو اپنے طور پر ان دونوں سے یہ باتیں کرسکتی ہے ورنہ اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں کیونکہ میں اتنے بڑے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

کیفیہ نے اچانک خاموشی اختیار کرلی اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ داؤد اسے فکرمند چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت وہ جس حیرت سے دوچار تھا پوری زندگی میں ایسی حیرت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو فیروز بخت کا سامنا ہوگیا۔ داؤد کو غصہ آگیا، پیشانی پر شکنیں ڈال کر بولا۔ ''فیروز بخت! تو اسی وقت کاروباری حویلی میں چلا جا۔ میں بہت فکرمند ہوں، تنہائی چاہتا ہوں۔''

فیروز بخت نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ میں اسی وقت چلا جاؤں گا لیکن کاروباری حویلی سے یہاں چلے آنے کا ایک ایسا سبب بھی ہے جو میں بیان کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

داؤد نے اس کا داہنا شانہ پکڑ لیا۔ ''یعنی..... کیا سبب؟''

فیروز بخت نے سر جھکا کر عرض کیا۔ ''میں جو کچھ بتا دینے پر مجبور ہوگیا ہوں، عام حالات میں شاید نہ بتاتا لیکن آپ نے مجھ پر احسان کیے ہیں اور آپ کے ایک خاص منصوبے اور مقصد کے تحت تربیت حاصل کررہا ہوں اس لیے میں اپنی زندگی کے اس گوشے میں کوئی شگاف نہیں ہونے دوں گا.....''

داؤد نے اکتا کر کہا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے، صاف صاف کہہ۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''احمد آباد کا ایک تاجر وصی احمد مجھ پر بہت مہربان ہے اور اس نے اپنی لڑکی سائرہ سے میرا تعارف کروایا ہے اور مجھے اس تعارف کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔''

داؤد ہنسنے لگا۔ ''تو نے بالکل صحیح اندازہ لگایا لیکن تو خوفزدہ مت ہو۔ وصی کی لڑکی سائرہ سے دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ ایک آدھ شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن شادی سے پہلے یہ یقین کرلینا چاہیے کہ اس سے مال و زر اور کاروبار کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔''

فیروز بخت، داؤد کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر بہت حیران ہوا۔ گفتگو نے زیادہ طول نہیں پکڑا۔ فیروز بخت شگفتگی لیے ہوئے اسی وقت کاروباری حویلی چلا گیا۔ داؤد اپنے کمرے میں اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔ اس کے پردۂ خیال پر کیفیہ، سعدیہ اور نرجس ایک ساتھ نمودار ہوئیں اور اسے طرح طرح کے سوالوں سے عاجز اور پریشان کرنے لگیں۔ وہ معلوم نہیں کیا سوچتا رہا لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے اپنے کمرے میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ داؤد نے نظریں اٹھائیں اور اپنے سامنے نرجس کو کھڑے دیکھا۔ داؤد گھبرا کر کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''نرجس! تم یہاں کب آئیں؟ خیریت تو ہے؟''

نرجس نے کھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس وقت میں آپ کے پاس اس تنبیہہ کے ساتھ آئی ہوں کہ آپ مجھ سے جلد از جلد شادی کرلیجیے کیونکہ اگر آپ نے اب بھی لیت و لعل سے کام لیا تو شاید ہم دونوں ہی کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ جائے۔''

داؤد نے کہا۔ ''نرجس! مجھ سے صاف صاف باتیں کر۔''

نرجس نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ میں آپ کی امانت دار ہوگئی ہوں۔ بھائی نظام سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ دنیا سنے گی تو کیا کہے گی؟ میں شادی کرکے یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی تاکہ اس پر پردہ پڑا رہے۔''

داؤد ایک اور پریشانی سے دوچار ہوگیا، بولا۔ ''اگر میں اس سے انکار کردوں تو؟ اس کا کیا ثبوت کہ اس امانت کا میں ہی ذمے دار ہوں۔''

نرجس تیوری بدل کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں کہہ رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ آپ ہی کی امانت ہے۔ آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں اور پھر مجھے بتائیں کہ اس سلسلے میں اس نے کیا کہا؟ اگر آپ نے مکرنے کی کوشش کی اور مجھ سے جان چھڑانا چاہی تو میں نے ذوالی کارروائی کے لیے پہلے ہی سے ایک ایسا منصوبہ بنا رکھا ہے کہ اس سے آپ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔''

داؤد نے سر پکڑ لیا۔ ''نرجس! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے تنہا چھوڑ دے تاکہ میں خوب سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کروں۔''

نرجس واپس جاتے ہوئے بولی۔ ''آپ آزاد ہیں جو چاہیں سوچیں، میں جارہی ہوں لیکن بہرحال یہ ضرور سوچیں کہ فرار کے سارے راستے بند ہیں۔ آپ کو شادی کا وعدہ ہر حال میں نبھانا پڑے گا۔''

نرجس چلی گئی اور داؤد نیم پاگل سا ہوگیا۔ وہ کیفیہ، نرجس اور سعدیہ کی تکون میں محصور ہوچکا تھا۔ داؤد کو الجھنوں نے اتنا پریشان کیا کہ وہ چند دنوں کے لیے احمد آباد سے باہر چلا گیا اور جب چند روز بعد واپس آیا تو نرجس، کیفیہ اور سعدیہ کے تعلق سے چند ایسی باتیں مشہور ہوچکی تھیں کہ داؤد

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بہت پریشان ہوگیا۔ لوگ اس کا احترام کرتے اور اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے لیکن اب داؤد کو ہر وقت یہ شک و شبہ رہتا کہ کہیں یہ سب اس کے پندار اور وقار کو لے کر نہ چلا جائے۔ یہ باتیں کون مشہور کر رہا تھا پتا نہ تھا لیکن ایک آدھ جگہ نظام کا نام لیا گیا اور جب داؤد نے اس سلسلے میں نظام سے پوچھا تو وہ مکر گیا اور کہا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہ کیوں ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا، ہم لوگ غریب سہی لیکن اپنی عزت و آبرو رکھتے ہیں۔ اب اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکلنا چاہیے ورنہ میں نرجس کو قتل کر کے اور معلوم نہیں کیا کچھ کر گزروں۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''میں نرجس سے ایک شرط پر شادی کر سکتا ہوں۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں نے آپ کی شرط نہیں سنی لیکن میں جس رسوائی اور بدنامی کے بھیانک خواب سے دوچار ہوں اس کے پیش نظر میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''

داؤد نے پس و پیش سے کہا۔ ''میں نرجس سے شادی کر لوں گا لیکن نرجس کو اپنے مال و زر کا ساجھی نہیں بناؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ میں کیفیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں یعنی کیفیہ میری دوسری بیوی ہوگی۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''کیفیہ اپنے بارے میں خود ہی کوئی فیصلہ کرے گی اس کے معاملے میں، میں خاموش رہوں گا۔ مجھ سے تو بس نرجس کی بات کیجیے اور کچھ نہیں۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں نے کیفیہ کا ذکر یوں ہی اطلاعاً کر دیا ہے، رہا نرجس کا مسئلہ تو میں اس سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ کیفیہ کی بات کیفیہ سے کروں گا۔ نرجس شادی کے بعد اپنے گھر چلی جائے گی، میں اس کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا لیکن کیفیہ میرے ساتھ رہے گی۔''

نظام نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ کیفیہ کی بات کیفیہ سے کیجیے، میں تو نرجس کی شادی تک خود کو محدود رکھوں گا۔ شادی کے بعد نرجس کو اپنے پاس رکھیے یا نہیں اور بھیج دیجیے، مجھے اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ آپ کی بیوی ہوگی اور آپ کو اس پر پورا اختیار ہوگا۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تب پھر ایک ہفتے کے اندر اندر یہ شادی ہو جائے گی۔ تو اس شادی کا چرچا نہیں کرے گا۔ ہاں، کیفیہ کی شادی کا چرچا بھی کر سکتا ہے۔''

نظام نے تردد سے پوچھا۔ ''نرجس کی شادی کا چرچا کیوں نہ کیا جائے کوئی خاص وجہ؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں تو ذلیل و خوار ہو جائے گا۔ کیفیہ اور نرجس سے شادیاں کر لینے کا چرچا ہوگا تو لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگیں گے۔ تیری دو بہنوں کی مجھ سے شادیاں کرنا عجیب رسوا کن بات ہوگی۔ لوگ معلوم نہیں کیا کیا سوچیں گے۔ اس لیے کسی ایک شادی کی خبر کو چھپائے رکھنا بہت ضروری ہوگا۔ ہاں اگر کہیں نرجس کی شادی کا ذکر کرنا ضروری ہی ہو جائے تو اس کے اظہار اور ذکر میں کوئی حرج نہیں۔''

نظام نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، ٹھیک ہے۔''

شادی سے پہلے نرجس کو نظام اپنے گھر لے گیا اور وہاں خاموشی سے شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔

ادھر جب کیفیہ کو نرجس سے شادی کرنے کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے داؤد پر زور دیا کہ سعدیہ کو بھی مایوس نہ کرے۔ داؤد نے جواب دیا۔ ''کیفیہ! اب میں تجھ سے شادی کروں گا۔ سعدیہ کے لیے مجبور نہ کر۔ نرجس سے میں مجبوراً شادی کر رہا ہوں، شاید وہ میری امانت لیے پھر رہی ہے۔''

کیفیہ نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ کی مرضی لیکن میں سعدیہ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ آپ سے بہ آسانی شکست نہیں کھائے گی۔''

داؤد نے طیش میں کہا۔ ''کیفیہ! میرے ساتھ یہ کتنا بڑا المیہ پیش آ رہا ہے کہ کہاں میں سرے سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور کہاں مجھے تین تین شادیوں پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ذرا سوچ تو سہی کہ جب لوگ یہ سنیں گے کہ میں نے اپنے گماشتے نظام کی تین بہنوں سے شادیاں کر لی ہیں تو وہ میرا کتنا مذاق اڑائیں گے، کتنا ہنسیں گے؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''میں کسی بھی معاملے میں اتنی گہرائی تک نہیں جاتی اور نہ لوگوں کی ہنسی یا داد و تحسین کو خاطر میں لاتی ہوں۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ آپ کو ہم تینوں بہنوں سے وہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا جو کر چکے ہیں اور پھر جب سب کچھ کر بیٹھے ہیں تو پھر ان سے آپ نے جو وعدے کیے ہیں، انہیں پورا کیجیے۔''

لیکن داؤد کو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ سعدیہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، بولا۔ ''کیفیہ! تو کچھ بھی کہہ، میں سعدیہ سے شادی نہیں کروں گا۔''

حسب گفتگو ایک ہفتے کے اندر اندر نرجس سے شادی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

ہوگئی اور چند ماہ بعد کیفیہ دلہن بن گئی۔ نرجس سے شادی نظام کے آبائی گھر میں نہایت رازداری سے ہوئی لیکن کیفیہ سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس شادی نے پورے احمد آباد کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ فیروز بخت اور ستار بھی حیرت زدہ تھے۔ شادی کے بعد دس دن تک تو داؤد کی کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ کیفیہ کو لے کر احمد آباد سے تقریباً پچاس میل دور دریائے سابرمتی کے ساحل پر آباد ایک غیر معروف بستی میں چلا گیا اور وہاں دادِ عیش دیتا رہا۔ وہاں کیفیہ کے ناز و انداز اور عشوہ و ادا نے داؤد کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ کیفیہ کی موجودگی میں داؤد کی قوت فیصلہ کند ہوکر رہ گئی۔ یہاں بھی کیفیہ اکثر و بیشتر گم صم ہوکر بیٹھ جاتی۔ داؤد کو اس کی خاموشی اور گمشدگی بہت کھلنے لگتی اور وہ اسے جھنجوڑ کر پوچھتا۔

''کیفیہ! کیا بات ہے؟ کیا تو اس شادی سے خوش نہیں ہے؟''

کیفیہ کچھ دیر تک داؤد کی صورت دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''کیا میں بتادوں وہ بات؟''

''ضرور بتادو، آخر یہ تامل کیوں؟ تذبذب کیسا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''یہاں کے عیش و عشرت میں مجھے سعدیہ بہن کی یاد اکثر ستانے لگتی ہے۔ میں لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ یہ خیال نہ آئے لیکن میں مجبور ہوجاتی ہوں۔''

داؤد نے چڑ کر کہا۔ ''کیفیہ! تم بہت سادہ لوح ہو۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ اس معاملے کو نرجس ہی تک رہنے دو۔ اگر میں نے تیرے کہنے سے سعدیہ سے شادی کرلی تو ہوسکتا ہے کہ کسی بھی دن میں سعدیہ کی طرف زیادہ جھک جاؤں اور میرے دل سے تیری یاد، تیری محبت دور ہوجائے۔ کیا تو پسند کرے گی کہ میں سعدیہ کو تجھ پر ترجیح دوں؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''داؤد! میں کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ میں اپنی بہنوں کو خوش و خرم دیکھنا چاہتی ہوں۔''

داؤد نے کہا۔ ''عجیب بات ہے لیکن اگر تو یہی چاہتی ہے کہ میں سعدیہ سے شادی کرلوں تو اب میں اس مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کروں گا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں صحیح معنی میں اسی دن خوش و خرم دکھائی دوں گی جس دن میری بہن سعدیہ کا بھی کوئی بندوبست ہوجائے گا۔''

داؤد بہت بے مزہ ہورہا تھا۔ کیفیہ جس موضوع پر باتیں کرنا چاہتی تھی، داؤد اس سے گریز اختیار کرنا چاہتا تھا، اس سے بچنا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک ماہ بعد داؤد اور کیفیہ اپنی حویلی میں واپس پہنچے۔ داؤد اور کیفیہ حویلی میں اترے تو ان دونوں کا سامنا سعدیہ سے ہوگیا۔

سعدیہ نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ''خوش آمدید، تم دونوں کا کیا حال ہے؟''

داؤد نے خفت سے جواب دیا۔ ''مزے ہی مزے ہیں۔''

سعدیہ نے منہ پھیر کر کیفیہ سے پوچھا۔ ''کیسا رہا سفر؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''بہت اچھا لیکن افسوس کہ اس سفر میں تم میرے ساتھ نہیں تھیں۔''

سعدیہ ان دونوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ داؤد کے دل پر سعدیہ کی افسردگی کا خاصا اثر ہوا اور اس نے دل میں اعتراف کیا کہ سعدیہ پر واقعی بڑا ظلم ہوا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ داؤد کا ضمیر اس پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ وہ کچھ دن حویلی میں رہ کر نرجس کے پاس چلا گیا اور وہاں داد عیش دینے لگا۔ اس دوران وہ فیروز بخت سے بھی بے تعلق سا رہا۔ ستار اپنے آقا کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ اس نے فیروز بخت کو مشورہ دیا۔ ''اب چونکہ حالات بدل چکے ہیں اور داؤد نے دو شادیاں کرلی ہیں۔ اس لیے جب دونوں بیویوں سے اولاد ہوجائے گی تو اولاد اور دونوں بیویوں کی موجودگی میں اس کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔ چنانچہ فیروز بخت کو چاہیے کہ کسی بھی مناسب موقع پر اپنی حیثیت مضبوط اور واضح کرلے۔''

فیروز بخت کو بھی بڑی تشویش تھی۔ اسے اپنی بدقسمتی پر سوچ سوچ کر رونا آتا تھا کیونکہ حالات اور زمانہ قدم قدم پر اس کی مخالفت کررہے تھے۔ فیروز بخت کے تردد اور تشویش کو داؤد بھی محسوس کررہا تھا اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ مایوس افسردہ اور دل شکستہ فیروز بخت کو یہ بتا کر چونکا دینے کا خواہش مند تھا کہ اس کا حق کسی طرح بھی نہیں مارا جائے گا اور ہر حال میں کاروبار، جائداد اور نقدی کا دو تہائی اس کو ملے گا اور وہ اپنے اس فیصلے کو اپنے وصیت نامے سے مضبوط اور مستحکم کرجائے گا۔ اپنے اس فیصلے کے علاوہ داؤد نے یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ وہ فیروز بخت کو ہدایت کرے گا کہ وہ احمد آباد کے مشہور تاجر وصی احمد کی بیٹی سائرہ سے اتنے تعلقات بڑھائے کہ دونوں کی شادی ہوجائے۔ داؤد نے اس کام کے لیے ستار کو استعمال کیا اور ستار نے وعدہ کرلیا کہ وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

داؤد انہی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے بعض

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

کارندوں نے نظام کی شکایت کی۔ ''وہ کام صحیح طرح نہیں کررہا ہے۔'' وہ نظام کو بلوا کر باز پرس کرنے والا تھا کہ کیفیہ نے یہ کہہ کر داؤد کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی کہ وہ حسب وعدہ اس کے لیے کسی نئی حویلی کا انتظام کردے کیونکہ وہ ملول اور غمزدہ سعدیہ کے ساتھ رہ کر خود کو پریشان نہیں رکھنا چاہتی۔

داؤد نے کیفیہ کے لیے دریائے سابرمتی کے کنارے ایک شاندار حویلی خرید کر، کیفیہ کو اس میں منتقل کردیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ نظام، سعدیہ کے پاس رہ رہا تھا۔ داؤد اپنی پرانی حویلی میں آتے ہوئے خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے وہاں بہت کم آتا تھا۔ بالآخر کیفیہ کی سفارش اور سعدیہ کی خواہش پر پرانی حویلی سعدیہ کو دے دی گئی کیونکہ داؤد نے اس سے شادی نہ کرکے اس کا تاوان حویلی کی صورت میں ادا کردیا تھا۔ اب نظام کے مزے ہی مزے تھے۔ داؤد کی خواہش تھی کہ اب نظام بھی شادی کرلے لیکن نظام شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس نے انکار کردیا۔

ان واقعات کو تین سال گزر گئے اور داؤد کا خمار اترنے لگا۔ اس دوران کیفیہ اور نرجس سے ایک ایک بچہ بھی پیدا ہوگیا۔ ان تین سالوں میں داؤد نے ان سب میں بڑی تبدیلیاں دیکھیں۔ اب نظام اور سعدیہ ایک ہوکر داؤد اور کیفیہ اور نرجس سے جھگڑنے لگے تھے اور نظام یہ مطالبہ کرنے لگا تھا کہ داؤد رشتے اور قرابتوں کے پیشِ نظر اسے اپنا جزوی حصے دار بنالے لیکن داؤد اس پر ہرگز تیار نہ تھا۔

پھر یکا یک نظام میں ایک غیر معمولی تبدیلی آگئی۔ اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ سعدیہ، داؤد کے سامنے جائے۔ وہ سعدیہ کو داؤد سے چھپانے لگا تھا لیکن سعدیہ، داؤد سے ملنے کے لیے بے چین رہتی۔ نظام نے داؤد کے خدمت گاروں کو نکال باہر کیا تھا اور بھری پری حویلی کو سنسان کرکے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف کیفیہ اور نرجس، سعدیہ سے ملنے سے کترانے لگی تھیں۔ داؤد ان دونوں کو ملوانا چاہتا تو وہ حیلے بہانے کرنے لگتیں۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے داؤد سے درخواست کی کہ انہیں یکجا رکھا جائے اور نظام کو ان دونوں سے نہ ملایا جائے۔ داؤد نے نرجس کو کیفیہ کے پاس چھوڑ دیا لیکن وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ نرجس اور کیفیہ، نظام سے خوفزدہ کیوں ہیں؟

اس دوران میں نظام کئی بار کیفیہ اور نرجس کے پاس پہنچا لیکن داؤد کے خدمت گاروں نے اسے حویلی کے پھاٹک پر سے ہی واپس کردیا۔ آخر نظام نے داؤد سے رجوع کیا اور دھمکی آمیز پیغام بھیجا۔ میں کہا۔ ''میرے آقا! آپ نرجس اور کیفیہ کو میری طرف سے خبردار کردیجیے کہ اگر ان دونوں نے اپنے موجودہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ کی تو میں اس کا بڑا بھیانک انتقام لوں گا اور میری وجہ سے ان دونوں کو جو عیش و آرام میسر آگیا ہے، انہیں ذرا سی دیر میں تباہ و برباد کرکے رکھ دوں گا۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''تیرا پیغام میں ان دونوں تک پہنچادوں گا لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ تیری دونوں بہنوں نے تجھ سے ایک دم ترکِ تعلق کیوں کرلیا؟''

نظام نے حویلی کے پھاٹک پر لگے ہوئے ایک خزاں رسیدہ درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے آقا! وہ بات میں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن اس خزاں رسیدہ درخت کو دیکھا کر آپ ان دونوں سے کہہ دیجیے گا کہ میں ان دونوں کو اس درخت کی طرح خزاں رسیدہ کرسکتا ہوں۔''

نظام واپس چلا گیا اور داؤد طرح طرح کے خیالات لیے اندر چلا گیا۔ اس نے نرجس اور کیفیہ کو طلب کیا اور نظام کا پیغام ان دونوں کے گوش گزار کرکے دریافت کیا۔ ''میں تم دونوں سے یہ معلوم کرکے رہوں گا کہ نظام سے تم دونوں کیوں نہیں ملنا چاہتیں اور اس کی اس دھمکی کا آخر مطلب کیا ہے؟''

نرجس اور کیفیہ نے خوفزدہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کیفیہ نے، جواب دیا۔ ''یہ سارا فساد سعدیہ سے شادی نہ کرنے کا ہے۔ اگر آپ سعدیہ سے بھی شادی کرلیتے تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔''

داؤد نے جھنجلا کر کہا۔ ''معلوم نہیں تو کیا کہہ رہی ہے۔ سعدیہ سے شادی کرنا آخر ضروری کیوں تھا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''وہ اپنی ناکامی کا ہم سے بدلہ لے گی۔ وہ ہمارے خلاف سازشیں کررہی ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''تم دونوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ شادی میں نے، سعدیہ سے نہیں کی اور نظام دھمکی تم دونوں کو دے رہا ہے، آخر اس کا مطلب کیا ہے؟''

نرجس نے کہا۔ ''بھائی نظام مجھ سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں انہیں آپ کے کاروبار کا جزوی حصے دار بنوادوں لیکن میں نے ہمیشہ یہ سوچ کر ان کی یہ بات آپ سے نہیں کہی کہ آپ اس پر کسی طور تیار نہیں ہوں گے۔ بس اس بات نے بھائی نظام کو ہم دونوں کے خلاف کردیا ہے اور وہ ہماری بربادی کے درپے ہوگئے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

داؤد ان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔

کیفیہ نے اچانک نرجس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی۔ دونوں میں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ داؤد ان دونوں کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا۔ نرجس اور کیفیہ دونوں ہی کے چہروں پر خوف اور پریشانی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں واپس آگئیں۔

نرجس نے کیفیہ سے کہا۔ ''تم ان سے وہ بات کہہ دو۔''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''میں نہیں کہوں گی، تم کہہ دو۔''

نرجس نے پس وپیش سے جواب دیا۔ ''تم ہی کہہ دو، میں نہیں کہہ سکوں گی۔''

کیفیہ نے لمحہ بھر کے لیے سکوت اختیار کرلیا۔ داؤد الجھن محسوس کررہا تھا، دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں ایک ذرا سی بات کو بلاوجہ طول دے رہی ہو۔ جب یہ بات طے ہے کہ میں نظام کو حصے دار نہیں بنا سکتا تو کسی کا اس موضوع پر بات کرنا ہی فضول ہے۔ تم دونوں میں سے جو بھی مجھ سے بات کرے، اپنے ذہن میں یہ بات ضرور بٹھالے کہ میں نظام تو کیا کسی کو بھی اپنا حصے دار نہیں بنا سکتا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''ہم دونوں، بھائی نظام کی حصے داری کی بات نہیں کریں گے بلکہ ہم نے اس پر اتفاق کرلیا ہے کہ اگر آپ کے بس میں ہو اور بات راز میں رہے تو کسی بھی طرح بھائی نظام کو ہلاک کروادیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ہمارا سکھ چین برباد کیے بغیر نہ رہیں گے۔''

داؤد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''کیفیہ! تو نے کیا کہا؟ جو کچھ کہا ہے اس کے مفہوم سے بھی واقف ہے؟''

نرجس نے کیفیہ کے بجائے جواب دیا۔ ''کیفیہ نے جو کچھ کہا، میں بھی وہی کہوں گی کیونکہ اگر ایسا نہ ہو، اور آپ نے تساہل سے کام لیا تو بھائی نظام پہل کرجائیں گے اور اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔''

داؤد پر سکتہ طاری تھا، پوچھا۔ ''وہ کیا پہل کرے گا؟''

کیفیہ نے خوشامد کی۔ ''میں آپ سے خوشامدانہ کہوں گی کہ بھائی نظام کے شر سے ہم سب کو نقصان پہنچ جائے گا۔ خدا کے لیے آپ کوئی ایسا بندوبست ضرور کردیں کہ بھائی نظام کا کام تمام ہوجائے۔''

داؤد نے کہا۔ ''تم دونوں جب تک ہر بات تفصیل سے نہیں بتاؤ گی، میں کوئی قدم بھی نہ اٹھا سکوں گا۔''

کیفیہ اور نرجس نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں صلاح مشورے کرنے لگیں۔

داؤد نے کہا۔ ''آج تو میں حیران ہورہا ہوں کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس سے تم دونوں نظام سے خوفزدہ ہورہی ہو۔''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''مجھے دو دن سوچنے کا موقع دیجیے، میں سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''دو دن نہیں، تم مجھ سے تین دن لے لو لیکن تم مجھ سے چھپانا کچھ بھی نہیں کیونکہ اگر نظام کسی طرح ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ بات ہمیں معلوم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر میں نظام کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتا۔''

یہ کہہ کر داؤد چلا گیا اور کیفیہ اور نرجس آپس میں صلاح مشورے کرنے لگیں۔

☆☆☆

سعدیہ نے سیاہ لباس زیب تن کیا اور بند گاڑی میں سوار ہوکر داؤد کی کاروباری حویلی میں پہنچ گئی۔ وہاں نظام صدر دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ سعدیہ نے پردے سے جھانک کر نظام کو اشارے سے، اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''داؤد سے کہہ دو، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

نظام تابعدار بن کر اندر گیا اور داؤد کو سعدیہ کا پیغام پہنچادیا۔ داؤد کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں اور کراہیت سے کہا۔ ''نظام! تم سب جانتے ہو کہ میں اپنی کاروباری حویلی میں گھر والوں سے نہیں ملتا۔ سعدیہ سے کہو واپس جائے میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

نظام نے سعدیہ کی وکالت کی۔ ''میرے آقا! سعدیہ بڑی سرکش اور ضدی ہے۔ ملے بغیر ہرگز واپس نہ جائے گی۔''

داؤد نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں یہاں نہیں ملوں گا۔''

نظام نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ کی مرضی میرے آقا ..... میں آپ کو مجبور تو نہیں کرسکتا۔''

وہ واپس چلا گیا، ذرا دیر بعد سعدیہ کے ساتھ پھر واپس آگیا۔ سعدیہ کی مترنم آواز دور ہی سے سنائی دی۔ ''میں نے سوچا آپ کو کیا تکلیف دوں، اس لیے میں خود ہی چلی آئی۔''

داؤد نے خفگی سے کہا۔ 'سعدیہ! تو نے تو کمال ہی کردیا۔ آخر وہ کون سی خاص بات ہے جس نے تجھے میرے پاس آنے پر مجبور کردیا؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو وہ دن نہیں یاد دلاؤں گی جب مجھے بھی آپ کی بارگاہِ ناز میں کوئی مقام حاصل تھا۔ میں تو اس وقت آپ سے درخواست کرنے آئی ہوں کہ کبھی کبھی آپ میرے، پاس بھی تشریف لے آیا کریں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

داؤد نے نظام سے کہا۔ ''نظام! تو حویلی میں جا، میں سعدیہ سے چند باتیں کر کے تجھے واپس بلالوں گا۔''

نظام نے سعدیہ پر نظر ڈالی اور حویلی میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی داؤد نے راز داری سے کہا۔ ''سعدیہ! تجھے نظام تنگ تو نہیں کر رہا؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، بھائی نظام مجھے نہیں تنگ کرتے بلکہ ہم دونوں کی یہ خواہش ہے کہ ہم آپ کی ایک شاندار دعوت کریں۔ اس طرح آپ کے اس کھنچاؤ کو دور کریں جو بدقسمتی سے ان دنوں معلوم نہیں کیوں پیدا ہو گیا ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں دعوت میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں، بول کس دن اور کب کر رہی ہے تو میری دعوت؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''آپ کل رات کا کھانا ہم دونوں کے ساتھ کھائیں۔''

داؤد نے کہا۔ ''بہتر ہے..... کیا نرجس اور کیفیہ کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں؟''

سعدیہ نے رک رک کر تکلف سے جواب دیا۔ ''چاہے تو لے آئیں، ان دونوں کو بھی..... ورنہ اگر نہ لائیں اور تنہا آئیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے اس کا اختیار آپ کو دیا۔''

داؤد کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا، بولا۔ ''میں تجھ سے جو چند خاص باتیں کرنا چاہتا تھا، اس وقت نہیں کروں گا، دعوت کے بعد کر لوں گا۔''

سعدیہ نے فراخ دلی سے کہا۔ ''میں آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔''

داؤد نے کہا۔ ''تو کل رات میں تنہا آؤں گا۔ نرجس اور کیفیہ نہیں آئیں گی۔''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں کیونکہ بھائی نظام کے ان دونوں سے خوشگوار تعلقات نہیں رہے۔''

داؤد، سعدیہ سے الگ ہوا اور نظام کو اس کے پاس بھیج دیا۔

اس رات داؤد نے نرجس اور کیفیہ کو بلایا اور غیر ارادی طور پر سعدیہ کی دعوت کا ذکر کر دیا۔ کیفیہ اور نرجس دعوت کے ذکر پر پریشان ہو گئیں۔ کیفیہ نے کہا۔ ''میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ سعدیہ یا بھائی نظام پر اعتبار نہ کریں۔ ان دونوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔''

داؤد نے دوٹوک جواب دیا۔ ''کیفیہ! جب تک تو مذکورہ خطرے کا صاف صاف ذکر نہیں کرے گی، میں تیری کوئی بات بھی نہیں مانوں گا۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''آپ نے سعدیہ سے شادی نہ کر کے اس کی دشمنی مول لے لی ہے۔ اسی طرح بھائی نظام کو اپنے کاروبار میں جزوی حصے دار نہ بنا کر اسے دشمن بنا لیا ہے۔ چنانچہ آپ کے یہ دونوں دشمن کسی موقع کی تلاش میں ہیں۔ جیسے ہی موقع ملے گا آپ پر حملہ کر دیں گے۔''

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مجھ پر حملہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں اور بالفرض محال اگر کسی نے مجھ پر کوئی حملہ کیا بھی تو اس سے فائدہ نہیں پہنچے گا کیونکہ میں نے ابھی سے اپنے کاروبار، جائداد اور نقدی کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ میرے دشمنوں کو اس میں آپ حبہ بھی نہیں ملے گا۔''

کیفیہ چپ ہو گئی لیکن اس کی بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کیفیہ، داؤد کو ہر قیمت پر دعوت سے روکنا چاہتی ہے۔ داؤد کو یہ غصہ تھا کہ نرجس اور کیفیہ معلوم نہیں کیوں کوئی خاص بات چھپا رہی ہیں۔

نرجس نے اپنے طور پر کہا۔ ''اگر آپ نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ سعدیہ اور نظام بھائی کی دعوت میں جائیں تو میرا ایک مشورہ ضرور مان لیں۔ اس سے آپ خطرے سے بچ نکلیں گے۔''

داؤد نے سنی ان سنی کر دی۔

کیفیہ نے کہا۔ ''میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ آپ ان کے ہاں کھانا ہرگز نہ کھائیں اور اگر کھانا ہی ہے تو ایک کتا اپنے ساتھ لے جائیں اور جو کچھ کھائیں پہلے کتے کو کھلائیں اور اگر کتے پر اس کھانے کا کوئی اثر نہ ہو تو خود بھی کھائیں۔''

داؤد ہنسنے لگا۔ ''خوب خوب، کیا ترکیب بتائی ہے کہ دعوت میں جائیں تو ایک کتا بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔''

نرجس اور کیفیہ نے داؤد کی باتوں سے یقین کر لیا کہ وہ ان کی باتوں کو مضحکہ خیز سمجھتا ہے اور ان کی کسی بات پر بھی عمل نہیں کرنا چاہتا۔ دوسرے دن علی الصباح وہ کہیں چلا گیا اور کافی دیر بعد واپس آیا اور فیروز بخت کو بلوا کر بطور خاص اس کو سمجھایا کہ اگر وہ کہیں گم ہو جائے، دراس کا پتا نہ چلے یا ناگہانی موت آ جائے تو وہ اپنی اولین فرصت میں قاضیِ شہر سے ضرور مل لے۔

فیروز بخت، داؤد کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ داؤد کی ساری باتیں بے سروپا اور ہذیان زدہ تھیں۔

شام سے ذرا پہلے داؤد نے کیفیہ اور نرجس کو مطلع کیا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جہانگیر بُکس 91

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مُسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی المناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھناچھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 300/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

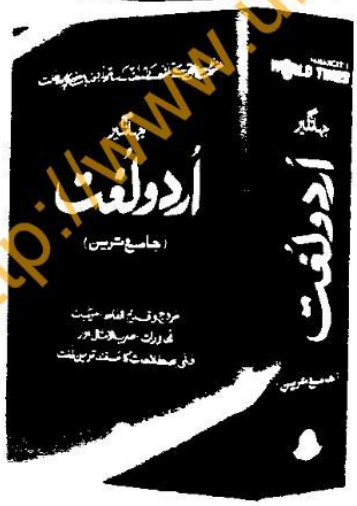

جہانگیر
اُردو لغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بُک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609
021-32765086

http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کہ وہ سعدیہ کی دعوت میں جا رہا ہے۔ کیفیہ نے پھر اصرار کیا۔ ''آپ ایک کتا اپنے ساتھ لیتے جایئے۔''

داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات کو حویلی سے نکل کر وہ نظام کی طرف چل پڑا اور ستار کو بطور خاص حکم دیا کہ وہ ایک کتا فراہم کردے۔

داؤد کے ہرکارے پالتو کتے کی تلاش میں نکل گئے اور بہت جلد ایک کتا لے آئے۔ داؤد نے کتے کی ڈوری پکڑی اور چار حمایتی کارکنوں کو اپنے ساتھ لیا اور دلیر چلا گیا۔ حویلی کے پھاٹک پر نظام اس کا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی فرط ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ''میرے آقا! آپ نے بڑی دیر کردی؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''بہرحال میں آگیا، اب تو تمہیں گلہ نہیں کرنا چاہیے۔''

نظام نے داؤد کے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے آقا! یہ کیا ہے؟ آپ اسے اپنے ساتھ کیوں لائے ہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''ارے بھائی! میں اسے اپنے ساتھ اس لیے لایا ہوں کہ اس کی رفاقت غیر مشتبہ ہے۔ آدمی، آدمی کو دھوکا دے دیتا ہے لیکن یہ دھوکا نہیں دیتا۔''

نظام نے منہ بنا کر کہا۔ ''گویا آپ کو اپنے غلام پر اعتبار نہیں ہے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''مجھے تجھ پر پورا اعتماد ہے لیکن کتے کو اپنے ساتھ لانے میں حرج بھی کوئی نہیں۔''

داؤد کے ساتھ چار اور آدمیوں کو دیکھ کر نظام اور زیادہ گھبرا گیا، پوچھا۔ ''کیا یہ بھی کتے کی طرح وفاداری میں یہاں آگئے ہیں؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''ان باتوں سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ تیرے جملہ سوالات کا میرے پاس ایک ہی معقول جواب ہے، وہ یہ کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، جو چاہوں کروں، کسی اور کو دخل اندازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

نظام نے داؤد کو برہم محسوس کیا تو خاموشی اختیار کی۔

اندر پہنچتے ہی سعدیہ واری ہوگئی اور بڑی دیر تک داؤد کے کندھے پر سر ٹکا کر آنسو بہاتی رہی۔ اس موقع پر نظام وہاں سے ہٹ گیا۔ سعدیہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ''آپ کا آنا مشتبہ تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ واقعی آجائیں گے۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''تجھے یقین کیوں نہیں تھا؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''آپ نے اب تک مجھ سے جتنے بھی وعدے کیے ہیں، ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ اس لیے میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھی کہ شاید آپ نہیں آئیں گے۔''

داؤد نے مسکرا کر کہا۔ ''غلط، بالکل غلط۔ میں نے صرف ایک وعدہ نہیں پورا کیا۔ وہ وعدہ تھا تجھ سے شادی کرنے کا۔''

سعدیہ روہانسی ہوگئی۔ ''خدا کے لیے مجھے وہ باتیں نہ یاد دلایئے ورنہ میں زور زور سے رونے لگوں گی۔''

داؤد نے جابرانہ انداز میں کہا۔ ''سعدیہ! تجھے اختیار ہے چاہے آہستہ رو یا زور زور سے رونا شروع کردے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی بہت پچھتاتا ہوں کہ تجھ سے شادی کیوں نہیں کرلی۔''

سعدیہ نے بات کاٹ دی۔ ''اگر آپ ذرا بھی پچھتائے ہوتے تو آج میں آپ کی بیوی ہوتی۔''

داؤد نے کہا۔ ''تیرا کیا خیال ہے، میں تجھ سے شادی کرلوں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''اس سے اچھی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔''

داؤد نے اپنا ہاتھ سعدیہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''تو لا، اپنا ہاتھ دے دے میرے ہاتھ میں، کر وعدہ۔''

سعدیہ نے اپنا ہاتھ داؤد کے ہاتھ میں دے دیا پھر ذرا آنکھ دبا کر پوچھا۔ ''سعدیہ! کیا خیال ہے، کیا آج کی رات میں تیرے پاس ہی رہ جاؤں؟''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں، حویلی آپ کی، میں آپ کی، یہاں کی ہر چیز آپ کی۔''

داؤد نے کہا۔ ''اور تیرا بھائی نظام کیا کہے گا؟ وہ تو میری اچھی طرح مخالفت کرے گا۔''

سعدیہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بھائی نظام بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے آج تک میرے کسی بھی معاملے میں میری مخالفت نہیں کی۔''

داؤد کے چار آدمی باہر کھڑے اس کے حکم کے منتظر تھے۔

کچھ دیر بعد نظام دوبارہ آگیا۔ سعدیہ نے مسکرا کر کہا۔ ''بھائی نظام! یہ کہتے ہیں کہ میں تجھ سے شادی کرلوں گا۔ یہ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں کہ میں نے ان کے چہرے پر اذیت اور کرب کے نشان اور آثار بہت واضح محسوس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کر لیے۔"

نظام نے گویا سعدیہ کی بات سنی ہی نہیں بولا۔ "کھانا کتنی دیر میں کھلا رہی ہے تو؟ میرا خیال ہے اب شروع کر دیا جائے۔"

سعدیہ نے جواب دیا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد اعلان ہوا کہ کھانا لگایا جا چکا ہے، لوگ دسترخوان پر پہنچ جائیں۔

کھانے کا کمرا بہت شاندار اور سجا ہوا تھا۔ داؤد نے کتے کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے آدمیوں کو خاموشی سے حکم دیا کہ وہ جیسے ہی تالیوں کی آواز سنیں، اس کے پاس پہنچ جائیں۔

نظام نے ایک بار پھر کتے پر اعتراض کیا۔ "میرے آقا! کتا نجس العین ہے، اسے دفعان کر دیجیے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "لیکن آج اس نجس العین کو میں اپنے ساتھ ہی رکھوں گا، تو پریشان نہ ہو کیونکہ اس نے آج تک کسی کو بھی نہیں کاٹا۔"

نظام نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "لیکن میرے آقا! میں اس ناپاک جانور کو دسترخوان کے آس پاس بھی نہیں کھڑا ہونے دوں گا۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "نظام! کوئی ایسا ارادہ نہ کر جس پر تو قادر نہ ہو۔"

اس کے بعد داؤد نے ایک لقمہ کتے کے آگے پھینک دیا۔ کتے نے بڑی بے صبری سے لقمہ کھا لیا اور دوسرے کا انتظار کرنے لگا۔ داؤد نے کتے کو کئی نوالے کھلائے مگر کوئی خاص بات نہیں ظاہر ہوئی۔ آخر مطمئن ہو کر خود بھی کھانے لگا۔ نظام احتجاجاً چلا گیا۔ سعدیہ نے ساتھ دیا لیکن وہ نہایت تکلف سے کھا رہی تھی، نوالہ چباتے ہوئے بولی۔ "اگر بھائی نظام بدتمیزی سے چلے نہ جاتے تو وہ کھانے میں آپ کا ساتھ دیتے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا فرض میں انجام دے رہی ہوں۔"

داؤد کھانا کھاتا رہا لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے کھانے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کی۔ گھی یا تیل کی جگہ کسی اور ہی چیز کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سعدیہ سے پوچھا۔ "کھانے میں کیسا گھی استعمال کیا ہے تو نے؟ عجب مزہ ہو گیا ہے سالن؟"

سعدیہ مسکرائی، بولی۔ "گھی میں معلوم نہیں کیوں ذرا سی بو پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے بو کی پروا نہیں کی اور اب پچھتا رہی ہوں کہ مجھے اس گھی میں سالن نہیں پکانا چاہیے تھا۔"

داؤد نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ فارغ ہونے کے بعد کچھ سستی اور جسم میں سنسناہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ داؤد نے خود کو سنبھالے رکھا اور سعدیہ سے کہا۔ "سعدیہ! آج رات میں یہیں رہوں گا، نظام کو یہ بات بتا دی ہے؟"

سعدیہ نے جواب دینے کے بجائے نظام کو آواز دی۔ "نظام! کہاں بیٹھ گئے۔ اب آ جاؤ، کام ختم ہو گیا۔ اب یہ ملک التجار اپنے قابو میں ہے، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

جواب میں نظام مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی داؤد کو ایک زنانے دار ہاتھ رسید کر دیا، بولا۔ "تو بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے۔ واللہ دانتوں پسینا آ گیا۔"

داؤد کا سر چکرانے لگا۔ اس نے اپنے کتے کو تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس کے پورے جسم میں جھنجھناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ سر میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ داؤد نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میرا پورا جسم سن ہو رہا ہے، کیا تم دونوں نے مجھے زہر کھلا دیا ہے؟"

نظام نے جواب دیا۔ "نہیں، زہر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور میں یہ بھی کہوں گا کہ میں نے تجھے کچھ نہیں دیا۔ میں نے سعدیہ کے مشورے سے تجھے چند ایسی چیزیں کھلا دی ہیں جس سے تو چند ساعتوں میں فالج کا شکار ہو جائے گا اور فالج گرنے کا مطلب ہوگا کہ یہ مرض کسی انسان نے نہیں لگایا، آپ ہی لگ گیا ہے۔"

داؤد بڑی بے بسی سے رو دیا۔ "آہ ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا؟"

سعدیہ نے سفاکی سے کہا۔ "ہم دونوں نے کچھ بھی نہیں کیا سب تیرے کرتوتوں کی سزا ہے۔ اب بھگت اور اللہ سے توبہ استغفار کرتا رہ۔ ممکن ہے دوسری دنیا میں تیری یہ توبہ استغفار کام آ جائے کیونکہ اس دنیا میں تو یہ توبہ استغفار تیرے کام آنے سے رہی۔"

نظام نے داؤد سے سختی سے کہا۔ "داؤد! مجھے معاف کرنا، تو مجھے اپنے کاروبار میں جزوی حصے دار بھی نہیں بنا رہا تھا حالانکہ تیرے بعد اب سب کچھ میرے ہی تصرف اور اختیار میں ہوگا۔"

داؤد نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ خود کو مفلوج محسوس کر رہا تھا۔ اس نے نظام پر واضح کر دیا۔ نظام! ذلیل انسان! مجھے میرے اندر کا ہمزاد برابر یہ بتا رہا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا کہ سعدیہ اور نظام میرے خلاف ہیں اور کسی وقت بھی کوئی انتہائی اقدام کر سکتے ہیں۔''

نظام قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جب گر پڑے تو ہری گنگا۔ اب میں تیرے کاروبار کا پورا پورا مالک بنوں گا۔ تیری جائداد، تیرا کاروبار اور تیری نقدی۔ یہ سب میرے تصرف اور اختیار میں ہوگی۔''

داؤد کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی لیکن اسے اس حال میں بھی اپنی شکست منظور نہیں تھی۔ پورے وقار سے بولا۔ ''نظام! ذلیل، کمین اور محسن کش انسان! میری دو بیویوں کی موجودگی میں تو کیا پائے گا؟ کچھ بھی نہیں اور اس حال میں کہ وہ دونوں ہی تجھ سے نفرت کرتی ہیں اور اگر ان کا بس چل جاتا تو وہ دونوں تجھے اپنی راہ سے ضرور ہٹا دیتیں۔''

نظام اور زور سے بولا۔ ''اور کچھ؟ اور کچھ فرمایئے تاکہ میں ایک ہی سانس میں تیری ساری ہوائیوں کو اڑا دوں اور یہ بتا دوں کہ تیرے مقابلے میں، میں زیادہ شاطر ہوں۔''

داؤد کی قوتِ گویائی بھی جواب دے رہی تھی، بمشکل جواب دیا۔ ''فیروز بخت اور میری بیویوں کی اولاد میرے کاروبار، جائداد اور نقدی کی مالک ہوگی۔ ان کی موجودگی میں تو کچھ بھی نہیں۔''

نظام نے داؤد کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ دبا کر کہنا شروع کیا۔ ''داؤد! اس وقت میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں، اسے غور سے سن۔ تو ملک التجار تھا اور میں تیرا ادنیٰ گماشتہ۔ تو ملک التجار اس لیے بن گیا کہ تیرے ہم پیشہ حضرات میں ایک بھی تیرا ہم پلہ نہیں تھا۔ میں تیرا معمولی گماشتہ ہونے کی حیثیت سے تجھ سے اپنا موازنہ کرتا رہتا تھا اور ہمیشہ ہی خود کو تجھ سے اعلیٰ اور افضل پاتا تھا۔ پھر جب میں نے یہ سنا کہ تو شادی سے فرار ہے تو میرے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے کلبلانے اور سر اٹھانے لگے۔ آخر عجلت میں، میں نے ایک نادر تجویز سوچی اور اس پر نہایت ہوشیاری سے عمل بھی کر ڈالا اور اللہ کے فضل سے اس وقت میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اس میدان اور اس مقابلے میں تجھے شکست دے دی ہے۔''

اب داؤد سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ نظام نے سعدیہ کی طرف دیکھا تو سعدیہ نے کہا۔ ''نظام! یہ شخص چند ساعتوں کا مہمان ہے۔ اگر یہ زندہ بھی رہا تو فالج اسے ہمیشہ کے لیے معطل اور معذور کر دے گا اس لیے اسے شرمسار اور خجل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری باتیں بتا دی جائیں جن سے اس کی حماقت کا علم خود اسے بھی ہو جائے۔''

نظام ہنسا اور داؤد کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''چچا جان! خوش فہمی سے آج تک جن عورتوں کو آپ میری بہنیں سمجھتے رہے ہیں وہ میری بہنیں نہیں بیویاں تھیں۔ انہیں میں نے ہی آپ سے قریب کر دیا تھا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ ان دونوں کو اپنا آلۂ کار بنا کے آپ کی ہر چیز پر قبضہ کر لوں۔ چنانچہ انہیں جو کچھ بھی ملے گا، ان سے میں وصول کر لوں گا۔ میرے پورے منصوبے میں چند باتیں میری مرضی کے خلاف ہوئیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اپنی بیویوں کو آلۂ کار بنا کر تیری تجارت، جائداد اور نقدی پر قبضہ کروں لیکن کیفیہ اور نرجس نے مجھے سمجھایا کہ اس طرح کام بگڑ جائے گا اس لیے ان دونوں کا تیری بیویاں بن جانا بہت ضروری ہے چنانچہ وہ دونوں میری اجازت اور مرضی سے تیری بیویاں بن گئیں۔ بعد میں تیری خوش قسمتی نے زور کیا اور نرجس اور کیفیہ اپنی اس موجودہ زندگی سے مطمئن اور آسودہ نظر آنے لگیں اور میرے بار بار کے اصرار کے باوجود انہوں نے میرے آلۂ کار بنے رہنے سے صاف انکار کر دیا اور مجھے یہ دھمکی دی کہ اگر میں نے انہیں زیادہ مجبور کیا تو تجھے ساری باتیں بتا دیں گی۔ میں ڈر کر خاموش ہو گیا لیکن میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ نرجس اور کیفیہ مجھے دھمکی تو دے سکتی ہیں لیکن اس دھمکی پر عمل نہیں کر سکتیں کیونکہ میرے اس فریب اور چال میں وہ دونوں خود بھی شریک تھیں اور اس کا انکشاف خود انہیں تیری نظر سے گرا دیتا۔''

داؤد، نظام کی باتیں بڑی بے چینی سے سن رہا تھا۔ اس کے پورے جسم میں ایک آگ سی لگ رہی تھی، آہستہ سے بولا۔ ''فریب دھوکا۔''

نظام نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ ''اگر تو سعدیہ سے بھی شادی کر لیتا تو ہیں کہیں کا بھی نہ رہ جاتا لیکن جب کسی انسان پر قسمت مہربان ہوتی ہے تو اس کا ہر کام ہو کر ہی رہتا ہے چنانچہ سعدیہ تیری دلہن نہیں بن سکی اور میرا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ میں تیرے فلوج ہوتے ہی نرجس اور کیفیہ کو ان کے موجودہ منصب سے معزول کر دوں کیونکہ اب وہ میرے لیے قابلِ اعتبار نہیں رہیں۔ اب سعدیہ میری بیوی رہے گی اور میں تیری دولت، جائداد اور رقم سے اسے عیش کروا دوں گا، یہ بھی کیا یاد کرے گی۔ رہا فیروز بخت کا مسئلہ تو اسے اپنی راہ سے ہٹا دینا اتنا مشکل کام تو نہیں۔ پھر اس پر بھی دستِ شفقت پھیر کر حسبِ مرضی کام نکالا جا سکتا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک تو کھانے کا اثر داؤد کو پریشان کررہا تھا، دوسرے یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ کو مختل اور معطل کیے دے رہی تھیں۔ نظام نے مزید کہا۔ ''میرے منصوبے میں آپ کو زہر دینا شامل نہیں تھا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ آپ نہایت چالاک اور ہوشیار آدمی ہیں۔ آسانی سے قابو میں نہیں آئیں گے اور زہر دینے میں ہر وقت یہ احتمال رہتا کہ آپ کسی نہ کسی وقت زہر خورانی کو پکڑ لیں گے اور اس طرح ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ چنانچہ کئی اطبا کو رشوتیں دے کر ایک ایسا محلول حاصل کرلیا کہ اگر اسے کھانے میں شامل کردیا جائے تو اسے کھانے والا مفلوج ہوکر رہ جائے گا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اب آپ کبھی بھی اچھے نہیں ہوں گے اور یوں ہی سسک سسک کر اپنی جان دے دیں گے۔''

اب داؤد اپنے ہوش وحواس بھی کھو چکا تھا، سعدیہ نے کہا۔ ''نظام! میرا خیال ہے اسے کمرے میں بند کردیا جائے۔ وہاں اس کا کام تمام کردیا جائے گا اور جیسے ہی اس کا کام تمام ہوگا، نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اس کی ساری چیزوں پر قبضہ کرلیا جائے گا اور اگر کسی نے مجھ سے ٹکرانا بھی چاہا تو میں اسے چھٹی کا دودھ یاد کروادوں گی۔''

داؤد نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑلی ہیں اور پھر ان ٹانگوں کے ذریعے کھینچ کر اسے ایک کمرے میں بند کردیا گیا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی نظام کے ذریعے یہ خبر عام ہوچکی تھی کہ داؤد پر فالج گر گیا۔ نظام اور سعدیہ نے داؤد کو کیفیہ اور نرجس کے پاس پہنچادیا اور طنزاً کہا۔ ''اپنے شوہر کو سنبھالو، رات کھاتے کھاتے فالج کے حملے میں ڈھیر ہوگئے۔''

کیفیہ اور نرجس کی چیخیں نکل گئیں، نرجس نے کہا۔ ''بخدا! میں دعوے سے کہوں گی کہ تم دونوں نے داؤد کو ارادتاً اس حال کو پہنچایا ہے.....''

کیفیہ بولی۔ ''میں اس کی گواہی دوں گی۔''

نظام نے غصے میں کہا۔ ''خبردار! جو تم دونوں میں سے کسی نے بھی ایسی ویسی بات کی۔ اگر ایسی غلطی کی گئی تو اس کا انجام پہلے ضرور سوچ لینا کیونکہ مجھے تم دونوں سے زیادہ کوئی بھی نہیں جانتا۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ہمارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔''

حویلی میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔ نظام نے سعدیہ کو ان دونوں کے پاس چھوڑا اور خود کاروباری حویلی میں پہنچ کر رونے لگا۔ داؤد کا عملہ سناٹے میں آگیا اور کچھ دیر بعد یہ سارے ہی لوگ مفلوج داؤد کو دیکھنے پہنچ گئے۔ انہوں نے بے ہوش داؤد کو دیکھا اور اس کی دونوں بیویوں کو تسلیاں دینے لگے۔ ستار اور فیروز بخت بھی داؤد کے پاس کھڑے آنسو بہاتے رہے۔

ستار نے کیفیہ سے پوچھا۔ ''میری معزز مالکہ! میرے آقا کی بیماری میں کوئی سازش تو کارفرما نہیں ہے؟''

کیفیہ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے۔''

سعدیہ ان کی باتیں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

نرجس نے سعدیہ کے کان میں بڑی دردمندی سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تو داؤد سے شادی کررہی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ میرا خیال ہے اس سازش میں تو خود بھی شریک تھی۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو ایک بات بتائے بغیر نہیں رہ سکتی وہ یہ کہ نظام پرلے درجے کا حریص اور دولت پرست ہے۔ یہ شخص اپنے مفاد پر ہر شخص کو قربان کرسکتا ہے۔ اس نے داؤد کے خلاف کوئی سازش کی ہے تو میں تجھے یہ مشورہ دوں گی کہ تو نظام سے کنارہ کشی اختیار کرلے اور ہم دونوں کے ساتھ ہوجا۔''

سعدیہ نے حقارت سے جواب دیا۔ ''بہت بہت شکریہ۔ اول تو یہ ہم دونوں پر تہمت ہے کہ اپنے محسن داؤد کو ہم دونوں نے اس حال کو پہنچایا۔ دوسرے یہ کہ میں نظام کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے میرا ساتھ دیا ہے پھر میں اس کا ساتھ کیوں چھوڑ دوں۔''

کیفیہ نے غصے میں کہا۔ ''سعدیہ! تیری باتیں اس بات کی غمازی ہیں کہ ہمارے خدشات درست ہیں۔ اب تک نظام نے جو کچھ بھی کیا ہے بہت بھیانک ہے۔ اگر تو اس پر اعتبار کرتی ہے تو کرتی رہ لیکن ہم اس پر کسی قسم کا بھی اعتبار نہیں کرسکتے۔ اگر نظام نے ہم دونوں سے چھل کیا تو یہاں سے اسے وہ جواب ملے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔''

سعدیہ نے طنزاً کہا۔ ''چھل فریب میں تم دونوں خود بھی شریک ہو پھر تم کس منہ سے ایسی باتیں کررہی ہو۔ نظام کو جو کچھ کرنا ہے، وہ کرے گا اور دیکھنا یہ ہے کہ اسے اس کے ارادوں سے کون باز رکھتا ہے۔''

ان کی باتیں فیروز بخت اور ستار نے بھی سنیں۔ کیفیہ نے پُرجوش لہجے میں فیروز بخت کو آواز دی۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''فیروز بخت! ادھر آ۔''

فیروز بخت کیفیہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کیفیہ نے اسے شانوں سے پکڑ کر سعدیہ کے روبرو کھڑا کر دیا۔ ''سعدیہ! اسے دیکھ اور خوب غور سے دیکھ لے۔ یہ دوسرا داؤد ہے جو مفلوج داؤد کے کاروبار، جائداد اور نقدی کو سنبھالے گا۔ ہم دونوں اور داؤد کا پورا کاروباری عملہ اس کی مدد کرے گا۔''

سعدیہ نے فیروز بخت کو گھور کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

اطبا نے سر توڑ کوششیں کی کہ داؤد کو اچھا کر لیں لیکن ناکام رہے۔ ملک التجار داؤد کا مفلوج ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ خبر ہر طرف پھیل گئی اور عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اب ہر شخص کو داؤد اور اس کی دونوں بیویوں، ان کی اولاد اور فیروز بخت سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ چالاک نظام نے ہوا کا رخ دیکھتے ہی نرجس اور کیفیہ کی خوشامدیں شروع کر دیں۔ ان دو کے علاوہ تیسرا فیروز بخت تھا جس کی خوشامد میں لگا رہتا۔

سعدیہ کو یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ نرجس اور کیفیہ سے خوش اخلاقی یا محبت سے ملا جائے لیکن موقع پرست اور ابن الوقت نظام ان تینوں کو رام کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان میں سب سے بھولا فیروز بخت تھا۔ نظام نے سوچا کہ پہلے اسے قابو میں کیا جائے، اس کے بعد کسی اور کو بے بس کیا جائے۔

لیکن کیفیہ اور نرجس اپنے طور پر فیروز بخت کو نظام کے خلاف کرنے میں مشغول تھیں۔ سعدیہ اور نظام نے کھیل بگڑتے جو دیکھا تو خاصے پریشان ہو گئے۔ کیفیہ اور نرجس نے ان دونوں کے خلاف معاندانہ روش اختیار کی اور ان دونوں کا اپنی حویلی میں داخلہ تک بند کر دیا۔ تجار کی نظر میں نظام کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ سعدیہ سے کہتا۔

''سعدیہ! یہ تو معاملہ الٹا ہو گیا۔''

سعدیہ نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''جو کام کسی اعلیٰ منصوبہ بندی کے بغیر کیا جائے گا، اس کا یہی انجام ہو گا۔''

نظام نے پوچھا۔ ''لیکن اب میں کیا کروں؟ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''اب بھی چند ایسی تدبیریں موجود ہیں جن کو کھیل کر پانسا پلٹا جا سکتا ہے۔''

نظام نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ... کون سی تدبیریں؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''میں وہ تدبیریں بتا تو سکتی ہوں لیکن ڈر یہ ہے کہ تم مجھے دھوکا دے دو گے۔''

نظام نے تلملا کر کہا۔ ''ایسا نہیں ہو گا سعدیہ... تو مجھ سے جیسی چاہے قسم لے لے، میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔''

سعدیہ کوئی جواب دیے بغیر سامنے سے ہٹ گئی۔ نظام نے اس کا پیچھا کیا اور دوسرے کمرے میں پہنچ گیا، بولا۔ ''سعدیہ! تو میری بات کا یقین کر، میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔''

سعدیہ نے جواب دیا۔ ''میں نرجس اور کیفیہ سے ملوں گی اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کروں گی۔ ان میں سے ایک بھی اگر قابو میں آ گئی تو میں تجدید راہ و رسم کروا دوں گی۔ آگے کا کام تمہارا ہو گا۔ ایک سے شادی کر کے دوسری کو اپنی راہ سے ہٹا دینا۔ تمہاری دوسری بیوی میں رہوں گی اور داؤد کی ہر چیز پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنی اس بیوی کا بھی کام تمام کر دینا ہو گا پھر ہم دونوں رہ جائیں گے اور اللہ نے چاہا تو خوب عیش کریں گے۔''

نظام نے تشویش سے پوچھا۔ ''اور فیروز بخت کا کیا ہو گا؟''

''اسے میں قابو کر لوں گی۔''

ایک ہفتے بعد داؤد کا انتقال ہو گیا اور اسے نہایت شاندار طریقے سے دفن کر دیا گیا۔ جنازے میں تجار کے علاوہ قلعے دار، حاکم شہر، امرا اور بعض دوسرے عہدے داروں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر قاضی نے داؤد کی اس وصیت کا اعلان کر دیا جس کی رو سے دو تہائی کا حق دار فیروز بخت قرار پایا تھا اور بقیہ ایک تہائی میں دونوں بیویاں اور ان کی اولاد شامل تھی۔ سعدیہ کو حویلی مل گئی تھی۔ نظام کو کچھ بھی نہیں ملا تھا، اس وصیت نامے کے اعلان نے نظام کی ہمت توڑ دی اور اسے، داؤد کی فتح مندی اور اپنی شکست فاش کا احساس شرمسار کرنے لگا۔ احمد آباد کے دوسرے مشہور تاجر وصی احمد نے فیروز بخت کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اپنے قول اور فعل سے نظام کو متنبہ کر دیا کہ اب فیروز بخت سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کا مطلب وصی احمد کے خلاف اعلان جنگ ہو گا اور نظام میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وصی احمد سے مقابلہ کرے۔

جاری ہے

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ دعوت و عزیمت — سید ابوالحسن ندوی
اکبر — امین اثیر
طبقات ناصری — منہاج سراج
طبقات الاولیا — علامہ عبدالوہاب
الطبری — ابی جعفر جریر الطبری
السیرۃ النبویہ — السعودی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مقابلہ

کاشف زبیر

کبھی کبھی ایسے حالات و واقعات پیش آتے ہیں کہ انسان اپنے مزاج اور ماحول سے یکسر مختلف روپ دھارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی بدلاؤ اس کی زندگی میں بھی آیا اور ہوا کی سرسراہٹ سے بھی سہم جانے والا بلا خوف و خطر موت سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گیا... بالآخر برہم حالات میں بھی قدرت نے اس کا بھرم رکھ لیا۔

دوست نما دشمن کی محبتوں کا بے باق حساب کتاب

وہ مشکل سے بارہ سال کا لڑکا تھا۔ بے پناہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے فر کا بنا ہوا بھاری کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں سنگل بیرل بائیس بور کی رائفل تھی۔ لکڑی کا دستہ اس کے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔ دور برف سے ڈھکے میدان میں برف کی طرح براق سفید گھوڑا ایک کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ شدید برف باری نے پورا ماحول سفید کر دیا تھا۔ لڑکے کے عقب میں اس کا باپ موجود تھا۔ ہاتھ میں رائفل ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تذبذب کے آثار تھے۔ اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''پاپا! میں نہیں کرسکوں گا۔''

''الیکس! تم کرو گے۔'' رومونوف نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ سخت مزاج شخص تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بھی اس کے اندر نرمی نہیں تھی۔ رومونوف وکٹر سابق آرمی آفیسر تھا۔ فوج چھوڑنے کے بعد وہ گھوڑے پالنے لگا تھا جو فوج کو فراہم کیے جاتے تھے۔ سائبیریا کے اس دور افتادہ علاقے میں آبادی بہت کم تھی اور یہاں خاص طور سے مشرقی کریمیا سے لوگ لاکر بسائے گئے تھے۔ ان میں ایک وکٹر خاندان بھی تھا۔ یہ لوگ مویشی پروری کے ساتھ ساتھ فوجی ملازمت بھی کرتے تھے۔ رومونوف صرف چودہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوگیا تھا، بتیس سال کی عمر میں وہ ریٹائرڈ ہوگیا اور اب آبائی کام کر رہا تھا۔ سوویت یونین میں نجی پیشے کی اجازت نہیں تھی مگر رومونوف کو خاص طور سے گھوڑے پالنے اور فوج کو سپلائی کرنے کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ الیکس وکٹر اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ الیکس کے علاوہ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔

گزشتہ کچھ عرصے سے بھیڑیوں نے رومونوف کے فارم کو اپنے نشانے پر رکھ لیا تھا اور وہ اب تک اس کے دو گھوڑے ہلاک کر چکے تھے۔ اس کے بعد رومونوف بھیڑیوں کے خلاف جنگ پر اتر آیا۔ اس نے گھات لگا کر نصف درجن بھیڑیے ہلاک کر دیے۔ مگر اب بھی اس گروہ کے کچھ بھیڑیے باقی تھے جو اس کے گھوڑوں کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے بھیڑیوں کا سربراہ جو ایک عظیم الجثہ بھیڑیا تھا، رومونوف ہر قیمت پر اسے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اس نے سربراہ کو ہلاک کر دیا تو اس کے بعد بھیڑیے اس کے فارم کا رخ نہیں کریں گے۔

دس سال کی عمر میں رومونوف نے الیکس کو نشانے بازی کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ الیکس خاموش فطرت اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا، اسے جانوروں اور ہتھیاروں سے زیادہ پھول اور پودوں میں دلچسپی تھی مگر ساتھ ہی وہ ہر کام پوری دل جمعی سے کرنے کا عادی تھا، چاہے وہ اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ دو سال میں وہ ماہر نشانہ باز بن گیا تھا۔ وہ سو گز دور رکھی بیئر کی بوتل اڑا دیتا تھا مگر اس نے آج تک کسی جاندار کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ جب بھیڑیوں نے رومونوف کے فارم پر حملے کیے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ الیکس کسی جاندار پر اپنی نشانے بازی آزمائے اور وہ اس خیال سے پریشان تھا۔ باپ سے ڈرتا تھا اس لیے صاف انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں کہا کہ وہ شاید ایسا نہ کر سکے مگر رومونوف نے توجہ نہیں دی۔

باقی ماندہ بھیڑیوں کے لیے رومونوف نے ایک ناکارہ ہوجانے والے گھوڑے کو چارا بنایا تھا۔ اس کے کھر میں چوٹ آئی تھی جس سے کھر کا نصف حصہ گل گیا تھا۔ اب وہ گھڑسواری کے لیے بیکار تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ بہت خوب صورت اور صحت مند جانور لگتا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک اس طرح سفید تھا کہ اگر ساکت ہوتا تو برف کے پس منظر میں مشکل سے ہی نظر آتا۔ رومونوف اور الیکس ایک جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہاں سے گھوڑا کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا اور اب انہیں بھیڑیوں کا انتظار تھا۔ اچانک رومونوف نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک بھیڑیا آگیا ہے۔''

''کس طرف ہے؟'' الیکس نے سر ہلائے بغیر پوچھا۔ وہ بدستور رائفل پکڑے ساکت تھا۔ گھوڑے نے بھیڑیے کی آمد محسوس کر لی تھی اور وہ مضطرب تھا۔

''دائیں طرف سے۔'' رومونوف نے جواب دیا۔ ''اس نے باڑ پھلانگ لی ہے۔ جب میں کہوں تو رائفل کو ہلکا سا اس طرف کرنا۔''

الیکس نے سر ہلایا مگر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی۔ اچانک رومونوف نے سرگوشی میں کہا۔ ''وہ آگیا ہے، اسے نشانہ بناؤ۔''

الیکس نے رائفل کا رخ ہلکا سا بدلا اور اس تنومند بھیڑیے کا نشانہ لینے لگا جو اب تیز قدموں سے گھوڑے کی طرف لپک رہا تھا اور گھوڑا آنے والے خطرے سے بچنے کے لیے اچھل کود کر رہا تھا مگر وہ خود کو رسی سے آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ رومونوف چلایا۔ ''گولی چلاؤ۔''

الیکس کی انگلی لبلبی پر کانپ رہی تھی اور وہ کوشش کے باوجود بروقت فائر نہیں کر سکا۔ بھیڑیے نے گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور اس کی گردن پر دانت گاڑ دیے تھے۔ الیکس نے گولی چلائی مگر نشانہ نہیں لگا۔ رومونوف نے غصے میں اپنے بڑی سی فر والی ٹوپی اتار کر نیچے پٹخ دی اور اپنی رائفل سے بھیڑیے کا نشانہ لیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی بھیڑیے کے سر میں اتر گئی اور وہ مردہ ہوکر نیچے گرا مگر اتنی دیر میں وہ گھوڑے کی شہ رگ ادھیڑ چکا تھا۔ جب وہ میدان میں پہنچے تو گھوڑا اور بھیڑیا زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ ان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کا خون سفید برف پر نمایاں تھا۔ رومونوف نے بیٹے کی طرف دیکھا اور موسم سے زیادہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم کبھی اچھے نشانے باز نہیں بن سکتے۔''

☆☆☆

دخانی اسٹیمر دریائی بندرگاہ پر رکا ہوا تھا اور دور اٹھتے بھوئیں کے پس منظر میں شعلے چمک رہے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گولوں کے دھماکے یہاں تک سنائی دے رہے تھے مگر بندرگاہ پر موجود افراد ان کا نوٹس لیے بغیر اپنے کاموں میں لگے تھے۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ گزشتہ تین مہینے سے اسی قسم کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ ڈاک سے نوجوان سپاہیوں کا ایک جتھا اسٹیمر میں سوار ہو رہا تھا اور ان کے چہروں پر خوف کا عالم تھا۔ ان سب نے نئی وردی پر نئے گرم کوٹ پہن رکھے تھے مگر ان میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھے اور انہیں محاذِ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ ایک سارجنٹ میگافون پر چلّا چلّا کر انہیں اسٹیمر میں سوار ہونے کو کہہ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ انہیں بتا رہا تھا کہ انہیں بہادری سے مادرِ وطن پر چڑھ دوڑنے والے نازی جرمن دشمنوں سے لڑنا ہے۔ بزدلی دکھانے اور فرار کی سزا صرف موت تھی۔ تقریباً اسّی نوجوان سپاہیوں پر مشتمل دستہ اسٹیمر میں سوار ہوا اور وہ ڈاک سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ دریا میں بے شمار کشتیاں اور اسٹیمر تھے۔ یہ سب اس وقت سوویت فوج کے لیے کام کر رہے تھے۔

اسٹالن گراڈ تین مہینے سے جرمنوں کے محاصرے میں تھا۔ سوویت یونین پر چڑھ آنے والے جرمن بہت تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے اس اہم ترین صنعتی شہر تک آن پہنچے تھے۔ اس وقت یہ روس کا صنعتی حب تھا مگر جرمن... بے پناہ جنگی قوت اور کوشش کے باوجود اسٹالن گراڈ پر قابض نہیں ہو سکے تھے۔ نازیوں کی نظر یہاں تیل صاف کرنے والے کارخانوں پر تھی۔ وہ ان پر قبضہ کر کے اپنی جنگی مشینری کو قوت فراہم کر سکتے تھے۔ وہ اکتوبر میں یہاں آئے تھے اور اب جنوری کا آخر تھا۔ سردی اور برف باری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ روسی فوج جرمنوں کے مقابلے میں نہ تو تربیت یافتہ تھی اور نہ ہی اچھے ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ اسے بس ایک ہی فائدہ تھا کہ اس میں لڑنے اور مرنے کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تین مہینے کے مختصر عرصے میں اس محاذ پر ایک ملین افراد مارے جا چکے تھے۔ ان میں سے اکثریت روسیوں کی تھی مگر جرمنوں کا جانی نقصان بھی کم نہیں تھا اور انہوں نے اس محاذ پر اپنی چھٹی آرمی کھو دی تھی۔

اسٹیمر تیزی سے جنگ والے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا اور سارجنٹ سپاہیوں کو بتا رہا تھا کہ انہیں جرمنوں کی ایک مشین گن چیک پوسٹ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کرنا تھا مگر سارجنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ اس اہم پوسٹ پر سوویت فوج کے ایک درجن حملے ناکام ہو چکے تھے اور ان حملوں میں ہزار سے زیادہ سپاہی مارے گئے تھے۔ یہ سپاہی ابھی ٹریننگ مکمل کر کے آئے تھے اور انہیں عملی جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے جیسے جیسے کنارہ نزدیک آ رہا تھا ان کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر سارجنٹ سے کہا۔ ''تم ہمیں موت کے منہ میں بھیج رہے ہو۔ ہمارا لیڈر کون ہے اور ہمیں اس محاذ کے بارے میں کچھ نہیں پتا ہے۔''

''خاموش ہو کر بیٹھو۔'' سارجنٹ نے غرا کر کہا مگر نوجوان نہیں بیٹھا بلکہ اس نے اچانک پلٹ کر دریا میں چھلانگ لگائی اور یخ بستہ پانی میں تیرتے ہوئے اسٹیمر سے دور جانے کی کوشش کرنے لگا مگر اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ سارجنٹ نے اپنا پستول نکال کر عقب سے اس پر گولی چلائی اور وہ ساکت ہو گیا۔ سرخ ہوتا پانی اس کی لاش بہا کر لے گیا تھا۔ سارجنٹ نے پستول واپس رکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''جس نے فرار کی کوشش کی اس کا یہی انجام ہوگا۔''

الیکس دم بخود بیٹھا ہوا تھا۔ چھ مہینے پہلے اسے جبری بھرتی پروگرام کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا اور اب تربیت دے کر براہِ راست گرم محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی سب نوجوان تھے جنہوں نے تربیت حاصل کی تھی۔ اسٹیمر کنارے لگا تو انہیں ہانک کر اتارا جانے لگا اور کنارے پر موجود مسلح فوجی انہیں ایک کیمپ میں لے آئے۔ وہاں انہیں محاذ کے بارے میں مختصر سی بریفنگ دی گئی۔ نقشے سے وضاحت کی گئی کہ جرمن مشین گن پوسٹ کہاں تھی۔ یہ سارا علاقہ میدانی تھا مگر مشین گن پوسٹ ذرا بلندی پر تھی اور وہاں سے جرمن، روسی مورچوں پر فائرنگ کرتے تھے۔ الیکس سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح حملہ کریں گے، ان کے پاس تو اسلحہ ہی نہیں تھا۔ اس کے برابر میں موجود نوجوان نے کہا۔

''ہمارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ ہم لڑیں گے کیسے؟''

''یہ ہمیں اسلحہ دیں گے۔'' الیکس نے امید کے ساتھ کہا۔ ''بغیر ہتھیار کے ہم کیسے لڑ سکتے ہیں؟''

اس مختصر بریفنگ کے بعد انہیں بتایا گیا کہ اسلحہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.youtube.net

انہیں آگے دیا جائے گا اور اب انہیں یہاں سے محاذ کی طرف جانا تھا۔ وہ کیمپ سے نکل کر اس جنگل کی طرف روانہ ہوگئے جس کے پار جرمن پوسٹ تھی۔ جنگل کے آغاز میں انہیں اسلحہ دیا گیا مگر اس طرح کہ کسی کو رائفل دی جا رہی تھی اور کسی کو اس کی گولیاں جو چھ چھ کے پیک میں تھیں۔ الیکس حیران تھا کہ وہ ان معمولی رائفلوں سے جرمنوں کی محفوظ مشین گن پوسٹ کیسے فتح کریں گے جس میں بھاری والے مشین گن لگی ہوئی تھی اور عام جرمن سپاہی بھی مشین گن سے مسلح تھا مگر سوال کرنے یا ہچکچانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ ایک خوفناک سارجنٹ یہاں بھی میگا فون لیے انہیں لڑنے اور مرنے پر اکسا رہا تھا اس کا زیادہ زور دھمکیوں پر تھا کہ کسی نے فرار کی کوشش کی یا واپس آیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ اس کی باتوں سے الیکس کو لگا کہ جتنا خطرہ آگے سے تھا، انہیں اتنا ہی خطرہ پیچھے سے بھی تھا۔ الیکس کے حصے میں ایک خالی رائفل آئی۔ رائفل اور کارتوس الگ الگ دینے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ خود روسیوں کو خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی نوجوان اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف نہ پھیر دے۔

چند منٹ بعد وہ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور عقب سے میگا فون پر چنگھاڑتے سارجنٹ کی آواز یہاں تک آ رہی تھی اور لازمی بات تھی کہ جرمنوں نے بھی یہ چیخ و پکار سن لی تھی۔ ابھی وہ نصف جنگل میں تھے کہ بھاری مشین گن گرجنے لگی۔ جنگ نے جنگل کا حلیہ پہلے ہی بگاڑ دیا تھا۔ گولیاں اتنی خطرناک تھیں کہ تنے کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ انسانوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مشکل سے چند منٹ آگے بڑھنے والے نصف نوجوان خاک و خون میں غلطاں ہو چکے تھے اور باقی افراتفری میں اپنی جان بچانے کے لیے دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ کیونکہ واپس آنے کا انجام انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ الیکس بھی اندھا دھند بھاگنے والوں میں شامل تھا۔ چند منٹ بعد اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک ویران قصبے میں جا نکلا۔ یہ جگہ اسٹالن گراڈ کے نواح میں تھی۔ بیشتر مکانات تباہ ہو گئے تھے اور باقی بھی بری طرح متاثر تھے۔ صرف چند ایک سالم مکانات کھڑے تھے۔ قصبے کے وسطی چوک کے فوارے کے حوض میں روسی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور یہ اتنی زیادہ تھیں کہ حوض اوپر تک بھر گیا تھا۔ لاشوں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کافی دن پرانی لاشیں بھی تھیں کیونکہ اوپر موجود لاشیں تازہ تھیں اور بعض کے زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے چند ٹینک اور دو گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ الیکس جلدی سے حوض میں گھس گیا۔ آنے والے جرمن تھے۔ دو گاڑیوں میں سے ایک اسٹاف کار بھی تھی اور اس سے ایک اعلیٰ جرمن آفیسر اترا۔ اس نے فاتحانہ نظروں سے اس ویران ہو جانے والے قصبے کو دیکھا اور حمام کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے ساتھ آنے والے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ انہیں یہاں بچ جانے والے روسیوں کی تلاش تھی۔ ان میں سے دو حوض کی طرف آنے لگے تو الیکس جلدی سے لاشوں کے درمیان لیٹ گیا اور اس نے کچھ لاشوں سے خون لے کر اپنے چہرے اور کوٹ پر مل لیا۔ مگر آنے والے.... بے وقوف نہیں تھے انہیں معلوم تھا کہ لاشوں میں زندہ افراد بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے انہوں نے حوض کے کنارے کھڑے ہو کر لاشوں پر اپنی ہلکی مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی، انہوں نے اس طرح دو طرف سے فائرنگ کی کہ کوئی فرد بچنے نہ پائے۔ الیکس آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور منتظر تھا کہ کب اس کا جسم چھلنی ہوتا ہے مگر معجزانہ طور پر وہ محفوظ رہا۔ جرمن سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوئے اور وہ اٹھا تو ذرا دور ایک عینک والے نوجوان کو دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ بھی خود کو ٹٹول رہا تھا۔ اس نے الیکس سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

''الیکس وکٹر ساتویں رجمنٹ سے، میں ابھی تربیت حاصل کر کے آیا ہوں۔''

''میں بھی۔'' دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میکس لائنوف، میں ایک صحافی ہوں اور مجھے بھی جبری بھرتی کر لیا گیا۔''

الیکس دیوار کے سوراخوں سے دیکھ رہا تھا۔ جرمن افسر حمام کی نصف ٹوٹی دیوار کے دوسری طرف بوائلر کی ٹنکی کے نیچے کھڑا ہوا غسل کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنی وردی اتار کر دیوار پر لٹکا دی تھی اور اب اس کا گنجا سر دکھائی دے رہا تھا جس پر وہ صابن مل رہا تھا۔ حمام کے باہر دو مسلح سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ نزدیک ہی کہیں جرمن توپیں تواتر سے گولہ باری کر رہی تھیں کیونکہ رہ رہ کر گولے کی پرواز کی سنسناتی آواز آتی اور پھر اس کے گرنے کا دھماکا سنائی دیتا تھا۔ جرمن افسر کے ساتھ کل آٹھ افراد تھے۔ ان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں سے پانچ گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ اچانک الیکس کو خیال آیا اور وہ مردہ سپاہیوں کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میکس نے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میرے پاس رائفل ہے، مجھے گولیوں کی تلاش ہے۔''

''گولیاں میرے پاس ہیں۔'' میکس نے کلپس نکال کر دکھائے۔ ''مگر تم ان سے کیا کرلو گے؟''

''میں اس جرمن کو نشانہ بناؤں گا۔'' الیکس نے حمام میں غسل کرنے والے جرمن افسر کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ وہ مارا جائے گا لیکن اس کے بعد اس کے آدمی ہمیں بخشیں گے؟''

''تم گولہ گرنے کی آواز سن رہے ہو، ہمیں پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ گولہ گرنے والا ہے۔ میں اسی حساب سے فائر کروں گا۔ گولی کی آواز دھماکے میں دب جائے گی۔''

''ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔'' میکس نے کہا۔ ''رائفل مجھے دو۔''

الیکس نے سوچا اور رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ ''افسر کو نشانہ بنانا ہے۔''

میکس نے کارتوس پیک فٹ کر کے ایک سوراخ سے رائفل کی نال نکالی اور نشانہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد گولے کا دھماکا ہوا مگر اس نے فائر نہیں کیا۔ اس نے شرمندگی سے الیکس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں ہے۔''

''رائفل مجھے دو۔'' الیکس نے کہا تو میکس نے رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ الیکس نے سوراخ سے رائفل نکالی اور سب سے پہلے افسر کے پاس کھڑے سپاہی کا نشانہ لیا۔ وہ ایسی جگہ تھا کہ گرتا تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔ گولے کی سنسناہٹ کے ساتھ اس نے سانس روک لی اور دھماکا ہوتے ہی فائر کر دیا۔ سپاہی گر گیا۔ اس نے تیزی سے رائفل لوڈ کی اور دوسرے سپاہی کا نشانہ لیا اور اس بار بھی اس کا نشانہ درست بیٹھا۔ میکس سوراخ سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ داد دی۔ ''واہ، اتنا اچھا نشانہ۔''

الیکس نے تیسرا نشانہ جرمن افسر کو بنایا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر تھا اور گولی اسی پر لگی۔ اسی لمحے میکس نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ''ایک سپاہی اس طرف آ رہا ہے، اس نے شاید دیکھ لیا ہے۔''

''کس طرف ہے؟''

''دائیں طرف۔'' میکس نے کہا اور جلدی سے دیوار کے ساتھ ہو کر لیٹ گیا۔ وہ خود کو مردہ ظاہر کر رہا تھا۔

الیکس نے پوزیشن بدل کر اس سپاہی کو دیکھا جو اپنی مشین گن سنبھالے ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اگلے گولے کے ساتھ اسے نشانہ بنایا۔ گاڑیوں میں موجود سپاہیوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ ان کے افسر اور دوسرے ساتھیوں پر کیا گزری تھی۔ اب، راستہ صاف تھا۔ وہ اور میکس وہاں سے اٹھ کر نکل گئے۔

☆☆☆

میکس نے الیکس کا تعارف کرایا۔ ''جنرل سر! یہ الیکس وکٹر ہے ساتویں رجمنٹ سے۔''

جنرل گریگ فوراً سمجھ گیا۔ جس طرح ملا، الیکس کو اندازہ ہوا کہ اس کے کارنامے کی گونج فیلڈ ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئی تھی۔ کرنل ریف جرمن فورز کا دماغ تھا اور اس نے اسٹالن گراڈ کے محاذ پر روسی افواج کو شدید نقصان سے دوچار کیا تھا۔ الیکس نے اس کا خاتمہ کر کے جرمنوں کو بڑا دھچکا پہنچایا تھا۔ خاص طور سے ایسے وقت جب کہ جرمن اسٹالن گراڈ پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے اور حملے کی بڑی ذمے داری کرنل ریف کے سپرد تھی۔ جنرل گریگ نے اپنے تلے الفاظ میں الیکس کی تعریف کی اور مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''جرمن اسنائپر ہمارے لیے دردِ سر بن گئے ہیں۔ روزانہ ہمارے درجنوں آدمی ان کا نشانہ بن رہے ہیں اور اب ہمیں ان کا خاتمہ کرنا ہے۔''

یورپ میں ابتدائی فتوحات کے بعد جب جرمنوں کو دوسرے محاذوں پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ہٹلر کے حکم پر اسنائپرز کا شعبہ تشکیل دیا گیا۔ اس میں صرف ان افراد کو شامل کیا جاتا تھا جو اعلیٰ درجے کے نشانے باز ہوتے تھے اور ان کے لیے فوجی خدمات کی باقی شرائط معاف تھیں جیسے عمر کی حد یا پھر مکمل صحت وغیرہ۔ ان میں پندرہ سال کے لڑکوں سے لے کر ستر سال تک کے افراد شامل تھے اور بعض جسمانی معذوریوں کا بھی شکار تھے۔ ان افراد کو سرگرم محاذ پر بھیجا جاتا تھا جہاں یہ مورچے بنا کر دشمن فوج اور عام افراد کو نشانہ بناتے تھے۔ جنرل گریگ کا جوابی پلان یہ تھا کہ روسی نشانچیوں کا ایک دستہ تیار کیا جائے جو جرمن نشانچیوں کا خاتمہ کرے۔ اس نے دستہ تشکیل دے دیا تھا اور الیکس کیونکہ اعلیٰ درجے کا نشانے باز تھا اس لیے اسے اس گروپ میں خاص طور سے شامل کیا گیا تھا۔ اس نے نقشے پر اسٹالن گراڈ کے ایک نواحی صنعتی علاقے کا بتایا۔ ''یہاں وہ خاص طور سے سرگرم ہیں اور یہ جگہ محاذِ جنگ سے دور نہیں ہے۔ باقی تفصیلات تمہیں میجر مبس بتائے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

الیکس چونکا، میکس مسکرا رہا تھا۔ باہر آنے پر اس نے کہا۔ ''اس خبر کو سب سے پہلے میں نے بریک کیا اس لیے ہائی کمان کی طرف سے مجھے میجر کا عہدہ دیا گیا ہے اور اب میں یہاں سرکاری رپورٹر ہوں۔''

الیکس کو لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی۔ یعنی اب وہ چھوٹے درجے کا افسر تھا۔ مگر اس کا تعلق کسی مخصوص آرمی سے نہیں تھا بلکہ وہ اسنا پرز کے اس گروپ کا حصہ تھا جسے میدانِ جنگ میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ویسے وہ ساتویں رجمنٹ کا ایک حصہ تھا۔ شام تک وہ واپس اسٹالن گراڈ آچکے تھے اور یہاں روسی افواج کے زیرِ قبضہ علاقے میں ایک تباہ شدہ کارخانے کی عمارت میں اس کی ملاقات گروپ کے باقی ارکان سے ہوئی۔ یہ چار افراد تھے۔ جوزف، کریم، نتالیہ اور رونی۔ سوائے نتالیہ کے باقی تینوں تجربے کار سپاہی تھے اور برسوں سے جنگ کا حصہ تھے۔ انہیں نشانے کی وجہ سے اس گروپ میں شامل کیا گیا تھا۔ نتالیہ نوجوان تھی، مشکل سے بائیس برس کی حسین اور تر و تازہ لڑکی۔ الیکس کو افسوس ہوا کہ وہ اس سے محاذِ جنگ پر مل رہا تھا جہاں زندگی کے اگلے پل کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پردوں سے بنے اس کمرے میں ایک میز تھی اور چاروں طرف لکڑی کی بنچیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کمرا ان کے لیے مخصوص تھا۔ نتالیہ نے الیکس سے ہاتھ ملایا تو اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''میں نے سنا ہے تم نے ایک منٹ میں چار جرمن مار گرائے جن میں کرنل رینف جیسا بڑا شکار بھی تھا۔''

''اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں بڑا شکار کر رہا ہوں۔'' الیکس نے جواب دیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ براہِ راست جنگ کا پہلا موقع تھا۔ میں دو گھنٹے پہلے مشرقی گھاٹ پر اترا تھا اور میرے ساتھ آنے والے نصف سے زائد نوجوان صرف دس منٹ میں مارے گئے تھے۔''

''جرمن زیادہ خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔'' جوزف نے کہا۔ وہ لمبا تڑنگا، مضبوط جسامت اور سخت چہرے والا شخص تھا۔ کریم کا تعلق یوکرائن سے تھا۔ نسلاً وہ مسلم تاتاری تھا۔ رونی چھوٹی جسامت اور لڑکوں جیسے چہرے والا ہنس مکھ شخص تھا۔ اس کی عمر اس کے چہرے سے نہیں جھلکتی تھی۔ وہ سب خوش دلی سے الیکس سے ملے۔ جوزف اس گروپ کا سربراہ تھا۔ بیئر سے شغل کے بعد وہ کام کی طرف آئے۔ جوزف نے لالٹین کی روشنی میں میز پر ایک نقشہ بچھایا اور اس پر سرخ مارکر سے بنے سیکٹرز کی وضاحت کرنے لگا۔ ''یہ کل دس سیکٹرز ہیں۔ یہ سارا علاقہ کارخانوں اور گوداموں پر مشتمل ہے اور جنگ نے یہاں سب تباہ کر دیا ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہ اسنا پرز کے لیے آئیڈیل ہے۔ اتفاق سے یہ جرمنوں اور ہمارے درمیان میں ہے۔''

''جرمن اسنا پرز کتنے ہیں؟''

''اوپر والے سمجھتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ ہیں مگر مجھے معلوم ہے ان کی تعداد نصف درجن بھی نہیں ہے مگر وہ سب بہت ماہر اور چالاک ہیں۔ وہ ہم سے پہلے کام کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے یہاں آمد و رفت کے ٹھکانے اور مورچے بنا رکھے ہیں۔ اب ہمیں یہ کام کرنا ہوگا۔''

''ان کے پاس ہتھیار بھی بہتر ہیں۔'' رونی نے اپنی رائفل کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں اس قسم کے ہتھیار استعمال کرنا پڑتے ہیں۔''

''یہ زیادہ برے نہیں ہیں۔'' الیکس نے اپنی رائفل کو سہلایا۔ ''بشرطیکہ ہم اچھے طریقے سے استعمال کریں۔''

''ان کی حد زیادہ نہیں ہے۔'' جوزف نے خبردار کیا۔ ''جرمن رائفلوں کی حد زیادہ ہے اور ہمیں ان کا نشانہ لینے کے لیے زیادہ نزدیک جانا ہوگا۔''

''یہ ہماری مجبوری ہے۔'' نتالیہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ''اب میری دوسری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔''

''دوسری ڈیوٹی؟'' الیکس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نرس بھی ہوں۔'' نتالیہ بولی۔ ''شام کے وقت کچھ دیر فیلڈ اسپتال میں ہوتی ہوں۔''

''میں بھی چلتا ہوں، میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔''

''آؤ میں ڈاکٹر کو دکھا دوں گی۔'' نتالیہ بولی۔

وہ باہر آئے اور رکاوٹوں سے ہوتے ہوئے عمارت سے باہر نکل آئے۔ گلیوں میں ملبا بکھرا ہوا تھا اور جن جگہوں سے گزرنا خطرناک ہو سکتا تھا، وہاں روشنی کی گئی تھی۔ وہ تاریک گلیوں سے گزرنے لگے۔ برف باری نہیں ہوئی تھی مگر سردی انتہا کی تھی۔ وہ گرم کوٹوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ الیکس نے پوچھا۔ ''تم کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''یہیں کی۔'' نتالیہ نے کہا۔ ''میرا گاؤں شہر سے صرف تین میل دور ہے۔''

''تمہارے گھر والے؟''

''پہلے پورا گھر تھا۔'' نتالیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''اب صرف ماں ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' الیکس نے کہا اور پھر اپنے بارے میں بتایا۔ اس کے باپ کا دو سال پہلے انتقال ہوا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا اور ماں اس سے بھی پہلے گزر چکی تھی۔ اب اس کا دنیا میں سوائے دو بہنوں کے اور کوئی نہیں تھا مگر وہ دونوں بھی اس سے دور تھیں۔ ''میں نے آخری بار انہیں پاپا کی تدفین میں دیکھا تھا۔''

''میں محسوس کر سکتی ہوں کہ اپنے لوگوں سے بچھڑنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔'' نتالیہ نے کہا اور اس کے قریب ہو گئی۔ اس نے الیکس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا مگر انہیں بہت گھوم پھر کر جانا پڑا تھا۔ اسپتال ایک ایسی عمارت میں تھا جو گولہ باری کا نشانہ بنی تھی مگر اس کا مرکزی ہال سلامت تھا۔ نتالیہ نے اسے ایک ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ڈیوٹی پر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے پاؤں کی چوٹ دیکھی اور اسے چند گولیوں کے ساتھ ایک مرہم بھی دیا۔ الیکس کو خاص تکلیف نہیں تھی، وہ صرف نتالیہ کے ساتھ کے لیے یہاں تک گیا تھا۔ اگلے دن ان کا گروپ صبح سویرے روانہ ہوا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور باہر تاریکی تھی۔ انہوں نے سفیدی مائل خاکی لباس اور دیگر چیزوں کے ذریعے خود کو کیموفلاج کیا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی رائفلوں کی نال پر بھی کپڑے لپیٹے ہوئے تھے تاکہ ان کی چمک نمایاں نہ ہو۔ سب سے آگے جوزف تھا اور باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ وہ ایک تباہ شدہ فیکٹری میں داخل ہوئے۔ یہاں ہر طرف بڑے بڑے فولادی پائپ اور مشینری بکھری ہوئی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے وہ آہستگی سے حرکت کر رہے تھے تاکہ آواز نہ ہو۔ بالآخر وہ فیکٹری کے مرکزی ہال میں داخل ہوئے۔

''اس جگہ سے۔'' جوزف نے اوپری بالکونیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''درجنوں روسی سپاہی جرمن اسنائپرز کا نشانہ بن چکے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے، وہ یہیں ہوتے ہیں؟''

''نہیں، وہ اسی وقت آتے ہیں اور دوبارہ تاریکی ہونے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔'' جوزف نے کہا۔ ''آج ہم ان سے پہلے آئے ہیں اور اب ہمیں ان کے لیے گھات لگانی ہوگی۔''

جوزف انہیں مناسب جگہوں پر لگانے لگا اور اس نے بھیجنے سے پہلے کہا۔ ''یاد رکھنا، اپنی حفاظت تمہاری اپنی ذمے داری ہے۔ کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگائے گا۔''

الیکس اور رونی کو درمیانی فلور پر ایک ایسی جگہ ملی تھی جہاں سے پائپ مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ یہاں نہ صرف مناسب آڑ تھی بلکہ وہ یہاں سے چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے۔ نتالیہ اور کریم ایک جگہ تھے جبکہ جوزف اکیلا تھا۔ الیکس اور رونی نے روشنی ہونے سے پہلے اپنے مورچے بنا لیے۔ الیکس ایک پائپ کے اندر تھا اور یہاں سے وہ ایک طرف نظر رکھ سکتا تھا جبکہ رونی نے دو پائپوں کے درمیان والی جگہ منتخب کی تھی اور یہاں سے وہ الیکس کے عقب میں نظر رکھ سکتا تھا۔ اب انہیں انتظار کرنا تھا اور ایک نشانچی کے لیے سب سے صبر آزما کام یہی ہوتا ہے کہ اسے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد رونی نے سرگوشی میں کہا۔ ''کیا خیال ہے، وہ پہلے سے یہاں نہیں ہو سکتے اور اب روشنی کا انتظار کر رہے ہوں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' الیکس نے تسلیم کیا۔ وہ اپنی چھوٹی سی دوربین سے سامنے فیکٹری کے شیلف دیکھ رہا تھا۔ یہاں فیکٹری کے باہر کی سمت بھی ایسی جگہیں تھیں جہاں مورچا لگایا جا سکتا تھا مگر رات بے پناہ سردی میں رہنا آسان کام نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جوزف، نتالیہ اور کریم کہاں تھے؟ وہ ایسی جگہوں کو خاص طور سے کھوج رہا تھا جہاں سے ان تینوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اچانک اسے ایک شیلف میں معمولی سی حرکت محسوس ہوئی اور اس نے تیزی سے رائفل سنبھال کر اس کا رخ اس شیلف کی طرف کر دیا۔ رونی بھی چوکنا ہو گیا۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

الیکس نے جواباً اشارہ کیا کہ سامنے والے شیلف پر کوئی ہے۔ اس دوران میں وہ رائفل کی دوربین سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے ایک رائفل نظر آ گئی مگر وہ ساکت تھی۔ اس کی صرف نال نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں رونی بھی عقب کا جائزہ لے رہا تھا اور اب روشنی تیز ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے اشارے سے الیکس کو بتایا کہ اس نے بھی ایک نشانچی تلاش کر لیا ہے۔ مگر اس کی جھلک نظر نہیں آ رہی ہے بلکہ صرف نال دکھائی دے رہی ہے۔ الیکس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے رونی کو منع کیا۔ ''فائر مت کرنا۔''

مگر اسی لمحے ایک فائر کی آواز گونجی۔ رونی نے فوراً نفی میں سر ہلایا کہ فائر اس نے نہیں کیا ہے۔ پہلے فائر کے بعد دوسرے فائر کی آواز گونجی اور الیکس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''دھوکا..... یہ ٹریپ تھا۔''

اب رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی۔ جیسے ہی الیکس اوپر ہوا ایک گولی اس کی طرف آئی اور ٹن سے فولادی پائپ سے ٹکرائی۔ وہ واپس پائپ میں گھس گیا۔ رونی اپنی جگہ دبکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دائیں طرف اوپری سمت سے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

الیکس پھنس گیا تھا۔ فائروں سے لگ رہا تھا کہ جرمن کئی ہیں اور وہ بہتر پوزیشنوں پر تھے۔ پتا نہیں نتالیہ، جوزف اور کریم کس حال میں تھے۔ اس نے چلّا کر نتالیہ کو آواز دی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں۔'' نتالیہ کی آواز میں لرزش تھی۔ الیکس کا دل ڈوبنے لگا، کوئی مارا گیا تھا۔ رونی بھی فکر مند تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''سنو، میں نکل کر اس سمت فائر کروں گا اور تم پائپ کراس کر کے دوسری طرف جاؤ گے۔''

''اس میں خطرہ ہے۔''

''خطرہ مول لینا ہوگا۔'' رونی نے کہا۔ ''ہم پھنس گئے ہیں اور کوئی مارا بھی گیا ہے۔''

الیکس نے سر ہلایا۔ رونی نے اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر اس طرف فائر کیا جہاں جرمن موجود تھا اور الیکس نے اٹھ کر چھلانگ لگائی اور پائپ کے دوسری طرف جا گرا۔ وہ بال بال بچا تھا کیونکہ جرمن کی چلائی ہوئی گولی اس کے پاس سے گزری تھی۔ اب وہ محفوظ اور آزاد تھا۔ فائر کر کے رونی واپس آڑ میں چلا گیا تھا۔ اس نے اشارے سے الیکس کو جرمن کی پوزیشن بتائی۔ اس کے مطابق وہ درمیانی شیلف میں تیسری کھڑکی کے پاس تھا۔ الیکس نے آئینہ نکالا اور اسے بہت آہستہ سے آڑ سے نکال کر دیکھا۔ اس بار اسے نشانچی نظر آ گیا۔ اس کی چلائی گولی نے آئینے کے ٹکڑے کر دیے۔ الیکس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کی توجہ مجھ پر ہے، تم اس کی توجہ بٹاؤ۔''

رونی نے سر ہلایا۔ ''میں فائر کروں گا۔ اس کی توجہ ہٹے گی تو تم اس پر فائر کرنا۔''

الیکس تیار ہو گیا۔ رونی نے ذرا پیچھے سرک کر اچانک پائپ کے اوپر سے اٹھتے ہوئے شیلف کی طرف فائر کیے۔ وہ آڑ میں ہوا تھا کہ جرمن نے جوابی فائر کیے۔ دونوں نے عجلت سے کام لیا تھا اس لیے دونوں بچ گئے مگر الیکس نے سکون سے اس کا نشانہ لیا اور وہ گولی کھا کر شیلف پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اب وہ اس طرف سے محفوظ تھے۔ الیکس نے رونی سے کہا۔ ''ہمیں نیچے جانا ہوگا۔''

''یہ پائپ نیچے جا رہے ہیں۔'' رونی نے کہا۔

''کہیں پھنس نہ جائیں، آگے سے بلاک نہ ہوں۔''

''چانس لینا پڑے گا۔'' رونی نے پھر کہا۔ ''میں پہلے جاتا ہوں۔''

رونی پائپ میں گھس گیا۔ یہ دو فٹ قطر کا پائپ تھا۔ رونی اس میں غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد نیچے سے اس کی آواز آئی۔ ''میں پہنچ گیا۔''

مگر الیکس اس دور ان میں نیچے موجود جرمنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں نیم تاریکی تھی اور چھپنے کی جگہیں زیادہ تھیں۔ الیکس کا اندازہ تھا کہ کم سے کم تین جرمن اور موجود تھے۔ اسے خیال آیا کہ وہ انہیں یہاں سے بہتر نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس نے اوپر شیلف کی طرف دیکھا جس پر موجود جرمن مارا گیا تھا۔ وہاں سے باقی جرمنوں کے مورچے بہتر نظر آ سکتے تھے۔ وہ اس طرف بڑھا۔ اس میں خطرہ تھا مگر نیچے کے مقابلے میں کم تھا۔ وہ شیلف تک پہنچا تو اس نے جرمن کو وردی کے بجائے عام لباس میں پایا۔ صرف اس کے سر پر موجود سیاہ کیپ پر سواستیکا کا مخصوص نازی نشان بنا ہوا تھا۔ گولی نے اس کا سر اڑا دیا تھا۔ الیکس نے اس کی رائفل دیکھی جو بہت جدید قسم کی تھی اور اس پر لگی دوربین بھی شاندار تھی۔

الیکس نے اسے ڈھکیل کر جگہ بنائی اور اس کی رائفل کی دوربین سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ جلد اس نے دو جرمنوں کے مورچے تاڑ لیے اور ایک مورچے پر رائفل مرکوز کر لی۔ وہاں موجود جرمن وقفے وقفے سے فائر کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ نظر آ رہا تھا مگر باقی جسم آڑ میں تھا۔ الیکس نے سانس روک کر اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کیا تو اس کا ہاتھ اور رائفل کی نال نائب ہو گئی۔ ہاتھ پر زخم کھا کر وہ احتیاط بھول گیا تھا اور نیچے موجود الیکس کے کسی ساتھی نے اسے نشانہ بنایا۔ گولی کھا کر وہ کھلی جگہ پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ الیکس نے احتیاط کے طور پر اس کے سر میں گولی اتار دی۔ دو ساتھی گنوانے کے بعد جرمنوں کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پسپا ہو گئے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد الیکس نیچے پہنچا تو اس کے ساتھی کریم کی لاش کے پاس افسردہ کھڑے تھے۔ جرمن اسنائپر کی گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کر دیا تھا۔ نتالیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الیکس نے اپنی ٹوپی اتاری اور جوزف سے کہا۔ ''ہمیں اس کی لاش واپس لے جانی ہوگی۔''

''بہت مشکل ہے۔'' جوزف نے کہا مگر نتالیہ نے اصرار کیا۔

''الیکس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کریم ہمارا ساتھی ہے۔ ہم اسے واپس لے کر جائیں گے۔''

انہوں نے لکڑیاں اور کینوس تلاش کر کے اسٹریچر بنایا اور اس پر کریم کی لاش رکھ کر روانہ ہوئے۔ راستے میں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

انہیں بہت دشواری پیش آئی مگر وہ کامیاب رہے۔ کریم کی قربانی سے قطع نظر آج انہوں نے دُگنی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ روسی اسنائپر جرمن اسنائپروں پر حاوی رہے تھے۔ اس رات انہوں نے کامیابی کا جشن منایا۔ کریم کی موت کا دکھ زیادہ دیر نہیں رہا تھا کیونکہ یہ میدانِ جنگ کا حصہ ہوتا ہے۔ موت اور جنگ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نتالیہ اس جشن میں شریک نہیں تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جوزف نے اچانک کہا۔ ''یہ تم پر مرتی ہے۔''

الیکس خاموش رہا، رونی نے بھی تائید کی۔ ''تم سے اس کا رویہ بالکل مختلف ہے۔''

''ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔'' الیکس نے بچا ہوا گلاس حلق میں انڈیل لیا مگر جوزف نے یقین سے کہا۔

''ہوگی..... جلد ہوگی۔''

اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے الیکس اسپتال پہنچا۔ وہ نتالیہ کی تلاش میں تھا، تب اس نے دیکھا کہ وہ میکس کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں ایک طرف بیٹھے تھے۔ میکس جس طرح نتالیہ سے بات کر رہا تھا، اس کے دلی جذبات دور سے بھی محسوس ہو رہے تھے۔ نتالیہ ہنس رہی تھی مگر اس کے انداز میں میکس کی طرح جذبات کی جھلک نہیں تھی۔ الیکس خاموشی سے واپس آ گیا۔ جاتے وقت وہ خوش تھا مگر اب وہ اندر سے بھی چپ سا تھا۔ اس کے اندر نتالیہ کے لیے جو خانہ کھلا تھا، وہ بند ہونے لگا تھا۔ اس دن انہوں نے ایک مختلف سیکٹر کو چیک کرنا تھا۔ جوزف کا کہنا تھا کہ کل والے سیکٹر میں اب جرمن نہیں آئیں گے۔ یہ نشانچیوں کا اصول تھا کہ ایک بار جو جگہ دشمن کی نظر میں آ جاتی تھی، وہاں دوبارہ نہیں جاتے تھے بلکہ نیا ٹھکانا تلاش کرتے تھے۔ اس لیے آج جوزف نے نیا سیکٹر چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ نتالیہ آج ٹیم کا حصہ نہیں تھی۔ مگر اس سیکٹر میں انہیں جرمنوں کا سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ واپس آئے تو نتالیہ ان کی منتظر تھی۔ اس نے الیکس سے کہا۔

''میں تمہیں ایک بچے سے ملواتی ہوں۔''

بچہ بیرک کے باہر راہداری میں اپنا بکس رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جوتے پالش کرتا تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی مگر وہ چہرے سے ذہین اور سمجھدار لگ رہا تھا۔ نتالیہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ میخائل کورسکوف ہے۔ اس کے پاؤں میں بم کا ٹکڑا لگا تھا اس لیے اسپتال آیا۔ مجھے وہیں ملا تھا۔''

الیکس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''تم جوتے پالش کرتے ہو؟''

موسم سرما کی دل فریبیاں
فرصتی کے شارے کی مست خرامیاں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مایا جال ● باپ کی تلاش میں پُرخار راستوں پر گامزن بیٹی کا کٹھن سفر

ہوسِ زر کا ہولناک کھیل **امجد رئیس** کا انتخاب

آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے مشترکہ ساتھیوں کی ایک نرالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا معمار درپیش تھا۔ **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کی شمولیت

جواری ● **احمد اقبال** کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز

مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب، معاشرت، ماحول کی عکاسی، جرم اور محبت کی پُردرد ناقابلِ فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● برفیلے پہاڑوں اور خوشنما وادیوں میں قتل و خون کی پراسرار کارروائیاں

دوسری کہانی ● محبت اور عداوت کی جنگ میں کسی ایک کی فتح کا دل خراش فسانہ

چلتے چلتے

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''یس سر۔'' میخائل نے اعتماد سے کہا۔
''یہ جرمنوں کے علاقے میں بھی جاتا ہے۔'' نتالیہ نے انکشاف کیا تو الیکس چونک گیا۔
''جرمنوں کے علاقے میں؟ وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟''
''نہیں سر! کیونکہ میں ایک بچہ ہوں اور انہیں بھی جوتے پالش کرنے والے کی ضرورت ہے۔''
میخائل نتالیہ سے مانوس تھا اور اس وجہ سے کھل کر بات کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ جرمن کیمپ میں عام فوجیوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فوجی وردی میں نہیں ہوتے اور ان کے پاس فوجی ہتھیاروں کے بجائے صرف دوربین لگی رائفلیں ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد نصف ورجن سے زیادہ نہیں ہے اور وہ چال ڈھال سے بھی فوجی نہیں لگتے۔ وہ صبح سویرے جاتے ہیں اور رات میں تاریکی ہونے کے بعد واپس آتے ہیں۔ ان میں ایک طویل قامت نیم گنجا شخص بھی ہے۔ اس کے ساتھی اسے کارل میکر کہتے ہیں۔ کارل، میخائل سے اکثر جوتے پالش کراتا ہے۔ وہ اسے معاوضے کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی دیتا ہے۔ بچہ سمجھ کر وہ اس کے سامنے ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو خفیہ ہوتی ہیں اور میخائل نے جو سنا، اس کے مطابق کارل اور اس کے ساتھی اسنائپرز ہیں اور وہ گھات لگا کر روسی فوجیوں اور عام افراد کو شوٹ کرتے ہیں۔ الیکس نے میخائل سے جوتے پالش کرائے اور اسے چند سکے دیے تو وہ خوش ہو کر گیا۔ نتالیہ نے الیکس کی طرف دیکھا۔
''میرا خیال ہے یہ کارل ہی جرمن اسنائپرز کا سربراہ ہے۔''
''ہوسکتا ہے۔'' الیکس نے کہا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ ''تم میکس لائنوف کو جانتی ہو؟''
نتالیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو؟''
''میں نے اسے اسپتال میں تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔''
''وہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔'' نتالیہ نے بھی ہچکچا کر جواب دیا۔ ''ہم ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔''
''اس کے علاوہ بھی کچھ.....؟''
نتالیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میری طرف سے اور کچھ نہیں ہے۔''
الیکس نے اپنے اندر اطمینان محسوس کیا۔ ورنہ جب سے اس نے نتالیہ اور میکس کو ساتھ دیکھا تھا، اندر سے ایک عجیب سی خلش کا شکار تھا۔ ''اور میکس کی طرف سے؟''
اس بار نتالیہ نے دوسری طرف دیکھا۔ ''اس کے بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔''
الیکس گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''میکس میرا اچھا دوست ہے۔''
''میں جانتی ہوں لیکن وہ موقع پرست بھی ہے۔ اس واقعے سے اس نے کہیں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔''
الیکس سمجھتا تھا مگر اس نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔ میکس صحافی کی حیثیت سے فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور اسے میجر کا رینک بھی مل گیا تھا جبکہ الیکس صرف لیفٹیننٹ بن کر میدانِ جنگ میں خطرات مول لیتا پھر رہا تھا۔ اس نے نتالیہ سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو۔''
''کیوں؟''
''اس میں بہت خطرہ ہوتا ہے۔'' الیکس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ''تم نے دیکھا، ذرا سی غلطی سے کریم جان ہار گیا۔''
''ہاں لیکن اب میں اس گروپ کا حصہ ہوں۔''
''تم نرس ہو اس لیے اس ڈیوٹی سے بچ سکتی ہو۔''
''پہلے میں سوچ رہی تھی کہ اس کام سے انکار کر دوں۔'' نتالیہ نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ ''مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔''
''کیوں بدل دیا ہے؟''
''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' نتالیہ نے آہستہ سے کہا۔
''خطروں میں بھی؟''
''ہاں خطروں میں بھی۔'' نتالیہ نے اقرار کیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور الیکس بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا گیا تھا۔ پھر کوئی راہداری کی طرف آیا تو وہ جلدی سے الگ ہو گئے مگر ان چند لمحوں میں ان کے بیچ ہمیشہ کے لیے خاموش عہد و پیماں ہو گئے تھے۔ الیکس نے کہا۔
''اب میں پہلے سے زیادہ چاہتا ہوں کہ تم اسنائپرز کی جنگ سے دور رہو۔''
''مجھے اس کے لیے درخواست دینی ہوگی لیکن امید ہے کہ درخواست منظور ہو جائے گی کیونکہ نرسوں کی بہت کمی ہے۔''
''بس تم درخواست دے دو۔'' الیکس نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں جنرل گریگ سے بات کر سکتا ہوں۔''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''
☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

الیکس، جوزف اور رونی عمارتوں کے ملبے کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ الیکس نے میخائل سے حاصل شدہ معلومات سے جوزف کو آگاہ کیا تو اس نے انکشاف کیا کہ اس نے بھی کارل کے بارے میں سنا ہوا ہے۔ جاسوسوں کے مطابق خود جرمن بھی کارل کو بہت پراسرار سمجھتے ہیں۔ وہ کسی سے گھلنے ملنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں واحد کہانی یہ ہے کہ روسی محاذ پر اپنے اکلوتے بیٹے کی ہلاکت کے بعد وہ بہ طور اسنائپر اس جنگ میں شامل ہوا تھا اور اس کی واحد ساتھی اس کی رائفل ہے۔ وہ کھلی جگہوں سے گریز کر رہے تھے کیونکہ یہاں اسنائپرز کی موجودگی کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک جگہ بم نے عمارت کا سامنے والا حصہ اڑا دیا تھا۔ وہ اس کے دوسرے فلور سے گزر رہے تھے کہ راستے میں یہ پھٹا ہوا حصہ آ گیا اور عمارت کھلی تھی۔ فرش کا ٹوٹا حصہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور اسے چھلانگ لگا کر کراس کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے الیکس گیا اور آرام سے دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھر رونی گیا اور آخر میں جوزف نے چھلانگ لگائی مگر ابھی وہ ہوا میں تھا کہ اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ دوسری طرف آنے کے بجائے نیچے گر گیا۔ رونی تیزی سے آگے آیا تھا مگر الیکس نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

''بیکار ہے، اس کی پیشانی پر گولی لگی ہے۔''

انہوں نے احتیاط سے نیچے جھانکا تو جوزف کی لاش ملبے کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ جرمن نشانچی کا نشانہ کمال کا تھا کہ گولی پیشانی کے عین وسط میں لگی تھی۔ سامنے دور تک گودام اور ریل لائن کی پٹریاں تھیں جن پر کہیں کہیں ناکارہ بوگیاں اور مال بردار ڈبے کھڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر تھے اور جرمن نشانچی ان میں سے کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ جرمنوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ روسی بھی جوابی کارروائی پر اتر آئے تھے اور اب اس علاقے پر قبضے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ یہاں سے جرمنوں کو نشانہ بنا سکیں۔ جرمن روسی نشانے بازوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ الیکس سوچ رہا تھا کہ ان کا نصف دستہ ویسے ہی ختم ہو گیا ہے۔ دو مارے گئے تھے اور نتالیہ کو اس نے خود پیچھے رہنے کو کہا تھا۔ اس نے رونی سے کہا۔

''ہمیں اوپر جانا ہوگا۔ میں ایک نظر اس علاقے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ بہت خطرناک ہوگا۔ تم نے اس کا نشانہ دیکھا نہیں ہے۔'' رونی نے نیچے پڑے جوزف کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے جوزف کو ٹھیک پیشانی میں گولی ماری ہے۔''

''اس کے باوجود میں دیکھنا چاہوں گا۔''

وہ اوپر کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک جگہ سے الیکس نے آئینے کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ وہ اس چار منزلہ عمارت کی چھت پر آئے۔ یہاں بھی ملبا موجود تھا اور مارٹر گولوں نے چھت میں کئی جگہ سوراخ کر دیے تھے۔ الیکس نے رونی سے کہا۔ ''تم کسی سوراخ سے نیچے کا جائزہ لو گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ فائر کرے اور تم دیکھو گے کہ وہ کہاں سے فائر کر رہا ہے؟''

رونی نے سر ہلایا اور منڈیر کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک سوراخ دریافت کر لیا۔ وہ نیچے دور تک پھیلے ملبے کو دیکھنے لگا۔ الیکس نے پہلے آئینے کی مدد سے نیچے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ آئینے کی چمک، جرمن نشانچی کی توجہ حاصل کر لے گی۔ پھر اس نے اپنا ہیلمٹ اتار کر اسے رائفل کی نال سے اوپر کیا تو فوراً گولی آ کر اس پر لگی۔ رونی نے سر ہلایا۔ ''میں نے دیکھ لیا ہے، ادھر آؤ۔''

''کہاں ہے؟'' الیکس اس کے پاس پہنچ گیا۔

''پٹریوں کے درمیان، دیکھو جگہ جگہ چھوٹے کمرے ہیں، ان پر ملبا گرا ہوا ہے۔ فائر وہیں سے ہوا ہے۔''

''کس طرف سے؟''

''بالکل درمیان میں کسی جگہ سے میں نے دھواں اٹھتے دیکھا تھا۔''

فاصلہ چھ سو گز سے زیادہ تھا اور جرمن کا نشانہ بالکل درست لگا تھا۔ الیکس کا دل گواہی دینے لگا کہ یہ وہی شخص کارل ہے۔ میخائل نے اس کے بارے میں جو بتایا تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ ماہر نشانچی ہے اور اسے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس شام وہ کیمپ میں اپنی بیرک میں موجود تھے۔ نتالیہ کا چہرہ ستا ہوا تھا کیونکہ جوزف اس کا باس ہی نہیں، اس کا استاد بھی تھا۔ اس نے نتالیہ کو نشانے بازی کی تربیت دی تھی۔ اس نے نتالیہ کی خوب صورتی سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ وہ اس سے مشفقانہ انداز میں پیش آتا تھا۔ اپنی ٹیم کے لیے وہ باپ جیسا تھا اسی لیے سب اس کا دکھ اب تک محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بے دلی سے کھانا کھایا اور اب بیئر سے غم غلط کر رہے تھے۔

نتالیہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں بھی کل چلوں گی۔''

''نہیں۔'' الیکس نے بے ساختہ کہا۔ ''کارل بہت خطرناک شخص ثابت ہو رہا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksurdu.net
http://www.urdutube.net

''تمہیں یقین ہے کہ وہ کارل ہی ہے؟'' نتالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔''

''چھٹی حس۔'' رونی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''دوست! میدانِ جنگ میں چھٹی حس نہیں، گن چلتی ہے۔''

''میں پیشہ ور سپاہی نہیں ہوں۔'' الیکس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''میں چھٹی حس پر انحصار کرتا ہوں۔''

رونی کا موڈ خراب تھا۔ اس نے بیئر کی نئی بوتل اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔ الیکس نے نتالیہ کی طرف دیکھا۔ ''کارل کو کیسے پتا چلا کہ ہم اس سیکٹر میں آئیں گے؟''

نتالیہ پھر حیران ہوئی۔ ''اسے کیسے پتا چل سکتا ہے؟''

''وہ باقاعدہ مورچا بنا کر اس ویران جگہ پر ہمارا منتظر تھا اور وہاں مورچا بنانے کا کوئی جواز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہمارا خاتمہ کرے۔ ہماری نصف نفری وہ ختم کر چکا ہے۔''

نتالیہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''الیکس! کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں نے.....''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' الیکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''تب تمہارے کہنے کا مقصد کیا ہے؟'' نتالیہ نے جذباتی لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر جانے لگی تھی کہ الیکس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا اور پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔ نتالیہ مزاحمت نہیں کر سکی یا پھر وہ مزاحمت کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب جذبات کا طوفان تھما تو دونوں پُرسکون تھے۔ نتالیہ اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔ اس بار اس نے جذباتی ہوئے بغیر پوچھا۔ ''کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''نہیں لیکن مجھے لگا کہ یہ بات کسی طرح جرمنوں تک پہنچی ہے۔''

''ممکن ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کا ذریعہ میں نہیں ہوں۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔''

''میخائل.....''

''وہ صرف ایک معصوم بچہ ہے۔'' نتالیہ بولی۔

''ہاں لیکن اس کی معصومیت میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' الیکس نے کہا تو نتالیہ سوچ میں پڑ گئی، پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میخائل کے سامنے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، یہ تو ہمارا خفیہ پلان تھا۔''

الیکس کو یقین تھا کہ کارل پہلے سے ان کا منتظر تھا اور ایسا صرف ایک صورت میں ہو سکتا تھا جب اسے پہلے سے اطلاع ہو۔ بیرک کا دروازہ کھلا تو وہ سمجھے کہ رونی ہوگا مگر آنے والا میکس تھا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد الیکس نے اسے بیئر پیش کی اور پوچھا۔ ''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''ماسکو سے۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں انٹرنیشنل پریس کے لیے ایک بریفنگ تھی۔ مجھے یہ کام سونپا گیا تھا اسے نمٹا کر آ رہا ہوں۔ یہاں کیا چل رہا ہے؟''

میکس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر الیکس اور نتالیہ دونوں جھینپ گئے۔ الیکس نے جلدی سے کہا۔ ''کچھ نہیں۔''

نتالیہ باہر نکل گئی تھی، میکس نے حیرت سے کہا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

الیکس نے سگریٹ سلگایا۔ ''پتا نہیں۔ ویسے نتالیہ بتا رہی تھی کہ تم اسی کے گاؤں سے تعلق رکھتے ہو؟''

میکس نے بھی سگریٹ نکال لیا۔ ''ہاں، ہم نوجوانی تک ساتھ رہے پھر میں یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ماسکو چلا گیا۔''

الیکس سوچ رہا تھا کہ کیا نوجوانی میں ان میں پسند کا رشتہ رہا تھا مگر نتالیہ نے ایسے کسی تعلق کی تردید کی تھی۔ وہ چونکا، میکس اس سے گروپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور جب اس نے جوزف کی موت کا بتایا تو اسے دھچکا لگا۔

''جوزف مارا گیا؟''

''آج ہی کی بات ہے۔ جرمن نشانچی نے اسے ماتھے پر گولی ماری۔''

''تم لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے؟'' میکس کے انداز میں سوال سے زیادہ الزام تھا۔

''سچی بات ہے، ہم واقعی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔'' الیکس نے اعتراف کیا۔ ''وہ بھیڑیا ہے۔ ہم نے پہلے اس کے دو ساتھی مارے تھے، اس کے بعد سے وہ اکیلے شکار کر رہا ہے۔''

''اب تم اور رونی رہ گئے ہو۔''

''ہاں ہم چند دن دیکھتے ہیں اور مزید نشانچیوں کے لیے درخواست کرتے ہیں۔''

''اب سربراہ کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' الیکس نے شانے اچکائے۔ ''ہم بھی اکیلے بھیڑیے ہیں۔''

''کیا میں جنرل گریگ سے بات کروں؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

''ابھی نہیں، پہلے ہمیں کوشش کر لینے دو۔'' الیکس نے کہا۔ ''مجھے خطرہ ہے کہ کہیں جنرل گروپ ہی ختم کردے۔ محاذ کی صورتِ حال بدل رہی ہے۔ اب جرمنوں پر ہمارا دباؤ بڑھ رہا ہے اور آنے والا وقت ان کے لیے سخت ہوگا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں اس جرمن سے کریم اور جوزف کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میکس نے کہا۔ ''کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟ دو تین دن تک میں فارغ ہوں کیونکہ ابھی میں نے فیلڈ ہیڈ کوارٹر رپورٹ نہیں کی ہے۔''

''تم چاہو تو کل ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔''

نتالیہ کے ساتھ میخائل اندر آیا۔ وہ میکس کو دیکھ کر ٹھٹکا اور اس کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا۔ نتالیہ نے اسے تسلی دی۔ ''یہ ہمارا ساتھی ہے۔''

الیکس نے میخائل سے ہاتھ ملایا۔ ''کیسے ہو ننھے دوست؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میخائل بولا۔ ''میں کچھ بتانے آیا ہوں۔''

''کوئی خاص اطلاع ہے؟''

میخائل نے سر ہلایا۔ ''کارل کل سے جرمن کیمپ میں نہیں آیا ہے۔''

''کل سے؟'' الیکس چونکا۔ ''تمہیں یقین ہے؟..... میرا مطلب ہے کہ وہ آیا ہو اور تمہیں پتا نہ ہو؟''

''نہیں، میں رات بارہ بجے تک وہاں رہا تھا۔ پھر آج صبح چھ بجے پہنچا، کارل نہیں تھا۔ میں نے اس کے جاننے والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ رات نہیں آیا۔''

الیکس نے اسے چند سکے دیے تو وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میکس نے کہا۔ ''جس طرح یہ پیسے کے عوض تمہیں اطلاعات دے رہا ہے، کیا اس طرح جرمنوں کو نہیں دے سکتا ہے؟''

''میخائل ایسا لڑکا نہیں ہے۔'' نتالیہ نے انکار کیا۔ ''میں اسے جانتی ہوں۔''

''جنگ کے دوران کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' میکس نے اصرار کیا۔ نتالیہ کو غصہ آ گیا۔

''ہاں، جنگ میں دوست بھی پشت میں چھرا گھونپ دیتے ہیں۔''

میکس کا چہرہ ست گیا اور پھر وہ خاموشی سے بیرک سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد الیکس نے افسوس سے کہا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

نتالیہ بھی شرمندہ تھی۔ ''سوری میرے منہ سے نکل گیا۔''

اگلے دن الیکس اور رونی روانگی کی تیاری کر رہے تھے کہ میکس آ گیا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کے شانے پر اسنائپر رائفل تھی۔ الیکس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ تم آؤ گے یا نہیں۔''

میکس نے کہا۔ ''آج کہاں جانا ہے؟''

''اس سیکٹر میں۔'' الیکس نے نقشے پر واضح کیا۔ ''کل بھی ہم یہیں گئے تھے۔''

''جرمن یہاں موجود ہیں۔''

''ہاں۔''

''کیا ہم فضائیہ کی مدد حاصل نہیں کر سکتے؟''

الیکس نے اسے دیکھا۔ ''یہ آدمی کا آدمی سے اور گولی کا گولی سے مقابلہ ہے۔ جرمن نے بھی اپنی فضائیہ کو نہیں بلایا ہے۔''

''مگر وہ ہمارے دو ساتھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔''

''ہم نے بھی حساب برابر رکھا ہے۔'' الیکس نے کہا تو میکس نے بے دلی سے سر ہلایا۔ وہ الیکس کی حکمتِ عملی سے متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر فضائیہ کی مدد لینے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ روانہ ہو رہے تھے کہ نتالیہ بھی آ گئی۔ وہ وردی میں اور رائفل کے ساتھ تھی۔ الیکس نے کہا۔

''طے ہوا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی۔''

''آج میں جاؤں گی۔''

وہ روانہ ہوئے۔ وہ اسی سیکٹر کی طرف جا رہے تھے مگر اب راستہ دوسرا تھا۔ وہ ان تارتوں سے دور تھے جہاں سے گزشتہ روز گزرے تھے۔ اب وہ ریل کی پٹریوں اور ان پر کھڑے ڈبوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ الیکس نے نتالیہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور جب تک وہ راستہ کلیئر نہ کر دے، وہ آگے نہیں بڑھے گی۔ نتالیہ نے کہا۔ ''تم میرے لیے فکرمند ہو؟''

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' الیکس نے آہستہ سے کہا تو نتالیہ مسکرانے لگی۔ کچھ دور موجود میکس ان کی گفتگو نہیں سن پا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔ جیسے جیسے وہ اس جگہ کے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں سے جوزف پر فائر ہوا تھا وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو رہے تھے۔ ریلوے لائنوں کے درمیان جگہ جگہ ملبا تھا، پہلے یہاں چھوٹے چھوٹے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

کمرے تھے جن میں ریلوے کا اسٹاف ٹھہرتا یا کام کرتا تھا مگر بمباری نے ان میں سے بیشتر کو تباہ کر دیا تھا۔ الیکس ملبے کے ایک ایسے ہی ڈھیر سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بننے والے خلا میں غائب ہو گیا۔ نتالیہ نے چیخ ماری۔

''الیکس۔'' وہ خلا میں جھک گئی تھی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

میکس اور رونی بھی تیزی سے آئے تھے۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا تو الیکس تقریباً دس فٹ نیچے فرش پر پڑا دکھائی دیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں، تم لوگ ہوشیار رہو۔''

بالآخر وہ کھڑا ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس کی چھت بمباری کا نشانہ بنی تھی۔ پھر اس پر ملبا آن پڑا تھا اور وہ اسی ملبے سے گزر رہا تھا کہ اس کے بوجھ سے ٹین کی شیٹ نیچے گر گئی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں دیواروں میں کئی سوراخ تھے۔ فرش پر ملبے کا ڈھیر تھا۔ اس نے سوراخوں سے باہر کا جائزہ لیا تو اسے کمرا مورچے کے لحاظ سے ٹھیک لگا۔ یہاں سے وہ سارا علاقہ دکھائی دے رہا تھا جہاں جرمن نشانچی کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ اس نے باہر نکل کر اپنا خیال پیش کیا تو سب سے پہلے نتالیہ نے مخالفت کی۔ ''یہ بہت رسکی ہے۔ یہاں حفاظت کے لیے کچھ نہیں ہے اور اکیلا آدمی بہت آسانی سے نشانہ بن جائے گا۔''

''میں نے صرف خیال پیش کیا ہے۔'' الیکس نے کہا اور وہ آگے روانہ ہو گئے۔ اچانک رونی نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب نیچے دبک گئے۔ الیکس زمین سے لگ کر رونی تک گیا۔ اس نے کہا۔ ''وہاں اس طرف میں نے کسی کی جھلک دیکھی ہے۔''

اس طرف متواتر پٹریوں پر بے شمار ڈبے الگ الگ کھڑے تھے۔ الیکس نے کہا۔ ''اس طرف چھپنے کی بے شمار جگہیں ہیں۔ میرا خیال ہے، وہاں جانا خطرناک ہوگا۔''

''میں ایک بار چیک کرتا ہوں۔'' رونی نے اصرار کیا۔ ''تم مجھے کور دو۔''

الیکس نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک آئل بوگی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس پر چڑھ کر دیکھتا ہوں، اگر مجھے مناسب لگا تو میں تمہیں اشارہ کروں گا ورنہ ہم واپس جائیں گے۔''

رونی رضامند ہو گیا۔ الیکس بوگی پر چڑھا اور اس کے ڈھکن کے ساتھ ابھری گول جگہ پر مورچا جمایا۔ اس نے رائفل رکھ لی تھی۔ مگر یہ جگہ زیادہ محفوظ نہیں تھی۔ اسے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے مڑ کر رونی کو اشارہ کیا اور وہ پٹریوں پر جھکا ہوا تیز قدموں سے اس طرف بڑھ گیا۔ الیکس کی نظریں اس سمت نگراں تھیں اور وہ کوئی حرکت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اسے حرکت نظر آ گئی۔ دو بوگیوں کے درمیان والی جگہ پر ایک شخص اس طرح دبکا ہوا تھا کہ صرف اس کا ہیٹ دکھائی دے رہا تھا اور اس نے رائفل کا رخ الیکس کی طرف کیا ہوا تھا۔ وہ بروقت نیچے ہوا تھا اور گولی آکر ٹن سے بوگی کے ڈھکن پر لگی۔ تیزی کی وجہ سے الیکس اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور گول بوگی سے لڑھکتا ہوا نیچے برف کے ڈھیر پر آ گرا۔ اس نے اٹھتے ہوئے چیخ کر رونی کو آواز دی۔ ''رونی! واپس آ جاؤ۔''

مگر اسی لمحے دوسرا فائر ہوا اور ایک چیخ سنائی دی۔ نتالیہ بھاگی مگر الیکس نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ ''کیا تم بھی مرنا چاہتی ہو؟''

''رونی۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

''میکس! تم اس طرف سے جاؤ اور بہت ہوشیار رہنا۔'' الیکس نے کہا اور نتالیہ کو ساتھ لے کر بوگیوں کی آڑ میں اس طرف بڑھا مگر جب وہ چند منٹ بعد وہاں پہنچے جہاں الیکس نے جرمن کو دیکھا تھا تو اس کے پاس ہی رونی کی لاش پڑی تھی اور جرمن غائب تھا۔ وہ ایک بار پھر کامیاب رہا تھا۔ اس کی گولی رونی کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس شام جب وہ بیرک میں موجود تھے تو میکس نے الیکس سے کہا۔

''اب کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ میرا خیال ہے تم اب اپنی خدمات دوبارہ اپنی رجمنٹ کو دے دو۔''

''نہیں۔'' الیکس نے اس شام پہلا جملہ کہا۔ ''جب تک میں اسے مار نہیں دیتا، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''تم اکیلے ہو۔'' نتالیہ نے بھی کہا، وہ میکس سے متفق لگ رہی تھی۔

''وہ بھی اکیلا ہے۔ اب جنگ اس کے اور میرے درمیان ہوگی۔'' الیکس نے دانت پیس کر کہا۔

میکس نے اسے دیکھا۔ ''دوست! تم خود کو ضائع کر رہے ہو۔ جرمن جلد یہاں سے جانے والے ہیں۔ یورپ میں ان کی حالت خراب ہے اور جلد روس کی تازہ دم فوج نئے ہتھیاروں سے حملہ کرنے والی ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ آنے والے موسمِ سرما میں ہماری جنگ روسی سرحدوں سے باہر ہوگی۔''

''ابھی اس میں بہت وقت ہے اور مجھے امید ہے کہ مجھے اتنا وقت ملے گا کہ میں کارل کو ٹھکانے لگا سکوں یا پھر وہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کامیاب رہے۔'' الیکس کے لہجے میں زہر آ گیا تھا۔

''تم کل جاؤ گے؟'' نتالیہ نے پوچھا۔

''ہاں لیکن میں اکیلا جاؤں گا۔''

''پلیز.....''

''میں جانے سے پہلے تم سے ملنے آؤں گا۔'' الیکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ممکن ہے اس کے بعد میں کئی دن واپس نہ آؤں یا شاید کبھی واپس نہ آؤں۔''

''ایسا مت کہو۔'' نتالیہ نے تڑپ کر کہا تو میکس نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے اس نے اس وقت بھی نتالیہ کو دیکھا جب وہ الیکس کے گرنے کے بعد مضطرب ہو گئی تھی۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ ''میں جا رہی ہوں، صبح تمہارا انتظار کروں گی۔''

نتالیہ کے جانے کے بعد میکس بھی کھڑا ہو گیا۔ ''میں چلتا ہوں۔ شاید آج مجھے فیلڈ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنا پڑے۔''

''یعنی کل تم نہیں آؤ گے؟''

''مشکل ہے، اب میں اس معاملے میں شامل نہیں ہو سکتا۔'' میکس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''عملی طور پر اسنائپر گروپ ختم ہو چکا ہے۔''

''جب تک ایک بھی اسنائپر ہے، گروپ ختم نہیں ہو سکتا۔'' الیکس نے سخت لہجے میں کہا تو میکس نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔

''میں تمہارے احساسات سمجھ رہا ہوں دوست لیکن میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ جلد تمہیں رپورٹ کرنا پڑے گی اور تمہیں ہیڈ کوارٹر بلوا لیا جائے گا۔''

''میں نے کہا نا کہ کل میں جاؤں گا تو میری واپسی کامیابی سے مشروط ہو گی۔'' الیکس نے اپنی رائفل اٹھاتے ہوئے کہا۔ میکس کے جانے کے بعد وہ لیٹ گیا اور پھر.... بے خبر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اسپتال آیا جہاں نتالیہ رات کی ڈیوٹی کے بعد تھکی ہوئی اس کی منتظر تھی۔ اس نے التجا کی۔

''الیکس میری بات مان لو۔ کارل بہت خطرناک شوٹر ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' الیکس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔''

''تم نے ناشتا کیا؟''

الیکس نے انکار کیا تو نتالیہ اسے لے کر میس میں آئی۔ وہ ناشتا کرنے لگے۔ نتالیہ نے بتایا کہ رات اچانک کئی زخمی آ گئے تھے اور ان کی دیکھ بھال میں اسے ایک لمحہ بھی آرام کا نہیں ملا۔ وہ ناشتا کر کے کافی پی رہے تھے کہ نتالیہ کے ایک ساتھی نے میس میں جھانکا اور بلند آواز سے بولا۔ ''نتالیہ! میخائل کا پتا چلا؟''

نتالیہ کھڑی ہو گئی۔ ''کیا..... کیا ہوا؟''

''وہ صنعتی علاقے کے ریل یارڈ میں ملا ہے۔'' ساتھی نے اگرچہ واضح نہیں کہا تھا مگر نتالیہ اور الیکس سمجھ گئے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں میخائل کی لاش سگنل کے کھمبے سے لٹک رہی تھی اور دو روسی فوجی اسے اتار رہے تھے۔ نتالیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میخائل کی لاش اتری تو اس نے اسے گود میں لے لیا۔ میخائل کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا مگر اس کی معصومیت برقرار تھی۔ اس کی دائیں مٹھی بند تھی۔ الیکس نے زور لگا کر اسے کھولا تو اس میں ایک سکہ دبا ہوا تھا اور یہ جرمنی کا سکہ تھا۔ نتالیہ نے سکہ دیکھا تو بے قابو ہو کر چلانے لگی

کیا آپ کو معلوم ہے؟

☆ ایک منٹ میں انسان کا دل تقریباً چھ سیر خون رگوں میں بھیج دیتا ہے۔

☆ ایک منٹ میں خون جسم کے کونے کونے سے چکر لگا کر دل میں واپس آ جاتا ہے۔

☆ کہتے ہیں ایک منٹ میں، دنیا میں ایک ہزار مکعب فٹ بارش ہوتی ہے۔

☆ زمین اپنے محور کے گرد ایک منٹ میں 950 میل چکر لگاتی ہے۔

☆ ایک منٹ میں سمندر 35 ہزار ٹن میٹھا پانی دریاؤں سے حاصل کرتے ہیں۔

انتخاب۔ انعم کمال، کراچی

ذہین امیدوار

ایک فرم کا مالک، ملازمت کے امیدوار سے۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم یہ کاروبار چلا لو گے؟''

امیدوار۔ ''کیوں نہیں جناب۔ میں نے کافی رش میں سائیکل چلائی ہے۔''

مرسلہ۔ کشور کمال، کراچی

اقوال زریں

مخلوق میں جب تک خ لق کا نظام نہیں چلایا جائے گا دنیا میں امن نہ ہوگا۔ (قول سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ)

انتخاب۔ ڈاکٹر شبیر احمد، ہائی سیکیورٹی نیو سینٹرل جیل ملتان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

''یہ اسی کا کام ہے، میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔''

نتالیہ نے بھاگنے کی کوشش کی تو الیکس نے اسے جکڑ لیا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور یقین دلا رہا تھا کہ وہ کارل سے اس ناحق قتل کا بدلہ لے کر رہے گا۔ رفتہ رفتہ نتالیہ کا جوش تھمنے لگا۔ اس نے الیکس کی طرف دیکھا۔ ''تم سچ میں اسے مار سکو گے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن اگر میں واپس آیا تو کارل زندہ نہیں ہوگا۔''

''تب جاؤ، میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' نتالیہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ الیکس نے اسے پیار کیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ نتالیہ میخائل کی لاش اٹھوا کر اسپتال تک لائی جہاں اسے دیگر لاشوں کے ہمراہ تدفین کے لیے بھیج دیا گیا۔ دوپہر کے وقت نزدیکی محاذ پر زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کے لیے اسپتال سے نرسوں اور ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا تھا۔ نتالیہ کو سوتے سے اٹھا کر روانہ کیا گیا۔ ابھی وہ محاذ پر زخمیوں کو دیکھ رہی تھی کہ جرمن طیاروں نے حملہ کر دیا اور ان کے گرائے بموں نے فیلڈ میڈیکل کیمپ میں تباہی پھیلا دی۔

☆☆☆

الیکس کو اس جگہ چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ بھاری کمبل میں لپٹا ہوا تھا اور اس کے باوجود سردی اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ آتے ہوئے اپنے ساتھ راشن اور پانی لے آیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس نے خاموشی سے کمرے میں اتر کر اس کی چھت پر ٹین کی چادر رکھ لی تھی اور جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو اس نے کمرے میں اضافی سوراخ پتھر لگا کر بند کیے اور صرف دو سوراخ چھوڑ دیے تھے جن سے وہ باہر کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ لکڑی کا ایک ٹکڑا ساتھ لایا تھا جسے اس نے تراش کر اور رنگ کر کے ایسی صورت دے دی تھی جیسے کسی انسان کی آنکھ اور چہرے کا حصہ ہو۔ جب اسے باہر دیکھنا ہوتا تو وہ پہلے اسے سوراخ کے آگے کرتا اور جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ جرمن نے اس کی پناہ گاہ کو نہیں تاڑا ہے تب وہ باہر دیکھتا تھا۔ اب تک اسے جرمن کا سراغ نہیں ملا تھا مگر اسے یقین تھا کہ جرمن اپنی جگہ موجود ہے۔

دن میں الیکس کم سے کم پانی اور کھانا استعمال کر رہا تھا تاکہ حاجت کا مسئلہ نہ ہو۔ وہ رات سے پہلے اس جگہ سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ دن میں یہاں معمولی سی حرکت بھی نظروں میں آجاتی۔ شام تک اسے حاجت محسوس ہونے لگی تھی اور رات تک کا وقت اس نے بہت مشکل سے گزارا۔

تاریکی چھاتے ہی وہ حرکت میں آیا اور ٹین کی چادر سرکا کر کمرے سے نکل آیا۔ اس نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا کہ کوئی آواز نہ ہو جس سے جرمن اس کی موجودگی سے واقف ہو جائے۔ فارغ ہو کر اس نے پہلے جانے کا سوچا مگر پھر اسے احتیاط کے خلاف سمجھتے ہوئے واپس آگیا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چند لمحے کے لیے ہی سہی مگر نتالیہ سے مل آئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کل زندہ رہے گا یا نہیں۔ مرنے سے پہلے وہ ایک بار نتالیہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سرد آہ بھر کر وہ کمرے میں آیا اور ٹین کی چادر برابر کر لی۔ اب اسے اگلے چوبیس گھنٹے یہیں رہنا تھا۔

جس وقت الیکس واپس آیا، عین اسی لمحے تقریباً تین سو گز کی دوری پر ایسے ہی ایک کمرے سے کارل نکلا تھا۔ اس نے باہر آکر اپنا جسم کھولا اور خاموشی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی اور وہ پھر اسی جگہ روپوش ہو گیا۔ جس طرح الیکس اس سے بے خبر تھا، اسی طرح کارل کو علم نہیں تھا کہ الیکس کا ٹھکانا کہاں ہے مگر وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ اسی جگہ ہیں۔ اب دونوں صبح کے انتظار میں سو رہے تھے۔ درحقیقت وہ سو نہیں رہے تھے بلکہ آرام کر رہے تھے، اور ان کے ذہن نیند کی حالت میں بھی چوکنا تھے۔ صبح ہوتے ہی الیکس چوکنا ہو گیا۔ سورج اس کی پناہ گاہ کے عقب میں دائیں طرف سے نمودار ہو رہا تھا اور جب وہ کسی قدر بلندی پر آتا تو سامنے والا حصہ پوری طرح روشنی میں آجاتا۔ اس وقت الیکس وہاں پڑی سوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔

مگر اس کا حریف دھوپ کی شعاعیں عین سامنے سے آنے کی وجہ سے اچھی طرح دیکھنے سے قاصر ہوتا اور اسی وقت الیکس سوراخوں سے باہر جھانک کر اس کی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوراخوں کے پتھر نکال دیے اور دوربین سے سامنے کا جائزہ لینے لگا۔ اسے ایک جگہ شبہ تھا کیونکہ وہاں ملبا کچھ اس طرح پڑا تھا جیسے اسے خاص طور سے یہاں لا کر ڈالا گیا ہو۔ یہ فطری انداز میں نہیں پڑا تھا۔ اس ملبے میں جا بہ جا رخنے تھے۔ ان کے درمیان سے کسی رائفل کو بہ آسانی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سورج اوپر آیا تو الیکس نے اضافی سوراخ پتھر لگا کر بند کر دیے تھے۔ اب صرف دو سوراخ کھلے تھے اور الیکس ان کے سامنے آنے سے بھی گریز کر رہا تھا کیونکہ دھوپ اس طرف آگئی تھی اور اگر کوئی دوربین سے دیکھ رہا تھا تو اسے اندر حرکت نظر آجاتی۔ وقت گزرتا رہا۔ تین بجے الیکس کو پاس ہی آہٹیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سنائی دیں تو وہ چوکنا ہو گیا۔ ایسا لگا کہ کوئی فرد اس ملبے پر چل رہا تھا جس کے نیچے اس کی پناہ گاہ تھی۔ اس نے رائفل کا رخ چھت کی طرف کر لیا اور اچانک ٹین کی شیٹ ہٹی تو وہ ٹریگر دباتے دباتے رہ گیا۔ آنے والا میکس تھا۔

''ابھی تم میرے ہاتھ سے مارے جاتے۔'' الیکس نے سرد لہجے میں کہا۔ میکس اندر آیا اور اس نے چادر واپس اپنی جگہ کی۔ وہ تھکا ہوا اور زخمی لگ رہا تھا، اس کی گرد آلود وردی پر جا بہ جا خون کے دھبے تھے۔ وہ آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کاش کہ تم ٹریگر دبا دیتے۔''

''اگر تمہاری خواہش موت ہے تو وہ زیادہ دور نہیں ہے۔ جرمن واقف ہو گیا ہے کہ میں کہاں ہوں اور اب وہ ہمارے یہاں سے نکلنے کا انتظار کرے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میکس نے آہستہ سے کہا۔

الیکس چونکا پھر ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرانے لگا۔ ''تم جانتے ہو، اس کا مطلب ہے کارل کو ہمارے بارے میں اطلاع تم دیتے تھے؟''

میکس کا چہرہ ست گیا۔ ''ہاں، میں ہی اسے بتاتا تھا۔''

الیکس نے بہ مشکل خود پر قابو پایا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس ذلیل شخص کے سر میں گولی اتار دے مگر وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''کیوں..... کیوں؟''

میکس رونے لگا۔ ''میں پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے نتالیہ کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تمہیں چاہتی تھی اور میں برداشت نہیں کر سکا تھا۔''

''تم میں خود اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے ہاتھ سے میرا خاتمہ کر سکو اس لیے تم نے دشمنوں سے ساز باز کر لی؟''

''ہاں، میں بزدل ہوں۔ میں خود سے تمہیں مار سکتا تھا۔'' میکس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ ''میں رائفل لے کر آیا تھا مگر وہ باہر چھوڑ دی ہے۔''

ابتدائی صدمے پر قابو پانے کے بعد الیکس اس کا ردِعمل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میکس اسے ہوش و حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا، وہ نتالیہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ماضی کا ذکر کر رہا تھا۔ الیکس کا دل ایک لمحے کو رکا۔ ''میکس! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو..... نتالیہ کیسی ہے؟''

میکس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مورچے میں موجود سوراخوں کی طرف دیکھا۔ ''جرمن سمجھ رہا ہے کہ میں ابھی یہاں آیا ہوں۔''

الیکس نے پھر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''اگر میں اس سوراخ کے سامنے جاؤں تو؟''

''جرمن تمہارے سر میں سوراخ کر دے گا۔'' الیکس نے پہلو بدلا۔ ''میں نے نتالیہ کا پوچھا ہے؟''

میکس نے گہری سانس لی۔ ''وہ ایک فیلڈ کیمپ میں تھی جب جرمن طیاروں نے وہاں بمباری کی۔''

الیکس نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہاں موجود سب افراد مارے گئے۔'' میکس پھر رونے لگا۔ ''نتالیہ بھی ماری گئی۔ میں نے اسپتال میں اس کی لاش دیکھی ہے۔''

الیکس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے خود کو کہتے سنا۔ ''تم مجھے یہ بتانے آئے ہو؟''

''نہیں۔'' میکس نے آنسو صاف کیے۔ ''میں ایک اور مقصد لے کر آیا ہوں۔''

''مجھے قتل کرنے کا۔'' الیکس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''ایک بار پھر تمہاری ہمت جواب دے گئی۔''

''نہیں، اس کام سے۔'' میکس نے کہا اور اچانک آگے بڑھ کر سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ الیکس اسے روکتا یا واپس کھینچتا، گولی کی آواز آئی اور میکس پلٹ کر پیچھے گرا۔ گولی ٹھیک اس کی آنکھ میں لگی تھی اور وہ فوراً مر گیا تھا۔ الیکس کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔ میکس اس کا دوست تھا مگر وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا اور اس کے لیے رو رہا تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ میکس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے آنکھیں صاف کیں اور دوسرے سوراخ سے باہر جھانکا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ جرمن اسی جگہ سے برآمد ہوا تھا۔ وہ طویل قامت تھا اور اس نے سر پر کیپ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی الیکس حرکت میں آ گیا اور ایک منٹ بعد وہ پٹریوں پر جرمن کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر الیکس نے رائفل تانی اور بولٹ چڑھایا تو جرمن آواز سن کر ساکت رہ گیا۔ پھر وہ کیپ اتارتے ہوئے الیکس کی طرف گھوما تھا کہ اس نے فائر کر دیا۔ گولی ٹھیک جرمن کی پیشانی پر لگی۔ وہ پلٹ کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ الیکس نے گہری سانس لے کر رائفل نیچے کر لی۔ مقابلہ ختم ہو گیا تھا اور وہ فاتح تھا مگر ایسا فاتح جو اپنا سب کچھ ہار گیا ہو۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سودائے جنوں

چوتھا حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھڑی ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی جنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.Bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نرس یہ اطلاع دینے کے بعد واپس جا چکی تھی۔ اب ان تینوں کی دم بخود سی نگاہیں وارڈ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں..... وہاں اب انہیں بھاری جسامت اور چوڑے شانوں والا ایک درمیانے قد کا آدمی نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی چوکور اور بھرا بھرا تھا، پیشانی کی طرف سے بال ایک سرخ وسپید گنج پیدا کرتے ہوئے اڑ چکے تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی اور گول تھیں۔ اس نے جسم پر پولیس شیرف کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ دائیں ہولسٹر سے اسٹین لیس اسٹیل کے سروس ریوالور کی جھلک نظر آ رہی تھی جس کے سرے سے ایک چین مختصر کڑے کی صورت میں اس کے بیلٹ سے منسلک تھی، اس کے اندر داخل ہوتے ہی عقب میں اس کے دو ساتھی بھی نمودار ہوئے تھے۔ دونوں جوان اور اسمارٹ تھے اور وردی پوش بھی۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جبکہ مسٹر جان کا چہرہ ایک دبدبے اور رعب کی غمازی کر رہا تھا۔ ہونٹ پتلے تھے۔

ماسوائے جینی کے ڈاکٹر کمال احمد اور حماد اندال یہ اندازہ قائم کر چکے تھے کہ یہ ہی آدمی جینی کا باپ اور پولیس شیرف مسٹر جان نسویٹر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اپنی بیٹی جینی کی وہاں غیر متوقع موجودگی سے مسٹر جان کا چونکنا لازمی امر تھا اور اسی سبب اس کے چہرے سے ہویدا روایتی رعب اور دبدبے میں فرق بھی آیا تھا۔

''ہیلو ڈیڈ.....'' جینی نے سنجیدہ لہجے میں باپ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''ہائے ہنی..... یہ..... تم ادھر کیسے؟'' مسٹر جان ایک سرد مہری نظر بیڈ پر صاحب فراش پڑے ڈاکٹر کمال اور اس کے قریب سرہانے والی کرسی پر حماد پر ڈالتے ہوئے اپنی بیٹی سے بولا۔ اس کا لہجہ بھی اس کی بھاری شخصیت سے ہم آہنگ تھا۔

''ڈاکٹر کمال میرے کلاس فیلو ہیں۔ ہم لیڈز یونیورسٹی میں اکٹھے فیلوشپ کر رہے ہیں۔'' جینی نے بتایا۔ جان نسویٹر نے اپنے باریک ہونٹ بھینچ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر وہ آگے سرکا۔ حماد اب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جینی نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔ جان نے حماد سے مصافحہ کیا تو جینی نے اس کے بارے میں مختصراً باپ کو بتایا۔ حماد سے مصافحے کے دوران جان نے اس کے چہرے پہ..... گہری نظریں ڈالی تھیں۔ حماد نے اسے کرسی پیش کی مگر وہ وہیں کھڑے کھڑے بیڈ پر نیم دراز ڈاکٹر کمال سے مخاطب ہو کے بولا۔

''ویل ڈاکٹر!..... ہاؤ آر یو؟''

''لٹل فائن سر!..... کچھ بہتر ہے طبیعت.....'' ڈاکٹر کمال نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ مس جینی کے فادر ہیں۔''

''ہوں..... نو ڈاؤٹ..... بٹ..... میں اپنی پوسٹ اور اپنے فرائض منصبی کو اپنی فیملی پر ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔'' وہ کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے آگے بولا۔ ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ خالصتاً انصاف کی بنیاد پر ہوگا، کسی سفارش کی بنا پر نہیں اور اس وقت میں تمہاری کلاس میٹ کے باپ کی حیثیت سے نہیں، ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے روپ میں تمہارے سامنے ہوں..... اس لیے تم بھی اپنا بیان غیر مبہم اور صاف رکھنا، دیٹس اٹ۔'' وہ اس کرسی کے قریب آیا جو حماد نے اس کے لیے خالی کی تھی، ڈاکٹر کمال کو مسٹر جان کے میکانکی سے لہجے میں چھپی وہ گمبھیر تا آمیز تنبیہہ ضرور محسوس ہوئی تھی جسے ڈاکٹر کمال کے ذہنی طباع نے اس کے اس خفتہ کنایئے پر محمول کیا تھا کہ شاید وہ جینی کے حوالے سے ایک محتاط قسم کے زعم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اگر کمال اس کی پر غلط الزام تراشی کر کے سزا دلوانے کی کوشش کرے تو وہ یعنی جان ایسا ہرگز نہیں کرے گا..... جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی اور ڈاکٹر کمال ہی نہیں اس کی اپنی بیٹی جینی بھی شیرف جان کے غبارے سے ہوا نکالنے والی تھی۔ جب اسے چشم دید گواہان سے یہ پتا چلتا کہ مجرم کون ہے۔ چنانچہ اس کی بات سن کر..... ڈاکٹر احمد نے معنی خیز مسکراہٹ سے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔

''نائس ٹو میٹ یو..... مسٹر جان! گلیڈ ٹو میٹ یو..... آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی اور یہ اطمینان بھی کہ آپ انصاف کے تقاضوں پر کسی قسم کی فیملی ریلیشن شپ کو فوقیت نہیں دیتے..... پلیز..... جسٹ..... ہیو اے سٹ.....''

شیرف جان نسویٹر نے بھویں اچکائیں، مصافحہ کیا اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ شکل وصورت سے ہی نہیں بلکہ اپنے لہجے سے وہ عیار اور گرگ باراں دیدہ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر کمال کے لب ولہجے اور طمانیت بھری رمزیہ مسکراہٹ نے اس کے اندر ایک عجیب سی کھٹک پیدا کر دی تھی۔

جان نسویٹر کے کرسی پر براجمان ہوتے ہی ڈاکٹر کمال نے ایک گہری ہمکاری خارج کر کے ایک اور وار کیا۔

''تو آپ پہلے..... میرا بیان لینا پسند کریں گے..... یا پھر چشم دید گواہان کا.....؟''

''چشم دید گواہان!.....؟ وہ کہاں ہیں؟'' شیرف جان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ کمال نے مسکراتے ہوئے اپنی شفاف عدسوں والی عینک کو عادتاً انگلی سے درست کیا اور پھر اس کے قریب خاموش کھڑے حماد اندال اور جینی نسویٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دونوں چشم دید گواہ آپ کے سامنے کھڑے ہیں جبکہ آپ کی بیٹی کی گواہی ذرا کنڈیشنل ہے.....''

ڈاکٹر کمال کے اس انکشاف پر شیرف جان نے سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے پتلے ہونٹ سکیڑے اور بولا۔

''او..... آئی..... سی..... میں ان سے پھر بات کرتا ہوں..... پہلے تم اپنا بیان دو گے..... تمہارے ساتھ آخر ہوا کیا تھا اور کیا تم نے ان لوگوں کو بھی پہچان لیا تھا.....؟ آئی مین..... نمبر پلیٹ وغیرہ نوٹ کی.....؟'' قریب کھڑے اس کے دونوں نائین میں خاتون نے ڈیجیٹل ڈائری نکال لی تھی جبکہ دوسرے نے آواز ریکارڈ کرنے کے لیے ایک ڈیوائس پکڑ لی تھی۔

اس کے سوال پر ڈاکٹر کمال نے قدرے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔ ''میرا خیال ہے جناب کوئی راہ چلتے آدمی کو عقب سے اچانک ٹکر مار دے تو اس بے چارے کو تو اپنا ہی ہوش نہیں رہے گا تو وہ نمبر پلیٹ کیا پڑھ پائے گا۔''

''کار کی نمبر پلیٹ میں نے نوٹ کی تھی اور اس کے اندر موجود چاروں افراد کو بھی دیکھا تھا مسٹر جان!''

قریب موجود حماد اندال نے قدرے جوش سے بتایا تو مسٹر جان نے اس کی طرف سرد نظروں سے گھورتے ہوئے ٹوکا۔ ''ابھی آپ کی باری نہیں آئی بیان دینے کی، اپنی باری میں آپ بولیے گا۔'' ڈاکٹر کمال کو ہی نہیں بلکہ حماد اور جینی کو بھی مسٹر جان کے لہجے سے جانبداری کی بو آنے لگی۔

''ہاں تو ڈاکٹر کمال!..... کیا تمہاری کسی سے دشمنی تھی؟..... یا تمہارا اس کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا تھوڑے دنوں پہلے.....؟ یا کسی پر شبہ؟''

جان نے ایک بار پھر اپنا روئے سخن اس کی طرف موڑا تو اس بار ڈاکٹر کمال نے بھی اسے سرد اور طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''مسٹر جان.....! بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان دونوں چشم دید گواہان سے بیان لے لیں کیونکہ میں سردست کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ کار کی ٹکر لگنے کے بعد سے میری آنکھ یہاں اسپتال کے بیڈ پر کھلی ہے۔'' اس نے پاس کھڑے حماد اور جینی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جان بھی ایک کائیاں اور عیار آدمی تھا، اس کے چبھتے ہوئے طنز کو بھانپتے ہی بولا۔

''مسٹر کمال! میں نے آپ سے کچھ اور پوچھا ہے کہ تمہارا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا..... یا تمہیں کسی پر شبہ ہو؟..... کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حادثہ محض اتفاق ہو؟''

''یہ حادثہ اتفاق تو بہرحال نہیں تھا۔'' ڈاکٹر کمال نے بالآخر بتایا۔ ''کار کا بدلتا ہوا رخ اور اچانک تیز رفتاری کے ساتھ میری طرف بڑھنا صاف ظاہر کرتا تھا کہ نشانہ میں ہی تھا۔ رہی بات جھگڑے کی تو میرا آج تک کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ آپ کنفرم کروا سکتے ہیں۔ ہاں البتہ..... کچھ نظریاتی اختلافات کے باعث تھوڑے دنوں پہلے میرا ایک شخص کے ساتھ مباحثہ ضرور ہوا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے کمال نے اسے ڈی کارلو کے بارے میں بتا دیا۔

''ہوں۔'' جان نے ہنکاری لی۔ ''میرا نہیں خیال کہ محض اتنی سی بات پر ایک پڑھا لکھا ہائیلی ایجوکیٹڈ اسکالر اس طرح کی خطرناک مجرمانہ حرکت کر سکتا ہے..... بہرحال تمہیں شبہے کا حق اور اختیار ہے۔'' جان نے گمبھیر لہجے میں کہا تو اس کی بات پر کمال سمیت حماد کا دماغ جلنے لگا جبکہ جینی کے چہرے پر انتہائی شرمساری اور خجالت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ظاہر ہے، وہ بھی اپنے پولیس آفیسر باپ کی جانبداری اور حقائق سے پہلوتہی کرنے پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی جبکہ جان کو ابھی دھماکا خیز انکشافات کا علم ہونے والا تھا، وہ بھی شاید حماد کی طرح کافی دیر سے کھڑی اندر ہی اندر ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھی، بول ہی پڑی۔

''ڈیڈ!..... اس کار کے اندر..... ڈی کارلو ہی موجود تھا، اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ..... آپ اب ذرا مسٹر حماد اور ہمارے بیان بھی قلم بند کر لیں تاکہ آپ کو اپنے کمنٹس دینے کے بعد واپس نہ لینے پڑ جائیں۔''

ڈاکٹر کمال اور حماد کے لیے جینی کے باپ کو ایسے چبھتے ہوئے تیز جملوں کی توقع ہرگز نہ تھی، تاہم کمال اور حماد نے دیکھا جان نسویٹر نے بیٹی کی بات پر اپنی موٹی چربی گردن گھما کر اس کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''مائی ڈاٹر.....! قانون کو میں تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں..... یہی وجہ ہے کہ مجھے آج تک اپنے کمنٹس واپس لینے نہیں پڑے۔ ہاں ان میں ترمیم کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اکثر ایسے کیسز بھی میں نے اپنی بیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں بھگتائے ہیں جن میں جھوٹے گواہوں کو بھی میں نے سخت سزائیں دلوائی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ حماد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں مسٹر.....؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''حماد اندال.....'' اس کے استفسار پہ بات کاٹنے پر حماد نے کہا تھا۔

''یس..... مسٹر حماد!..... اب آپ کا بیان شروع ہوتا ہے..... مگر میں نے ابھی جو جملے اپنی بیٹی جینی سے کہے..... انہیں ذرا ذہن میں رکھ کے میرے سوالوں کے جوابات دیجیے گا۔ Agreed؟''

جان نسویٹر کے لب و لہجے میں چھپی تنبیہہ بالکل واضح تھی مگر اس ڈھکی چھپی دھمکی کے پیچھے ایک جانبدارانہ ہٹ دھرمی کو شاید وہاں صرف ڈاکٹر کمال ہی کے ذہن رسا نے بھانپنے کی کوشش چاہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں موجود چشم دید گواہان، بشمول اس کی اپنی بیٹی جینی کو بھی باطل قرار دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر کمال سردست خاموش ہی رہا۔ تاہم حماد نے ابتدا کردی۔ اس نے پولیس شیرف جان نسویٹر کو وہی کچھ بتایا جو تھوڑی دیر پہلے وہ کمال اور جینی کو بتا چکا تھا۔ اسے سن کر جان نسویٹر کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ کی رمق ابھری۔ پھر وہ اپنی بیٹی جینی کی طرف متوجہ ہوا، اس نے بھی وہی کچھ بتایا تو آخر میں جان نسویٹر اپنی دونوں رانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو کیا ڈیڈ آپ بھائی کا بھی بیان قلم بند کریں گے؟'' جینی نے پوچھا۔

''یقیناً.....''

''پھر آپ ڈی کارلو کی گرفتاری کے احکامات بھی جاری کرڈالیں گے؟''

''ابھی اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' جان نسویٹر نے بیٹی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے دونوں تابعین عقب میں تھے۔ اچانک جان دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس کے تابعین ایک دم دائیں بائیں ہوکر الرٹ کھڑے ہوگئے۔

''قریبی دوستوں کی گواہی زیادہ قابل قبول نہیں ہوتی، بہتر ہوگا کہ..... تم لوگ ڈی کارلو سے صلح صفائی کی کوشش کرلو۔''

''ہرگز نہیں ڈیڈ!'' جینی یکدم تلخ لہجے میں باپ سے بولی۔ ''آپ انصاف کے تقاضوں کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ کیا آپ ڈی کارلو جیسے شر پسند کے خلاف کوئی عملی کارروائی کرنے سے ہچکچا رہے ہیں؟ اس لیے کہ اس کا باپ امریکی پارلیمنٹ کا ممبر ہے؟''

ڈاکٹر کمال اور حماد کے مطابق جینی نے اپنے باپ کو اسی تنقید کا نشانہ بنایا تھا..... جو ان دونوں کے لبوں پہ آتے آتے رہ گئی تھی۔

''اس حوالے سے ڈی کارلو بھی تم لوگوں پر یہ الزام عائد کرنے کا حق رکھ سکتا ہے کہ اسے اپنے تین مخالفین کی محاذ آرائی کا سامنا ہے..... جو اس کا تعلیمی کیریئر خراب کرنے کے ساتھ تاج برطانیہ میں اس کے باپ کا بھی امیج خراب کرنے کی مذموم سازش میں مصروف ہیں۔'' جان نسویٹر نے جینی کی طرف تکتے ہوئے کہا تو اس بار حماد بھی چپ نہ رہ سکا۔ جینی سے بولا۔

''ویل جینی! آپ کے ڈیڈ تو ابھی سے ہی ڈی کارلو کی وکالت کرنے لگ گئے ہیں..... یہ اس پر کیا ہاتھ ڈالیں گے۔''

اس طنزیہ چوٹ پر شیرف جان نسویٹر نے اپنی چندی چندی آنکھوں سے گھورتے ہوئے حماد کی طرف دیکھا۔ وہ حماد سے کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے بعد وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

نائمہ جیسی ایک بہادر لیڈی رپورٹر کے اس وقت دہشت زدہ ہوجانے کی وجہ بڑی معقول تھی۔ رات کا وقت اور بحیرۂ روم کا چوگرد کھلا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بلاخیز سمندر اس پر مستزاد ایک آبدوز پر بے سہارا اٹکا ہوا انسانی وجود جو محض کسی ایک طوفانی لہر کے اشارے پر بھی ہو کہ وہ ایک ہی ہلے میں اسے آبدوز کی خالی باڈی سے، دوبارہ ہیبت ناک سمندر میں پھینک دے۔ ایسے ہولناک ماحول میں..... اچھے اچھوں کا پتا پانی ہوجائے۔ نائمہ کی بھی اس وقت یہی حالت ہورہی تھی۔ آب دوز کی باڈی کے ساتھ وہ کسی کمزور وحشت زدہ آبی مخلوق کی طرح چمٹی ہوئی تھی اور اس کے چہار اطراف ہیبت ناک سمندر کے اچھلتے پانیوں کا ہولناک شور تھا اور تاریکی تھی۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ اس کا ساتھی عابد شیکھری کہاں تھا؟ اس نے ہذیانی چیخ نما آواز سے اسے دو تین بار پکارا بھی تھا مگر اسے اگر عابد جواب دیتا بھی تو سمندر کی بے رحم موجوں کے شور و شغب میں بھلا اس کی آواز کب سنائی دیتی جبکہ خود نائمہ کو اپنی آواز دبتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ چند ثانیوں تک خالی الذہنی کی حالت میں اسی طرح چمٹی آبدوز کے سہارے ہولے ہولے ہچکولے کھاتی رہی..... وہ پانی سے بھی شرابور ہورہی تھی۔ آسمان پر بادل خوفناک انداز میں گرجنے لگے تھے اور موسلا دھار بارش بھی شروع ہوچکی تھی..... ایسے میں نائمہ کو اپنی زندگی محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً تنکے کے سہارے پر ہی محسوس ہورہی تھی کہ اچانک..... وہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

چونکی۔ اس کے پاؤں کسی کی گرفت کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ آیا یہ آبدوز کس ملک کی تھی۔

''نائمہ.....'' دفعتاً اسے اپنے قریب عابد شیکھری کی آواز سنائی دی اور وہ خوشی سے چور ہو کے جواباً چلائی۔

''عابد..... عابد..... تت..... تم..... کہاں ہو.....؟''

''ادھر ہوں۔ تمہارے پیروں کی طرف.....'' نائمہ آواز کی سمت لیٹے لیٹے پلٹی اور عابد کو دیکھ کر بے اختیار اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ عابد خود بھی آبدوز کی باڈی کی چکنی پھسلواں سطح سے چپکا ہوا تھا۔ سمندر اور بارش کے پانی سے وہ بھی شرابور تھا۔ تیز شرانے دار بارش اور طوفانی ہواؤں نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ عابد تھوڑی کوشش کے بعد کہنیوں اور سینے کے بل گھسٹتا ہوا نائمہ کے قریب ہوگیا کیونکہ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اسے ہولناک حالات نے دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ نائمہ کو بھی عابد کی قربت سے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ اس نے نائمہ کا ہاتھ دبایا، جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی ہمت اور حوصلوں کو خطا نہ ہونے دے۔ اس کے ساتھ ہی عابد کی نظریں تیزی سے گردوپیش کا جائزہ بھی لینے میں مصروف تھیں۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی دیوہیکل وہیل مچھلی کی پشت کے ساتھ چپکے ہوئے ہوں۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ زیادہ دیر آبدوز کی سپاٹ پشت پر سوار رہنا ان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اور اس سے بڑھ کر ایک خطرہ اور بھی لاحق تھا جس کے تصور سے ہی لرزہ طاری ہوجاتا تھا کہ کچھ پتا نہیں تھا کہ آبدوز کسی وقت بھی سمندر کے گہرے پانیوں میں جاسکتی تھی۔ ایسی صورت میں بھیانک موت ان کا مقدر ہوتی، لہٰذا عابد نے قریب ہونے کے باوجود قدرے چلا کر نائمہ سے کہا۔ ''میرے ساتھ..... ساتھ آگے کھسکتی رہو..... ہمیں اندر داخل ہونے کی کوشش کرنا ہوگی۔'' جواباً نائمہ نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ عابد کو آبدوز کا وہ واحد وسطی حصہ نظر آرہا تھا جو کسی کوہان کی طرح آبدوز کی پشت پر ابھرا ہوا تھا۔ انٹرنس اور ایگزٹ وہیں تھا..... یقیناً وہ دروازے بند ہی ہوں گے لیکن عابد کو کچھ امید تھی کہ وہیں کہیں ''بفر رومز'' کا خلا ضرور بنا ہوگا جدھر مختلف خودکار میکنزم کے تحت آبدوز میں نہ صرف آکسیجن بھری جاتی ہوگی بلکہ فالتو پانی بھی باہر نکالا جاتا ہوگا۔ اگرچہ یہ کوئی زیادہ پرامید سہارا نہیں تھا لیکن بجھتے چراغ کی آخری ٹمٹماتی اور لرزتی روشنی کے مصداق..... موہوم امید ضرور تھی۔

دونوں نے آگے کھسکنا شروع کردیا..... یہ شکر تھا کہ آبدوز کی مخصوص دھاتی سطح پر موٹے موٹے فولادی ربٹ اور نٹ وغیرہ لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے دونوں خود کو جمائے ہوئے تھے اور اب دھیرے دھیرے آگے بھی کھسکنے لگے تھے۔ وہ ابھی اپنے ہدف سے تھوڑی ہی دور تھے کہ انہیں اچانک آبدوز کی سطح کی تھرتھراہٹ (وائبریشن) میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا۔ عابد کا دل اچھل کر حلق میں آن لگا۔ کیا آبدوز دوبارہ نیچے گہرے پانیوں میں جانے والی تھی؟ ایک اذیت ناک اور جاں گسل خدشہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس نے چلا کر نائمہ سے کہا۔

''نائمہ! جلدی آگے بڑھو..... آبدوز شاید نیچے جانے والی ہے۔'' اس کی بات سن کر نائمہ کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔ وہ دونوں آبدوز کے جس مذکورہ گوشے تک پہنچنا چاہ رہے تھے، یقینی طور پر وہاں ان کے داخلے کے لیے دروازے وانہیں تھے۔ ابھی اندر داخل ہونے کا مرحلہ باقی تھا اس کے لیے کوئی حل نکالنا تھا ابھی..... لیکن بس! ایک امید تھی ایک آس تھی۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ آخری دم تک اپنی جان بچانے کے لیے تگ ودو جاری رکھتا ہے۔ سو یہ دونوں بھی اس وقت، وہی کچھ کر رہے تھے۔ عابد شیکھری کو بھی یہ امید تھی کہ آبدوز کے مذکورہ گوشے پر پہنچ کے اندر داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور مل ہی جائے گی کیونکہ وہاں اور کچھ نہیں تو ایسے کوئی سوراخ نما ٹیوب کے آہنی ڈھکن نظر آہی جائیں گے جو ایمرجنسی کی صورت میں آبدوز کی نکاسی کا راستہ کہلاتا تھا۔

بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گئے مگر قریب پہنچتے ہی عابد کو آبدوز کے کوہان پر اسرائیلی ملٹری بحریہ کا مخصوص مونوگرام والا نشان نظر آگیا اور اس کا چہرہ جیسے یکلخت سکتے میں ڈوب گیا۔ ان کے لیے یہ صورت حال آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی ہوگئی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کے چاروں طرف موت تھی اور یہ دونوں گویا موت کے دامن میں ہلکورے کھا رہے تھے..... عابد نے ابھی نائمہ کو یہ کریہہ حقیقت نہیں بتائی تھی کیونکہ اب بالآخر اس نے دشمنوں کی کچھار میں ہی مجبوراً پناہ لینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

عابد نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور پھر جلد ہی اس کی امید بر آگئی۔ مذکورہ گوشے میں اسے بفر رومز ڈور کے علاوہ..... وہ گول ''آدم گزار'' ڈھکن نظر آہی گیا جسے ایمرجنسی ایگزٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اب انہیں اصل مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اسے کھولنے کا تھا، اس طرح کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایمرجنسی راستے عموماً کوئی خودکار لاک سسٹم سے مبرا ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھ اور زور آزمائی سے کھولے جاسکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اندر سے کھولنے کے مقابلے میں باہر سے کھولنا مشکل کام تھا مگر عابد نے اسے کرنے کا عزم کرلیا تھا..... یہ اسرائیلی آبدوز تھی۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا مگر اب بھی وہ اس ہولناک حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے کہ یہ اسرائیل کی ایک ایٹمی میزائل بردار آبدوز ''آگوسٹا'' تھی، آگوسٹا 291..... جس کے اندر اس وقت اسرائیلی بحریہ کا کیپٹن پریمانن اپنے کمرے میں موجود تھا اور چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد سر کو کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس سفر پر نکلے ہوئے اسے ایک ماہ ہو چکا تھا..... اور اس کے کانوں میں کسی اور قسم کی آوازوں کے بجائے صرف آبدوز کے انجن سے نکلنے والی بھاپ کی ''شوں شوں'' اور اس کے دو انجنوں کا شور ہی سنائی دیتا تھا۔ اس کی دنیا سمٹ کر صرف آبدوز کی ''سینٹرل کمانڈ پوسٹ'' تک ہی محدود رہ گئی تھی۔

یہ ایک نیچی چھت والا کمرا تھا جس میں بیس آدمی ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور اتنے لوگوں کے ٹھنسے رہنے سے یہ کمرا گرم رہتا تھا۔ اس گرم فضا میں مشینوں کی گھوں گھوں اور مختلف قسم کے سوئچ آن آف کرنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ یہ چھوٹی سی جگہ ایک ایٹمی میزائل بردار آبدوز کے کمانڈ سینٹر سے کہیں زیادہ کسی فیکٹری کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

اسرائیلی بحریہ کے کپتان پریمانن کی یہ آبدوز آگوسٹا 291..... بحیرۂ روم کے ایک خفیہ سی چینل میں لیبیا سے تقریباً ایک ہزار ناٹیکل دور گشت کر رہی تھی۔ اس کا مشن لیبیائی ساحلوں پر گشت کرنا تھا۔ اسرائیل اب اس آبدوز کے ذریعے لیبیا اور اس سے ملحقہ اسلامی ریاستوں پر فوری طور پر ایٹمی حملہ کرسکتا تھا..... تاہم اس آبدوز آگوسٹا 291 کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ بحیرۂ روم اور لیبیا سے متصل ساحلی کناروں پر آباد اسلامی ممالک سے فلسطینیوں کے لیے جو خفیہ کمک..... جو جدید ہتھیاروں وغیرہ کی صورت میں ہوتی تھی ان پر نہ صرف کڑی نگاہ رکھنا تھا بلکہ انہیں ٹریس کر کے تباہ بھی کرنا تھا۔ کیپٹن پریمانن نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آگوسٹا کو سطح آب پر لانے کا حکم جاری کیا تھا۔ ''پیری اسکوپ'' پر متعین نائب کپتان پیٹرنوت بھی پچھلے چند گھنٹوں سے ریٹائرنگ روم میں تھا۔ چلتے پھرتے اس ایٹمی ری ایکٹر کی حامل ایٹمی آبدوز میں مسلسل قیدی کی صورت میں ڈیوٹی دیتے رہنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ اس سے آبدوز کی محدود فضا کی حدت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا تھا..... آکسیجن کی بھی اکثر و بیشتر قبل از وقت ضرورت پڑتی رہتی تھی اور اس ''اضافی ضرورت'' کے پیش نظر آبدوز کو بار بار تھوڑی دیر کے لیے سطح سمندر پہ لانا پڑتا تھا..... یہ آگوسٹا آبدوزیں امریکا سے حاصل کردہ تھیں۔

نائب کپتان نے دو تین بار آبدوز کے چیف انجینئر سے کہا تھا کہ وہ اس کا حل نکالے مگر شاید اس نے کچھ خاص توجہ نہ دی تھی اور اسے ''روٹین'' کا مسئلہ قرار دیا تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ پیٹرنوت کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اسے کسی ''خاموش خرابی'' کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی، جو کسی وقت بھی خوف ناک اور خوابیدہ عفریت کی طرح بیدار ہو کے ان سب کو نگل لے گی..... پیٹرنوت بھی کیپٹن پریمانن سے کم تجربے کار نہ تھا۔ وہ ایک ٹھگنے قد اور گول سر والا یہودی تھا۔ اس نے امریکی بحریہ سے تربیت حاصل کی تھی، گھنی بھوری مونچھیں اور گنجے پن کی طرف مائل اس کے سر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ پرانے زمانے کے بحری قذاقوں کا کوئی سردار ہو۔ چالیس سالہ نائب کپتان پیٹرنوت..... ریڈیو الیکٹرونکس ایکسپرٹ سے ترقی کرتے ہوئے ایٹمی آبدوز کا نائب کپتان بنا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے بڑے افسران اسے جنگی چالوں کا ماہر خیال کرتے تھے جو آبدوزوں کے ساتھ اس طرح کھیلتا تھا جس طرح شطرنج کے مہروں سے کھیلا جاتا ہے۔ اس ایٹمی آبدوز آگوسٹا میں ''ہائیڈروفون لائن'' سسٹم اس نے فٹ کیا تھا۔ جب اس کی چھٹی حس کچھ زیادہ خطرے کا الارم بجانے لگی تو اس نے کیپٹن پریمانن سے اس سلسلے میں حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ابھی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف جائے کہ انٹرکام پر پریمانن کی کال آگئی۔ اس نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ چند سیکنڈوں بعد دونوں روبرو تھے۔

''ریئر ایڈمرل ارودت یعود کی ابھی ابھی کال موصول ہوئی ہے..... وہ کوانڈو آئی لینڈ میں واقع ہمارے اسپائی اسٹیشن میں آج ہی پہنچے ہیں۔ ہمیں وہاں فوراً طلب کیا ہے۔''

کیپٹن پریمانن نے ہوانا کے سرمئی سگار کا گہرا کش لے کر اپنے نائب سے کہا تو نوت کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں، بولا۔ ''کیا حملے کے احکامات صادر ہونے والے ہیں سر؟''

''ایسا کچھ لگتا تو نہیں..... لیکن ایڈمرل ارودت یعود کو بھی لگتا ہے ہائر اتھارٹیز سے کچھ خاص نوعیت کے خفیہ احکامات ملے ہیں جس کے لیے انہیں ہم سے کوانڈو آئی لینڈ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksstube.net
http://www.urdutube.net

میں فوری میٹنگ کی ضرورت پیش آئی ہے۔''

''او کے سر!.....لیکن.....'' نائب پیٹر نوت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''کوئی پرابلم.....؟'' کیپٹن پریمانن نے اس کی طرف تکتے ہوئے سوالیہ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ بالآخر اس نے وہ مسئلہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''ہمیں اسی وقت سسلی روانہ ہونا ہے۔ اگر تمہیں ایسا کوئی مسئلہ محسوس ہو رہا ہے تو اسی وقت سدباب کرو..... بلکہ خود ایک بار انسپکشن کر لو.....تمہاری تسلی بخش رپورٹ کے بغیر میں روانگی کے احکامات جاری نہیں کروں گا۔ ڈو اٹ ناؤ.....ہری اپ۔'' کیپٹن پریمانن نے بارعب لہجے میں کہا تو وہ اسے مخصوص انداز میں سیلیوٹ کر کے پلٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک انجینئر اور ایک ونپن آفیسر کے ساتھ معائنے کے لیے سب سے پہلے آبدوز کے کمپارٹمنٹ نمبر سات میں پہنچا۔ آبدوز دس کمپارٹمنٹس میں تقسیم کی گئی تھی۔ نمبر چار، ایک بڑا سا کمرا تھا جس میں سولہ ''والٹ'' تھے اور ہر والٹ میں ایٹمی میزائل رکھے تھے۔ والٹ پانچ فٹ قطر کا تھا جس میں آر ایس ایم 28 قسم کے ایٹمی میزائل نصب تھے۔ یہ میزائل جس قدر دشمنوں کے لیے مہلک تھے اسی قدر ان لوگوں کے لیے بھی خطرناک تھے جو ان کے قریب موجود تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میزائلوں کے راکٹ دو ایسے ایندھنوں سے چلتے تھے جو بڑی تیزی سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔

میزائل رکھنے والے خانوں Silos میں پمپ لگے ہوئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی خانے میں سمندر کا پانی داخل ہو جائے تو اسے فوراً باہر نکال دیا جائے کیونکہ اگر یہ پانی میزائل سے خارج ہونے والی نائٹروجن ٹیٹرا آکسائیڈ سے مل جاتا تو اس کے نتیجے میں بننے والا تیزاب میزائل کی باڈی کو کھا جاتا اور میزائل آبدوز کے اندر ہی پھٹ سکتا تھا۔

نائب پیٹر نوت اس وقت انجینئر اور ونپن آفیسر کے ساتھ مشاہدے میں مصروف تھا۔ سیل نمبر سات، چھ اور چار میں وہ تینوں تھوڑی دیر تک پانی کے رساؤ کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر کیمیکل کے ری ایکشن سے بننے والے دھوئیں کی نشاندہی کرنے والے الارم کا بھی جائزہ لیا گیا۔ کنٹرول پینل پر پمپ چلانے والے سوئچ بورڈ کو چیک کیا گیا۔ کیمیائی لیک کی نشاندہی کرنے والی سرخ رنگ کی سوئی خطرے کے زون سے دور تھی، تاہم اس کے ہلکے سے ارتعاش کو نوت نے فوراً بھانپ لیا۔ اس نے ونپن آفیسر سے تحکمانہ کہا۔ ''اس ڈائل کو دیکھو غور سے۔'' ونپن آفیسر کوچ جن نے فوراً آگے بڑھ کر ڈائل پینل کا جائزہ لیا اور اس کے چہرے پر تشویش کی ہلکی رمق ابھری جو دوسرے ہی لمحے معدوم بھی ہو گئی۔ پھر وہ ازراہِ تشفی مؤدبانہ کپتان نوت سے بولا۔

''سر! یہ درست کیا جا چکا ہے.....تھوڑی دیر پہلے سیل نمبر پانچ میں نائٹرک ایسڈ بن رہا تھا، اسے درست کیا جا چکا ہے۔''

''پھر یہ سوئی کیوں تھرک رہی ہے؟''

''یہ دھیرے دھیرے معمول پہ آجائے گی سر! میں پھر بھی چیک کرتا رہوں گا۔'' ونپن آفیسر کوچ جن نے کہا۔

اس کے بعد وہ تینوں آبدوز کے ''دنبالے'' کی طرف آگئے۔ یہاں موجود ''پروپیلر'' سیکشن انچارج ایک تیس سالہ خوش شکل عورت سارہ تھی۔ ریڈار سیکشن بھی ساتھ ہی تھا۔ یہاں آبدوز کے ''صوت گیر'' آلات نصب تھے جو آبدوز کے ''پروپیلر'' کے سمندر کے پانی میں چلنے سے پیدا ہونے والے جوار بھاٹا کی لہروں کو کنٹرول کرتے تھے جو دشمن آبدوز کے صوت گیر آلات (Sonar) سگنل کی صورت میں پکڑ سکتے تھے۔ یوں انہیں فوراً اسرائیلی آبدوز آگوستا کی قریب میں موجودگی کا پتا چل جاتا۔

نوت نے اپنی انسپکشن مہم ختم کرنے کے بعد ونپن آفیسر کوچ جن سے دریافت کرنا چاہا کہ آخر سیل نمبر پانچ میں نائٹرک ایسڈ بننے کی کیا وجہ تھی جس کا وہ خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ سوائے اس کے، کہ یہ عمومی نوعیت کا ایک ''کیمیائی تعامل'' تھا جو دور کر دیا گیا ہے۔ نیز اس نے پیٹر نوت کو اس بات کی بھی تسلی دی کہ وہ آبدوز کے مین ایٹمی ری ایکٹر کے نظام پر بھی مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔

اپنی طرف سے اگرچہ دونوں مذکورہ آفیسرز نے آگوستا کے نائب کپتان پیٹر نوت کو ہر طرح سے تسلی دے دی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ پھر بھی اسے اپنے اندر کوئی پھانس سی چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بہرطور اس نے بہت جلد کیپٹن پریمانن کو اپنی مثبت یا منفی انسپکشن رپورٹ دینا تھی لہٰذا اس نے کیپٹن کو جوں کی توں رپورٹ پیش کر دی چونکہ اس کے پاس خود اپنی بے چینی کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں تھی اس لیے وہ اس سلسلے میں خاموش ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد.....جس وقت کیپٹن پریمانن سسلی کے جزیرے کو انڈو میں اسرائیلی خفیہ اسپائی اسٹیشن میں موجود اسرائیلی بحریہ کے ریئر ایڈمرل اردوت یعود کو فون کرنے والا تھا کہ اچانک پروپیلر اینڈ ریڈار سیکشن انچارج سارہ نے انٹرکام پر اسے چونکا دینے والی اطلاع دی کہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

طرابلس کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز حیفہ کے لیے روانہ ہوا ہے..... اس جہاز میں بھاری مقدار میں عسکری آلات سمیت کندھے سے فائر ہونے والے طیارہ شکن میزائل لدے ہوئے تھے۔ یہ خفیہ کمک..... لیبیا میں مقیم فلسطین لبرل آرگنائزیشن PLO کی طرف سے فلسطینی حریت پسند مجاہدین کے لیے روانہ کی جارہی تھی۔ طرابلس کی بندرگاہ میں موجود موساد کے ایک جاسوس..... جو وہاں ''ہاربر ماسٹر'' کے نائب کی حیثیت سے گھسا بیٹھا تھا..... نے یہ رپورٹ بھیجی تھی۔ علاوہ ازیں مذکورہ جہاز میں بہت سارے مہلک ہتھیار بھی لوڈ ہو رہے تھے۔ اسرائیل کی کھلی جارحیت کے جواب میں فلسطینی مجاہدین کی بھی اس طرح کی خفیہ کمک کی ترسیل کا سلسلہ جاری رہتا تھا جسے سبوتاژ کرنے کے لیے اسرائیلی جاسوس ان مذکورہ اسلامی ممالک میں گھسے بیٹھے تھے۔

بہرطور کیپٹن پریمانن کے لیے یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ اس جہاز کو تباہ کرنے کے لیے پریمانن اور نوت فوری طور پر ایکشن پلان کے لیے سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی آبدوز کو دوبارہ سمندر کی گہرائیوں میں اتارنے کا بھی حکم جاری کر دیا گیا۔

ادھر جس وقت عابد شیکھری اور نائمہ آبدوز آگوسٹا کی پشت پر سوار اس کے ایمرجنسی دروازے کے ڈھکن کو کھولنے کی سرتوڑ مگر ناکام کوششوں میں مصروف تھے تو اس وقت انہیں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ ان کے چہروں کے رنگ زرد پڑ گئے۔ یہ لوگ یہی سمجھے کہ شاید آبدوز دوبارہ سمندر کی گہرائیوں میں اترنے والی ہے مگر دوسرے ہی لمحے عابد ٹھٹکا۔ ایک جگہ سے باڈی شن ہوئی تھی دونوں کوہان کی آڑ میں چلے گئے۔ اس وقت پروپیلر اینڈ ریڈار سیکشن کے دو افراد معمول کی بیرونی چیکنگ کے لیے باہر آئے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب عابد اور نائمہ ان کی نظروں سے بچ کر دروازے سے فوراً اندر کھسک گئے۔ وہ دونوں مذکورہ افراد ریڈار سسٹم کی ایک معمولی خرابی کو دور کرنے کی نیت سے آئے تھے، جس کی ایک ٹیکنیکل خرابی کا تعلق باہر سے تھا۔ خرابی تھوڑی دیر بعد ہی دور کر لی گئی تھی اور جلد ہی انہیں اندر داخل ہونے کا کاشن مل گیا کیونکہ آبدوز نیچے جانے والی تھی۔ وہ دونوں لپک کر اندر داخل ہو گئے اور خود کار دروازے ایئر ٹائٹ لاک کر دیے گئے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ دونو وارد ان کی موت بن کے اس خطرناک اسرائیلی ایٹمی آبدوز کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

تل کرم میں ایک مسلم تاجر کے مکان کے تہ خانے میں ہونے والی مجاہدین کی خفیہ میٹنگ سے واپسی کے وقت ''المجاہد'' کی زبیدہ قیصری اور PLSO کی لیلیٰ آفندی کے خوبرو چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ دونوں مجاہداؤں کے دلوں میں ملنے والے مشن کی جلد سے جلد تکمیل کے عزائم انہیں حرکت پذیری پر مہمیز کر رہے تھے۔

بیت صفانہ پہنچ کر باقر کو بھی تل کرم کی میٹنگ کے اہم نکات سے آگاہ کر دیا گیا۔ جس کے مطابق ''المجاہد'' کی (زبیدہ قیصری) کو فرنٹ P (خالد بن جنید) کے ساتھ ''لیبیا مشن'' کے سلسلے میں مشترکہ طور پر آپریشن کرنا تھا۔ سب سے پہلے انہیں بحیرۂ روم کے گہرے پانیوں میں موجود..... دو اسرائیلی U-boats آگوسٹا 291 اور آگوسٹا K-9 کو نشانہ بنانا تھا۔ جس کی وجہ سے فلسطینی مجاہدوں کی سورسز متاثر ہو رہی تھیں۔ مشن کی تکمیل کے بعد انہیں سسلی کے جزیرے کوانڈو میں اسرائیلی خفیہ اسپائی اسٹیشن کو تباہ کرنا تھا جدھر اسرائیلی بحریہ کی ہائی کمانڈ پوسٹ ہر وقت موجود رہتی تھی۔

جبکہ PLSO کی (لیلیٰ آفندی) کو تیونائی کے ادھورے مشن کو مکمل کرنا تھا..... باقر کو افسوس ہو رہا تھا کہ اب جبکہ انہیں اہم ترین مشن سونپے گئے تھے تو وہ خود صاحب فراش تھا جبکہ نسن کی تلاش بھی ان کے ذمے تھی۔ باقر کا بایاں کاندھا زخمی تھا اگرچہ اس کی حالت اب قدرے بہتر تھی مگر لیلیٰ نہیں چاہتی تھی کہ باقر اس اہم مشن میں اس حالت میں ساتھ چلے لیکن باقر بضد رہا۔

اگلے روز پو پھٹنے سے پہلے زبیدہ قیصری اپنے دو بہترین کمانڈوز کے ساتھ تل کرم کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں انہیں پی فرنٹ کے خالد بن جنید سے ملنا تھا اور لیبیا مشن پر روانہ ہونا تھا جبکہ لیلیٰ آفندی اور باقر اپنے پی ایل ایس او کے تین مجاہدوں کے ساتھ تیونائی روانہ ہونے کے لیے کمربستہ ہوئے..... اس کے لیے انہوں نے اگلے دن بعد مغرب روانگی کا پروگرام بنایا تھا جبکہ اس صبح زبیدہ وغیرہ پہلے ہی تل کرم کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔

مغرب کی نماز وہیں بیت صفانہ کی پہاڑی ٹھکانے میں ادا کرنے کے بعد لیلیٰ اور باقر اپنے تین کمانڈو ساتھیوں عبداللہ، لئیق احمد اور علی ارسلان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

روانگی کے لیے انہوں نے جس خفیہ راستے کا انتخاب کیا تھا یہاں اسرائیلی گشتی فوجیوں سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ کم ہی تھا، تاہم پھر بھی ہر ممکنہ خطرے اور بھڑ جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی تھے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.urdutube.net/
http://www.bookstube.net/

مدنگاہ رکھتے ہوئے یہ پانچوں جری مجاہد پاپیادہ ہی روانہ ہوئے تھے۔ اس بار انہوں نے اپنا ''اسٹے پوائنٹ'' ابونصر کے سرائے کے بجائے کھجوروں کے تاجر حسن علی کا فارم مقرر کیا تھا۔ یہ وہی کھجوروں کا فارم تھا جہاں کچھ عرصہ پہلے لیلیٰ ایک ناخوشگوار اور تلخ تجربے سے گزر چکی تھی۔ جب حسن علی کے حساب کار محمود الحسن کے بیٹے اسد نے غداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لیلیٰ کے کھانے میں بے ہوش کرنے کا سفوف ملا دیا تھا تاکہ بعد میں وہ اسے ایک اسرائیلی یہودی افسر کے حوالے کر کے منہ مانگا انعام وصول کر سکے۔ مگر لیلیٰ نے اپنی تربیت اور ذہنی فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے غدار اسد کی یہ مکروہ سازش ناکام بنادی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اسے اپنی پستول کی گولی سے جہنم واصل بھی کر ڈالا تھا۔

ریڈیو وائرلیس سسٹم پر لیلیٰ نے حسن علی سے رابطہ کر کے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ بیت صفانہ والے اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر یہ لوگ ایسے مقام پر بہ خیریت پہنچ گئے جو طے شدہ تھا۔ یعنی حسن علی کی بھیجی ہوئی گاڑی انہیں لینے کے لیے وہاں پہنچنے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک پرانے ماڈل کا راکٹ ٹرک وہاں آن پہنچا۔ ڈرائیونگ کیبن میں صرف دو افراد تھے۔ بغیر وقت ضائع کیے یہ پانچوں کدکڑے مار کے ٹرک کے پچھلے جنگلے والے حصے میں مختلف خالی جگہوں میں جا دبکے..... ٹرک کو دانستہ طور پر کھجوروں کی بوریوں سے لادا گیا تھا..... ان سب کے سوار ہوتے ہی ٹرک روانہ ہوگیا۔

رات جھکنے لگی تھی۔ آج محاق چاند کی رات تھی..... طباق چاند کے مقابلے میں محاق چاند کی رات وقت سے پہلے ہی اتری ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اپنے عروج پر پہنچتے پہنچتے سخت تاریک ترین رات کہلاتی ہے..... ایسی ہی شب یلدا اس وقت بھی طاری ہوچکی تھی۔ ہر سو اندھیرے کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ کھلے تاریک آسمان پر ستارے بھی کم ہی نظر آرہے تھے۔ کھجوروں سے بھرا راکٹ ٹرک نیم صحرائی علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بھی کم ہی پڑ رہی تھیں۔ تاہم گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں یہ بھی کم نہ تھی۔ ڈرائیور بڑی مشاقی کے ساتھ مناسب رفتار سے ٹرک دوڑا رہا تھا اور اس نے دانستہ ایسے راستے کا انتخاب کیا تھا جو معمول سے ہٹ کر تھا اور شارٹ کٹ بھی۔

پون گھنٹے بعد یہ سب بہ خیریت..... حسن علی کے کھجوروں والے فارم میں جا پہنچے۔ یہاں سے تیونائی یعنی ڈیوڈ اسٹار کے اسٹیٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والا راستہ قریب پڑتا تھا..... اس مقام سے تقریباً پچیس کلومیٹر دور جنوب مشرق کی طرف سے ایک دوسرا راستہ صحرائے نجف کی طرف جاتا تھا جدھر اسرائیلی ڈیمون ریسرچ پلانٹ تھا۔

فارم کی عمارت کے ایک، صاف ستھرے کمرے میں یہ پانچوں مجاہد بیٹھے تھے۔ رات کا کھانا سرو کیا جاچکا تھا جو خاصا پرتکلف تھا۔ کھانے میں بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت، ابلے ہوئے چاول، روٹی اور کھجوروں کا مربّا بھی شامل تھا۔ حسن علی خود بھی شامل تھا۔ کمرے میں روشنی تھی اور یہ خاصا بلند چھت والا کمرا تھا۔ ایک عمر رسیدہ ملازم بھی وہاں موجود تھا مگر لیلیٰ نے اس کی چال ڈھال سے محسوس کیا تھا کہ اس کی ملازمت کی نوعیت اور ہی قسم کی لگتی تھی پھر کھانے کے دوران لیلیٰ نے ایک اور بات محسوس کی تھی۔ مذکورہ ملازم کو اس نے کئی بار خود کو بہ غور گھورتے بھی پایا تھا اور جب لیلیٰ کی غیر ارادی طور پر اس پر نگاہ پڑی تھی تو اس نے یکدم اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لی تھیں۔ جانے کیوں لیلیٰ کے دل میں کھٹک ابھری۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ اس وقت لیلیٰ نے حسن علی کو اپنے نئے مشن سے بھی آگاہ کرنا تھا مگر..... اس کے مذکورہ ملازم کی وہاں غیر معمولی موجودگی اور اس کی طرف سے پیدا ہونے والی نامعلوم سی کھٹک کے باعث وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ نہ ہی اسے یہ موقع مل پا رہا تھا کہ وہ حسن علی سے اس کے بارے میں استفسار کرے۔ بالآخر حسن علی نے خود ہی لیلیٰ کے چہرے اور اس کی بار بار جھجھک آمیز نگاہیں اپنے ملازم پر پڑتے دیکھ کر فوراً بھانپ لیا اور پھر اس کی طرف آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے ہولے سے لیلیٰ کو مخاطب کر کے بولا۔

''عزیزی لیلیٰ! بات تو کچھ تلخ سی ہی محسوس ہوتی ہے مگر بتا دینا بھی مقصود ہے..... یہ..... میرا حساب کار (منشی) محمود ہے۔ جس کے اکلوتے بیٹے اسد کو غداری کی پاداش میں تمہاری گولی کا نشانہ بننا پڑا تھا۔''

لیلیٰ..... اپنے میزبان اور ہمدرد حسن علی کی اس بات پر بری طرح چونکی۔ اس بوڑھے بدنصیب باپ پر دکھ اسے بھی تھا کہ تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے جب اسی جگہ اسد نامی جو نوجوان اس کے پستول کی گولی کا نشانہ بنا تھا، وہ اس بدنصیب آدمی کا واحد اکلوتا بیٹا تھا۔

وہ حسن علی سے ازراہِ تاسف بولی۔ ''مجھے بھی اس بات کا دکھ تھا۔ میرا ارادہ اسد کو ہلاک کرنے کا نہیں تھا حالانکہ اس کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ اسد کی غداری آشکار ہوتے ہی میں اسے صرف لعن طعن کر کے چھوڑ دینا چاہتی تھی مگر.....''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''میں سمجھتا ہوں.....'' حسن علی نے ہولے سے یہ کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''اسد پیسوں کے لالچ میں آ گیا تھا مگر اس کا باپ ایسا نہیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے میرے فارم کا حساب کار ہے اور بہت دیانت دار انسان ہے..... خود اسے بھی اس بات کا دکھ ہے کہ اس کے بیٹے نے اچھا کام نہیں کیا تھا..... مجاہدوں کے بعض کڑے اصولوں سے وہ بھی واقف ہے جو غداری کی سزا کو صرف موت پر ہی منتج کرتے ہیں۔ تمہاری ملنے والی اطلاع اور اسد سے متعلق خبر پر میں نے محمود الحسن کو قائل کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے تم اب بے فکر رہو۔ اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی ناراضگی یا کینہ نہیں۔'' حسن علی نے اپنی مختصر اُصراحت بھری گفتگو ختم کی مگر جانے کیوں لیلیٰ کو تسلی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند منٹوں کے دوران محمود کی اس کی طرف گھورتی نظروں میں اس نے کئی سوالوں کی چبھن کو انتقام کے شعلوں میں لپٹتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ لیلیٰ نے اس کو اپنے ایک فطری وہم آمیز خدشے پر بھی محمول کرنے کی کوشش چاہی تھی لیکن عبث..... وہ مطمئن نہ ہو پائی۔

''اس بار تم لوگوں کا کیا مشن ہے؟'' بالآخر لیلیٰ کو پرسوچ انداز کی خاموشی میں مستغرق پا کر حسن علی نے پوچھا۔ مگر اب لیلیٰ کا چین اور اعتبار رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے پُرزدیدہ نگاہوں سے محمود کی طرف دیکھا جو حسن علی کی آخری بات پر دانستہ قریب آ گیا تھا۔ لیلیٰ نے ایک لمبی ہمکاری خارج کرکے دانستہ اتنا کہا۔

''اس بار ہمارا مشن ذرا اہم نوعیت کا ہے..... جس کے مطابق.....'' لیلیٰ نے اتنا کہہ کر پھر کن انکھیوں سے محمود الحسن کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہمہ تن گوش نظر آیا۔ اگرچہ بہ ظاہر اس نے اپنی توجہ کسی اور جگہ مرکوز کر رکھی تھی مگر اس کے کان لیلیٰ کی مشن آشکار کرنے والی گفتگو پر کھڑے محسوس ہو رہے تھے، لہٰذا یہاں تک کہنے کے بعد لیلیٰ دانستہ چپ ہو گئی اور یونہی اس کے قہوے کی تعریف کر ڈالی۔ حسن علی بھی ایک جہاندیدہ آدمی تھا، وہ لیلیٰ کے مسلسل تذبذب میں مبتلا رہنے کا مطلب سمجھ ہی چکا تھا لہٰذا بولا۔

''شکریہ..... میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے..... میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

لیلیٰ نے اندر ہی اندر سکون کی سانس لی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ حسن علی اسے مشن بتانے پر اس وقت مجبور نہ کرے اور وہی ہوا۔ حسن علی اٹھ کھڑا ہوا تو یہ سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اچانک ہی..... ادھیڑ عمر حساب کار محمود الحسن نے اپنے عبا کے اندر سے ایک پستول نکال کر لیلیٰ پر تان لیا۔ اس کی حرکت پر وہاں موجود حسن علی سمیت سب ہکا بکا رہ گئے۔

''مم..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بے رحم عورت!.....'' حساب کار محمود جوشِ غیظ سے لرزتی آواز میں لیلیٰ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تت..... تم نے..... میرے جوان بیٹے..... میرے واحد سہارے اسد کو جس بے رحمی سے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا، آج میں تم سے اس کا انتقام لے کر ہی رہوں گا۔''

لیلیٰ کے چہرے پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ باقر کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔ اس کے تینوں ساتھی بھی اس اچانک اور بالکل غیر متوقع صورتِ حال پر ایک لمحے کو بت بنے کھڑے رہ گئے تھے مگر حسن علی نے ہمت کرتے ہوئے اپنے حساب کار محمود سے..... تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے..... محمود.....؟''

''یہ پاگل پن نہیں ہے آقا! یہ خون کا بدلہ خون ہے.....'' وہ غرایا۔ اس کے بیٹے کی موت نے اسے انتقام میں اندھا کر ڈالا تھا۔ ''یہ خونی قاتلہ اسے معاف بھی کر سکتی تھی۔''

''میں اسے واقعی ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' بالآخر لیلیٰ نے ہمت کرکے جنونی محمود سے کہا۔ ''مگر وہ محض روپوں پیسوں کے لالچ میں یہودیوں کا آلۂ کار بن چکا تھا اور ہمارے شہید مجاہدوں کی قربانیوں کو نہ صرف خاک میں ملا رہا تھا..... بلکہ..... ان کے فلسطین اور قوم کے حق میں بنائے گئے منصوبوں کو بھی آئندہ سبوتاژ کرنے کا ناپاک عزم کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں.....'' لیلیٰ کی بات حلق میں ہی اٹک گئی کیونکہ اس وقت کمرے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا..... اس میں ایک چیخ بھی شامل تھی۔

☆☆☆

پی فرنٹ کا خالد بن جنید اپنے ساتھی شیخ دانیال جبکہ المجاہد کی زبیدہ اپنے ساتھی فاروق کے ساتھ ''لیبیائی مشن'' پر مشترکہ طور پر روانہ ہونے کی پلاننگ میں مصروف تھے..... انہیں اٹلی میں سسلی کے جزیرے کو انڈو آئی لینڈ پہنچنا تھا جدھر انہیں..... اسرائیل کا ایک بڑا خفیہ ''کٹ آؤٹ سسٹم'' باہ کرتا تھا اور وہ تھا اسپائی اسٹیشن.....

اپنے ایک مشترکہ لائحہ عمل کے تحت انہوں نے اٹالین پاسپورٹ کے ذریعے ہوائی سفر کو ترجیح دی تھی۔ اگرچہ پہلے ان کا ارادہ حیفہ کی بندرگاہ میں بحری سفر کرنے کا تھا مگر اس میں خطرہ بھی تھا۔ یہ غیر محفوظ روٹ ہوتا ان کے لیے جبکہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہوائی سفر کے لیے اٹالین پاسپورٹ پر اسرائیلی حکام کچھ زیادہ چیکنگ کے مراحل سے مسافروں کو گزرنے نہیں دیتے تھے کہ اسرائیل کے عرصہ دراز سے اٹلی سے اچھے تعلقات اور روابط تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اٹلی اور سسلی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کرسچین کے علاوہ وہاں ایک بڑی تعداد میں ''جیوش کمیونٹی'' بھی رہتی تھی۔ غالباً بحیرۂ روم کے قریب واقع اٹلی واحد ملک تھا جس سے اسرائیل کے اچھے تعلقات تھے جبکہ مسلم کمیونٹی اٹلی میں تھوڑی تعداد میں تھی۔

اٹالین پاسپورٹ کا انتظام فلسطینی مجاہد گروپوں کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ ان کے ہمدرد تیونس سے مراکش اور لیبیا سے اردن اور شام بشمول قبرص تک پھیلے ہوئے تھے۔ چند دنوں بعد ہی یہ دونوں فلسطینی گروپوں کے اہم کمانڈوز..... ٹورسٹ کے بھیس میں تل ابیب سے اٹلی کی طرف پرواز کر چکے تھے۔ مختلف ناموں اور مختلف بھیس میں یہ لوگ ایک خشک دوپہر میں اٹلی کے دارالحکومت روم کے ائرپورٹ میں اترے۔ ان چاروں (خالد بن جنید، زبیدہ قیصری، شیخ دانیال اور فاروق) نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ایڈونچر کٹ نما مختصر سامان تھا۔ کیمرے اور ہینڈی کیم کے علاوہ ان کے پاس ٹورسٹ گائیڈ بک اور دیگر ایسا چھوٹا موٹا سامان تھا جو انہیں مکمل طور پر ٹورسٹ گروپ ظاہر کرتا تھا۔ خالد اور زبیدہ نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کے طور پر شو کر رکھا تھا۔ باقی دانیال اور فاروق ان کے دوست تھے۔ لیبیا میں مقیم فلسطینی مجاہدوں کی سب سے بڑی سورس P.L.O. کا ایک ایجنٹ بھی..... ائرپورٹ کے باہر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ان کے انتظار میں پہلے سے موجود تھا۔ کسٹم اینڈ امیگریشن سے ایک گھنٹا سر کھپائی کے بعد یہ چاروں باہر آ گئے۔

ان چاروں کے حلیے مذکورہ ایجنٹ کو بتا دیے گئے تھے۔

''آج موسم خشک ہے مگر دوستوں کے لیے یہ پریشانی کا باعث بہرحال نہیں بنے گا۔'' ایک دبلے پتلے اور بہ ظاہر عام سے نظر آنے والے وردی پوش ٹیکسی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر مسکرا کر ان سے کہا، تو جواباً..... خالد کھلنڈری مسکراہٹ سے بولا۔

''ہمیں اس کی پوری امید ہے..... بشرطیکہ یہاں سے روانہ ہونے کے بعد کیپسنو..... (اٹالین کافی) سے ہماری تواضع کی جائے۔''

''کلیئر۔''

دونوں طرف سے مخصوص کوڈ ورڈز کے ادا ہوتے ہی ڈرائیور نے ہولے سے کہا اور پھر یہ سب لوگ بلیو اور یلو رنگ کی مرسیانو میں سوار ہو گئے۔

''مجھے سکندر کہتے ہیں، ہم اس وقت وکیوریہ مارکیٹ (Vucciria Market) سے گزریں گے۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ میں تمہیں اترنا پڑے گا۔ وہاں میرا ایک ساتھی ویٹر کے بھیس میں راہنمائی کرے گا۔''

سکندر نامی ڈرائیور نے اپنی نظریں سامنے ونڈ اسکرین کے پار جمائے رکھتے ہوئے بڑی متانت سے کہا۔

''کیا ہمیں آج کہیں ٹھکانا کرنا پڑے گا، یا.....''

خالد نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو سکندر اس کی چھوڑی ہوئی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں!..... تم لوگوں کو کم از کم دو دن یہاں مختلف مقامات کی سیر کرنا ہوگی اور کچھ تاریخی مقامات میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے تصویر کشی کرنا ہوگی لیکن خبردار..... کسی مقامی آدمی سے الجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ اٹلی میں مافیائی ڈان کے ''دمی عام افراد کے روپ میں گھومتے پھرتے ہیں..... غیر ملکی ٹورسٹ ان کا خاص شکار ہوتے ہیں..... ان کا مقصد محض خوف زدہ کر کے بلیک میل کرنا اور اپنے مجرمانہ مفاد کے لیے استعمال کرنا ہوتا ہے۔''

ایک لمحے توقف کے دوران اس نے ذرا گردن موڑ کر اپنے برابر میں بیٹھے خالد کی طرف بھی دیکھا تھا پھر آگے بولا۔

''سسلی میں تمہارا یقینی طور پر پالرمو (Palermo) میں ہی قیام ہوگا۔ بالخصوص وہاں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ سسلی پالرمو..... خطرناک مافیائی چیفس کا گڑھ ہے لیکن اگر تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو گے، تو تمہارے مشن کے لیے اٹلی اور سسلی سے زیادہ محفوظ ترین مقامات کوئی نہیں ہو سکتے۔''

''تمہارا مطلب ہے..... یہاں ہمیں کسی اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے؟'' عقبی سیٹ پر فاروق اور دانیال کے ساتھ براجمان زبیدہ نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے سکندر سے دریافت کرنا چاہا۔

''یقیناً۔'' وہ بولا۔ ''اس لیے تو کہہ رہا ہوں..... بس! اپنے کام سے کام رکھنا۔''

''ہم یہاں ویسے بھی سیر سپاٹا کرنے نہیں آئے ہیں..... اپنے عظیم مشن سے زیادہ ہمیں یہاں کسی شے میں دلچسپی سرے سے ہی نہیں ہے۔'' فاروق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ شاید سکندر کا بار بار انہیں یہ کہنا اسے برا لگا تھا۔

''تم شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھے دوست!''

سکندر نے ونڈ اسکرین کے اوپر لگے بیک ویو مرر میں ایک نظر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فاروق کا برا سا منہ بنتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے کہ مجاہدین کو ہمیشہ اپنا مشن اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اگر کوئی تم سے خوامخواہ بھی الجھنے کی کوشش کرے تو اسے طرح دے جانا۔ بس! یہی مافیائی ٹاؤٹ کے گھیرے سے بچنے کا واحد طریقہ ہے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ..... پوری دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور مافیا اٹلی اور سسلی میں سرگرم ہے۔ اٹلی کے قدیم شاہی خاندان ''باربرن''..... انہی کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئے۔''

''تمہاری راہنمائی کا شکریہ برادر! ہم اب واقعی اس بات کا خاص خیال رکھیں گے۔'' دانیال نے مشکور لہجے میں کہا اور فاروق نے بھی تنبیہی انداز میں دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

کھڑکی سے باہر اٹلی کے اس خوب صورت تاریخی شہر (دارالحکومت) روم کے نظارے بہت دلفریب تھے مگر چاروں مجاہدوں کے لیے ان میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ اس کے برعکس ان کے دل و دماغ میں جوشِ جنوں اور غیظ کی منتقمانہ آگ بھری ہوئی تھی، اپنے عظیم مجاہدوں ابو جہاد اور خلیل الوزیر کے اسرائیلی یہودیوں کے ہاتھوں بہیمانہ قتل پر ان کے سینے آتشِ انتقام سے بھرے ہوئے تھے اور آج وہ انہی کا بدلہ چکانے آئے تھے۔ ان کے اس اہم مشن کی کامیابی سے نہ صرف اسرائیل کے خارجی عظیم تر مفادات پر کاری ضرب پڑتی بلکہ آئندہ کے لیے ان کے چھپے ہوئے ہمدردوں کی جاری رسد کی صورت میں خفیہ امداد کی رکاوٹیں بھی دور ہو جاتیں۔ یہی نہیں..... برادر اسلامی ملک لیبیا کو جس اسرائیل کی طرف سے کسی بھی وقت ایٹمی حملے کا خدشہ دامن گیر رہتا تھا، وہ بھی ایک طویل عرصے کے لیے ٹل جاتا..... جب تک لیبیا کو سنبھلنے اور اس کا جنگی اصولوں کے تحت کچھ سدباب کرنے کا اچھا خاصا وقت مل جاتا..... یہی سبب تھا کہ خود لیبیا بھی اپنے ہاں مقیم فلسطینی مجاہدوں کو سپورٹ کرنے والے ایسے مقتدر ہمدردوں کے لیے راہیں ہموار کیے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ..... وکسیور یہ مارکیٹ میں سڑک کے بالکل کنارے ہی واقع ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ کے قریب جا پہنچے۔

ٹیکسی انہیں وہاں چھوڑ کے روانہ ہوگئی۔ البتہ..... وقتِ رخصت..... سکندر نے اتنا ضرور کہا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت ان سے دوبارہ ملاقات بھی ہوسکتی ہے۔

ریسٹورنٹ میں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ اریب قریب فوڈ اسٹالز کی بھرمار تھی۔ سڑک کے دو رویہ گلیاں بھی تھیں۔ ان گلیوں کی بلند دیواروں پہ اقامتی گوشوں پر قدیم طرزِ تعمیر کے حامل چوبارے نظر آرہے تھے۔ کہیں نیم برہنہ عورت و مرد کے مجسمے تھے تو کہیں جانوروں کو تیر سے شکار کرتے پتلے۔

ریسٹورنٹ میں مونو، دوسرخ و سپید چمڑیوں والے مرد عورتیں، زیادہ تر بنیان اور نیکروں میں ہی نظر آرہے تھے۔ اس کی وجہ دھوپ اور موسم کی خشکی تھی۔ دھوپ کو تو یہ لوگ ویسے بھی ایک نعمت کا درجہ دیتے تھے اور چلتے پھرتے گویا ''سن باتھ'' کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی اور کوئی اپنے لوگوں میں یا پھر کھانے پینے میں مشغول تھا۔ ایسے میں سکندر کی تنبیہہ انہیں باطل ہی محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی جان بوجھ کر ان سے یہاں الجھنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

بہرطور یہ چاروں جیسے ہی ایک خالی میز کی طرف جا کر براجمان ہوئے اٹل کے جن کی طرح ایک لمبا سا شخص ان کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم پر مذکورہ ریسٹورنٹ کے مخصوص مونوگرام والی وردی تھی جس کی پشت پر مچھلی اور سینے پر آکٹوپس بنا ہوا تھا۔ گویا یہ ریسٹورنٹ ''سی فوڈ'' کے لیے مشہور تھا۔

''ڈیپ فرائڈ پران اینڈ فش اور زبردست کافی لے آؤ۔'' خالد نے اس ویٹر کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''او کے سر! کیا آپ آکٹوپس کی ڈش پسند فرمائیں گے جو یہاں کی ایک خاص ڈش ہے؟''

ویٹر نے مؤدبانہ کہا تو خالد نے فقط نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس ویٹر نے انہیں ریسٹورنٹ کے اندر ایک میز پر جا کے بیٹھنے کو کہا۔ ٹیبل کا نمبر بھی اس نے بتا دیا اور خود مشینی انداز میں آرڈر لے کر واپس پلٹ گیا..... یہی ویٹر ان کا مطلوبہ تھا۔

''کیا یہ بھی کوئی کوڈ ورڈز تھے..... یا محض آرڈر؟'' زبیدہ نے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں خالد سے پوچھا۔

''دونوں۔'' خالد نے مختصراً جواب دیا اور پھر یہ چاروں ریسٹورنٹ کے اندرونی گوشے میں آگئے۔

ان کے مطلوبہ نمبر والی میز کونے میں اور نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھی۔ یہ چاروں وہیں جا بیٹھے۔

بلاشبہ مذکورہ ویٹر PLO کا ہی ایجنٹ تھا جس کے بارے میں سکندر نے انہیں بتایا تھا۔ ان کے میز کرسیاں سنبھالتے ہی وہ ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا سجائے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net

www.pdfbooksfree.pk

وہاں آن پہنچا اور سرو کرنے کے دوران جب وہ خالد اور زبیدہ کے درمیان میں جھکا تو ہولے سے بولتا بھی چلا گیا۔

''بیس منٹ میں یہ سب ختم کرنا ہوگا، جب میں بل لے کر پلٹوں گا تو اس وقت میری ڈیوٹی بھی آف ہو چکی ہوگی۔ باہر نکل کر تمہیں مجھ سے ملے بغیر..... مجھے صرف فالو کرنا ہوگا۔ مگر میرے پیچھے آنے کا تمہارا انداز ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے تم اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے ہو۔ کلیئر؟''

''او کے.....'' خالد نے ہولے سے جواباً کہا۔

بیس سے پچیس منٹوں کے دوران یہی کچھ ہوا۔ یہ چاروں اب ریسٹورنٹ سے نکل کر ویٹر کے پیچھے چلنے لگے جس کے جسم پر اب وردی کے بجائے عام سا مقامی لباس تھا۔ یہ پیدل سفر بھی پندرہ بیس منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے ویٹر کو ایک تنگ سی گلی میں مڑتے دیکھا۔ یہ بھی اس میں مڑ گئے۔

یہاں انہیں ایسا کوئی خطرہ تو نہ تھا مگر..... یہ سب احتیاط کے پیش نظر ہی کیا جا رہا تھا۔ گلی میں مڑتے ہی ویٹر ایک چکردار زینے طے کرنے لگا اور اوپر ایک اقامتی فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر اور جیب سے چابی نکال کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے تک..... یہ چاروں بھی زینے چڑھتے وہاں پہنچ چکے تھے۔

اگلے چند منٹوں بعد یہ سب اندر ایک کمرے میں موجود تھے۔ فلیٹ دو کمروں کا تھا۔ مختصر سا لاؤنج تھا۔ اس کی ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ ویٹر نے اپنا نام بتائے بغیر انہیں الرٹ رہنے کا کہا اور صرف اتنا بولا۔ ''تم لوگوں کو آج رات ہی سسلی کے لیے روانہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے ابھی تم آرام کر کے سفر کی تکان اتار لو۔''

''سسلی پہنچ کر ہمیں ہتھیاروں اور ایک عدد خفیہ ٹھکانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس کا کیا بندوبست ہے؟''

خالد بن جنید نے اس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔ ''یہ سب تمہیں سرمر (sire mar) میں سوار ہونے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔''

''سرمر.....؟'' خالد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ایک کار فیری سروس ہے۔ ایک لگژری ریورکروزر..... جو لوگوں کو اٹلی اور سسلی کے جزائر تک پہنچانے کی سروس کہلاتی ہے جبکہ عام راستوں اور سڑکوں کے لیے یہاں انٹربس سروس ہے.....'' اس نے بتایا۔

''سرمر میں ہی سسلی کی طرف سفر کرنے کے دوران تم سے PLO یعنی ہمارا تیسرا اور آخری ایجنٹ ملاقات کرے گا جو تم لوگوں کی مشن کے سلسلے میں سپورٹ اینڈ لاجسٹک فراہم کرنے کے بعد غائب ہو جائے گا۔ آگے تم چاروں کو اپنی صوابدید پر سب کچھ کرنا ہوگا۔'' اس کی بات پر خالد نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

ان چاروں کو جہاں جگہ ملی یہ وہاں پڑ کے سو گئے۔

شام گئے جاگے تو..... PLO کے اس دوسرے ایجنٹ نے ان کے لیے کچن میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

نہا دھو کر یہ سب لوگ تازہ دم ہو چکے تھے۔ کھانے کے بعد..... اس ایجنٹ نے انہیں ایک تھری وہیلر کار میں بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیا۔

انہوں نے جس سرمر (sire mar) میں سسلی کی طرف اپنا سفر شروع کرنا تھا، اس کی نشاندہی اور ٹکٹوں کا بندوبست بھی اس ''ویٹر نما'' ایجنٹ نے کر دیا تھا۔ بندرگاہ اور اس کے اطراف کا علاقہ بھی بڑا دلفریب تھا۔ تھری وہیلر کار کو تین لیرا ادا کر کے یہ لوگ اتر آئے، ایک دو منزلہ لگژری ریورکروزر سسلی کی طرف روانگی کے لیے موجود تھی۔ ٹکٹ آفس کی طرف دانیال اور فاروق نے رخ کیا جبکہ خالد اور زبیدہ سی پورٹ کے اندر بڑھ چکے تھے، یہاں ایک نسبتاً کم رش والی جگہ پر رک کر یہ ظاہر بے پروا نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگے۔ خالد بن جنید نے جینز کی ٹائٹ پینٹ پہن رکھی تھی اور ہاف آستین کی نیلی شرٹ، آنکھوں پہ اس نے سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ پچیس چھبیس سالہ خوبرو خالد اس وقت کسی کھلنڈرے نوجوان کی طرح ہی نظر آ رہا تھا جبکہ تیس پینتیس سالہ گوری رنگت اور صحت مند جسم کی مالک زبیدہ نے بھی وقت اور حالات کی مجبوری کے باعث ٹخنوں سے اونچی سیاہ چست پتلون اور اوپر لوز شرٹ پہن رکھی تھی۔ گھنے بال کاندھوں تک آتے تھے جنہیں اس نے پونی ٹیل کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی دھوپ کا چشمہ تھا جسے اس نے اپنی پیشانی پہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں اس کی غیر معمولی کشادہ آنکھوں کی خوبروئی گہرا پن لیے ہوئے تھی۔ دانیال اور فاروق ہم عمر تھے، جو بیس بائیس کے پیٹے میں تھے۔ انہوں نے لانگ نیکرز پر بیگی اسٹائل کی بنیان ٹائپ ٹی شرٹیں زیب تن کر رکھی تھیں۔

اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔ خالد اور زبیدہ کو خوشی تھی کہ ان کے مزید دو دن ضائع ہونے سے بچ گئے تھے، ورنہ تو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ والے PLO کے ایجنٹ نے یہی کہا تھا کہ ممکن ہے انہیں دو روز بعد سسلی کے لیے روانہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہونا پڑے اور شکر تھا کہ ''ممکن'' نہ ہوسکا تھا اور انہیں اسی روز اٹلی (روم) چھوڑنے کا گرین سگنل مل گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دانیال اور فاروق آتے نظر آئے، ان کی چال ڈھال سے لاابالی پن بہ دستور عیاں تھا۔ یہ دونوں پالرمو (سسلی) کے چارٹکٹ خرید لائے تھے۔

لگژری ریور کروزر میں ان کے سوار ہونے کے آدھے گھنٹے بعد دو تین بار بگل ہنکارنے کی آواز ابھری اور پھر ان کا پالرمو کی طرف سفر شروع ہوگیا۔

جس وقت یہ آبنائے میسینا سے گزر رہے تھے، اس وقت رات اترنے لگی تھی اور فضا خنک ہونے لگی تھی۔ اپنی ایڈونچر کٹ سے انہوں نے کچھ گرم جیکٹس وغیرہ نکال کر پہن لی تھیں۔ لگژری کروزر میں ہر شے کی سہولت تھی۔ بار روم، بلیئرڈ روم، سوئمنگ پول، کلب..... غرضیکہ وہ سب کچھ جس کی یہاں کے لوگوں کو خوشی میں ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ سفر انہی گہما گہمیوں اور رنگینیوں کے ساتھ جاری تھا کہ اچانک ریور کروزر کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی، یہاں تک کہ وہ آبنائے میسینا کے بیچ ہلکورے کھانے لگی۔ پتا چلا کہ ریور کروزر میں کوئی خرابی ہوگئی تھی۔ اس طرح کا ایک اعلان مختلف کمپارٹمنٹ اور کمروں، تفریحی پوائنٹ پر نصب اسپیکروں پہ کیا جانے لگا۔

''ایک معمولی ٹیکنیکل خرابی کے باعث کروزر ''البٹا'' کو اینکر کروایا گیا ہے۔ ہمارا تربیت یافتہ عملہ بہت جلد اس کی خرابی دور کردے گا..... آپ اپنی تفریح جاری رکھیے۔''

مسافروں کو اس کی کوئی پروا نہ تھی بلکہ انہوں نے اسپیکر پر ہونے والے اس اعلان کو شاید سننے میں بھی دلچسپی نہ لی ہو۔ وہ سب اپنی اپنی عورتوں اور تفریح میں مگن تھے مگر..... خالد اور زبیدہ وغیرہ کے لیے یہ بات باعث پریشانی تھی اس لیے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل میں کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتے تھے۔ بہرطور اب ایک غیر معینہ انتظار کے سوا کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہ لوگ عرشے سے اپنے سوئٹس کی طرف بڑھے۔ کروزر میں لائٹنگ کا بھی غیر معمولی بندوبست کیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں سطح آب پر جیسے کوئی فانوس ہلکورے لے رہا ہو۔ لوگ اس وقت کو بھی انجوائے کررہے تھے۔

راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک زبیدہ ٹھٹکی۔ دائیں بائیں عرشے پر فولڈنگ چیئر اور میزوں پر بھی کچھ لوگ موجود تھے، انہی میں سے دو افراد میں سے ایک کو..... زبیدہ نے اپنے ساتھی سے کچھ کہتے سنا تھا۔ باقی تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی مگر..... جو جملہ تیز اور شناسا تھا اس پر ضرور چونکی تھی۔ اس آدمی کے منہ سے کوانڈو کا لفظ زبیدہ کو چونکانے کا سبب بنا تھا۔ یہ سفر قلیل مدت کا تھا تاہم ریسٹنگ اینڈ ریٹائرنگ کے لیے انہوں نے مشترکہ طور پر ایک سوئٹ لے رکھا تھا۔ یہ ایک پرتعیش نشست گاہ تھی۔ ایک دو کاؤچ بھی کونے میں دھرے پڑے تھے۔ زبیدہ لوٹنے کا کہہ کر باہر نکل آئی تھی اور راہداری سے ہوتی ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی ریلنگ والی مختصر سیڑھیوں کے ذریعے دوبارہ عرشے پر آگئی۔ اس کی عقابی نگاہوں نے جلد ہی ان دو آدمیوں کو دیکھ لیا جو دو فولڈنگ چیئر پر ایک گول میز کے قریب بیٹھے اسکاچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دونوں سرخی مائل رنگت کے مقامی ہی آدمی نظر آتے تھے، تاہم زبیدہ کی گھاگ نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ کچھ اچھے قماش کے نہیں لگتے..... ان دونوں میں سے ایک کے منہ سے ہی اس نے کوانڈو کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے قریب کی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ مردوں کو منی اسکرٹ والی طرح دار اسمارٹ سی ویٹرس سرو کررہی تھی جبکہ مرد ویٹر خواتین کو..... زبیدہ کی میز کی طرف لپکنے والا سفید شرٹ اور ٹائی کے نیچے سیاہ پتلون پہنے ایک خوبرو سا ویٹر تھا۔

زبیدہ نے اسے اپنے لیے ایک عدد لائم جوس لانے کا کہا جو تھوڑی دیر بعد ہی ایک بیگ کی شکل میں اس کے سامنے دھرکے لوٹ گیا۔ نفیس قسم کے بلوریں پیگ کے کنارے پر ادھ کٹا لیمو ''اڑسا'' ہوا تھا۔

''یار روجر!..... میں باس کے غصے سے بہت ڈرتا ہوں، کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔'' زبیدہ نے ایک کو اپنے ساتھی سے یہ کہتے سنا۔

دوسرا جواباً بولا۔ ''نہیں چک! تاخیر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر مسئلہ یہ ذرا اور قسم کا ہے، سمجھ میں نہیں آتا..... ایسے حساس اور نازک معاملات باس کو خود کروانے چاہیے تھے، لاسکی رابطہ بھی کیا جاسکتا تھا۔''

روجر نامی شخص نے قدرے منہ بسور کے کہا تھا۔

زبیدہ جس مقصد کے لیے یہاں بیٹھی تھی، وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا مگر کوانڈو کے لفظ پر وہ بیٹھی رہی۔

''کوانڈو پہنچنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ جو خطرے سے خالی نہیں..... میں نے تو سنا ہے وہاں ایسا حساس بلکہ مہلک اور سنگین ترین سیکیورٹی سسٹم ہے کہ ایک پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا..... پھر ہم تو.....''

''میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا۔'' چک نامی اس کے ساتھی نے برملا کہا۔ ''ہم تو خیر چوری چھپے نہیں جارہے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

باس نے ہمارے لیے کوانڈو کے جزیرے تک پہنچنے کے لیے ایک تھرو پراپر چینل کا بندوبست کروادیا ہے لیکن..... پھر بھی..... مجھے ایسا لگتا ہے..... جیسے ہم وہاں بخیر و عافیت پہنچ بھی جائیں تو واپس کبھی نہیں لوٹ پائیں گے۔''

''خیر!..... ایسی بات بھی نہیں چک۔'' روجر اسکاچ وھسکی کا ایک گھونٹ بھر کے بولا۔

''ہمارا باس، کوانڈو کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ اسرائیلیوں نے وہاں کھربوں ملین ڈالرز لگائے ہیں۔ وہ اپنے اس خفیہ اسپائی اسٹیشن کا نقصان اور اس کی privacy پر آنچ تک نہیں آنے دے گا اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ چیک ڈوکر کے نام سے سسلی ہی نہیں پورا اٹلی بھی کانپتا ہے۔''

''مگر اسرائیلیوں کو شاید باس کی خطرناکیوں کا علم نہیں۔''

اس وقت اسپیکر ہنکارا۔ مسافروں کو روانگی کی خوشخبری سنا دی گئی تھی۔ ریورکروزر البٹا کی فنی خرابی دور کردی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد روجر اور چک بھی اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئے۔ مگر زبیدہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پہ سناٹے اترے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے سسلی سے پالرمو تک پہلے ہی سے اندر ہی اندر ایک آگ بھڑکی ہوئی ہے اور خود ان چاروں کو بھی ایک ہاتھی نہیں کئی ہاتھیوں کے درمیان رہنا پڑے گا۔

☆☆☆

آئزر مین بیری جونیئر کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی جنرل آئزک فرناش فوراً حرکت میں آیا تھا۔ وہ کمشنر پیریز ناون کی لاڈلی اکلوتی بیٹی بازغہ کو کسی بھی صورت میں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک یہودی کی غداری قوم کی تباہی پر منتج ہوسکتی ہے..... وہ جس قدر سنگ دل اور سفاک ذہنیت کا مالک تھا، اتنا ہی مکار اور عیار بھی تھا۔ اسے اس حقیقت کا بھی خوب اندازہ تھا کہ کمشنر ناون بھی یقیناً بہت پہلے سے اس بات کا ادراک کرچکا ہوگا اور وہ اپنی بیٹی کو کسی متوقع سزا سے بچانے کے لیے ضرور ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا لہٰذا اس نے سب سے پہلے اور فی الفور کمشنر پیریز ناون کی گرفتاری اور نظربندی کے احکامات جاری کر ڈالے۔ اس کے بعد..... اس نے بازغہ کی تلاش اور بہ صورتِ دیگر اسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات جاری کردیے۔ گویا وہ بازغہ کے ڈیتھ وارنٹ جاری کرچکا تھا۔ وہ بھی اپنے ہیڈ کوارٹر کے ''سچویشن روم'' میں تھا کہ اسے ایک چونکا دینے والی اطلاع موصول ہوئی، جسے سن کر غیظ و غضب کے مارے اس کا چہرہ مزید مسخ ہوکے مکروہ نظر آنے لگا۔ اگرچہ وہ پہلے ہی بازغہ کی تلاش کے لیے سات لڑاکا اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز بازغہ اور اس تیسرے مریض کی تلاش میں روانہ کرچکا تھا۔ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تیونائی حملے کے کسی زخمی مجاہد کو اسٹیٹ سے نکال لے گئی ہے اور اس سلسلے میں جنرل فرناش نے اسپتال کے جی ایم ایس کی بھی خوب خبر لی تھی مگر اس وقت اسے بازغہ کے بلیک ڈارنٹ جاری کرنے کے اختیار نہیں ملے تھے۔ تاہم اس نے مفرور بازغہ کے باپ کمشنر پیریز ناون کو فوری طور پر اپنے آفس طلب کرلیا تھا۔

پیریز ناون جیسے ہی اپنا منہ لٹکائے اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو قہر و غضب سے پھنکتے ہوئے جنرل فرناش نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ بھاری ہمر کم ہونے کے باوجود وہ لمبے تڑنگے جنرل فرناش کے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کا تھپڑ کھا کے چند قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور ہوگیا۔

''ناون! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی غدار بیٹی کو تم نے ہی فرار کروایا ہے، اس فلسطینی حریت پسند کے ساتھ۔''

جنرل فرناش بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں سے غضب کی خوف ناکی ٹپک رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جہازی سائز کی میز سے بھرا ہوا لمبی نال والا خوف ناک پستول نکال لیا اور اس پر تان لیا۔

''آئی ول شوٹ یو..... بتاؤ مجھے کدھر گئی ہے تمہاری غدار بیٹی؟''

ناون کی حالت غیر ہورہی تھی، پہلے تو اس نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا کہ اس کی پھول سی نازک بیٹی بازغہ جدھر بھی گئی ہوگی، کم از کم اس درندہ صفت آدمی سے دور ہی تھی تاہم وہ جنرل فرناش سے خوف زدہ بھی تھا۔ اسے اپنی جان خطرے میں نظر آرہی تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''سس..... سر!..... مم..... مجھے تو نہیں معلوم..... میں تو خود تیونائی دھاوے کے بعد تل ابیب روانہ ہوگیا تھا..... شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' جنرل فرناش حلق کے بل دہاڑا۔ ''میں پوچھتا ہوں..... تم نے اپنی بیٹی کو کدھر فرار کروایا ہے؟'' ناون کی پیشانی سے پسینا بہنے لگا تھا، وہ بولا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''میں قسم کھاتا ہوں سر! مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔''

جنرل فرناش کا مکروہ چہرہ لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ہندی چندی آنکھوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اپنے سامنے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپاتے کھڑے کمشنر پیریز ناون کو گھورے جا رہا تھا۔ لمبی خوف ناک نال والا پستول ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس کی نال کا رخ ناون کی طرف ہی تھا اور انگلی ٹریگر پر ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا کہ جنرل فرناش کسی بھی وقت اسے شوٹ کر ڈالے گا۔ اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور چھت کا پلستر اکھڑ کر نیچے گرا۔ اپنا غیظ نکالنے کے لیے جنرل فرناش نے چھت پر فائر داغا تھا۔

بہرطور..... اس نے اسی وقت پیریز ناون کو وردی اتارنے کا حکم دے ڈالا اور اسے نظر بند رہنے کے احکامات جاری کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ فون پر ان سات لڑاکا کمانڈوز کو لیڈ کرنے والے ایجنٹ پالی مور سے رابطہ کر رہا تھا جنہیں اس نے بازغہ اور تیسرے مریض (محسن) کی تلاش میں روانہ کیا تھا۔

☆☆☆

''ہگانہ آرمی'' کے موروثی ہیرو اور بانی بہ الفاظِ دیگر یہودیوں کے باپ..... آئزرمین بیری جونیئر کے ساتھ اعصاب شل کر ڈالنے والی کارنر میٹنگ بھگتانے کے بعد..... شن بیتھ کی مادام میڈوسا نے ہی نہیں بلکہ الیا بیتھ کے چیف فوہاگ بیل نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ بہ قول فوہاگ کے مادام میڈوسا خوش قسمت تھی کہ وہ آج آئزرمین بیری کے عتاب سے بلکہ اس کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی۔

دونوں نے وہ رات پروگرام کے مطابق یروشلم کے ایک سپر کمفرٹ ہوم میں اکٹھے بسر کی تھی۔ اس کے بعد شام سے پہلے پہلے وہ دونوں اپنے الگ الگ ہوائی سفر پہ روانہ ہو گئے تھے۔ مادام میڈوسا نے لندن کا رخ کیا تھا جبکہ فوہاگ بیل نے واشنگٹن کی ٹھانی تھی۔ وہ وہاں امریکی وزارتِ خارجہ کے سیکریٹریٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ عالمی معاملات میں گریٹر اسرائیل پلان کے مفادات کو آگے بڑھانا اس کا خاص مشن رہتا تھا..... کیونکہ یہودیوں نے اپنے عظیم اسرائیل کو ایک علامتی سانپ کا نام دے رکھا ہے۔ جو تمام عالمِ اسلام کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے اور اس کا منہ یروشلم کی طرف ہے۔ امریکی سیکریٹریٹ میں گھسے بیٹھے الیا بیتھ نے ایک سازش کے تحت عراق کے مخالف دھڑے کے چند عاقبت نااندیش جرنیلوں کو امریکی خفیہ احکامات کے تابع بننے پر مجبور کیا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب مشرقِ وسطیٰ میں خلیجی بحران نے جنم لیا تھا جس کا واحد مقصد عراق کے ممکنہ ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ عراقی عوام کی یہ بدقسمتی تھی شاید کہ..... عراقی صدر امریکا کی تہ میں کوڑیالے ناگ کی طرح چھپے بیٹھے اسرائیلی منصوبے کو نہ سمجھ سکا۔ جس نے اپنے مخلص اور وفادار ساتھیوں کا خیال رکھنا اور ان کی باتوں کو اہمیت دینا چھوڑ دیا اور کویت پر چڑھائی کر دی۔ اسرائیلی سازش کا اژدھا منہ پھاڑے عراق کو نگلنے کے لیے سرکنا شروع ہو چکا تھا۔ الیا بیتھ نے ٹیمپل ماؤنٹ پر اکیس فلسطینیوں کو گولیاں مار کے شہید کر دیا۔ اس طرح اسرائیل نے فلسطینی مسئلے کو بھی خلیج کے بحران سے منسلک کرنے کا جواز پیدا کر ڈالا۔ عراق میں تیل کی راشن بندی کر دی گئی۔ برطانیہ کے سابق وزیراعظم مسٹر ایڈورڈ ہیتھ نے بغداد میں عراقی صدر سے ملاقات کی اور ان سے برطانیہ کے بوڑھے اور بیمار باشندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ عراق نے فرانس کے سارے 330 اور برطانیہ کے 34 یرغمالیوں کو مسٹر ہیتھ کے ہمراہ بذریعہ ہوائی جہاز بغداد سے جانے کی اجازت دے دی۔ عراقی ری پبلکن گارڈز مکمل طور پر امریکا کی مٹھی میں تھے اور امریکا اسرائیل کی مٹھی میں تھا۔ عالمی بساط پر اسرائیل نے غضب کی چال چالی تھی۔

خلیجی بحران کے بعد اسرائیل..... عراق کو سبوتاژ کرنے کے لیے اپنے ایک نئے ایجنڈے پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔

الیا بیتھ امریکی مقتدرہ کے ذریعے چند ایسے عاقبت نااندیش عراقی جرنیلوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اسرائیل کا ناگ نہیں..... بلکہ ایک آگ اگلنے والے ڈریگون کی طرح عراق کو بغداد سمیت بھسم کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہاں واشنگٹن ڈی سی میں الیا بیتھ کے فوہاگ بیل کی چیرہ دستیاں جاری تھیں۔ ادھر..... لندن میں ''ہگانہ آرمی'' کے اس جڑواں بچے..... شن بیتھ کی مادام میڈوسا..... وہاں پہلے سے مقیم ''جیوش ہوم'' کی مدد سے ایک بڑی تجارتی کمپنی قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ابھی اسرائیل کو امریکا کی طرح کم از کم برطانیہ میں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خاطر خواہ طریقے سے اپنے پنجے گاڑنے کا موقع نہ ملا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برطانیہ خود بھی امریکا کے آگے سر جھکاتا تھا، تاہم اسرائیل یہاں پر دوسرے طریقے سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں مصروف کار تھا۔ شن بیتھ اس کی واضح مثال ہے۔ ایک بڑی ٹریڈ کمپنی کی کرتا دھرتا مادام میڈوسا نے اس وقت اپنے سیونتھ لیمپ اسٹریپ کے سات منزلہ دفتر کے ٹاپ فلور میں..... دو اہم ایجنٹوں نے بالی مور اور جزبیلا کو بلایا تھا۔

مذکورہ دونوں ایجنٹوں نے ویسٹ یارک شائر اور بالخصوص لندن کی انٹرنیشنل اسٹڈی سینٹرز کے پائے کی یونیورسٹیز کو چیک کیا تھا۔ آج ان کی رپورٹ ایک پاکستانی اسکالر ڈاکٹر کمال احمد سے متعلق تھی۔

بالی مور اور جزبیلا نے ڈاکٹر کمال کے متعلق بشمول اس کے پاکستانی بیک گراؤنڈ کے ساری تفصیل مادام میڈوسا کے گوش گزار کردی۔ ان میں ڈاکٹر کمال کی اسرائیلیوں کے خلاف آواز بلند کرنے سے لے کر عراقی دوست حماد اندال اور پولیس شیرف کی بیٹی جینیفر نسویٹر کی دوستی تک ساری اطلاعات شامل تھیں۔ یہی نہیں اپنے ہم قوم ہم مذہب یہودی ڈی کارلو کی ڈاکٹر کمال سے ذاتی چپقلش کے بارے میں بھی بتادیا۔

''چھ فٹ قد، چوڑے شانے، گورا رنگ، خوبرو، ہونہار طالب علم، نیشنلٹی پاکستانی، چہرے پہ شفاف عدسوں کی عینک۔ بہ ظاہر ٹھہرے ہوئے پانی جیسے چہرے پر تاثرات مگر اندر سے غضب کا جوشیلا اور شعلہ بیاں مقرر، وطن کی محبت سے سرشار..... نظر آنے والا ڈاکٹر کمال احمد لیڈز یونیورسٹی کی اب ہر دلعزیز شخصیت بن چکا ہے۔''

جزبیلا نے ڈاکٹر کمال کی شخصیت کا سراحت بھرا نقشہ مادام میڈوسا کے سامنے کھینچا تھا۔ تاہم مادام میڈوسا ڈی کارلو کے تذکرے پر فوراً جزبیلا کی طرف دیکھ کر پرجوش لہجے میں بولی۔

''فی الفور ڈی کارلو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ یہ ہمارے مشن میں بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔''

''یس مادام!..... ایسا ہی ہوگا۔'' جزبیلا نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ بیس، بائیس سالہ گوری چٹی اور نازک اندام سی نظر آنے والی درمیانی قد کی جزبیلا شن بیتھ کی ایک خطرناک ٹاپ ایجنٹ تھی۔

''تم کسی طرح..... حماد کے قریب ہونے کی کوشش کرو.....'' مادام میڈوسا نے جزبیلا کے ساتھ بیٹھے بالی مور سے مخاطب ہوکر تحکمانہ کہا اور خود ہی ... جواب دیا تھا۔

''بلکہ..... اس کے کسی کام آنے کی کوشش کرو..... تمہاری ہمدردی اسے متاثر کرے اور تمہارا اس پر کوئی احسان اسے مجبور بنا ڈالے۔''

میڈوسا نے آگے ہدایت دی تو اس کے بجائے نیلی آنکھوں والی جزبیلا نے ایک نگاہ قریب بیٹھے اپنے ساتھی بالی مور کی طرف دیکھتے ہوئے میڈوسا سے کہا۔

''یہ مسلم لوگ..... بالخصوص دوسرے ملک سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے کسی مقامی فرد سے کم ہی گھلتے ملتے ہیں۔''

''انہیں مجبور کرو..... مجبور..... بہت سے طریقے ہیں۔ کیا تم جیسی گھاگ ایجنٹ کو یہ طریقے بھی بتانا پڑیں گے؟'' مادام میڈوسا نے درشت لہجے میں جزبیلا اور بالی مور کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''حسن، شباب، شراب سے میری جوانا تک..... ہر ہتھکنڈے آزمالو..... ہمیں ہر حالت میں یہ دونوں قابل نوجوان چاہئیں۔ انہیں برین واش کرکے اپنے عظیم تر اسرائیل کے لیے استعمال کرنا ہوگا..... دیٹس اٹ.....''

''او کے میڈم.....! ایسا ہی ہوگا۔'' بالآخر جزبیلا نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد مادام نے انہیں جانے کا حکم دے دیا۔ ڈیکسامیتھ ان کارپوریٹڈ کمپنی کی اس سات منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور کا یہ لمبا چوڑا کانفرنس روم بھائیں بھائیں کرنے لگا کیونکہ شن بیتھ کے دونوں مذکورہ ایجنٹوں کے نکلتے ہی مادام بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے شاہانہ طرز کے آفس میں آگئی تھی۔

چکنے فرش والا یہ آفس پرتعیش اشیا اور جدید، نفیس اور بیش قیمت اشیا سے مزین تھا۔ اس کی دیواریں ہلکے سبز رنگ کے شیڈ والے شیٹے کی تھیں۔ جہازی سائز کی میز کے پیچھے اونچی پشت گاہ والی ریوالونگ چیئر نظر آرہی تھی۔ کرسیوں کے علاوہ نفیس قسم کے صوفے بھی لگے ہوئے تھے۔ میز کے سامنے دیوار پر بینتالیس انچ کی ٹی وی اسکرین (ایل ای ڈی) نصب تھی۔ مادام میڈوسا کمرے میں پہنچ کر اپنی چیئر کے پیچھے جاکر دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑی ہوگئی۔ سامنے دور تک بلند و بالا عمارتیں اور اوپر نیلے آسمان پر سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔ نیچے معروف شاہراہ تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے چند ثانیے اسی طرح کھڑی کچھ سوچتی رہی، پھر پلٹ کر اپنی بھاری بھرکم سیاہ چیئر پر براجمان ہوگئی۔ اس کی میز پر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دلکش خوشبوؤں سے بسا مارچ 2015ء کا پُر بہار پاکیزہ

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگہت سیما
اور رفاقت جاوید
کے دلنشیں ناول

زاھدہ پروین کا خوب صورت منی ناول..... **جنگل کا پھول**

زمر نعیم تشریف لائی ہیں متاثر کُن مکمل ناول **اسیرِ وفا** کے ساتھ

نبیلہ ابر راجا کا نیا ناولٹ **متاعِ دل** صرف آپ کے لیے

شیریں حیدر کی پُرسوچ تحریر..... **آئینہ**

رضوانہ پرنس کی حاضری
فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کے ہمراہ
پڑھیے اداکارہ سنبل ملک کی دلچسپ باتیں

صحرائے تھر کی کٹھنائیوں سے متعلق **سیما رضا ردا** کا پُرفکر افسانہ

اس کے ساتھ ساتھ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہر قلمکاروں کی فکر انگیز مگر دلآویز تحریریں، جن میں
سیما بنت عاصم، ام ثمامہ، روشانے عبد القیوم،
فرزانہ نگہت، بشریٰ باجوہ، نظیر فاطمہ، سلمیٰ غزل، سحرش فاطمہ،
ام ایمان، نادیہ جہانگیر، فرحت احمد اور قراۃ العین شکیل شامل ہیں

حسبِ معمول مختلف دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پُرمسرت و دلفریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مختلف ٹیلی فون کے علاوہ کمپیوٹر بھی دھرا پڑا تھا۔ اس کی مخروطی انگلیاں بغیر تار والے سپر کمپیوٹر سے کھیلتی رہیں۔ اس کے بعد سامنے اسکرین پر ٹی وی نشریات کے بجائے کمپیوٹر اسکرین کا نقشہ آن ہوگیا۔ وہ اب پورے انہماک کے ساتھ ڈاکٹر کمال کے مکمل تصویری اور تحریری بائیوڈیٹا کو دیکھ اور پڑھ رہی تھی۔ یہ سب تفصیل جزبیلا سے حاصل کردہ تھیں۔ بالآخر کچھ سوچ کر اس نے ٹی وی اسکرین سے کمپیوٹر سیٹ .... کو آف کر کے ٹی وی آن کردیا۔ آواز ہلکی رکھی اور اپنی خوب صورت سنڈول کلائی پر بندھی بہ ظاہر بیش قیمت نظر آنے والی رسٹ واچ کو چہرے کے قریب کرلیا۔

وہ اب واچ ٹرانسمیٹر پر جزبیلا سے تحکمانہ مخاطب تھی۔

''جزبیلا..... ! تم فوری طور پر پہلے ایک کام کرو..... سب کچھ چھوڑ کر..... ڈی کارلو کو تلاش کر کے اس کے ساتھ تھوڑے راہ و رسم بڑھاؤ اور پھر اسے میرے پاس لے آؤ..... او کے..... اٹس اوور.....'' اس کا اثباتی جواب سنے بغیر میڈوسا نے رابطہ منقطع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ..... اپنی کار میں روانہ ہو رہی تھی۔ اس کا رخ لیڈز یونیورسٹی کی طرف تھا۔ ذہن میں ابھرنے والے کسی اچانک اور فوری خیال کے تحت وہ اب بذات خود ڈاکٹر کمال سے ملاقات کا ارادہ رکھتی تھی۔

☆☆☆

ایمبولینس اسٹیٹ کی حدود سے نکل چکی تھی اور خاصی تیز رفتاری کے ساتھ تل ابیب کی طرف دوڑی جارہی تھی۔ ڈرائیور کے چہرے پہ کچھ الجھن کے تاثرات نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے، وجہ بہت معقول تھی کیونکہ اس نے بھی اسپتال کے احاطے میں اندر بیٹھے کمشنر پیریز ناون اور اس کی بیٹی بازغہ سے ہونے والی گفتگو کسی حد تک سن لی تھی۔ آخر کو وہ بھی ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے بھی دال میں کچھ کالا محسوس ہونے لگا تھا مگر سردست اس میں ایک کمشنر کی بیٹی (بازغہ) سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوسکی تھی۔ وہ کم از کم تل ابیب کے کسی بڑے اسپتال تک پہنچنے سے پہلے خاموش ہی رہنا چاہتا تھا مگر اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی۔

اندیشناک وسوسوں اور خطروں کی گود میں دھڑکتی یہ رات اپنے نصف پہر کی طرف گامزن تھی، ہر سو گہری تاریکی کا راج تھا۔ آسمان پر محاق کا چاند دور کہیں نیم صحرائی افق کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سفر تھوڑی دیر خاموشی سے جاری رہا۔ اس کے بعد اچانک بازغہ نے ایک ایسی حرکت کر ڈالی کہ ایمبولینس کے ڈرائیور کو بیک وقت حیرت و تشویش کا ایک زبردست جھٹکا لگا۔

برابر والی سیٹ پر بیٹھی بازغہ نے پستول نکال لیا تھا جس کا رخ ڈرائیور کی طرف تھا۔

''گاڑی روک دو۔'' دوسرے ہی لمحے وہ اس سے تحکمانہ درشتی سے بولی۔

ڈرائیور..... بازغہ کی اس غیر متوقع حرکت پر اپنی جگہ ہکا بکا رہ گیا مگر جب بازغہ نے انتہائی سرد لہجے میں اسے حکم عدولی پر گولی مارنے کی دھمکی دے ڈالی تو ڈرائیور نے فوراً ایمبولینس کی رفتار بتدریج کم کرنا شروع کردی۔ اس وقت ڈرائیور کی سماعتوں میں کمشنر پیریز ناون کی وہ بات گونجنے لگی جو وہ ایمبولینس کے بالکل قریب کھڑا اپنی بیٹی بازغہ سے انتہائی بوکھلاہٹ آمیز پریشانی اور تشویش سے کہہ رہا تھا۔

''بیٹی! تمہاری جان اس وقت سخت خطرے میں ہے۔ فلسطینی مجاہدوں سے تمہارے ہمدردانہ رویے نے جنرل فرناش کو آگ بگولا کردیا ہے۔ وہ تمہیں کسی وقت بھی گرفتار کر کے گولی مار دینے کا حکم صادر کرسکتا ہے۔ اس سفاک آدمی سے کوئی بھی بعید نہیں۔ تم فوراً آج کی فلائٹ پکڑو اور امریکا روانہ ہوجاؤ۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں تل ابیب سے باہر نکال دوں۔''

''میں کہتی ہوں گاڑی روک دو۔ ورنہ گولی مار دوں گی تمہیں۔'' ڈرائیور کو سوچوں میں پاکر بازغہ نے اسے پھر دھمکی دی جبکہ ڈرائیور تب تک اپنی سماعتوں میں گونجنے والی کمشنر پیریز ناون کی باتوں کا مطلب..... اب ٹھیک طرح سے سمجھ گیا تھا۔ پھر دفعتاً اس کے جی میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس نے یکدم ایمبولینس کی رفتار بڑھادی۔ بازغہ کی آنکھوں میں درشتی کی لہر کے ساتھ ایک خوف کی پرچھائیں بھی ابھری۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا کر بولی۔

''یہ..... یہ کیا کررہے ہو؟ میں نے تم سے کہا ہے، گاڑی روک دو۔ میں تم پر فائر کرنے لگی ہوں۔''

''میں جان چکا ہوں، تم کیا کرنے جارہی ہو۔'' ڈرائیور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''ضرور ایمبولینس کے اندر کوئی زخمی دشمن موجود ہے..... تم مجھ پر گولی چلاؤ گی تو یہ گاڑی الٹ جائے گی اور پھر کوئی نہیں بچے گا۔''

ڈرائیور کی بات پر ایک لمحے کو بازغہ بری طرح پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے اور کرے؟ بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ ایمبولینس کی رفتار اسی نوے کے قریب تھی اور اسٹیئرنگ پر ڈرائیور ہی کی گرفت تھی۔ ایسے میں اگر بازغہ اس پر گولی چلا دیتی تو یقیناً گاڑی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بے قابو ہوکر الٹ جاتی۔ یہ ایک خطرناک اور جان لیوا حادثے کا باعث بھی بنتا۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے بروقت ایک خطرناک چال چلی تھی۔ اس نے بھی بازغہ کی اس تشویش آمیز پریشانی کو تاڑ لیا تھا۔ بازغہ چیختی رہی، حالات یکدم خراب ہونے لگے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کا رخ تل ابیب کی جانب ہی کر رکھا تھا۔ دفعتاً ایمبولینس میں لگے وائرلیس سیٹ پر ڈرائیور کو کال بھی موصول ہوگئی۔ یہ اسٹیٹ کے اسپتال کے جی اے کی کال تھی۔ سات اسرائیلی لڑاکا کمانڈوز کو اس نے ایمبولینس کی لوکیشن کے بارے میں بتانا تھا۔ اپنے جی اے کی کال اور بات سن کر اس نے فوراً اسے بتا دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا اور..... وہ اس وقت کہاں ہے، بازغہ کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس کا چہرہ متوحش نظر آنے لگا۔ صورتِ حال کی سنگینی اور خطرناکی کا اسے بھی ادراک ہوگیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار وہ کمانڈوز کے ہتھے چڑھ گئی تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ نہ وہ، نہ اس کا محبوب محسن.....

بازغہ کی بے بسی پر اسرائیلی ڈرائیور کے بدہیت ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ مگر دوسرے ہی لمحے بازغہ پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ ایک پل کھاتے موڑ پر ڈرائیور نے جیسے ہی گاڑی کی رفتار ذرا کم کی بازغہ شیرنی کی طرح غراتے ہوئے اس پر جھپٹ پڑی۔ ڈرائیور نے مزاحمت کرنے کے بجائے اپنا حربہ آزمانا چاہا اور موڑ کاٹتے ہی اس نے رفتار بڑھانی چاہی۔ بازغہ نے اپنا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر جما دیا اور پاؤں کی ٹھوکر ڈرائیور کے اس پاؤں پر مارنے لگی جو ایکسلریٹر پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا، نتیجتاً ایمبولینس جھٹکے کھانے لگی۔ ڈرائیور نے بالآخر بازغہ پر جھپٹا مارا..... ردِعمل میں وہ اب بازغہ کو نہتا کرنا چاہتا تھا۔ بازغہ نے اس کے پہلو سے نال لگا دی اور لبلبی دبا دی۔ گولی کا دھماکا ہوا۔ بازغہ کا پستول والا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا۔ ڈرائیور ساکت ہوگیا۔ ایمبولینس ڈولنے لگی، بازغہ نے پستول پھینک کر ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمانے کی کوشش چاہی۔ وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی کہ دروازہ کھلتی اور ڈرائیور کی لاش باہر دھکیل دیتی۔ اس صورت میں ایمبولینس کے الٹنے کا خطرہ تھا۔ تاہم وہ..... ڈرائیور کی لاش سے چپکی رہی اور صرف اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ڈرائیور کا پاؤں ایکسلریٹر سے ہٹ گیا تھا، بازغہ نے ایک موقع پر دھیرے دھیرے بریک پیڈل پر دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔ ایمبولینس کا انجن کھانس کر بند ہوگیا۔ ذرا ہی دیر بعد ایمبولینس بھی رک گئی۔

اس اعصاب شکن کشاکشی میں بازغہ کے حواس شل ہوکر رہ گئے تھے۔ ایمبولینس رکتے ہی ہر سو دم بہ خود سی خاموشی چھا گئی۔ جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آتے آتے ٹل گیا ہو۔

بازغہ دوسرے دروازے سے اتری۔ فوراً ایمبولینس کا عقبی ڈبل پٹ کا دروازہ کھول دیا... مریض پریشانی کے عالم میں اٹھے بیٹھے تھے، محسن زیادہ پریشان نظر آرہا تھا..... اس نے بازغہ کو خون میں لتھڑا دیکھا تو مزید تشویش زدہ ہوگیا۔

''ہب..... بازغہ! تم ٹھیک تو ہو نا..... یہ..... یہ..... خون.....؟''

''میں ٹھیک ہوں..... لیکن.....'' بازغہ کچھ کہتے کہتے رکی، باقی دو مریض حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سے رہا نہ گیا..... چلا کر بولا۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے؟ کون ہو تم لوگ؟'' اس کے اشتباہ آمیز استفسار پہ..... بازغہ اور محسن نے کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ بازغہ نے ان دونوں کو ڈانٹ کر خاموش کرادیا۔ وہ ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ان دونوں مریضوں کی موجودگی میں وہ محسن سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، تاہم اس نے محسن کو سہارا دے کر ایمبولینس کے عقبی حصے سے اتارا..... اس کے بعد وہ اسے سہارا دے کر ڈرائیونگ کیبن میں سوار ہوگئی۔ محسن وہاں ڈرائیور کی لاش دیکھ کر چونک پڑا، تاہم بازغہ نے مختصراً الفاظ میں اسے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ جنرل فرناش نے ان کی تلاش میں سات لڑاکا کمانڈوز بھی روانہ کردیے ہیں اور ڈرائیور بھی اسپتال کے جی اے کو یہاں کی لوکیشن بتا چکا ہے، یہ سن کر محسن کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سات بے رحم اسرائیلی کمانڈوز بجلی کی تیزی کے ساتھ حرکت میں آتے ہیں، تاہم وہ بھی یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا، بولا۔

''بازغہ!..... ہم بہت سنگین اور خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں..... ہمیں فوراً یہ ایمبولینس چھوڑ کر اس وقت پیدل آگے بڑھنا ہوگا..... جلدی.....''

''لل..... لیکن..... تم زخمی.....''

''میں ٹھیک ہوں.....'' محسن نے بات کاٹی۔ ''دیر مت کرو، ہمارے پاس وقت کم سے بھی کم ہے۔ آؤ، میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا تو..... بازغہ نے اسے سہارا دیا۔ اس کے بازو اور ٹانگ کے زخموں کی اینٹھن کافی حد تک کم تھی، بازغہ اسے پہلے اس کی کنڈیشن کے بارے میں بتا چکی تھی کہ بازو کی ہڈی محفوظ تھی، گولی گوشت چیر کر نکل گئی تھی جبکہ ٹانگ میں گولی ران کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مقام پر پیوست تھی، تاہم حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ بازغہ کے سہارے تھوڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ اسلحے کے نام پر ان کے پاس صرف ایک عدد پستول تھا، جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں تھیں، ایک ڈرائیور پر بازغہ نے خرچ کر ڈالی تھی۔

موجودہ حالات میں محسن کا یہ فیصلہ درست تھا کہ انہوں نے ایمبولینس ویرانے میں چھوڑ دی تھی ورنہ ایمبولینس کا نظروں میں آجانا نسبتاً آسان ہوتا۔ وہ دونوں اب تاریکی کا حصہ بنے پیدل آگے بڑھ رہے تھے۔ رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ کہیں کہیں خودرو اور اونٹ کٹارا جھاڑیوں کی بھی بہتات نظر آتی تھی، وہ دونوں رکے بغیر آگے بڑھتے رہے..... پھر ایک نسبتاً بلند ٹیلے کے قریب پہنچ کر ذرا ستانے کے لیے رکے، محسن کو پیاس محسوس ہونے لگی۔ بازغہ کی بھی کم بری حالت نہیں تھی۔ تھکن اور پیاس سے اس کا بھی برا حال تھا۔ محسن کو اس کی تکالیف کا احساس تھا جو اس کی اپنی نہیں تھیں۔ ان تکالیف اور صعوبتوں کا تعلق..... تعلقِ خاطر سے تھا..... اور وہ تھا محسن..... محبوب..... محسن نے بازغہ کے اس جذبۂ دل کی عبارت کو آنکھوں سے ہی نہیں دل سے بھی پڑھا تھا۔ بارہا مواقعوں پر اسے سمجھانے کی بھی کوشش چاہی تھی کہ وہ جس راہ کا مسافر ہے اس راہِ پرخار میں اس طرح کے جذبات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ بے شک فطرت کے منافی چلنا بھی کارِعذاب سے کم نہیں مگر جو لوگ ایک کاز ایک مقصد اور ایک عزم کے لیے اپنی راہ کا تعین ایک بار کر لیتے ہیں پھر انہیں اپنی پہلی اور آخری منزل میں اپنا وہ نیک مقصد ہی نظر آتا ہے اور کچھ نہیں مگر بازغہ نے محسن کی یہ ساری باتیں بہ یک جنبشِ ابرو جھٹلا دی تھیں۔ اس نے یہ جواب دے کر محسن کو لاجواب کر رکھا تھا کہ وہ اس سے محبت سے پہلے ہی اس کے کاز، اس کے نیک مقصد سے متاثر ہو چکی تھی۔ محبت تو ویسے بھی کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ کسی بھی راہ سے کسی بھی ذریعے سے بازغہ کو بھی اعتراف تھا۔ جذبۂ انسیت ہی محبت کی پہلی سیڑھی ہے اور انسیت اثر پذیری کے عمل سے پھوٹتی ہے۔ بازغہ نے اپنے مختلف تعلیمی ادوار میں بہت کچھ پڑھا اور سیکھا تھا..... وہ برے بھلے کی تمیز کرنا جانتی تھی..... مثبت اندازِ فکر رکھنے والے ہی راہنمائی پاتے ہیں۔ وہ بھی محسن کی راہنمائی پا رہی تھی اور خوش تھی۔

محسن اب اسے خود سے چاہتا بھی تو جدا نہیں کر سکتا تھا۔ جانتا تھا، بازغہ اس کے ساتھ بہت دور تک نکل آئی ہے۔ اتنی دور کہ اب اس کے لیے واپسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ پلٹ کر دیکھتی تو پتھر کی بنا دی جاتی۔ اسے اب آگے ہی دیکھنا تھا، آگے ہی چلتے رہنا تھا اور وہ محسن کے ساتھ آگے چل رہی تھی۔

اچانک آسمان پہ گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ بازغہ سہم سی گئی، خود محسن کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ اس مخصوص قسم کی آواز کو دونوں اچھی طرح پہچانتے تھے۔ خونخوار دشمن ان کے تعاقب میں قریب پہنچ رہے تھے۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی، محسن نے ریتیلے ٹیلے کی ڈھلان پہ لیٹے لیٹے ذرا سر ابھار کے آواز کی سمت دیکھا۔ جلتی بجھتی روشنی کے جھماکے اسے دور سے ہی نظر آنے لگے، اس وقت ان کی تلاش کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

''دشمنوں کا ہیلی کاپٹر آرہا ہے، جھاڑیوں کی اوٹ میں آجاؤ فوراً۔'' محسن نے ہولے سے کہا۔ دونوں تیزی سے سرکتے ہوئے ایک ڈھلوان پر اگی گھنی جھاڑیوں کے مختصر سے جھنڈ کی اوٹ میں ہو گئے اور تب محسن نے ذرا سر ابھار کر سامنے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ دشمنوں کا ہی ہیلی کاپٹر تھا، اس میں سات اسرائیلی لڑاکا کمانڈوز جدید اسلحے سے لیس تھے اور وہ اپنے ہیلی کاپٹر سے ایک تیز گول دائرے والی سرچ لائٹ زمین پر ڈالے انہی کی طرف آرہا تھا۔ محسن بھی ہولناک حقیقت کا اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ان کے قدموں کے نشانات بھانپ چکے تھے، یہ بڑی خطرناک اور سنگین صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کمال کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ حماد اسے یونیورسٹی کیمپس لے آیا تھا۔ جینی بھی ان کے ہمراہ تھی مگر آج وہ یونیورسٹی کیمپس میں نہیں رکی تھی۔ ڈاکٹر کمال اور حماد کے کیمپس پہنچتے ہی وہ اپنی کار میں گھر چلی گئی تھی۔

''جینی ایک اچھی لڑکی ہے۔ ورنہ میں اس کی طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔'' حماد نے اعتراف کیا۔ دونوں کمرے میں آگئے تھے۔ ڈاکٹر کمال کی حالت کافی بہتر تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا جبکہ حماد اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

حماد کی بات سن کر ڈاکٹر کمال نے ہلکی مسکراہٹ سے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابتدا میں مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا کہ جینی کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئی کہ شاید حقیقت جان لینے کے بعد وہ..... اپنے بھائی ریان کی طرف سے جانب داری کا مظاہرہ کرے گی جیسا کہ اس کے باپ شیرف جان نے کیا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''ہاں!..... مگر..... مجھے خوشی ہوئی جب تمہاری دوست جینی نے نہ صرف حقیقت کو تسلیم کیا بلکہ اپنے باپ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔'' اس نے ذرا توقف کیا۔

''میرا خیال ہے اس نے اب اپنے گھر کا رخ بھی اس لیے کیا ہے..... آج لگتا ہے اس کی اپنے باپ سے ہی نہیں بلکہ اپنے بھائی سے بھی گرما گرم بحث ہوگی۔''

''ہاں! مجھے بھی یہی لگتا ہے مگر یار حماد! میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے جینی کے گھر میں کسی قسم کا آپس میں کلیش ہو۔'' ڈاکٹر کمال نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن اس متعصب کالے یہودی ڈی کارلو کو سزا ضرور ملنی چاہیے..... ورنہ وہ اور شیر ہوجائے گا۔ یہ بات قانونی طور پر آن دی ریکارڈ ہونی چاہیے۔ وہ دوسرا مجرمانہ حملہ بھی کرسکتا ہے۔'' حماد کے لہجے میں تفکر اور تشویش کے گہرے سائے تھے۔

''رپورٹ تو لکھوا دی گئی اس کے خلاف، دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟'' کمال نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! جینی بھی اس معاملے میں خاموش بیٹھنے والی نظر نہیں آرہی، مگر دوست! تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم بلاوجہ یونیورسٹی کیمپس کی حدود سے باہر مت نکلنا..... اور کہیں جانا ہو تو مجھے ضرور ساتھ رکھنے کی کوشش کرنا۔''

''تمہارا شکریہ حماد!..... میں تو تمہارا ویسے بھی ممنون ہوں اگر تم مجھے بروقت اسپتال نہیں پہنچاتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔''

ڈاکٹر کمال نے توصیفی لہجے میں کہا تو حماد بے اختیار سر جھٹک کر بولا۔ ''دوست! اس میں احسان یا شکریے کی کیا بات ہے۔ تم میرے ہم مذہب اور برادر اسلامی ملک پاکستان سے تعلق رکھتے ہو، یوں بھی یہ میرا انسانی ناتے فرض بھی بنتا تھا، تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں اس کے کام بھی آنے کی کوشش کرتا۔''

اگلے دن ڈاکٹر کمال یونیورسٹی نہیں گیا۔ جینی نے نوٹس کے سلسلے میں اس کی مدد کردی تھی۔ حماد بھی پیش پیش رہا تھا البتہ جینی کا موڈ سخت خراب نظر آرہا تھا۔ کمال کے پوچھنے پر اس نے ایک تلخ حقیقت کا قدرے شرمندگی کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کی توقع کے عین مطابق جینی کی اپنے باپ اور بھائی سے گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ بھائی نے اس روز واردات والے دن ڈی کارلو کی کار میں اپنی موجودگی سے صاف انکار کردیا تھا اور باپ نے بھی بیٹے کا ہی ساتھ دیا تھا جبکہ جینی پر الٹا الزام لگادیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کمال کی ڈی کارلو کے ساتھ ذاتی رنجش کی وجہ سے کمال کا ساتھ دے رہی ہے..... جینی گھر والوں سے ناراض ہوکر ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی کیمپس آکے فروکش ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر کمال اور حماد نے اس پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور دوستی کے ناتے اسے سمجھانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ محض ان کی خاطر اپنے گھر والوں سے ناراضگی ترک کرڈالے۔ پھر جینی نے ڈاکٹر کمال سے قدرے خفگی سے کہا۔ ''میں نے تمہاری خاطر نہیں بلکہ حق اور انصاف کی خاطر یہ سب کیا ہے۔ میں اگر ایک ذمے دار پولیس آفیسر کی بیٹی نہ بھی ہوتی تو بھی میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ مائی فٹ! ڈیڈی ایک پولیس افسر ہوتے ہوئے بھی ناانصافی کا مظاہرہ کریں گے، مجھے اس کی بالکل توقع نہ تھی بلکہ مجھے بھی پورا یقین ہے ڈیڈ کو بھی اندازہ ہے، یہ حرکت ڈی کارلو کی ہی ہے مگر یونیورسٹی انتظامیہ کی طرح وہ بھی ڈی کارلو پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچا رہے ہیں۔''

اس پر ڈاکٹر کمال کو اعتراف کرنا پڑا، بولا۔

''پہلے میں یہی سمجھتا آیا تھا کہ تیسری دنیا کے مقابلے میں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں قانون کی سختی سے پاسداری کی جاتی ہے اور بلاشبہ ایسا میں نے یہاں ہوتے بھی دیکھا ہے لیکن آج پہلی بار.....''

''کہیں کم کہیں زیادہ..... ایسا ہوتا ضرور ہے۔'' اس بار حماد نے کہا۔ ''ڈی کارلو بلاشبہ یک سر برآوردہ شخصیت کا بیٹا ہے، اقربا پروری اور شخصی دباؤ کا زہر ہر جگہ اپنا اثر منواتا ہے..... تاہم شاید سنگین جرائم کے معاملات میں ایسا نہ ہوتا ہو۔''

تینوں دوست آپس میں اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے۔ تاہم جینی نے اپنے گھر والوں سے ناراضگی برقرار رکھی تھی۔ آخری لیکچر اٹینڈ کرنے کے بعد ڈاکٹر کمال نے ریسرچ کلب کا رخ کیا۔ جاتے میں دو روز سے ریسرچ کلب بھی اٹینڈ کرتا ہوتا تھا، وہاں سے وہ رات دس سے گیارہ بجے کے بعد ہی فارغ ہوتا تھا۔ آج کا دن ریسرچ کلب کا تھا۔ ریسرچ کلب کی عمارت یونیورسٹی بلاکس کی چار منزلہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھی۔ یہ نارنجی رنگ کی مستطیل شکل کی عمارت تھی اور خاصے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی ایک وسطی گیٹ سے گزر کر وہاں پہنچتے تھے۔ کینٹین میں دوپہر کا کھانا کھا کے وہ تین بجے کمرے میں آیا۔ پھر لیب کوٹ سنبھالا، ضروری کتابوں کا ہینڈ بیگ لیا اور ریسرچ کلب کی عمارت کا رخ کیا۔

یونیورسٹی کے آڈیٹوریم ہال لیکچر ہال اور مختلف بلاک

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

کے مقابلے میں ریسرچ کلب کی عمارت میں خاموشی اور سناٹا طاری رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہاں کوئی ذی نفس نہیں ہوتا تھا۔ سب ہوتے تھے مگر اپنے پریکٹیکل ورک میں اس قدر انہماک کے ساتھ مصروف رہتے تھے کہ..... بازو والے فرد سے بھی انہیں بولنے کا یارا نہیں رہتا تھا۔

ریسرچ کلب کی عمارت پام اور سنگتروں کے درمیان گھری ہوئی تھی، موسم خوشگوار تھا۔ اکثر دن میں بارش ہوتی تھی۔ فضا تھوڑی خنک ہوجاتی تھی۔ لندن ویسے بھی بارشوں اور بادلوں کا شہر کہلاتا ہے۔ فضا دھلی دھلی سی تھی، البتہ آج ٹھنڈک میں کاٹ کے بجائے ایک خوشگوار پن محسوس ہوتا تھا۔ موسم سرد اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سرِشام ہی اندھیروں کا گمان ہوتا تھا..... اس لیے ریسرچ کلب کے اطراف اور اندر کہیں کہیں لائٹس آن ہونے لگی تھیں۔ ایک خوب صورت ماربل چپس کی روش پہ چلتا ہوا جب وہ داخلی گیٹ کے قریب پہنچا تو ایک خاتون کو اندر سے نکلتا دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی کیونکہ وہ خاتون سرتاپا سیاہ برقع اور حجاب والے نقاب میں تھی، برقع کا اسٹائل خالص مشرقی تھا۔ پاکستانی اسٹائل کی اس برقع پوش خاتون کو جس کی صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، اگرچہ اس پر بھی سفید شفاف عدسوں اور نفیس فریم والی عینک لگی ہوئی تھی، گلاسز یقیناً فوٹو سنز تھے، جو دن کی روشنی میں سیاہ پڑ جاتے تھے۔ آنکھیں اس کی خوب صورت اور روشن تھیں۔ اس کی چال ڈھال میں ایک وقار تھا۔ اس نے کوئی بڑا ہینڈ بیگ اٹھا رکھا تھا جس کا بیلٹ شاید ٹوٹ چکا تھا اس لیے اس نے اسے تھوڑا فولڈ کر کے خاصا اوپر اٹھا رکھا تھا۔

عورتوں کو گھورنا، یہ ڈاکٹر کمال احمد کی فطرت ہی نہیں تھی لیکن اس خاتون میں ڈاکٹر کمال کی غیر ارادی دلچسپی کی وجہ یہی تھی کہ..... خاتون مذکور مشرقی روایات ہی کا نہیں بلکہ اسم بامسمیٰ کا بھی مکمل نمونہ نظر آتی تھی۔ ورنہ تو وہ سرتاپا ستر پوش تھی۔ اس کے نازک اندام وجود کا کوئی حصہ نظر انداز نہیں ہوتا تھا، حتیٰ کے ہاتھوں تک میں سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے..... کچھ اسلامی روایات کا مرقع اور مشرقی اقدار کا منبع اس کی شخصیت کو چار چاند لگائے ہوئے تھا، اس سبب ڈاکٹر کمال اسے احترام کی نگاہ سے چند ثانیے دیکھتا رہا اور فوراً نظر جھکا کر آگے بڑھا، وہ قریب آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال کے کچھ عجیب سے محسوسات ہونے لگے۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو معاً ایک ہلکی سی آواز کمال کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز ایک روتی ہوئی سسکاری سے ہی مشابہ تھی۔

ڈاکٹر کمال کے دل کو گھونسا سا لگا۔ اسے "اپنے پن" میں ایک دکھ کا احساس ہوا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدم یکلخت رک گئے۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ اس میں احساسِ ہمدردی کے سوا کوئی عامیانہ جذبہ نہ تھا۔ اچانک اس برقع پوش خاتون کے ہاتھ سے بیگ گرا اور کھل گیا۔ پختہ روش پر بیگ گرتے ہی اس کے اندر سے کچھ کتابیں اور دیگر عام سی اشیا نکل کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ کمال کے پیروں کو جیسے بریک لگ گئے۔ ازراہِ ہمدردی وہ پلٹا..... خاتون کے لیے برقع میں اکڑوں بیٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنا مشکل ہو رہا تھا، تاہم کمال نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی اور ساتھ ہی شستہ لہجے میں بولا۔

"میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔ پلیز....."

اس دوران دونوں کے چہرے اور نگاہیں بہت قریب قریب ہوگئیں، تو کمال کو ایک اور جھٹکا لگا۔ بے داغ اور شفاف عدسوں والی عینک کے پیچھے خاتون کی دلکش اور کشادہ آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی اور جانے کب سے اتری ہوئی تھی کہ اب آنسو بن کر بہنے لگی تھی۔ اس نے ایسی ہی ایک نم ناک سی نگاہوں سے کمال کے چہرے کو دیکھا..... حیا کی سرخی ابھری اور نقاب کے پیچھے سے لب کی موہوم سی حرکت ڈاکٹر کمال نے محسوس کی۔

"تھینکس۔"

اس گفتگو کی دونوں طرف سے ابتدا شستہ انگریزی میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو یہ خاتون کچھ پریشان اور دکھی بھی لگی۔ وہ جلدی جلدی اس کی چیزیں سمیٹنے لگا اور چند سیکنڈوں میں کتابیں سمیٹ کر اس کے بیگ میں ٹھونس دیں۔ اس قلیل وقت میں اس نے دو ایک بار اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش بھی کی تھی کہ شاید اس نے ان دو برسوں میں ریسرچ کلب آتے ہوئے اسے دیکھا ہو، مگر عبث! اسے یاد نہ آیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی، آج پہلی بار مشرقیت کی مائل ایک برقع پوش خاتون کو دیکھا تھا۔ آخر یہ کون تھی؟ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، خاتون نے ایک بار پھر تہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا لہجہ اب بھی سسکا سسکا اور دکھی محسوس ہوا تو کمال سے نہ رہا گیا، بولا۔

"میرا نام ڈاکٹر کمال احمد ہے۔ میں یہاں ایک پاکستانی ریسرچ اسکالر ہوں..... برا مت مانیے گا پلیز.....! آپ کو بھرپور اسلامی اقدار اور مشرقی روایت میں دیکھ کر مجھے ایک سچی اور جذباتی سی خوشی ہوئی ہے، مگر اس خوشی میں کوئی جمالیاتی ہوس کے بجائے ایک احساسِ تماخر..... فرنگیوں کے دیس میں ایسی روایات پر اٹل رہنا..... آپ کے بلند کردار کی غمازی کرتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان ہونے کے ناتے میرا اتنا فرض تو ضرور

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

قدرت کا انمول تحفہ
ہاشمی شہد
قدرتی اور خالص
سردی آتے ہی شروع ہو جاتے ہیں مدتے موسم کے اثرات۔
جوڑوں کا درد، سوجن، نقاہت، توانائی میں کمی، بلغم، کھانسی۔
شہد کی اعلیٰ نسل مکھیوں کے چھتے سے شیدا کردہ ہاشمی شہد جس کی
ہر خوراک ہے موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کی قدرتی مدد۔

صحت بھی ... شفاء بھی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بنتا ہے کہ دیارِ غیر میں آپ کی پریشانی کی وجہ تو پوچھ سکوں۔''

اس کی بات سن کر برقع پوش خاتون نے اپنی نم ناک آنکھوں سے بہ غور اس کی طرف دیکھا۔ کمال کو اس کی کشادہ آنکھوں میں نمی کی صورت تیرتی ایک دکھ آمیز اداسی محسوس ہوئی، پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''بہت خوشی ہوئی مجھے بھی..... کہ اجنبی ہونے کے باوجود..... ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا رشتہ دیارِ غیر میں بھی کس قدر مضبوط ہے اور بلاشبہ میرا دکھ ایک ایسا ہی کوئی اپنا ہی سمجھ سکتا ہے لیکن مجھے اپنے اس دکھ پر فخر بھی ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق خدانخواستہ میرے کسی برے کریکٹر کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی اسلامی روایات اور احکامات کی پابندی کے باعث ہے۔ یہاں دیگر ایسی خواتین کی طرح مجھے بھی کچھ ناروا اور جانبدارانہ اور تضحیک آمیز صورتِ حال سے گزرنا پڑتا ہے۔''

ڈاکٹر کمال اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ تاہم وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ لمحہ بھر کے لیے رکی تو کمال مستفسر ہوا۔

''آپ کو کبھی یہاں دیکھا نہیں، کیا آپ یہاں کام کرتی ہیں؟ آئی مین..... کوئی جاب یا اسٹڈی وغیرہ؟''

''کرتی تھی، کام اور اسٹڈی..... دونوں.....'' وہ قدرے سسک کر بولی۔ ''تھوڑے عرصے پہلے ہی مجھے یہاں لیب اسسٹنٹ کی جاب ملی تھی مگر تھوڑے دنوں بعد ہی مجھ پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ میں برقع میں نہ آؤں۔ چند دن یہ بحث چلتی رہی، میں ایک مذہبی اور قدامت پرست مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ بالآخر آج مجھے جاب سے فارغ کر دیا گیا۔ بہت مشکلوں سے مجھے یہ جاب ملی تھی..... لیکن.....'' وہ پھر سسک پڑی۔

اس کی مختصر آپ بیتی نے ڈاکٹر کمال احمد جیسے حساس انسان کو بھی دکھی کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے جوش سے بولا۔ ''آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ایک بہادر اور عظیم خاتون ہیں۔ میں آپ کا احتجاج میڈیا پر لے کر جاؤں گا۔ لیڈز جیسے ایک بڑے بین الاقوامی تعلیمی ادارے میں اس طرح کی تعصبانہ سرگرمی خود ان کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔''

''نہیں..... نہیں..... میں خود کو تماشا نہیں بنانا چاہتی..... یہاں لندن میں میرے عزیز رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کریں گے، بہرحال آپ کا شکریہ..... میں پہلے بھی زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہن کا پیٹ پالنے کے لیے چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتی تھی..... اب وہی کر لوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھر سسک پڑی تھی۔

کمال جیسے بااصول اور آدرش پرست انسان کے لیے یہ باتیں اسے بے چین کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ بولا۔ ''آپ..... کب سے یہاں مقیم ہیں؟ اور کس ملک سے belong کرتی ہیں؟''

''میں انڈین نژاد ایک مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں تاہم میری پیدائش ادھر ہی کی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ..... واقعی..... پھر تو آپ یہاں کی سٹیزن ہوئی نا؟''

''ہاں..... لیکن باوجود اس کے ہم جیسے لوگوں کو..... یہاں دوسرے اور تیسرے درجے کے شہری ہی کی حیثیت حاصل رہتی ہے۔''

''یقیناً یہ تو آپ نے بالکل درست کہا۔'' کمال بولا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔

''کچھ اچھا تو نہیں لگتا..... لیکن خدا کے لیے آپ میری نیت پر شبہ مت کیجیے گا۔ اب میں اپنی شرافت کے گن تو نہیں گاتا، مگر بہرحال اس پورے ادارے میں ڈاکٹر کمال احمد فرام پاکستان اپنی رواداری، اصول پسندی اور ایک ہونہار اسکالر کی حیثیت سے مشہور ضرور ہے..... میرا کارڈ رکھ لیجیے، میں شاید آپ کے کسی کام آنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔'' خاتون نے قدرے جھجک کر کارڈ کمال کے ہاتھ سے لے لیا پھر بولی۔

''میرے پاس تو ایسا کوئی کارڈ نہیں۔ ویسے میرا نام مرینہ ہے..... میں ویسٹ یارک شائر کے ایک چھوٹے سے علاقے ''ویسٹ کورڈ'' میں رہتی ہوں۔''

''اوہ.....'' ویسٹ کورڈ کے نام سے کمال چونکا تھا۔ اسے معلوم تھا اس علاقے میں زیادہ تر انڈین مسلم کمیونٹی کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں ان کی رہائش بڑی قابلِ رحم تھی۔ عام سا علاقہ تھا اور ڈربا نما لکڑی کے تنگ و تاریک گھروں میں یہ لوگ رہتے تھے۔

''آپ کی کوالی فکیشن کیا ہے؟'' کچھ سوچتے ہوئے کمال نے آخری سوال کیا۔

''میں نے میڈیکل کیمپوزیشن سائنس اینڈ ٹیکنیشن میں ڈپلوما کیا ہے۔ یہاں میں لیب ٹیکنیشن کے شعبے میں تھی۔'' مرینہ نے بتایا اور ڈاکٹر کمال متاثر ہوا۔

بولا۔ ''اوکے! آپ فکر نہ کریں..... بہرحال مجھے افسوس ہے آپ کے ساتھ یہاں ناروا سلوک روا رکھا گیا جس کی پاداش میں آپ کو اتنی اچھی جاب سے ہاتھ بھی دھونا پڑے۔'' اس کے بعد کمال نے بھی اسے مختصراً اپنے بارے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں بتا دیا اور خاتون کی مدد کے لیے اس سے اجازت بھی لینا پڑی۔ جسے قدرے جھجک کے ساتھ مرینہ نے قبول بھی کر لی..... پھر وہ خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

کمال اندر لیب کلب کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ رات گیارہ بجے تک وہاں کام کرتا رہا۔ مگر اس کا دھیان اس مسلم برقع پوش خاتون کی طرف ہی لگا رہا۔ اس کے شستہ اندازِ گفتگو... اس کے رکھ رکھاؤ، خودداری اور وضع داری نے اسے از حد متاثر کیا تھا۔ پھر یہاں اس کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور پروفیشنل جیلسی جیسے حالات کے بارے میں سن کر دکھی بھی ہوا تھا۔ وہ خود ایک پڑھا لکھا اور ہائیلی ایجوکیٹڈ انسان تھا۔ پڑھے لکھے کی قدر کرتا تھا۔ مرینہ کے بارے میں یہ سن کر کہ اسے محض اپنے اٹل اصولوں کی خاطر ریسرچ کلب جیسے ادارے کی جاب چھوڑنا پڑی تھی حالانکہ اس بڑے ادارے میں جاب ملنا کسی خوش قسمتی سے کم بات نہ تھی۔ مگر آفرین ہے اس خاتون پر، اپنے اصولوں کا اس نے سودا نہیں کیا تھا۔ اس نے ادارے کی جانبدارانہ پالیسی سے اختلاف کیا تھا اور بغیر حجاب کے جاب پر آنا اسے قبول نہیں تھا مگر اس کی خاطر اس نے نوکری کو لات ماردی تھی۔ یہی سب باتیں کمال سوچتا رہا اور مرینہ کے لیے اس کے دل و دماغ میں قدر و قیمت سوا ہوتی گئی۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ وہ اس کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر کمال کے لیے مرینہ (برقع پوش مسلم خاتون) سے ملاقات اتفاقی ضرور تھی مگر..... مرینہ کے لیے نہیں..... مرینہ..... اپنا بیگ سنبھالے ڈاکٹر کمال سے رخصت ہوئی..... ذرا آگے جا کر اس نے مڑ کے دیکھا، کمال اندر جا چکا تھا۔ وہ لان میں آ گئی۔ یہاں ایک نسبتاً ویران گوشے میں کھڑے ہو کے اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا حجاب اتار دیا۔ آنکھوں سے چشمہ بھی۔ برقع کے پیچھے اس نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ٹائٹ پینٹ اور چست شرٹ۔ برقع بیگ میں ٹھونسنے کے بعد وہ باہر آ گئی۔ سڑک پر چہل پہل تھی۔ ایک طرف اس کی کار پارک تھی، وہ اس میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔ برقع کے نیچے سے جس خاتون کا چہرہ برآمد ہوا تھا، وہ کسی مرینہ کا نہیں بلکہ ''شن بیتھ'' کی زونل چیف مادام میڈوسا کا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر کمال جیسے لوگوں کو کس طرح متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ صیہونیت کی ایک چال اور فیری میسن کا بنیادی منشور تھا کہ دشمنوں کو للکارنے کے بجائے انہی کے بھیس میں ان کے درمیان گھس بیٹھو۔ انہی کا طریقہ، وتیرہ اور دستور اپنا کے ان ہی کی جڑیں کاٹ ڈالو..... اس کے لیے خواہ برقع اوڑھنا پڑے یا لمبی لمبی ڈاڑھیاں ہی کیوں نہ رکھنی پڑیں۔

مادام میڈوسا اپنے شاہانہ آفس روم میں بھاری بھرکم چیئر پر بیٹھی تھی اور اس کے حسین چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی تو کشادہ آنکھوں میں زہریلی چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں ڈاکٹر کمال کا دیا ہوا خوب صورت گولڈن کلر کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ نگاہیں اس کارڈ پر مرکوز تھیں، پھر اس کارڈ کی دھار پر وہ اپنی زبان پھیرنے لگی اور ہولے سے خود کلامی میں بڑبڑائی۔ ''ڈاکٹر کمال!..... میں اپنے وطن اسرائیل کو تمہاری صورت میں ایسا تحفہ پیش کروں گی کہ رہتی دنیا تک پوری یہودی قوم مادام میڈوسا کا احسان نہیں بھولیں گے۔''

ادھر ڈاکٹر کمال اس کریہہ انگیز حقیقت سے بے خبر..... ''مرینہ'' کی پرنم شخصیت کے حصار میں کھویا ہوا تھا۔ حتی الامکان اس نے اپنا کام نمٹایا اور ریسرچ کلب سے نکل کر کیمپس کی جانب چل پڑا۔ پام اور نارنجی پتوں والے درختوں کے درمیان گھری پختہ روش پہ چلتے ہوئے بھی وہ مرینہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا..... ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے احتیاطاً ساتھ لائی ہوئی چھتری کھول کر تان لی۔ دوسرے ہاتھ میں فائل بیگ تھام رکھا تھا۔ موسم کی مناسبت سے اس نے لمبا رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ یونیورسٹی بلاک کی دیوار کو کراس کر کے وہ ایک وسیع پارک کے درمیان سے گزرتا ہوا چکنے فرش والے احاطے میں آ گیا جو بارش کے پانی سے چمک رہا تھا۔ یونیورسٹی بلاک کی طرف کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی، کچھ لوگ بھی چھتر پہنے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیے، پارک کے الگ تھلگ کنج میں چار پانچ گورے گوریاں گروپ بنائے گیلی گھاس پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہاں جو بھی لوگ نظر آ رہے تھے، ان کا تعلق ادارے کے کسی نہ کسی شعبے سے تھا۔ ڈاکٹر کمال خاموشی سے چلتا ہوا اپنے روم میں آ گیا۔ کچن میں اپنے لیے ہلکا پھلکا برگر بنا کر کھایا اور ذرا دیر بعد کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے وقت بھی اس کے چشمِ تصور میں اس برقع پوش مسلم خاتون مرینہ کا حجاب پوش چہرہ..... شفاف عدسوں کے پیچھے جھانکتی کشادہ آنکھیں اور ان میں تیرتی نمی..... سسکتا لہجہ، وہ سب یاد آنے لگا۔ اسے واقعی مرینہ سے ہمدردی ہونے لگی تھی، مگر وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ محض جذبۂ ہمدردی تھا یا اس میں کسی اور جذبے کا بھی دخل تھا.....؟ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی اب تک کی زندگی میں کبھی محبت

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.Booksure.net
http://www.urdutube.net

نام کے جذبات نے بھی شب خون مارا تھا یا وہ اب تک ایک خشک زندگی ہی بسر کرتا چلا آیا تھا اور اس کی خوش جمالی کہیں دب چکی تھی؟ بڑے بھائی ظہیر احمد کا خون سفید پڑتے ہی ساری ذمے داری..... کمال ہی کے کاندھوں پر آن پڑی تھی اگرچہ اس وقت اس کے ماں باپ بھی زندہ تھے مگر انتھک محنت اور عسرت و تنگدستی کی زندگی نے انہیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور ناتواں کر ڈالا تھا۔ یہ کمال ہی جانتا تھا کہ کس طرح اس نے خود کو، بوڑھے ماں باپ کے علاوہ اپنی دونوں جوان بہنوں ثمینہ اور راشدہ کو بھی سنبھالا۔ ان کی شادیاں کیں۔ اس دوران کمال اپنی میڈیکل کی خشک اور مشکل تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ پارٹ ٹائم جاب بھی اسے کرنا پڑی تھی۔ پھر وقت گزرا اور..... ماں باپ فوت ہوگئے۔ کمال پانچ سال کے لیے حصولِ علم کی خاطر پاکستان بہاولپور سے یہاں اس شہر خراب لندن آ گیا تو..... یہاں بھی اس کا یہی وتیرہ رہا یعنی پڑھائی۔ یہاں گوری فرنگی جینی سے اس کی کسی حد تک بات چیت اور کلوز فرینڈ شپ ہوئی مگر وہ بھی زیادہ تر اکیڈمک لیول تک..... اگرچہ بعض مواقع پر جینی نے کمال کی دبی ہوئی جمالیاتی حس کو بھی بیدار کرنے کی کوشش چاہی تھی لیکن اسے یہ سب ''ہنوز دلی دوراست'' والا معاملہ ہی لگا تھا۔ مگر وہ ناامید نہ تھی، پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھے ہوئے تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کمال سے دوستی کو جینی نے اس سے آگے کے معنی دے رکھے تھے، جو ابھی اس کے دل کے گوشِ نہاں تھے۔

آج کمال نے سرسری انداز میں بستر پر لیٹے لیٹے ابتدا سے ان سب باتوں پر غور کیا تو اسے لگا انسیت اور پسندیدگی بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ وہ مرینہ کے بارے میں سوچتے سوچتے جانے کب نیند کی مہربان دیوی کی آغوش میں جا سویا۔

اگلے روز چھٹی تھی، وہ صبح دس بجے اٹھا۔ عام دنوں میں وہ سات بجے اٹھ جاتا تھا۔ ایک گھنٹے میں تیار ہو کے یونیورسٹی کا رخ کرتا۔ چھٹی والے دن صرف دو گھنٹے لیٹ اٹھا کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ دن چڑھے سوتا رہے۔ گیارہ بجے تک وہ غسل وغیرہ اور ناشتے سے فارغ ہو کے لائبریری کا رخ کرتا۔ مگر آج اس کا جانے کیوں لائبریری جانے کا بھی جی نہیں چاہا۔ بستر سے اٹھ کر بھی اس پر کسلمندی سی طاری تھی۔

جینی چونکہ آج کل والدین سے ناراضگی کے باعث مستقل طور پر یونیورسٹی کیمپس میں ہی فروکش تھی، اس لیے وہ آن دھمکی اور دستک دے ڈالی۔ کمال سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ سردی کے باعث کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں، تاہم باہر موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی، رخنوں سے کرنیں اندر پڑ رہی تھیں۔ اس نے پیروں میں سوفٹی پہنی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولتے ہی جینی حسب عادت دندناتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ سب سے پہلے اس نے لائٹ آن کی تھی۔ کمال نے السائی ہوئی نظروں سے اس کا استقبال کیا تھا اور مختصر آہائے ہیلو اینڈ گڈ مارننگ کے بعد پلٹ پڑا۔

جینی نے ہلکے بلیو کلر کا گھٹنوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اوپر اسی رنگ کی شرٹ تھی جس کا گریبان کمال کے لیے غیر معمولی اور جینی کے لیے معمولی کشادہ تھا۔ اس نے اپنے سنہری بال سلیقے سے پن کر کے باندھے ہوئے تھے نیلی آنکھوں میں اشتیاق ہلکورے لے رہا تھا اور بھرے بھرے گلابی ہونٹوں پہ رمز یہ سا ارتعاش نظر آتا تھا۔ وہ خاصی حسین نظر آ رہی تھی اور پرکشش بھی۔

''مائی گاڈ!..... یہ تم نے کمرے کو جیل روم کیوں بنا رکھا ہے۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ کر کمرے کی دو عدد کھڑکیاں کھول کر پردے ہٹا دیے۔ ''دیکھو..... باہر کتنا خوشگوار موسم ہو رہا ہے۔ لندن والوں کی تو لگتا ہے آج قسمت جاگ پڑی ہے..... اس چمکتی دمکتی دھوپ میں۔ آج سب کے گھروں پہ تالے ہی پڑے ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمال کی طرف پلٹی۔ وہ بیڈ پر جا بیٹھا تھا۔ جینی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گھٹنوں تک اس کے اسکرٹ سے نیچے برہنہ سڈول ٹانگیں ہولے ہولے تھرکنے لگیں۔

''کیسی ہو؟'' کمال نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں ٹھیک ہوں..... مگر جاؤ پہلے تم واش روم سے فارغ ہو جاؤ۔ میں کچن میں کچھ کھانے کے لیے بناتی ہوں..... میں نے صرف چائے پی ہے، ناشتا اکٹھے کرتے ہیں۔ ہے کچھ کچن میں..... یا بھائیں بھائیں کر رہا ہے؟''

کمال ہنس دیا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''سب کچھ موجود ہے میرے لیے ہاف فرائی بنا لینا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے باتھ ٹاول سنبھالا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

گھنٹے بھر بعد دونوں ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔ جینی کا ارادہ ناشتے کے بعد کہیں باہر نکلنے کا تھا جبکہ کمال کا لائبریری جانے کا ارادہ تھا۔ ناشتے کے دوران ہی حماد بھی آ گیا..... اس نے صرف چائے لی اور کپ تھامے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کمال نے اس کے چہرے پہ کچھ مسرت بھرے تاثرات محسوس کیے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے ساتھ اپنی کوئی خوشی شیئر کرنا چاہ رہا ہو۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

''کیا بات ہے دوست! آج خوش نظر آرہے ہو؟ کیا تم پر بھی جینی کی طرح خوشگوار موسم کا اثر تو نہیں ہو گیا؟''

کمال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ناشتا ختم کر چکا تھا۔ جینی ابلے ہوئے انڈے اور توس پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ اس نے فلاسک سے کمال کے اشارے پر اس کے خالی کپ میں چائے انڈیل دی۔ اپنے لیے جینی نے کافی بنائی تھی۔

کپ تھامے کمال ناشتے کی میز سے اٹھ کر کرسی پر آ گیا۔ یہ راکنگ چیئر تھی، جو باہر کیمپس کے لان میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب دھری تھی۔ وہاں چمکیلی دھوپ اتری ہوئی تھی اور فضا دھلی نکھری نظر آتی تھی۔

''ہاں دوست! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں آج تم دونوں سے اپنی ایک خوشی شیئر کرنا چاہتا ہوں۔'' حماد نے چائے کا گھونٹ بھر کے..... دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''ضرور..... ہمیں بھی خوشی ہوگی، کیا خبر ہے؟'' کمال نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''میری بہن حبیبہ کی شادی ہے۔ نکاح سیرمنی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ میری خواہش ہے اگر تم دونوں بھی اس میں میرے ساتھ شامل ہوتے۔''

حماد نے بتایا تو کمال سے پہلے جینی یکدم اپنا کافی کا مگ سنبھالے میز سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دل آویز مسکراہٹ سے بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ ''ہاؤ امیزنگ..... کونگ ریچ یو..... میری بڑی خواہش ہے کہ کسی مسلم میریج سیرمنی کو اٹینڈ کروں..... مگر.....''

''مگر کیا.....؟'' حماد نے اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی تھی، جسے ڈاکٹر کمال نے اس وقت پہلی بار خصوصی طور پر نوٹ کیا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تھا اور جینی کو وہاں پا کر اس کی آنکھوں میں دلچسپی کو مچلتے دیکھا تھا۔

''نہیں..... کچھ نہیں..... اٹس اوکے..... یونہی، بٹ کہنا میرا تکیہ کلام بن چکا ہے۔ ایسے ہی کہہ دیا۔''

''بٹ تمہیں بہن کی شادی پر میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔'' ڈاکٹر کمال نے حماد سے کہا۔ ''تو پھر اس کا مطلب ہے تم..... اپنے وطن پلٹنے والے ہو۔''

''یقیناً.....'' وہ بولا ''لیکن اکیلے نہیں..... تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو گے، پلیز..... تم دونوں میں سے کوئی انکار نہیں کرے گا..... اٹس مائی وش.....''

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

http://www.booksfree.net

http://www.urdutube.net

حماد اندال کی بات پر کمال تو الجھ سا گیا مگر جینی کھل اٹھی اور اسی لہجے میں حماد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''رئیلی؟ مسٹر حماد!..... کیا تم واقعی ہمیں اپنے ساتھ عراق لے جانا چاہتے ہو؟..... اٹ ول بی سو گریٹ۔ مجھے مسلم روایات دیکھنے کا بہت قریب سے موقع ملے گا۔ یہ میرے لیے ساری زندگی ایک گڈ میموریز ہوں گی، تم کیا کہتے ہو..... کمال.....؟'' اس نے آخر میں کمال کو ٹہوکا دیا۔ وہ ایک کرسی اس کے قریب کھینچ کر براجمان ہو چکی تھی۔ حماد کو جینی کا بچوں کی طرح ہنستا مسکراتا چہرہ بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ مسکراتے وقت جینی کے سرخ و سپید رخسار دمکنے لگتے تھے، ایک ڈمپل سا اس کے دائیں گال پر پڑتا تو حماد کی شوقیہ دید فزوں ہونے لگتی تھی، ایسا ہی ایک معمولی سا گڑھا..... جینی کی ٹھوڑی پر بھی بنتا تھا۔ بلاشبہ چوبیس، پچیس سالہ سرو قد جینی..... بیک وقت حسن و لطافت کے علاوہ معصومیت کا مرقع بھی تھی۔ اس کے حسن و شباب میں ایک جاذبیت تھی..... وہ بیک وقت طرح دار بھی نظر آتی تو بچوں جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جانے والی بھی۔ اس کے چہرے کی دلفریبی میں عجیب سا کھویا کھویا پن بھی حماد کو محسوس ہوتا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں مگر اس کے گوشے قدرتی کاجل لیے ہوئے تھے..... دورانِ گفتگو تو کمال نے حماد کو جینی کی کھلکھلاہٹ میں گم بھی ہوتے دیکھا۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تو کمال نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے شرارتی لہجے میں جینی سے کہا۔ ''تو پھر دیر کس بات کی ہے..... تیاری پکڑو عراق جانے کی..... بس ایک کام تمہیں کرنا پڑے گا، کسی مسلم اسٹور سے تمہیں ایک عدد حجاب خریدنا پڑے گا۔''

''یقیناً..... میں پہنوں گی حجاب.....'' وہ بڑے شوق سے بولی۔ ''میں نے یہاں بہت سی مسلم خواتین کو حجاب میں دیکھا ہے اور سچ پوچھو..... مجھے ان خواتین میں ایک وقار سا محسوس ہوتا ہے..... ایک دبدبہ سا ان کی شخصیت کے... ہم رکاب ہوتا ہے۔''

''لیکن جینی! مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ..... یہاں ایسی حجاب پوش مسلم خواتین کے ساتھ بسا اوقات ناروا سلوک بھی کیا جاتا ہے۔ انہیں تضحیک اور مذاق کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ شرط رکھی جاتی ہے کہ حجاب پر انہیں بغیر حجاب کے آنا ہوگا۔''

کمال نے تلخی سے کہا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے گزشتہ ریسرچ کلب میں ملنے والی مسلم برقع پوش خاتون مرینہ سے ملاقات یاد آ گئی۔ اس نے پتا نہیں کیوں مرینہ کے بارے میں حماد اور جینی سے برسبیل تذکرہ بھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

(بے شک کمال نے جس خاتون مرینہ کے بارے میں کہا تھا وہ..... ایک بہروپیا، دام میڈ و ساتھی، مگر حقیقت پھر بھی وہی ہے جو متذکرہ بالا حجاب پوش مسلم خواتین کے بارے میں بتائی گئی ہے۔ جو بہرحال ڈھکی چھپی بات نہیں ہے)

ممکن تھا کمال کے اس تلخ اظہار کے بعد یہ موضوع آگے بڑھتا لیکن حماد نے فوراً کہا۔

''اب ایسی بات بھی نہیں کہ جینی پر عراق جانے کے لیے حجاب کی شرط لگائی جائے..... تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کمال!..... تم تو خود کہتے تھے کہ تمہیں عراق اور بالخصوص بغداد دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

''ہاں دوست!..... یہ شوق تو میرا اب بھی قائم ہے۔'' کمال نے فوراً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''لیکن..... پڑھائی آڑے آتی ہے۔ ریسرچ کا کام بھی کافی پڑا ہے۔''

''ارے بھئی! پڑھائی ہوتی رہے گی، محض دو چار روز کی بات ہے۔ تم دونوں کی بھی ایک آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' حماد نے پورے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ پھر جینی سے مخاطب ہوا۔ ''تم اگر واقعی عراق جانے میں سیریس ہو تو..... پلیز.....! ذرا کمال کو بھی راضی کر لو..... میں یقین سے کہتا ہوں، بہت انوکھا ایڈونچر محسوس کرو گے، خوب انجوائے کرو گے..... میں تمہیں وہاں تاریخی مقامات کی بھی سیر کرواؤں گا۔ میرے والدین بھی تم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوں گے بلکہ مس جینی! میری بہن حبیبہ تو تمہیں دیکھ کر زیادہ ہی خوش ہوگی، وہ بہت محبت کرنے والی بہن ہے میری.....''

جینی کا اشتیاق تو واقعی دو چند ہونے لگا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ابتدا میں کمال ہی نہیں بلکہ حماد بھی جینی کی اس... دلچسپی کو مذاق ہی سمجھے ہوئے تھے مگر اب..... اس کا بڑھتا ہوا اشتیاق ہی نہیں بلکہ پوری رضامندی پا کر حیرت محسوس کرنے لگے تھے، حماد کو زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

بہرطور..... حماد کے کہنے کی دیر تھی کہ جینی نے کمال کی منتیں کرنا شروع کر دیں۔ بالآخر تھوڑی دیر بعد جب حماد نے یہ دیکھا کہ جینی اور ڈاکٹر کمال نے اس کے ساتھ عراق جانے اور اس کی بہن حبیبہ کی شادی میں شرکت کرنے کی ہامی بھر لی ہے تو اس کی خوشی دیدنی حد تک اس کے مسرت آمیز اور حیرت زدہ چہرے سے کافی دیر تک مترشح ہوتی رہی۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

آبدوز کے ''سی کاک'' کھول دیے گئے تھے۔ آبدوز اب دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوبنا شروع ہوگئی۔

عابد شیکھری اور نائمہ اندر داخل ہو چکے تھے اور عابد نے اب مزید احتیاط کے پیشِ نظر نائمہ کو یہ حقیقت بالآخر گوش گزار کردی کہ انہوں نے حادثاتی طور پر جس آبدوز کے اندر پناہ لی تھی، وہ درحقیقت ایک اسرائیلی آبدوز تھی۔ نائمہ نے جب یہ سنا تو اس کا چہرہ یکدم فق ہوگیا۔ تاہم عابد نے اسے تسلی دینی چاہی تھی کہ وہ اللہ پر بھروسا رکھے، جو اب تک انہیں جان لیوا خطرات سے بچاتا آیا ہے وہی ان کی آگے بھی دست گیری فرمائے گا۔ نائمہ کو کچھ حوصلہ ہوا..... اور اس نے عابد کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

آبدوز کا اندرونی ماحول باہر کی بہ نسبت اتنا پرشور نہ تھا۔ البتہ اس کی گھوں گھوں اور شوں شوں سماعتوں کو مجروح کرتی محسوس ہوتی تھی، مگر یہ آوازیں بھی کسی کسی مخصوص گوشے سے ابھرتی محسوس ہوتی تھیں۔

بہرطور..... آبدوز کے اندر دونوں محتاط روی سے سرکتے ہوئے کسی تنگ سے گوشے میں چھپے بیٹھے..... تھوڑی دیر تک اپنے گردوپیش کی سن گن لیتے رہے۔ عابد شیکھری کے چہرے پر گہری تفکر آمیز سوچ کے تاثرات ضرور ہویدا ہو رہے تھے، نامعلوم کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں عنقریب کسی بڑے اور زبردست معرکے سے واسطہ پڑسکتا ہے۔ وہ دونوں اس وقت کسی بڑے خطرے کی گود میں آن گرے تھے تاہم یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ..... اب تک وہ دشمن کی نظروں میں نہیں آئے تھے۔ اگر آبدوز میں موجود اسرائیلیوں کو ان کی ذرا بھی بھنک پڑجاتی تو یقیناً آبدوز کے کونے کونے میں ان کی زبردست ڈھنڈیا پڑجاتی۔

یہ دونوں آبدوز کے شائیں شائیں کرتے ماحول میں نہایت محتاط روی کے ساتھ سرکتے ہوئے اس طرف نکل آئے جدھر آگوسٹا پر صوت گیر مشین کنٹرول کرنے والے عملے کے لوگ موجود تھے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ عابد نے ایک گول شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانکا..... وہاں سیکشن انچارج سارہ موجود تھی اور دو مرد بھی تھے۔ عابد نے نائمہ کو گردوپیش پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی تھی اور خود گول شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔

کمرے کے آلات، بڑی بڑی اسکرینیں اور مخصوص قسم کے بلنک کرتے پینل بورڈز دیکھ کر اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ آبدوز کا ریڈار سیکشن تھا۔ وہ خود ایک بڑی جہازراں کمپنی (ایجر) کا مالک تھا۔ اس کی خاصی عمر سمندر گردی میں گزری تھی۔ وہ یہ سب باتیں سمجھ رہا تھا۔ جس دروازے سے وہ چپکا کھڑا تھا، وہ تھوڑا کھلا ہوا تھا اس لیے اندر موجود وہ ان کی باتیں بھی بڑی آسانی سے سن رہا تھا۔

عملے کے تینوں افراد نے ہیڈفون چڑھا رکھے تھے۔ عابد ان کی وہ باتیں بھی سن رہا تھا جو انہیں احکامات کی صورت میں مل رہے تھے، ساتھ ہی وہ گاہے بگاہے سامنے لگی اسکرین پر بھی بہ غور نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کبھی کسی اسکرین کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور کبھی سبز..... ایک اسکرین پر نظر پڑتے ہی عابد شیکھری بری طرح چونکا تھا..... اس اسکرین پر بنفشی رنگ کا شیڈ سا پڑ رہا تھا جبکہ گراؤنڈ سیاہ تھا۔ وہاں ''وارہیڈ اسٹیٹس'' کا پورا گراف نظر آرہا تھا۔ پھر ان تینوں کی گفتگو جو یہ کبھی آپس میں اور کبھی مائیک پر کپتان اور نائب کپتان سے کر رہے تھے، وہ سب سن کر عابد شیکھری کے ایک لمحے کو تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ اب جا کے اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا تھا کہ نادانستگی یا حادثاتی طور پر بلاشبہ اسرائیلی جنگی آبدوز میں تو تھے ہی..... لیکن یہ عام آبدوز نہیں بلکہ خطرناک ایٹمی آبدوز آگوسٹا تھی جو اس وقت اپنے آہنی بطن میں نہ جانے کتنے نیوکلیئر بم اور وارہیڈ لیے ہوئے تھی۔ نیز یہ آبدوز گزشتہ کئی روز سے ایک خطرناک اور تباہ کن مشن پر نکلی ہوئی تھی، جس کا مقصد کسی وقت بھی مسلم ریاست لیبیا پر اٹیک کرنا تھا جبکہ ابھی انہوں نے لیبیا کی دو بڑی بندرگاہوں طرابلس اور بن غازی کو نشانے پر لے رکھا تھا اور اوپر سے جنگی احکامات ملنے کے منتظر تھے، تاہم اس وقت ان کا اہم مشن لیبیا سے فلسطینی مجاہدوں کو جانے والے خفیہ امدادی جہازوں اور semergeships کو روکنا اور انہیں سبوتاژ کرنا تھا۔ ان کی آپس کی ہونے والی گفتگو اور وقتاً فوقتاً ملنے والے احکامات، اور جوابی پیغامات جو مختصراً رپورٹس کی صورت میں عابد شیکھری کو سننے میں آئے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں بالکل ابھی ابھی بن غازی کی بندرگاہ میں متعین یا بہ الفاظِ دیگر ''گھس بیٹھیے'' اسرائیلی جاسوس نے جو بندرگاہ میں ہاربر ماسٹر کے نائب کی حیثیت سے چھپا بیٹھا تھا بھیجی جانے والی اپنی خفیہ رپورٹ میں مطلع کیا تھا کہ عنقریب طرابلس کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز ''سیمرج شپ'' حیفہ کے لیے روانہ ہوا ہے۔ اس جہاز میں بھاری مقدار میں عسکری آلات سمیت کندھے سے فائر ہونے والے طیارہ شکن میزائل لدے ہوئے تھے، اپنے مذموم کثیر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

القاصد کے حصول کے لیے اسرائیل کی یہ ایٹمی آبدوز چوبیس گھنٹے بحیرۂ روم میں لیبیا، اردن اور شام کے ساحلی حدود کے قریب گہرے پانیوں میں گشت کرتی رہتی تھی۔ فلسطینی مجاہدین کے لیے امداد پہنچانے والے اس مذکورہ بحری جہاز کو تارپیڈو مار کے تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا جاچکا تھا اور عابد شیکھری کا چہرہ فرطِ جوش تلے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچ رہا تھا..... وہ اس لیبیا سے روانہ ہونے والے بحری جہاز کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ اگر یہ اسرائیلیوں کے ہاتھوں تباہ ہوجاتا تو فلسطینی مجاہدین ایک بڑی کمک اور امداد سے محروم ہوجاتے۔ یہ ان کا بہت بڑا نقصان ہوتا۔ عابد کے دل و دماغ میں یہ سوچ سوچ کر جوش کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ ان کا حادثاتی طور پر اسرائیلی ایٹمی آبدوز میں داخل ہونا یقیناً مشیتِ ایزدی ہی تھا کہ وہ ان کی سازش سے باخبر ہوگیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس نیک مقصد میں اللہ اس کی بھرپور مدد کرے گا۔ تاہم وہ سوچنے لگا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا تھا۔ ایک نیک مقصد کے لیے اسے اپنی جان جانے کا کوئی ڈر یا خوف نہ تھا مگر نائمہ بھی اس کے ساتھ تھی..... اس نے جب نائمہ کو یہ سب بتایا تو نائمہ کے دل و دماغ سے بھی موجودہ اعصاب شکن حالات کا سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔ وہ پرعزم لہجے میں عابد شیکھری سے بولی۔

''عابد!..... ہم جب قبرص سے روانہ ہوئے تھے تو اس پختہ عزم کے ساتھ ہم نے عہد کیا تھا کہ فلسطین کے مظلوم عوام اور اس پر کھلی جارحیت کرنے والے اسرائیل کی ہر سازش کو ناکام بنا کر رہیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ مکڑی کے جال کی طرح اسلامی ممالک تک زہر کی طرح سرایت کی ہوئی یہودیوں کی ہر سازش کا مقابلہ کر کے اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کریں گے۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہوگے، اس بھیانک انکشاف کے بعد کہ ہم حادثاتی طور پر اسرائیل کی ایک خطرناک بوٹ میں آن پھنسے ہیں اور میں اپنی جان جانے سے خوف زدہ ہو رہی ہوں گی تو یہ غلط ہے..... ہمیں ہر صورت میں اس بحری جہاز کو نہ صرف بچانا ہوگا بلکہ اس آبدوز آگوسنا کو بھی تباہ کرنا ہوگا جو اپنے اندر تباہ کن سازشوں کے بم سنبھالے ہوئے چھپی بیٹھی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، وقت کم ہے..... جو کرنا ہے جلدی کرو۔''

نائمہ کی اس گفتگو نے عابد شیکھری کو سرتاپا سرشار کردیا۔ اس نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ مسکرا کر نائمہ کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو نائمہ نے بے اختیار اپنی گردن ذرا خم کر کے دھیرے سے موڑ کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

ٹھیک اسی وقت عابد کو ریڈار روم کے ادھ کھلے دروازے کے اندر سے کچھ جوشیلی آوازیں ابھرتی سنائی دیں۔ وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوا اور نائمہ نے گردوپیش پر اپنی نگاہیں گاڑ لیں۔

عابد نے اس بار دروازے کی ادھ کھلی جھری سے اندر جھانکا۔ سارہ کسی سے مؤدبانہ جوش کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے ایک اسکرین پر تھیں۔ ''سر!..... سیمرج شپ کو ٹریس کرلیا گیا ہے مگر ابھی وہ رینج سے دور ہے..... آگے کیا حکم ہے؟''

دوسری جانب سے سارہ احکامات سنتی رہی پھر بولی۔

''اوکے سر!..... میں اسے ٹارگٹ کیے ہوئے ہوں۔ فائرنگ کنٹرول کاؤنٹ ڈاؤن کے لیے میں نے ایگزلری پاور auxiliary power کو ری اسٹورڈ کرنا شروع کردیا ہے..... دو تارپیڈو ریڈی فار شوٹنگ کردیے ہیں۔''

سارہ اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر رہی تھی اور عابد کے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کسی صورت میں اس امدادی جہاز کو ان کے ہاتھوں تباہ ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسکرین اسے بھی نظر آرہی تھی، جس پر ایک بحری جہاز کا گراف متحرک تھا اور اس پر گول ٹارگٹ بلنک کر رہا تھا، جس کی لکیروں پر رنگ ابھی گرین تھا۔ عابد جانتا تھا کہ اس کا مطلب یہی تھا جہاز ابھی ان کے تارپیڈو کی رینج سے باہر تھا۔

اس دوران عابد نے سارہ کے ایک ساتھی کو اس سے مخاطب ہوتے سنا۔

''ہمیں فائرنگ رینج کو کراس کرنے کے لیے..... اپنی آبدوز کو نزدیک لے جانا ہوگا۔ کیپٹن پریمانن کا حکم ملا ہے، وہ اس جہاز کو جلد سے جلد تباہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ کسلی کی طرف فوراً روانہ ہوا جائے۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' سارہ نے کہا۔ ''میں خود بات کرتی ہوں۔'' پھر اس نے انٹرکام پر کیپٹن پریمانن سے بات کی اور مؤدبانہ اسے صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔

''کیپٹن! ہم فائرنگ رینج حاصل کرنے کے لیے آبدوز کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ حدود سے تجاوز کرنے پر ہم لیبیا کی گشتی جنگی آبدوزوں کے نشانے پر آجائیں گے اور ان کی نظروں میں بھی..... ہمیں تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔''

دوسری طرف سے غالباً اوکے کہا گیا تھا۔ سارہ اب پینل بورڈ کے مختلف جلتے بجھتے بٹنوں میں الجھ گئی تھی۔ ٹھیک

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اسی وقت اسکرین پر بلنک کرتے ٹارگٹ کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اب ٹارگٹ کا گول گراف..... امدادی شپ سمیت ریڈ ہو کے بلنک کرنے لگا تھا۔ سارہ نے اس وقت پُرجوش آواز میں مائیک پر کیپٹن پریمانن سے بات کی۔

''کیپٹن! ٹارگٹ چیس ہوگیا..... کاؤنٹ ڈاؤن شروع کیا جائے؟''

اسے اجازت مل گئی۔ سارہ کے ہاتھ تیزی سے پینل بورڈ پر تھرکنے لگے۔ ادھر عابد شیکھری کے چہرے پہ تشویش کے آثار نمودار ہوگئے۔ وہ کسی صورت میں بھی امدادی شپ کو تباہ ہونے نہیں دینا چاہتا تھا..... ابھی کاؤنٹ ڈاؤن شروع نہیں ہوا تھا..... پروسیس اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ عابد شیکھری کی رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہونے لگی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے جارحانہ قدم اٹھانے والا تھا۔ یہ اس کا خطرناک اقدام بھی ہوسکتا تھا۔ آبدوز میں موجود اسرائیلیوں کو ان کی بھنک بھی مل جاتی تو کھیل بگڑ جاتی۔ عابد کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اسی وقت کمرے میں تیز سیٹی کی سی آواز ابھری۔ دور کمرے میں روبوٹ کی سی زنانہ آواز سنائی دی۔

"Firing control countdown to launch & auxiliary power restored"

اور اس آواز کے ساتھ ہی اس آواز نے الٹی گنتی گننا شروع کردی۔ دو عدد تارپیڈو فائر کیے جانے کے لیے ریڈی ہو چکے تھے۔ عابد کے لیے اب حرکت کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر نائمہ سے مخاطب ہو کے اسے ساری صورتِ حال بتائی پھر اسے محتاط رہنے کا کہہ کر پستول نکال لیا۔ ابھی وہ اندر داخل ہونے کے ارادے سے بڑھا ہی تھا کہ اچانک عملے کے تین افراد میں سے ایک کو اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ عابد فوراً ایک طرف ہوگیا۔ وہ آدمی باہر نکلا تو بری طرح ٹھٹکا۔ سامنے اسے نائمہ کھڑی دکھائی دی۔ جس کی موجودگی یقیناً اس آدمی کے لیے ناقابلِ یقین ہی تھی۔ اس لیے وہ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر چند ثانیوں کے لیے تو حیرت زدہ ہی رہ گیا، پھر تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ نے بیلٹ کی جانب حرکت کی۔ وہ شاید کوئی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا کہ اچانک عقب سے عابد نے اس کے سر کے پچھلے حصے میں اپنے پستول کا دستہ رسید کردیا۔ وہ ہلکی کراہ آمیز آواز کے ساتھ تیورا کر گرا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

''اسے ایک طرف گھسیٹ کر لے جاؤ۔'' کہتے ہوئے عابد پستول سنبھالے اندر داخل ہوگیا۔ دونوں مرد و عورت اسکرین پر متوجہ تھے۔ ان کے کانوں پر ہیڈ فون تھے۔ ریڈار روم میں الٹی گنتی جاری تھی، عابد نے مرد کے عقب میں جا کر اس کا بھی وہی حشر کیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دائیں جانب چیئر پر بیٹھی سارہ بری طرح چونکی تو عابد نے نفرت و غیظ سے ہونٹ بھینچ کر اس کے سر سے ہیڈ فون اتار پھینکا اور بھیڑیے جیسی خونخوار غراہٹ سے بولا۔

''خبردار!..... کوئی غلط حرکت مت کرنا..... کاؤنٹ ڈاؤن اور فائرنگ سسٹم آف کردو..... جلدی..... ورنہ گولی مار کے بھیجا اڑادوں گا تمہارا۔'' پستول کی نال اس نے سارہ کی کنپٹی سے لگادی تھی۔ اس کے چہرے پہ خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ غالباً اسے بھی ایک اجنبی حملہ آور کی ریڈار روم میں تو کیا آبدوز میں بھی گھس آنے کی توقع نہ تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ جیسے سنبھل کے اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔

''تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکتے..... بہتر یہی ہے کہ.....'' دوسرے ہی لمحے عابد شیکھری کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کے مضبوط ہاتھ کا گھونسا سارہ کے جبڑے پر پڑا تھا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ خارج ہوگئی۔ گال پھٹ گیا اور شاید ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے ابل بھل خون جاری ہوگیا تھا۔ کسی عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا، یہ عابد کا شیوہ نہ تھا لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ اس نے اسی ہاتھ کے پنجے سے سارہ کی گردن دبوچ لی جس سے پنچ مارا تھا۔ خوفناک غراہٹ سے دوبارہ بولا۔ ''یہودن کتیا! اگر اب بھی تو نے میری بات نہ مانی تو میں تجھے جہنم واصل کرنے کے بعد بھی یہ سب کرسکتا ہوں..... میں بھی اس فیلڈ سے تعلق رکھتا ہوں..... ورنہ تمہاری اس ایٹمی آبدوز میں کس طرح داخل ہوسکتا تھا۔''

عابد کے لہجے کی گھن گرج اور پرقطعیت دلیل نے سارہ کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا..... سارہ نے اس مقام تک آنے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ کتنے ہی اسرائیلی آفیسروں کی آغوش گرم کی تھی..... یہ اس کے کیریئر کی آخری مہم تھی۔ اس کے بعد اسے تل ابیب کی بحریہ میں متعین کیا جانے والا تھا اور اس نے اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ روشن مستقبل اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی کے خوش آئند خواب دیکھے تھے۔ وہ یہ سب چکنا چور نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اندازہ تو اسے ہو ہی چکا تھا کہ اس کا (عابد کا) تعلق کسی حریت پسند تنظیم سے ہی ہوسکتا تھا لہٰذا گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

''د.....د..... دیکھو..... میں مرنا نہیں چاہتی.....

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تت..... تت..... تم اگر میری جان کی ضمانت دو تو میں..... تمہاری بات مان سکتی ہوں۔''

''میری اپنی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تو تمہاری زندگی کی ضمانت کیا دوں گا۔'' عابد درشت لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر تم میری بات مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر مان لو تو..... میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔''

''وعدہ کرتے ہو؟''

''ہاں..... وعدہ کرتا ہوں..... بشرطیکہ تم نے میرے کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالی تو۔''

سارہ نے اسی وقت پینل بورڈ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ عابد کی نظریں بھی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، اس وقت ریڈار روم میں مختلف الارموں اور سیٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ عابد نے دیکھا..... اسکرین پر ریڈار اور امدادی شپ کا گراف مسلسل بلنک کر رہا تھا۔ دوسرے گراف میں اس نے سگار جیسے دو تارپیڈو کو چیمبر سے نکلتے دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ الٹی گنتی جاری تھی، وہ سوچ رہا تھا، سارہ اسے کسی قسم کا دھوکا تو نہیں دے رہی ہے کیونکہ ابھی تک یہ گنتی کا عمل رکا تھا اور نہ ہی گراف غائب ہوا تھا۔ پھر چند سیکنڈوں بعد گنتی پانچ پر آ گئی۔ اس کے بعد چار..... پھر تین..... دو..... ایک..... زیرو..... اس کے ساتھ ہی عابد کی پھٹی پھٹی نظروں نے دوسری اسکرین سے دو سگار نما تارپیڈوز کو بیک وقت حرکت کرتے دیکھا..... وہ اپنی دم سے پانی کے بلبلوں کے طوفان چھوڑتے تیزی سے امدادی شپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اسرائیلی بچ!..... تو نے مجھے دھوکا دیا۔ تارپیڈو فائر کر دیے..... اب مرنے کے لیے تیار ہو جا۔'' عابد شیخری نفرت و غصے کے مارے دانت بھینچ کر بولا اور پستول کی نال سارہ کی کنپٹی پہ لگاتے ہوئے انگلی لبلبی پر رکھ دی۔

''ٹھہرو..... ٹھہرو..... تم غلط سمجھے ہو.....'' سارہ خوف سے چلّائی۔ ''تارپیڈو فائر کرنا میری مجبوری تھا، کاؤنٹ ڈاؤن..... آخری مرحلے میں تھا۔ چیمبر میں چین ری ایکشن کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ تارپیڈو کو فائر کرنے سے نہیں روکا جا سکتا تھا، اگر ایسا کیا جاتا تو وہ چیمبر کے اندر ہی بلاسٹ ہو جاتے اور پھر یہ آبدوز بھی تباہ ہو جاتی۔''

''تو پھر تم نے یہ کیا کیا ہے؟'' عابد کی کچھ جان میں جان آئی۔

''میں نے ان کی ڈگری (نشانہ) تبدیل کر دی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اسکرین کو دیکھتے رہو، تمہیں میری سچائی کا ثبوت مل جائے گا۔''

عابد کی دم بہ خود سی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ دو تارپیڈو..... گہرے پانیوں میں اپنے پیچھے ان گنت بلبلوں کے انبار چھوڑتے امدادی شپ کی طرف بڑھ رہے تھے اور پھر چند ہی سیکنڈوں بعد عابد نے دیکھا، تارپیڈوز..... امدادی شپ تک پہنچنے سے پہلے ہی دائیں بائیں مڑ گئے۔ ان کا رخ سمندر کی گہرائی تہ کی طرف ہو گیا..... اور پھر وہ غائب ہو گئے۔ امدادی شپ..... جوں کا توں اپنے سفر کی جانب گامزن تھا۔ یہ دیکھ کر عابد نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ اچانک وہ ٹھٹکا۔ ریڈار روم سے باہر اسے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے نائمہ کی فکر لاحق ہونے لگی، ادھر..... سارہ نے عابد شیخری کو ذرا غافل پا کر اچانک اس کے پستول والے ہاتھ پر گھونسا رسید کر دیا۔ عابد اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ کمرے سے باہر دوڑ کر نائمہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن سارہ نے اچانک ''ہاتھ'' دکھا دیا تھا۔ پستول عابد کے ہاتھ سے نکلتے ہی سارہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پھرتی کے ساتھ جھک کر پستول اٹھانا چاہا تھا کہ عابد نے ہونٹ بھینچ کر اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی گردن کے پچھلے حصے پر رسید کر دیا۔ سارہ کی کرب ناک چیخ سننے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ اس نے تیزی سے حرکت کی۔ اپنا پستول تلاش کر کے اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ اسے دو اسرائیلی وردی پوش فوجی نظر آئے۔ ان کے جسموں پر اسرائیلی بحریہ کی مخصوص وردی تھی اور سینے اور شولڈز پر مخصوص نشان تھے، ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی عابد نے ان پر دو تین تلے اوپر فائر جھونک دیے۔ دونوں کو اس پر اپنی بھاری گنیں تاننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ گرے اور ٹھنڈے پڑ گئے۔ عابد ان کی لاشوں کو پھلانگتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ ایک جانب اسے فلور پر نائمہ آڑی ترچھی پڑی نظر آ گئی۔ اس کے نچلے ہونٹ سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی..... وہ نیم بے ہوش تھی اور ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اسی وقت آبدوز کے اندر بگل چیخنے لگے..... عابد نے نائمہ کو سہارا دیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا..... دفعتاً عابد کو متعدد بھاری دوڑتے قدموں کی دھمک سنائی دی۔

جاری ہے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

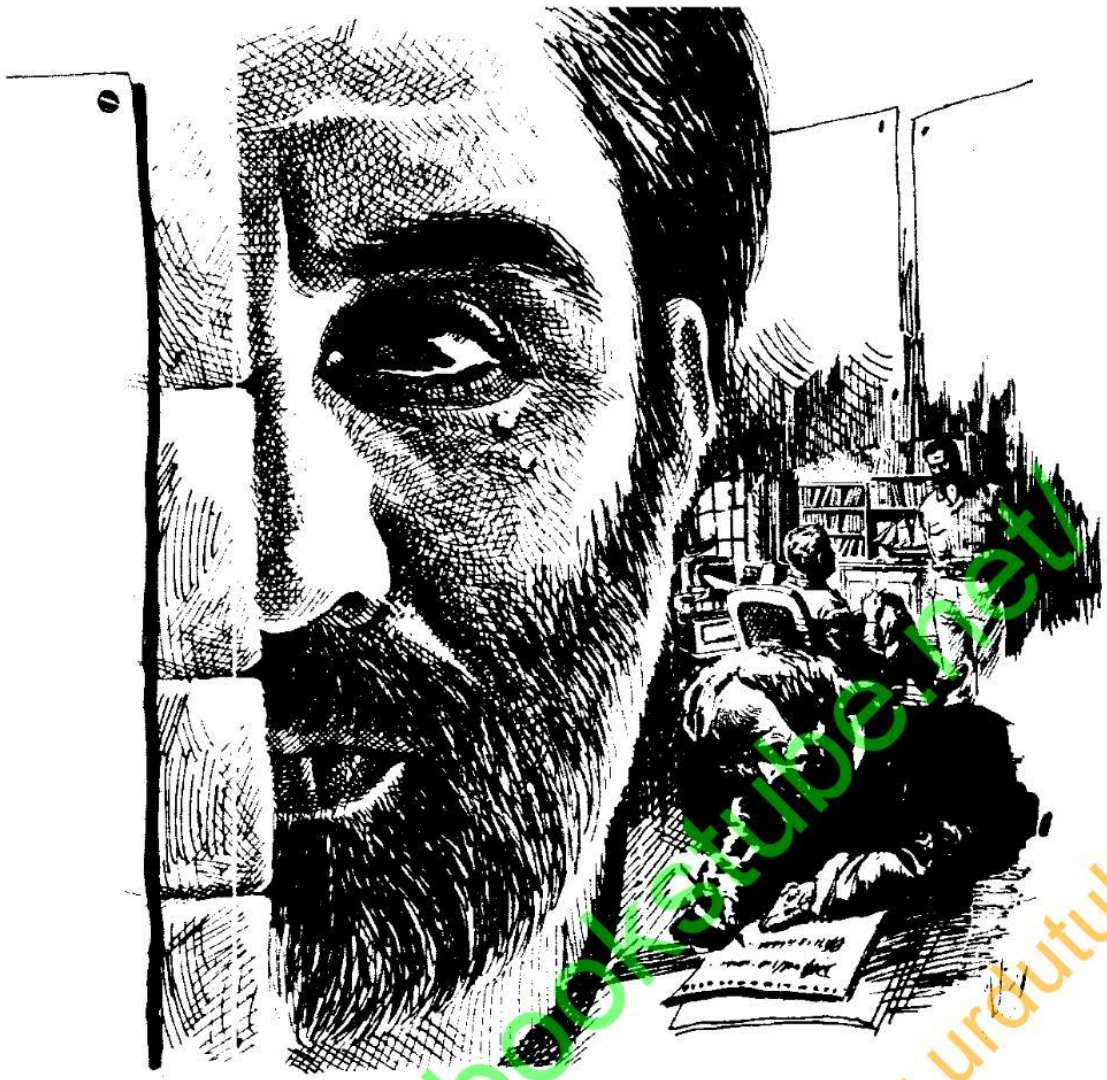

رشتہ

تنویر ریاض

مغربی معاشرے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہاں ہر ایک کو مکمل طور پر شخصی آزادی حاصل ہے اور برائی کی سب سے بڑی جڑ بھی یہی آزادی ہے جس کی کوئی حد مقرر ہے نہ ہی رشتوں کی کوئی پاسداری ہے۔ ان کے مقدر نے ان کے رشتے کو بھی ایک ایسے ہی موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں زندگی اور موت میں سے کسی ایک کا چنائو لازم تھا۔

مہذب دنیا میں خودغرض انسانوں کی بے باکیاں

مینڈولین میں لگنے والی گولی سے سوراخ ہوگیا اور ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید اس میں سے خون بہہ رہا ہے لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے اردگرد سرخ پتے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ساز میرے گھر کے قریب سے گزرنے والی کچی سڑک کے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا اور اکتوبر کی سردی شروع ہوچکی تھی۔ اس ساز پر میری توجہ اس وقت گئی جب ایک کوّا اس کے تاروں سے ٹکرایا۔ شاید کوّے نے بھی یہی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booktube.net/
http://www.urdutube.net/

سوچا ہوگا کہ اس میں سے خون نکل رہا ہے۔ جیسے ہی میں اس کے قریب گیا تو کوا خوف زدہ ہو کر اڑ گیا۔

میں تقریباً سارا دن گھر سے باہر رہا تھا اور اس سردی میں مجھے اپنے کپڑے ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔ میں بہت تھک چکا تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی تاہم اس مینڈولین کو دیکھ کر میرا تجسس بڑھ گیا تھا میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ مجھے پہلی گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور گولی میرے بائیں کان کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک قریبی درخت کے تنے میں جا گھسی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے مینڈولین اٹھایا اور اسے گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔ دوسری گولی کی آواز سن کر میں لڑکھڑایا اور گھر تک پہنچنے کے لیے محفوظ راستے کے بارے میں سوچنے لگا جو جنگل سے گزرتا تھا پھر ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ڈاکٹر ڈیولن! یہ تم ہو۔ میں نے کافی دنوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں جواب دینا چاہیے۔ کیا پتا تم مجھ پر دوبارہ گولی چلا دو۔''

''سوری، مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کے دوسری جانب براڈرڈیلمار ریس باتھ میں رائفل پکڑے کھڑا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں ملبوس تھا اور سر کو ایک ہیٹ سے ڈھانپ رکھا تھا جس کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ پچاس کا لگتا تھا۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ یہ تمہاری زمین ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نہیں تھے اور نہ ہی اس نے معذرت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

''یہ مینڈولین تمہارا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

اس کے کہنے پر میں نے پہلی بار مینڈولین کو غور سے دیکھا۔ یہ ایک قدیم طرز کا ساز تھا جسے نیشنل اسٹرنگ انسٹرومنٹ کمپنی نے غالباً 1930ء میں بنایا تھا۔ ایسی چیزیں یادگار کے طور پر رکھی جاتی ہیں۔

''ہاں۔'' میں نے اس سے جھوٹ بولا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اسے گولی کا نشانہ بنایا ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''واقعی؟'' میں نے مینڈولین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں صرف ایک سوراخ ہوا ہے۔ میں اسے نشانہ بازی نہیں کہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم شکار کے لیے نکلے ہو؟'' میں نے اس کی رائفل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''ڈاکٹر! تمہیں کبھی کبھی گرجا آجانا چاہیے تھوڑی سی عبادت تمہارے لیے، مفید رہے گی۔''

''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں پہلے اکثر اتوار کے روز گرجا آیا کرتا تھا البتہ ان دنوں مصروفیت کی وجہ سے ناغہ ہو رہا ہے۔''

''میری خواہش ہے کہ تم اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت عبادت کے لیے بھی نکال سکو۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔''

''جاؤ لیکن اس شخص کو ضرور تلاش کرنا جس کا یہ مینڈولین ہے۔ یہ ایک نادر شے ہے یقیناً کوئی نہ کوئی اسے واپس لینا چاہے گا۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے نیچے کی جانب چل دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کے تاریک حصے میں غائب ہو گیا۔ میں ایک دو منٹ وہاں کھڑا یہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کس جانب گیا ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے پسینا آنے لگا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے بلیو ماؤنٹین واپس آئے دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور میں اس گھر میں تنہا رہ رہا تھا۔ میں اب بھی یہی سوچتا ہوں کہ کیا واقعی یہ میرے والدین کا گھر ہے۔ سچ پوچھیں تو صحیح معنوں میں یہ کبھی گھر تھا ہی نہیں، یہ محض ایک مکان کہا جا سکتا تھا۔ جب چھوٹا تھا تب بھی میرے والدین اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے اور میں کم و بیش تنہا ہی پروان چڑھتا رہا۔ یہ عمارت قصبے سے لگ تھلگ پہاڑی کے دامن میں واقع تھی۔

جب میں دس سال کا تھا اس وقت اس قصبے میں ایک بارونق ٹاؤن اسکوائر ہوا کرتا تھا۔ مجھے مس مارتھا کا ہوٹل بھی یاد ہے جہاں بہترین کھانے ملا کرتے تھے۔ میرے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

والدین ایک سفری کارنیوال میں ملازمت کرتے تھے جو دی ٹین شوز کے نام سے مشہور تھا۔ میرے والد جادوئی کرتب دکھایا کرتے تھے۔ وہ بہت بڑے فن کار تھے اور ان کے کمالات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ والدہ ان کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت تھیں۔ انہوں نے محبت کی شادی کی تھی اور ان کے عشق کے قصے پورے قصبے میں مشہور تھے۔ میں نے کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سولہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ دیا تھا۔ میں یونیورسٹی میں جس شعبے سے وابستہ تھا، وہ دس سال بعد بند ہوگیا۔ میں بڑے شہر میں رہائش اور خوراک کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا تھا، اس لیے واپس اپنے آبائی گھر چلا آیا جو میرے والدین کی وفات کے بعد خالی پڑا ہوا تھا۔ یہاں رہ کر میں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور اس سے مجھے تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی۔

گھر پہنچ کر میں نے ٹوٹے ہوئے ساز کو ایک کرسی پر رکھا۔ کوٹ اور جوتے اتارے پھر کچن میں جا کر کافی تیار کرنے لگا پھر میں نے شیرف کا نمبر ملایا اور اسے اس واقعے کی اطلاع دی، جب میں نے ڈیلمار ریس کا نام لیا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ ایک غیر معمولی بات ہے، وہ عام طور پر کبھی چرچ سے اتنی دور نہیں جاتا۔''

''میں جانتا ہوں لگتا ہے کہ اس نے مینڈولین کا نشانہ لیا تھا۔''

''کیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''ہاں، وہ پرانے زمانے کا بنا ہوا ہے اور بہت سے لوگ ایسی چیزوں کو اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں۔''

''تمہیں وہ مینڈولین کہاں سے ملا؟''

''سڑک کے کنارے، میں اسے دیکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ ڈیلمار ریس نے مجھ پر دو مرتبہ گولی چلائی۔''

''کیا وہ اسے حاصل کرنا چاہ رہا تھا؟''

''لگتا تو نہیں، جب وہ سامنے آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی بات چیت ہوئی اور اس نے مجھے گرجا آنے کی دعوت دی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' شیرف بولا۔ ''اب بتاؤ تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ برادر ریس کسی ایسے شخص کا تعاقب کررہا تھا جس کے پاس یہ مینڈولین تھا۔ اس نے اس شخص پر گولی چلائی جو مینڈولین پر لگی اور وہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ شخص جنگل میں غائب ہوگیا۔ عین اسی وقت میں وہاں پہنچ گیا اور جیسے ہی میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ریس نے یہ سمجھ کر گولی چلا دی کہ میں وہی شخص ہوں جس کا وہ پیچھا کررہا تھا۔''

''یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کون شخص تھا۔'' شیرف نے کہا۔ ''تمہارے لہجے سے اندازہ ہورہا ہے کہ تم اس شخص کے بارے میں جانتے ہو؟''

''رے گراہم۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''وہی مینڈولین بجایا کرتا تھا۔''

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر شیرف نے کہا۔ ''وہ تین سال پہلے مر چکا ہے۔''

''لیکن تم نے کبھی اس کی موت کی تصدیق نہیں کی۔''

''ہاں۔'' شیرف نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اس کا اکثر دشمنوں کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ آخری مقابلے میں اسے شکست ہوئی اور ایک گولی اس کے چہرے پر لگی پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ مینڈولین گراہم کا ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرو۔''

میں لونگ روم میں آیا اور مینڈولین کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی پشت پر چاقو سے رے گراہم کے نام کا مخفف آرجی کندہ تھا۔ میں نے یہ بات شیرف کو بتائی اور کہا۔ ''اس کے علاوہ تم اس علاقے میں کسی اور شخص کو جانتے ہو جو مینڈولین بجاتا ہے؟''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' شیرف بولا۔ ''لیکن اس علاقے کا شیرف اور تمہارا پرانا دوست ہونے کی وجہ سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں دوبارہ یاد دلا دوں۔ وہ تین سال پہلے مر چکا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میری معلومات کے مطابق برادر ریس اور گراہم کبھی نہیں ملے۔ برادر ریس ایسا آدمی نہیں کہ کسی اجنبی پر گولی چلائے لیکن لگتا ہے کہ تم نے پہلے ہی اپنا ذہن بنالیا ہے۔''

''تمہیں میرے لہجے سے اس کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اب تم کیا کرنے والے ہو؟'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''رے گراہم کی بیٹی اب بھی ڈیولز ہرتھ میں رہتی ہے۔ وہ اس بارے میں ضرور جانتی ہے۔ وہی ایک ایسی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہستی ہے جس کا رے گرا ہم نے ہمیشہ خیال رکھا۔''

''لیکن تم وہاں اکیلے نہیں جاؤ گے۔''

''میں صبح ہونے کا انتظار کروں گا۔''

فون رکھنے سے پہلے اس کی آواز سنائی دی۔ ''نہیں، تم وہاں نہیں جاؤ گے اس بات کو بھول جاؤ۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا بدن تولیے سے خشک کیا۔ کپڑے بدلے اور گھر سے باہر نکل گیا۔ سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا اور ابھی میں نے اپنی پک اپ کے ذریعے آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ ہر چیز تاریکی میں چھپ گئی۔ میں اس راستے پر کئی سال بعد آیا تھا۔ جگہ جگہ کیچڑ سے گزرتا اور خطرناک موڑ کاٹتا ہوا جب میں اس علاقے کے نزدیک پہنچا تو سڑک پر گرے ہوئے ایک درخت نے میرا راستہ روک لیا۔ اب ٹرک کے ذریعے آگے جانا ممکن نہ تھا اور مجھے پیدل ہی بقیہ راستہ طے کرنا تھا۔ مجھے تو انجیلا کا گھر بھی معلوم نہیں تھا۔ بس ایک امید کے سہارے ہی اس سیاہ اور سرد رات میں اسے تلاش کرنا تھا۔

میں نے پک اپ کے ڈیش بورڈ سے ایک طاقت ور ٹارچ نکالی اور اپنے راستے پر چل پڑا۔ اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ دن میں ہونے والے واقعے کی وجہ سے ہے لیکن جلد ہی سمجھ گیا کہ گہری خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے میری یہ کیفیت ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر چلتے رہنے کے بعد میں ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ بچپن میں شیرف اسکڈمور اور میں اگست کی چاندنی راتوں میں یہاں آیا کرتے تھے اور گھنٹوں یہاں بیٹھ کر روشنی میں اڑنے والے کیڑوں کا رقص دیکھا کرتے۔ ابھی میں انہی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے ایک آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا اور آواز کی سمت ٹارچ روشن کر دی۔ وہاں گراہم کی بیٹی انجیلا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پندرہ برس ہوگی۔ اس کے جسم پر کوٹ تھا اور نہ پیروں میں جوتے اور وہ یقیناً سردی محسوس کر رہی تھی۔ ''ہائے ڈاکٹر ڈیولن، میں سمجھی کوئی اور ہے۔''

''ہیلو انجیلا۔'' میں نے ٹارچ نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جوتے نہیں پہن رکھے؟''

''نہیں۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''تم جان سکتے ہو کہ کیوں نہیں پہنے۔''

''تمہیں اس کھلی جگہ میں نہیں آنا چاہیے۔ گھر واپس جاؤ وہ یقیناً گرم ہوگا؟''

وہ کچھ کہے بغیر مڑی اور شمال کی طرف چل دی۔ میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''اگر میں بھی آجاؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

وہ کچھ لمحے سوچتی رہی پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے آجاؤ لیکن تمہیں فوراً ہی واپس جانا ہوگا کیونکہ میرے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی اس کا کیبن نظر آگیا۔ میں شاید اس اندھیرے میں اپنے طور پر اسے تلاش نہ کر پاتا۔ وہ مجھے گھر کے بجائے لکڑیوں کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ انجیلا نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر چلی گئی۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ یہ بداخلاقی ہوتی اگر میں اندر چلا جاتا۔ چند لمحوں بعد انجیلا کی آواز آئی۔

''اندر آجاؤ۔''

اس گھر میں صرف ایک کمرا تھا جس میں ایک بستر، میز، واش بیسن اور چولہا رکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی آتش دان نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چولہے سے ہی کھانا پکانے اور کمرے کو گرم رکھنے کا کام لیتی ہوگی۔ کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں البتہ فرش پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔

''کیا تم اپنے جوتے، اتار سکتے ہو ڈاکٹر ڈیولین؟'' انجیلا نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ قالین گندا ہو جائے۔''

میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس جگہ روشنی کے لیے کئی تیل کے چراغ جل رہے تھے اور وہاں گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ چولہے پر کچھ پک رہا تھا جس کی خوشبو گھر کے کھانے جیسی تھی۔

انجیلا نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

وہاں دو کرسیاں رکھی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ان میں سے کس پر بیٹھوں۔ اس نے میری سوچ پڑھ لی۔ ''دونوں کرسیاں ایک جیسی ہیں جس پر چاہو بیٹھ جاؤ۔''

وہ اٹھ کر بیسن کے پاس گئی۔ ایک جار میں پھولوں کا گلدستہ رکھا اور اس میں تھوڑا سا پانی ڈالا پھر اس نے وہ گلدستہ لا کر میز پر رکھ دیا۔

''بہت خوب صورت پھول ہیں۔'' میں نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں اس تاریکی اور سردی میں صرف میرے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

پھولوں کی تعریف کرنے نہیں آئے۔ کیا میں تمہاری آمد کا مقصد جان سکتی ہوں؟''

''تمہارا باپ مینڈولین بجایا کرتا تھا۔'' میں مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک مینڈولین ملا ہے جو میرے خیال میں اسی کا ہوسکتا ہے۔''

''اوہ۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور کھڑکی میں سے تاریک جنگل کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے بہت عرصہ پہلے اسے گرمیوں کے میلے میں بجایا تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے گردن ہلائی۔

''اس کی پشت پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید تم اسے لینا چاہو۔''

وہ اچانک مڑی اور غضب ناک آواز میں بولی۔ ''اسے میرے قریب بھی مت لانا۔'' اس کا چہرہ سفید ہورہا تھا اور اس نے اپنی انگلیوں سے واش بیسن کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اسے اپنے گرنے کا ڈر ہو۔

''ٹھیک ہے نہیں لاؤں گا۔'' میں نے اسے نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''اسے جلادو۔'' وہ بولی۔

''کیا؟'' میں نے آگے کی طرف جھک کر اپنی سانس قابو کرنے کی کوشش کی۔

''اس منحوس چیز کو جلادو۔'' اس نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ ''آج کی رات اتنی خاموشی کیوں ہے؟''

''باہر کوئی ہے۔'' اس نے نیچی آواز میں کہا۔

''ممکن ہے کہ وہ مہمان ہو جس کے آنے کی تمہیں امید تھی۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے یہاں مہمان آنے والا ہے؟''

''جب تم نے مجھے باہر ٹیلے پر دیکھا تھا تو یہی کہا کہ تم کسی اور کے آنے کی توقع کررہی تھیں پھر تم نے رات کے وقت میز پر پھول سجا کر رکھ دیے۔''

''تم واقعی ہوشیار آدمی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''گویا وہ بھوت سے نہیں ڈرتا۔''

''نہیں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''وہ میرا محبوب ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے چہرے پر چوٹ لگ گئی تھی اور وہ اتنا اچھا نظر نہیں آتا۔'' جنگل سے گزرتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز سے بہت شور ہوتا ہے لیکن وہ کسی کو ڈراتا نہیں ہے۔''

''پھر تمہارے خیال میں یہ کس کی آواز ہوسکتی ہے؟'' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں یہ کیسی آواز ہے۔''

گھر کے باہر کسی کے کودنے کی آواز آئی اور کھڑکی میں ایک بھیانک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ اتنا خوف ناک تھا کہ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور کرسی پر گر گیا۔ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ کہ وہ مکان کے اندر دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اسی لمحے ایک فائر کی آواز آئی اور کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر اندر آن گرا۔ میں نے انجیلا کو پکڑا اور اسے کھینچ کر میز کے پیچھے کرلیا۔

''کیا تمہارے پاس کوئی گن ہے؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

ایک اور فائر کی آواز سنائی دی اور کھڑکی میں نمودار ہونے والا چہرہ غائب ہوگیا۔ کچھ دیر تک کسی کے غرانے کی آواز آتی رہی پھر دروازے پر دستک ہوئی۔

''انجیلا۔'' کسی نے اس کا نام پکارا۔

''اوہ، خدا تیرا شکر ہے۔'' انجیلا نے گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں... ڈیلمر ریلیس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا انجیلا نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ریس کے ہاتھ سے بندوق گر پڑی۔

برادر ریس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ڈاکٹر ڈیولین، میں نے تمہارا ٹرک باہر دیکھا ہے۔''

میں نے اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟ باہر کون تھا؟'' وہ دونوں ساکت کھڑے رہے۔

''انجیلا نے یہ کیوں کہا کہ اس کی گن سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کیا تم نے اس آدمی کو گولی ماردی؟''

برادر ریس چند لمحے تک اپنا ہونٹ کاٹتا رہا جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ ''نہیں، میں نے صرف اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی تاکہ وہ انجیلا کو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

چھوڑ دے۔''

''تم بتاتے کیوں نہیں کہ یہ سب کیا تھا؟'' میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

انجیلا نے ریس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ اسے بتادو۔ یہ کسی نہ کسی طرح خود ہی اندازہ لگالے گا۔ اسے وہ پرانا مینڈولین مل گیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ریس بولا۔ ''کچھ دیر پہلے اسے اسے مینڈولین کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔''

میں نے بے اختیار ریس کی گن کی طرف دیکھا۔ وہ اعشاریہ بائیس کی رائفل تھی اور اس سے چھوٹے موٹے کام ہی لیے جاسکتے تھے۔

''تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔'' ریس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے چیلنج کررہا ہو۔

''دیکھو۔'' میں نے تھوڑا سا بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کم وبیش ہر معاملے کی چھان بین کرسکتا ہوں لیکن کھڑکی میں نظر آنے والا بھوت نہیں ہوسکتا۔''

ریس نے میری طرف ایک قدم بڑھایا لیکن انجیلا نے اس کا بازو پکڑلیا اور بولی۔ ''نہیں ڈیلمار! میں اسے سمجھاتی ہوں۔'' ریس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور رضامندی میں سر ہلادیا۔

''ڈاکٹر ڈیوین! بیٹھ جاؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ باہر کیا ہوا۔''

میں نے اس کی آواز میں درد محسوس کیا لیکن کچھ بولا نہیں بلکہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر کہنے لگی۔

''تم جانتے ہو کہ میرا باپ ایک شیطان صفت انسان تھا اور اپنی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھنے والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی بے تحاشا تشدد کیا اور کئی بار میں مرتے مرتے بچی۔ وہ میری زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا جب مجھے اس کے مرنے کی اطلاع ملی۔ میں اس کی تجہیز وتکفین میں شریک نہیں ہوئی۔ میں تو اس کی قبر پر بھی تھوکنا پسند نہیں کرتی۔''

مجھے اس کے بیان پر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اس حوالے سے رے گراہم کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

''اس روز بھی وہ نشے میں تھا جب اس کا سامنا ڈوویر اور اس کے بھائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ان کی اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن اس نے ان پر گولی چلادی ... جواب میں انہوں نے بھی فائرنگ کی اور اس کا چہرہ گولیوں سے چھلنی ہوگیا اور وہ اسے مردہ سمجھ کر چلے گئے۔ اس کی لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ ان تینوں بھائیوں پر مقدمہ چلا لیکن انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ انہوں نے ذاتی دفاع میں گولی چلائی تھی۔ قصبے کا ہر شخص رے گراہم کو جانتا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نشے کی حالت میں وہ کیا کرسکتا ہے چنانچہ انہیں بری کردیا گیا۔''

''لیکن ان سب باتوں کا مینڈولین سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے وہ چہرہ دیکھا تھا۔'' انجیلا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ کھڑکی میں کون تھا؟''

میں نے پلکیں جھپکائیں اور ذہن کی آنکھ سے اس چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا؟''

''وہ میرا باپ تھا اور اپنا مینڈولین لینے کے لیے رات میں یہاں کا چکر لگایا کرتا تھا۔''

''وہ ایک بار پھر ہمیں پریشان کرنے کے لیے واپس آگیا ہے۔'' ریس بولا۔ ''وہ گزشتہ شب یہاں آیا تھا عین اسی وقت میں بھی یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے زوردار للکارا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے رائفل سے اس کا نشانہ لینا چاہا لیکن وہ دور نکل گیا تھا۔''

''تاہم اس نے دیوار پر لٹکا ہوا مینڈولین اتار لیا تھا۔'' انجیلا نے سرگوشی کی۔

اسی لمحے ایک آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ کوئی شخص میرا ٹرک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور تیزی سے پہاڑی کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ وہ شخص اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے گا کیونکہ چابیاں میری جیب میں تھیں اور ان کے بغیر ٹرک اسٹارٹ نہیں ہوسکتا تھا۔

جیسے ہی میں ٹرک کے قریب پہنچا مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے اپنے دائیں جانب کسی کے دوڑنے کی آواز سنی۔ چور پہاڑی کی طرف واپس جارہا تھا۔ یقیناً اس نے میری ٹارچ کی روشنی دیکھ لی تھی جو اس اندھیرے میں لائٹ ہاؤس کا کام کررہی تھی۔ میں نے ان آوازوں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی اور یوں لگا جیسے وہ ڈیولنز ہرتھ کی طرف جارہا ہے۔ میں نے اپنی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

ٹارچ بجھادی اور جگنوؤں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ مجھے اس اونچی چٹان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی شخص گرینائیٹ کی سطح کو پتھر سے رگڑ رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے دفاع میں مجھ پر حملہ بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

''ہائے۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں ڈاکٹر ڈیولین ہوں۔ ڈیلمار ریس نہیں اور تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک کرخت آواز فضا میں ابھری۔ ''تم نے کہا ڈاکٹر ڈیولین۔''

''ہاں۔'' یہ بات میرے حق میں جاتی تھی کہ بلیو ماؤنٹین میں ہر کوئی میرے والدین کو جانتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے نہ ملا ہو تب بھی وہ مجھے اس حوالے سے پہچان سکتا تھا اور کسی کو بھی مجھ سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' اس کی آواز پھر فضا میں گونجی۔

چٹان کے عقب سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ میں اس کے مزید قریب ہوگیا اور جگنوؤں کی روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ ممکنات میں سے نہیں تھا۔ میرے سامنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ارے گراہم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا اوورآل اور پھٹی ہوئی سوتی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سر کے بال غائب ہوچکے تھے اور چہرے پر مستقل اداسی نظر آرہی تھی۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ ارے گراہم تین سال پہلے مرچکا تھا لیکن اب وہ میرے سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

''میں تمہارے والدین کو جانتا ہوں۔'' اس نے نرم آواز میں کہا۔ ''میں بھی ٹین شوز میں ساز بجایا کرتا تھا جہاں وہ کام کیا کرتے تھے۔''

میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ارے گراہم؟''

''ہاں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سب تمہیں مردہ سمجھ رہے ہیں لیکن تم زندہ سلامت میرے سامنے کھڑے ہو۔ کیا ڈدورو کے بھائیوں نے تمہیں قتل نہیں کیا تھا؟''

''نہیں، وہ کسی اور کو مارنے آئے تھے۔ میں تو نشے کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔''

''میں نے بھی یہی سنا ہے کہ اس روز تم نے بہت زیادہ پی لی تھی۔'' میں نے اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم تین سال تک کہاں رہے؟''

''زیادہ تر نارتھ کیرولینا میں۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''کچھ وقت دوسری جگہوں پر بھی گزارا، لگتا ہے کہ دنیا دیکھ لی۔''

''ٹھیک ہے، کیا تم بتانا چاہو گے کہ اس رات کیا ہوا تھا جب تمہیں اس جھگڑے کے بعد مردہ سمجھ لیا گیا؟''

''ہاں، میں بھی حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو میں بیٹھ جاؤں۔''

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چٹان کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا۔ میں بھی چند قدم کا فاصلہ طے کرکے اس کے سامنے براجمان ہوگیا۔ اس نے دور خلا میں دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ڈدویر کے بھائی اور میں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ میں کارخانے میں تھا اور وہ مال کی تقسیم کیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ یہ بات نہیں جانتے تھے۔''

''شراب۔'' میں نے تصدیق کرنے کے لیے پوچھا۔ ''تم شراب بناتے اور وہ اسے بیچا کرتے تھے؟''

''ہاں۔'' اس نے بے صبری سے کہا جیسے اسے بات ختم کرنے کی جلدی ہو۔ ''ایک رات میرا ایک شخص سے جھگڑا ہوگیا۔ اس نے مجھ پر چاقو سے وار کیا تو میں نے اپنے دفاع میں گولی چلادی۔ چھرے اس کے چہرے پر لگے اور وہ ناقابلِ شناخت ہوگیا۔ مجھے دفاع کا حق حاصل تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ مجھے ہی مجرم سمجھا جائے گا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پرانا شیرف کتنا گھٹیا شخص تھا چنانچہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ڈدویر کے بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک پلان بنایا اور مرنے والے کے کپڑے خود پہن لیے اور اپنے کپڑے اسے پہنا دیے تاکہ لوگ مجھے مردہ سمجھیں۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلا گیا۔ ویسے بھی میں تبدیلی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انجیلا بڑی ہوگئی تھی اور میرے بغیر بھی رہ سکتی تھی چنانچہ میں نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''اب کیوں آئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آدمی کو گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ان تین سالوں کے دوران شراب کا ایک قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں گیا۔ اب میں ایک بالکل بدلا ہوا آدمی ہوں۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے بقیہ ایام یہیں گزاروں۔ مجھ سے کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔''

''کیا تم آج ہی آئے ہو؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''نہیں، میں ایک ہفتے سے یہاں چھپا ہوا تھا۔ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ انجیلا کس حال میں ہے۔ میں زیادہ تر رات میں یہاں آیا کرتا تھا پھر میں نے اس جہنمی واعظ کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اسے یہاں سے بھگانے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔''

''تم نے اسے خوف زدہ کیا؟''

''نہیں اس نے مجھے ڈرایا۔''

''اگر تم یہاں رہنے کے لیے آئے تھے تو دیوار پر سے مینڈولین اتار کر کیوں بھاگ گئے؟''

''ہاں۔'' وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔'' وہ مینڈولین اپنی مخصوص جگہ پر لٹکا ہوا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کیوں اچک لیا۔ شاید اس لیے کہ بہت دن سے کوئی ساز نہیں بجایا تھا۔''

''لیکن ریس تمہارا پیچھا کرتا رہا؟''

''ہاں۔ اس نے تقریباً سارا دن میرا تعاقب کیا جیسے کسی جنگلی درندے کا شکار کرنے نکلا ہو۔ میں تمہارے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا کہ وہ اچانک ہی میرے قریب آ گیا۔ اس نے گولی چلا دی جو مینڈولین پر لگی۔ وہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں وہاں سے کھسک گیا۔ اگر تم درمیان میں نہ آتے تو میرا بچنا مشکل تھا۔ مجھے اس کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔'' تم جانتے ہو کہ مجھے یہ سب کچھ شیرف اسکڈمور کو بتانا ہوگا۔''

وہ غراتے ہوئے بولا۔'' تم وہی کرو جو تمہیں کرنا ہے۔''

''تم نے کس شخص کو قتل کیا تھا؟''

''میں خود نہیں جانتا کہ وہ کون تھا؟''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' کم از کم یہ تو بتا سکتے ہو کہ ایک ہفتہ کہاں چھپے رہے؟ اکتوبر میں تو اچھی خاصی سردی ہوتی ہے؟''

اس نے چاروں طرف دیکھا جیسے جائزہ لے رہا ہو کہ کہیں کوئی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا پھر بولا۔'' یہ بھی شیرف کو بتاؤ گے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔'' ضروری نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

اس نے مجھے پُراعتماد انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔'' کیونکہ یہ ایک راز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایسی چیزوں کا مطالعہ کرتے ہو اور میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے جاننے میں بھی دلچسپی ہوگی لیکن وعدہ کرو کہ اسے تم اپنے تک ہی محدود رکھو گے۔''

''بتاؤ تو سہی، وہ کیا راز ہے؟''

''میرے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس چٹان کے پیچھے ایک غار ہے۔ میں بچپن سے ہی اس جگہ سے واقف ہوں اور کئی مرتبہ وہاں ہفتوں تک روپوش بھی رہ چکا ہوں۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ ریس اور انجیلا تمہیں بھوت سمجھ رہے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے آنکھیں چڑھاتے ہوئے کہا۔'' وہ اتنے معصوم نہیں ہیں انہوں نے تمہیں کہانی سنائی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا شاید یہ خیال ریس کے ذہن میں آیا ہو۔ میں ان دونوں کو الگ کرنے آیا تھا آج بھی میں اسی لیے آیا تھا۔''

میں اس کی بے چینی کو سمجھ سکتا تھا۔ برادر ریس اور انجیلا کا کوئی جوڑ نہیں تھا اور ارے گراہم کی خواہش ہوگی کہ وہ اپنی بیٹی کو اس سے دور رکھے۔

''اسی لیے تم کیبن کے گرد منڈلا رہے تھے۔'' میں نے کہا۔'' شاید تمہیں توقع ہوگی کہ کھڑکی میں تمہارا چہرہ دیکھ کر ریس خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جائے گا۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم وہاں موجود ہو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔'' تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا لیکن میں ہر قیمت پر انجیلا کو اس جھوٹے واعظ سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔''

''لگتا ہے وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اچھا۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا لیکن اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

''تمہارا مینڈولین میرے پاس ہے۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ دیکھتے ہیں۔ شاید اس کی مرمت ہو سکے۔ میں تمہیں بہت عمدہ قسم کی گرما گرم کافی بھی پلاؤں گا۔''

''تاکہ تم اس دوران شیرف کو فون کر سکو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ اس سے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اس نے کہا۔'' مجھے انجیلا کی طرف سے تشویش ہے۔ میں دوبارہ وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔'' کیا تم مجھے وہ غار نہیں دکھاؤ گے جہاں تم چھپے ہوئے ہو؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''اس وقت میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ کل دیکھ لینا۔''
یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ عین اسی وقت ٹیلے کی بلندی پر ہاتھ میں رائفل پکڑے ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ ہر طرف چاند کی روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا وہ ریس تھا اور اس کے پہلو میں انجیلا کھڑی ہوئی تھی۔

رے گراہم کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے جیسے اسے، زمین نے جکڑ لیا ہو۔ اس نے ریس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ انجیلا اپنی عمر سے دس سال بڑی اور کافی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

''دیکھو۔'' میں نے یہ آواز بلند کہا اور ان دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ ''کیوں نہ تم سب میرے گھر چلو وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔'' ریس اپنی رائفل بلند کرتے ہوئے غرایا۔ ''یہ بوڑھا مجھے انجیلا سے الگ نہیں کر سکتا، اب وہ میری ہے۔''

گراہم کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اچھا، انجیلا اب تمہاری ہے۔''

''ایک منٹ۔'' انجیلا نے کمزور سی آواز میں کہا۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

''ہاں، میں بہت جلد تمہیں قبر میں پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد انجیلا میری ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گراہم پر رائفل تان لی۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت تک گراہم اپنا چاقو نکال چکا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ریس پر حملہ کیا لیکن اس وقت تک وہ گولی چلا چکا تھا۔ ریس کی ٹانگ میں چاقو لگا جبکہ گراہم پیچھے کی جانب زمین پر گر پڑا۔

انجیلا نے چیخ ماری اور بے اختیار ریس کی طرف لپکی اور اس پر جھک گئی۔ رے گراہم کی جیکٹ خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کی اور کراہتے ہوئے بولا۔ ''انجیلا سے دور رہو، کتیا کی اولاد۔''

انجیلا نے گھوم کر گراہم کو دیکھا اور بولی۔ ''میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے ریس کی ٹانگ سے چاقو نکالا اور اپنے لباس سے تھوڑا سا کپڑا پھاڑ کر اس کے زخم پر باندھ دیا۔

''ہم موسم بہار میں شادی کرنے والے ہیں۔'' ریس نے کہا۔ اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی اور وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' رے گراہم نے تلخی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر، تمہیں ان کو روکنا چاہیے۔''

''دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں روک سکتی۔'' ریس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''تم پہلے ہی قانون کی نگاہوں میں مر چکے ہو اور عنقریب اسی قبر میں پہنچ جاؤ گے جہاں تمہیں ہونا چاہیے۔''

''پلیز۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے التجا کی۔ ''یہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ ان کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہے۔''

میری نظریں حیرت سے اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی نہیں تھا اور وہ نادیدہ اجنبیوں کو یہ کہانی سنا رہا تھا۔

''اس بات کو بہ مشکل پندرہ برس ہوئے ہوں گے۔ نیتا ویلڈروپ میری بیوی کے پاس آئی اور اس کی گود میں ایک نوزائدہ بچی تھی جسے وہ جنگل میں چھوڑنے آئی تھی لیکن بچی کے رونے کی آواز سن کر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ اسے جنگل میں چھوڑنے کے بجائے ہمارے پاس لے آئی۔ ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے میری بیوی نے اس بچی کو گود لے لیا۔ اسی سال سردیوں میں ایک وائرس پھیلا اور نیتا اس کی تاب نہ لا کر مر گئی پھر ہم نے سنا کہ ڈیلمار نے وعظ دینا شروع کر دیا ہے۔ میں ڈیلمار کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن بیوی نے روک لیا۔ انجیلا، اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ اس شخص سے کیوں شادی نہیں کر سکتیں۔ اس نے تمہاری ماں کی عزت لوٹی تھی۔''

انجیلا نے اپنے قدموں پر گھسٹنا شروع کیا۔ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے رے گراہم کی طرف بڑھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم سمجھتے ہو کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں لیکن ریس نے میری ماں سے شادی نہیں کی تھی۔ جوانی میں لوگ کئی عورتوں سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ میری ماں بھی ایسی ہی ایک عورت تھی اس سے میرے اور ریس کے رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم مرتے وقت بھی جھوٹ بولنے سے باز نہ آئے۔''

اس نے مزید کچھ کہے بغیر ڈیلمار ریس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے گھر کی جانب چل دی۔ رے گراہم پیچھے کی جانب زمین پر گر پڑا اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ میں نے جھک کر دیکھا اس بار وہ واقعی مر چکا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صنف نازک کے شر اور بداعمالیوں کا عبرت اثر ماجرا

دیمک

مرزا امجد بیگ

عورت کو اللہ تعالیٰ نے عزت اور مان کا جو رتبہ دیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی لیکن یہی عورت جب بیچ چوراہے پر آجائے تو کہیں کی نہیں رہتی۔ کچھ ایسا ہی حال اس کی بے حیائی کا بھی تھا جسے نہ چار دیواری کا احساس تھا اور نہ ہی چادر کی تمنا... اسے تو اپنی سفلی خواہشوں کی تکمیل چاہیے تھی... معاشرے کی اسی دیمک سے پردہ چاک کرنے کے لیے مرزا امجد بیگ جب سامنے آئے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا... دیمک کے نقصان کا ازالہ تو ممکن نہ تھا لیکن مزید نقصان سے بچاؤ ممکن ہوگیا۔

ماہ صیام کے آغاز کے ساتھ ہی مہنگائی کے طوفان نے بھی سر اُٹھایا ہوا تھا۔ اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں خصوصاً پھل، سبزی اور وہ تمام چیزیں جو سحر اور افطار کے لوازمات کے لیے لازم تھیں، ان کے نرخ کم آمدنی یا محدود آمدنی والے افراد کی دسترس میں نہیں رہے تھے، بہرحال کسی نہ کسی طور گزارہ تو کرنا تھا۔ یہ مہینا ایک سال کے بعد آیا تھا اور پلٹ کر بھی اسے ایک سال کے بعد ہی آنا تھا لہٰذا قرض ادھار کرکے اس بابرکت ماہ میں شاندار سحری اور افطاری بھی ضروری تھی۔

دوسری جانب ذخیرہ اندوز، منافع خور اور موقع پرست دکاندار بھی یہی سوچ کر میدانِ کمائی میں کود پڑے تھے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی حجامت بنانے کا ایسا نادر موقع پھر ایک سال کے بعد ہی آئے گا، چنانچہ ان کی رگوں اور جیبوں سے جتنا بھی ممکن ہو، نچوڑ لو۔ چونکہ یہ رحمتوں اور برکتوں والا مہینا ہے اس لیے اس ایک ماہ میں سال بھر کے برابر منافع کمانا عین فطری اور جائز ہوگا۔ ایسا گولڈن چانس سال کے باقی گیارہ مہینوں میں کہاں ملتا ہے.....

ہم مسلمان بھی بڑی عجیب و غریب اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی قوم ہیں۔ پوری دنیا میں بسنے والی دیگر اقوام اپنے مذہبی تہواروں کے مواقع پر، ان تہواروں سے متعلق اشیائے ضرورت، کو کم سے کم نرخوں پر فروخت کرنے کا بندوبست کرتے ہیں، تاکہ ہر کمزور اور طاقتور یکساں طور پر مذہبی تہواروں کو منا سکے گا مگر ہمارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس کے آگے میں زبان کھولنے کی جسارت نہیں کروں گا۔ کاش! ہم نے اندھے جوش اور بہرے جذبات کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنی کوتاہیوں، خامیوں اور زیادتیوں پر غور کیا ہوتا تو آج یوں زمانے میں ذلیل و رسوا نہ ہو رہے ہوتے..... مگر ہمارے پاس غور کرنے کی فرصت ہے اور نہ ہی پشیماں ہونے کی توفیق کیونکہ ہمارے ایمان کی عمارت تو اس یقین پر قائم ہے کہ جنت تو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.pbookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہمیں باپ کے ورثے میں ملے گی۔

ایسا دعویٰ کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ جس باپ کے ورثے کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ ہمارے علاوہ اور بھی بہت سی اقوام کا باپ ہے اور یہ حقیقت تو ہم صدیوں سے فراموش کیے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض رب المسلمین نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ دسمبر کی ایک خنک شام تھی۔ میں حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا پیشے کے تقاضے نبھا رہا تھا کہ ایک پریشان حال شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کردیا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

''جی..... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''وکیل صاحب.....'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا نام سلطان ہے اور میں ایک بہت ہی خطرناک کیس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

سلطان نامی اس شخص کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ اس نے شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ ایک پستہ قامت اور باریش شخص تھا۔ رنگت گندمی اور بدن مائل بہ فربہی۔

''کیسا خطرناک کیس سلطان صاحب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ تو ٹھیک ٹھاک ہی نظر آرہے ہیں۔''

اگرچہ اس کے چہرے اور آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی تاہم خطرناکی والی کوئی بات اس کے ساتھ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ میرے سوال کے جواب میں جلدی سے بولا۔

''جناب! یہ کیس میرا نہیں ہے۔''

''پھر کس کا کیس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے ایک دوست کا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا نام خالد حسین ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے دوست خالد حسین کو کیا ہوگیا ہے؟''

''خالد کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''پچھلی رات کے وقت یہ واقعہ پیش آیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے خالد کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا، جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! میں نے کہا تھا نا کہ یہ ایک خطرناک کیس ہے۔''

اس کے حماقت نما اصرار پر مجھے غصہ تو آیا تاہم میں نے غصے کا اظہار مناسب نہ جانا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سلطان صاحب! اس بات کا فیصلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کہ یہ کیس کتنا خطرناک ہے۔ آپ بس مجھے حقائق سے آگاہ کردیں۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔

''اب جلدی سے بتادیں، پولیس نے آپ کے دوست کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''عزت لوٹنے کے الزام میں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

اس کی بے ساختگی نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''عزت لوٹنے کے الزام میں..... تمہارے دوست نے کس کی عزت لوٹی ہے؟''

میں غیر ارادی طور پر ''آپ'' سے ''تم'' پر آگیا تھا مگر میرے انداز کی اس تبدیلی کا سلطان نے کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! خالد نے کسی کی عزت نہیں لوٹی۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنی پڑوسن شکیلہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ شکیلہ کی شکایت پر ہی پولیس نے خالد کو گرفتار کیا ہے۔''

''اوہ..... تو یہ حدود آرڈی نینس کا کیس ہے۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے ٹھیک ہی کہا ہے سلطان، یہ واقعی خاصا خطرناک کیس ہے۔''

''جناب!'' وہ منت ریز انداز میں بولا۔ ''میں خالد کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ اس لائن کا آدمی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی گہری سازش کے تحت اسے اس وبال میں ڈالا گیا ہے۔''

''گہری سازش!'' میں نے رف پیڈ پر قلم گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ''کون کرسکتا ہے ایسی سازش؟''

''شکیلہ.....!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''وہ کردار کی اچھی عورت نہیں ہے۔ اس نے اپنے کسی خاص مقصد کی خاطر خالد کو اس مصیبت میں پھنسایا ہے۔''

''کیا تم بھی شکیلہ نامی اس عورت سے مل چکے ہو؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

اس کے خاموش ہونے پر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں..... ایک آدھ بار دیکھنے کا موقع ملا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ شکل ہی سے بازاری عورت نظر آتی ہے۔''

''تو کیا تم بھی خالد کے کہیں قریب ہی رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب، میری رہائش سلطان آباد میں ہے۔'' وہ اپنی گردن کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''خالد لیاقت اشرف کالونی میں رہتا ہے۔ ہم دونوں کا لاپل پر واقع ایک موٹر گیراج میں کام کرتے ہیں۔''

''لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک یا دو؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نام کی دو کالونیز تھیں۔ ایل اے سی ون (لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک) اور ایل اے سی ٹو۔ محمود آباد اور منظور کالونی کا بیشتر علاقہ ایل اے سی ون اور ایل اے سی ٹو کے درمیان واقع ہے۔

''لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک وکیل صاحب۔'' سلطان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اس کالونی کے بعد محمود آباد شروع ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ گزشتہ رات تمہارے دوست کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''جناب، واقعے کی تفصیل کے بارے میں تو مجھے زیادہ پتا نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ تھانے جا کر خالد سے ایک ملاقات کر لیں تو ساری کہانی آپ کے علم میں آ جائے گی۔''

خالد حسین کو، سلطان کے بیان کے مطابق گزشتہ رات گرفتار کیا گیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پولیس نے آج صبح اسے عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا اور اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہوگا۔

''ٹھیک ہے، میں آج رات کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر خالد سے ملوں گا۔'' میں نے سلطان کی بات کے جواب میں کہا۔ ''اور اگر مجھے اس کی باتوں میں صداقت نظر آئی تو میں یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لوں گا لیکن.....''

میرے ادھورے جملے پر سلطان نے فکرمند نظر سے مجھے دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''لیکن کیا وکیل صاحب؟''

''لیکن یہ کہ.....'' میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ تم نے کہا اور میں نے اس کی تصدیق کی کہ یہ کیس واقعی بہت خطرناک ہے لہٰذا اس سے نمٹنے کے لیے بہت زوردار مقابلے کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں اتنا تو پتا ہی ہوگا کہ عدالتی معاملات کی گاڑی نوٹوں کے پٹرول سے چلتی ہے.....؟''

''جی وکیل صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں یہ بات جانتا ہوں۔''

''اس کیس کو ہاتھ میں لینے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کون ادا کرے گا؟'' میں نے کہا۔

''صدیق صاحب.....!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''صدیق صاحب!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کون صاحب ہیں؟''

''صدیق صاحب اس گیراج کے مالک ہیں جہاں میں اور خالد کام کرتے ہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''وہ بہت مصروف انسان ہیں اس لیے انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ بعد میں وہ کسی وقت آپ سے ملنے آئیں گے۔ انہوں نے مجھے آپ کی فیس کے پیسے بھی دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی مجھ سے لے لیں۔''

''ابھی نہیں..... کل!'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''پہلے میں خالد سے ایک بھرپور ملاقات کر کے کیس کی نوعیت کا اچھی طرح جائزہ لے لوں۔ اس کے بعد کوئی حتمی فیصلہ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے جناب، جیسی آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا۔ ''میں کل دوبارہ آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ میں لگ بھگ پانچ سال سے خالد کو جانتا ہوں اس لیے اس کی بے گناہی کی گواہی دے سکتا ہوں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک شریف النفس انسان ہے۔ اس پر جتنا مکروہ الزام لگایا گیا ہے، میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کیا تم عدالت میں، خالد کی نیک نامی کی گواہی دو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی..... ضرور۔'' وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ جب کہیں گے، میں گواہی دینے عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''تم ایک سچے، مخلص اور انسان دوست آدمی ہو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سلطان۔'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

'' تم کل دوپہر کے بعد کسی بھی وقت میرے پاس آجاؤ۔ پھر آیندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔''

''جو حکم آپ کا وکیل صاحب!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔

میں نے آیندہ دو منٹ میں سلطان آف سلطان آباد کو چند اہم ہدایات دیں پھر رخصت کردیا۔ سلطان ایک سادہ مزاج اور سیدھا سادہ انسان تھا۔ خالد حسین کے لیے اس کے دلی جذبات نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے لیے نیکی اور قربانی کا جذبہ رکھتا تھا۔ فی زمانہ اس نوعیت کے جذبات دنیا سے ناپید ہوتے جارہے ہیں۔

☆☆☆

میں لگ بھگ دس بجے دفتری مصروفیات سے فارغ ہوا اور اپنی گاڑی کو محمود آباد کی سمت میں ڈال دیا۔ مجھے متعلقہ تھانے جاکر خالد حسین سے تفصیلی ملاقات کرنا تھی۔ محمود آباد کا علاقہ میرے لیے آؤٹ روٹ تھا تاہم چونکہ میں ایک لحاظ سے اس کیس میں ہاتھ ڈال چکا تھا لہٰذا آؤٹ روٹ اور ان روٹ کا حساب بے معنی ہوکر رہ گیا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت تھانہ انچارج اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا ورنہ خالد حسین سے ملاقات کے لیے مجھے انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑتا۔ ڈیوٹی آفیسر کو جب میں نے اپنی آمد کی غرض وغایت کے بارے میں بتایا تو وہ چونک کر مجھے تکنے لگا۔ پھر طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

''آپ کون ہیں؟''

میں اپنا بریف کیس اور کوٹ وغیرہ گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ اہم کاغذات کو نہایت ہی سلیقے سے تہ کرکے میں نے شرٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میری وضع قطع سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ میں کوئی وکیل ہوں۔

''میں حوالاتی کا ایک دوست ہوں..... برکت علی۔'' میں نے ڈیوٹی آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے چند باتیں کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔''

''آپ نے حوالاتی کا نام خالد حسین بتایا ہے نا...؟'' وہ شک زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جسے کل رات حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار کیا گیا تھا.....''

''جی، آپ کا فرمایا ہوا بالکل درست ہے۔'' میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''آج صبح ملزم کو عدالت میں پیش کرکے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیا گیا تھا۔ میں اسی خالد حسین سے دس منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ ایک خطرناک مجرم ہے برکت صاحب!'' ڈیوٹی آفیسر مجھے پڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''میں آپ کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ انچارج صاحب نے اس سلسلے میں سختی سے منع کررکھا ہے۔''

''آپ اپنے انچارج صاحب سے میری بات کرا دیں، میں خود ان سے اجازت لے لوں گا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا پھر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالنے کے بعد اضافہ کیا۔

''میرے پاس گروقت ہوتا تو میں کل کسی وقت آکر خالد حسین سے ملاقات کرلیتا۔ کل صبح کی میری فلائٹ ہے۔ خالد میرا سسرالی رشتے دار ہے۔ میں چاہتا ہوں، اس مصیبت کی گھڑی میں اس کے کسی کام آجاؤں۔ اگر میں چلا گیا تو یہ بے چارہ ادھر والات ہی میں پڑا سڑتا رہے گا۔''

میری اداکاری سے وہ یہی سمجھا کہ میں کوئی دولت مند شخص ہوں اور شاید خالد کی مالی مدد کرنے آیا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''برکت صاحب! انچارج صاحب تو اس وقت تھانے میں موجود نہیں ہیں۔ میں آپ کو صرف دس منٹ کے لیے حوالاتی سے ملنے کا موقع فراہم کردیتا ہوں لیکن اس میں میرا کیا بھلا ہوگا.....؟''

جملے کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا جیسے کسی تگڑی مرغی کو دیکھ کر جنگلی بلا استفساریہ انداز میں اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے کہ ''جست'' کب اور کس زاویے سے لگائی جائے۔

''جب میں خالد حسین کا بھلا کرنے یہاں آیا ہوں تو لگے ہاتھوں آپ کا بھی بھلا ہوجائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب آپ فوری طور پر مجھے حوالاتی سے ملوادیں تاکہ بھلائی کے عمل کا آغاز ہوسکے۔''

ڈیوٹی آفیسر نے فوراً سے پیشتر مجھے میرے مطلوبہ شخص تک پہنچادیا۔ میں نے اپنی جیب خاص میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اسے ٹوکن (بیعانہ) سمجھیں۔ کل دن میں کسی وقت میرا آدمی تھانے آکر آپ سے معاملات کرے گا اور آپ کی بھرپور خدمت کی جائے گی۔''

ڈیوٹی آفیسر نے فرطِ مسرت سے سو روپے کے کرارے نوٹ کو چوم کر جیب میں رکھا پھر معنی خیز انداز میں حوالاتی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''جناب! اب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

آپ، دس منٹ کیا، بیس منٹ تک حوالاتی سے گفت وشنید کرسکتے ہیں۔ انچارج صاحب ایک گھنٹے سے پہلے آنے والے نہیں۔''

میں ڈیوٹی آفیسر کو نظر انداز کر کے حوالاتی خالد حسین کی جانب متوجہ ہوگیا۔ آپ کو یقیناً اس بات پر حیرت ہو رہی ہوگی کہ سو روپے کے ایک نوٹ نے ڈیوٹی آفیسر کو اس قدر خوش کیسے کر دیا ہوگا۔ دراصل جس زمانے کا یہ واقعہ ہے اس وقت سو روپے والے نوٹ کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ چالیس سال کے بعد آج یعنی دو ہزار پندرہ عیسوی میں واقعی سو والا نوٹ اپنی وقعت اور قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے۔ اس میں آپ بہ مشکل ایک وقت کا سادہ سا کھانا ہی کھا سکتے ہیں مگر چالیس سال پہلے سو روپے میں ایک متوسط فیملی کا پورے دن کا خرچہ بہ آسانی چلایا جاسکتا تھا۔

پولیس والوں کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔ حرص اور لالچ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ میں نے اسی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈیوٹی آفیسر کے سامنے خود کو امیر و کبیر اور انتہائی مصروف انسان ظاہر کیا تھا۔ کسی بھی حوالاتی کے ایسے صاحب ثروت رشتے داروں سے پولیس والے بہت محبت کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان سے ''بہت کچھ'' ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی گفتگو سے ڈیوٹی آفیسر پر یہ تاثر قائم کر دیا تھا کہ کل دن میں میرا ایک آدمی تھانے آکر ان سے حوالاتی کے معاملے پر کوئی ڈیل وغیرہ کرے گا۔ ڈیوٹی آفیسر میرے اس جھانسے سے مطمئن ہوگیا تھا۔

خالد حسین کی عمر پینتالیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ صحت بس، واجبی سی تھی۔ وہ خاصا پژمردہ اور تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ خالد ایک لاابالی اور بدسلیقہ شخص تھا ورنہ حوالات کی ایک رات انسان کا یہ حشر نہیں بناڈالتی۔

میں نے حوالات کی آہنی سلاخوں کو تھام کر دوستانہ انداز میں اسے پکارا۔ ''خالد حسین! میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہارے سیٹھ صدیق صاحب نے مجھے تمہاری وکالت کے لیے مقرر کیا ہے۔''

اس نے ویران سی نظر سے مجھے دیکھا اور کھسک کر میرے قریب آگیا۔ پھر اس کے حلق سے ایک نحیف اور بے یقینی کی حامل آواز خارج ہوئی۔

''آ.....پ مجھے اس مصیبت سے نکال لیں گے.....؟''

''اگر تم پورا واقعہ سچ سچ مجھے بتا دو تو میں تمہیں اس مصیبت سے فلجات دلا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سب سے زیادہ اہمیت تمہاری سچائی کی ہے۔ وہی تمہاری بے گناہی کو ثابت کر سکتی ہے۔''

''وکیل صاحب! میں نے ابھی تک سچی سے ایک جھوٹ بھی نہیں بولا۔'' وہ فریادی انداز میں بولا۔ ''لیکن پولیس والوں کو میری بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ میرے مقابلے میں وہ اس بری عورت کی بات کو اہمیت دے رہے ہیں۔''

''بری عورت.....یعنی شکیلہ؟''

''جی..... جی وہی۔'' وہ نفرت بھرے انداز میں بولا۔ ''میں اسی بدمعاش عورت کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنسا ہوں۔''

''اوہ.....تو تمہیں یقین ہے کہ شکیلہ کردار کی اچھی عورت نہیں ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

''پکا یقین ہے وکیل صاحب۔'' وہ تاکیدی انداز میں بولا۔ ''ایک سو ایک فیصد یقین ہے مجھے۔''

''تو تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے شکیلہ نامی اس عورت پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا۔'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''وہ محض تمہیں پھنسانے کے لیے اتنی بڑی بات کہہ رہی ہے؟''

''میرا خدا مجھے غارت کرے اگر میں نے اس آوارہ عورت کو چھوا بھی ہو۔'' وہ بے حد جذباتی انداز میں بولا۔ ''میں اتنے بڑے گناہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

میں پچھلے پانچ منٹ سے خالد حسین سے مختلف نوعیت کے سوالات کر رہا تھا اور اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اس نوعیت کے کارنامے انجام دینے والوں کے انداز و اطوار اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ خالد میں وہ جرأت اور بیباکی دکھائی نہیں دیتی تھی جس قسم کا الزام شکیلہ نے اس پر عائد کیا تھا۔ مجھے خالد کی بے گناہی کا یقین آگیا تو میں نے سب سے پہلے اہم امور کو نمٹا لینا ضروری جانا۔

میں نے اپنی شرٹ کی جیب میں سے تہ شدہ کاغذات کو نکال کر سیدھا کیا۔ ان میں ایک تو وکالت نامہ تھا، ایک خالد کی درخواستِ ضمانت اور چند اہم نوعیت کے دیگر کاغذات۔ میں نے پہلی فرصت میں مختلف مقامات پر خالد کے دستخط لیے اور کاغذات کو دوبارہ پہلے کی طرح تہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کر کے شرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ خالد نے انگریزی میں دستخط کیے تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میٹرک کر رکھا تھا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی خالد حسین۔'' میں نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''شکیلہ کو آخر تم سے ایسی کون سی دشمنی ہے جو وہ تم پر اتنا گھناؤنا الزام عائد کر رہی ہے.....؟''

''میں نے دو چار بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''اس نے اپنے شوہر سے میری شکایت کر دی۔ منظور حسین مجھ پر خاصا گرم ہوا تھا۔''

''تم نے شکیلہ کو کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہی کہ..... یہی کہ وہ اپنا چال چلن ٹھیک کر لے۔ محلے داری میں اس قسم کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہوتیں۔''

''تمہارے خیال میں شکیلہ کا چال چلن درست نہیں؟''

''مجھے تو وہ بہت ہی مکار اور چال باز عورت لگتی ہے۔'' وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''منظور حسین ایک بوڑھا شخص ہے اور شکیلہ ابھی جوان جہان ہے۔ کوئی جوان اور خوب صورت عورت کسی بوڑھے شخص سے شادی کیوں کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں، وہ منظور حسین کو الو بنا کر کوئی اور ہی کاروبار کر رہی ہے۔ میں پچھلے بیس پچیس سال سے منظور حسین کا پڑوسی ہوں۔ کافی عرصہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اکیلا ہی اس گھر میں رہ رہا ہے۔ میں نے کبھی اس کے کسی رشتے دار کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا لیکن جب سے منظور حسین نے شکیلہ سے شادی کی ہے، کوئی نہ کوئی نئی مردانہ شکل گھر میں نظر آ جاتی ہے اور وہ بھی ایسے وقت جب منظور حسین گھر میں نہ ہو۔''

خالد حسین خاصی چونکا دینے والی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''یہ منظور حسین تمہارا کس طرف کا پڑوسی ہے؟''

''سامنے کا جی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ہم ایک ہی گلی میں رہتے ہیں۔ دونوں کے گھروں کے دروازے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھلتے ہیں۔''

''اسی لیے تمہیں شکیلہ کے گھر میں تاک جھانک کا زیادہ موقع مل جاتا ہوگا۔'' میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور تم اس کے گھر میں آنے جانے والے لوگوں کو آسانی سے دیکھ سکتے ہو گے؟''

''ایک حد تک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی نیت لگا کر منظور حسین کے گھر میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا بھی ایک گناہ ہے۔''

''منظور حسین اور شکیلہ کے گھر کی ساری تفصیل تو بیان کر دی۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اب ذرا اپنے بارے بس بھی تو بتاؤ۔''

''جی..... میں کیا بتاؤں اپنے بارے میں؟'' وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔

''یہی کہ تمہارے گھر میں کتنے افراد ہیں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اکیلا ہی ہوں جی۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اکیلا..... مطلب، تمہارے سوا گھر میں اور کوئی نہیں رہتا؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر جواب دیا۔

''تمہارے دیگر رشتے دار؟''

''کوئی نہیں جی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''والد صاحب میرے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ والدہ صاحبہ نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا۔ دو سال پہلے وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔''

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کوئی اور بہن بھائی..... چاچا ماما.....؟''

''نہیں جی، کوئی بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''خالد حسین! میرے اندازے کے مطابق اس وقت تمہاری عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ دو سال پہلے تمہاری والدہ کا انتقال ہوا یعنی اس وقت تم بیالیس، تینتالیس سال کے ہو گے۔ تمہارے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے تمہاری پرورش کی اور پال پوس کر تمہیں اتنا بڑا کر دیا۔ اس دوران میں والدہ صاحبہ کو تمہاری شادی وغیرہ کا خیال نہیں آیا؟ مائیں تو ان معاملات میں بہت حساس اور جلد باز ہوتی ہیں۔''

میرے ذہن میں جتنے بھی سوالات نمودار ہوئے وہ میں نے ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔ میرے خاموش ہونے پر خالد حسین برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''میں نے شادی کی تھی جناب لیکن یہ خوشی مجھے راس نہیں آئی۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ثمینہ سے میری شادی لگ بھگ پانچ سال رہی تھی وکیل صاحب۔''

اس کے چہرے پر تلخی کے تاثرات ابھر آئے۔ ان پانچ سالوں میں، میں نے اور میری ماں نے سکھ کا ایک لمحہ بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر تنگ آ کر میں نے ثمینہ کو طلاق دے دی۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سی سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ایک طویل اور دکھ بھری داستان ہے وکیل صاحب۔ ثمینہ کو میری زندگی سے نکلے ہوئے اب تین سال ہو گئے ہیں۔''

''ثمینہ کے ساتھ تمہاری شادی پانچ سال رہی تھی۔'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ''اس دوران میں کوئی اولاد وغیرہ نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے، پانچ سال ایک اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے؟''

خالد حسین نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔ ''نہیں جی..... کوئی اولاد نہیں ہوئی۔''

میں نے مزید پانچ منٹ تک اس سے مختلف سوالات کیے پھر تسلی تشفی کے علاوہ چند اہم ہدایات دے کر حوالات سے نکل آیا۔

واپسی کے سفر میں ڈیوٹی آفیسر سے ملاقات لازمی تھی بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ میری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''حوالاتی سے ملاقات ہو گئی جناب؟''

''بھرپور ملاقات ہوئی ہے۔'' میں نے ذومعنی جواب دیا۔

''کل آپ کا بندہ آ رہا ہے نا؟'' اس نے پُراشتیاق نظر سے مجھے دیکھا۔

''ضرور..... اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر اس معاملے کو ادھر ہی ہینڈل نہ کیا گیا تو خالد حسین بے چارہ بہت بری طرح مارا جائے گا۔''

''برکت صاحب! آپ بہت عقل مند اور موقع شناس انسان ہیں۔'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے بتایا تھا کہ کل صبح آپ کی فلائٹ ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہ جاننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں کل صبح پیرس کے لیے روانہ ہونے والا ہوں۔''

''وزٹ یا بزنس ٹرپ؟'' اس نے خاصی شوخی سے پوچھا۔

''وزٹ کا شوق تو عرصہ ہوا پورا ہو چکا۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اب تو تمام تر نقل و حرکت بزنس ہی بزنس ہے۔''

وہ میرے جواب سے، بے حد متاثر دکھائی دیا، جلدی سے پوچھا۔

''برکت صاحب! آپ کس چیز کا بزنس کرتے ہیں؟''

''میں لیدر جیکٹس کا ایکسپورٹر ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میرا مال پورے یورپ میں جاتا ہے۔ ہر تین ماہ کے بعد میں خود بھی ایک چکر لگاتا ہوں۔ کاروبار کی نگرانی بہت ضروری ہے۔ پارٹیوں سے بھی ملنا ہوتا ہے۔ فون پر تو رابطہ رہتا ہی ہے لیکن بالمشافہ ملاقات کی اپنی ہی ایک اہمیت ہے۔''

''اللہ آپ کو خیریت سے لے جائے۔'' وہ خلوصِ نیت کے ساتھ بولا۔

''مجھے امید ہے، خالد حسین کے ساتھ یہاں پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی؟'' میں نے استفساریہ نظر سے ڈیوٹی آفیسر کی طرف دیکھا۔

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں برکت صاحب۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''یہی سمجھیں کہ حوالاتی ادھر اپنے ہی گھر میں ہے۔''

میں نے ڈیوٹی آفیسر کی بات سنی.... اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد بے فکر ہو کر تھانے سے نکل آیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے کرداروں اور پس منظر سے اچھی طرح آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے ملزم خالد حسین، اس کے مخلص دوست سلطان اور ان دونوں کے سیٹھ صدیق صاحب کی زبانی معلوم ہوئی تھیں اور باقی میری ذاتی ریسرچ ہے۔ ان تمام تر حالات و واقعات میں سے میں نے چند اہم نکات فی الحال آپ سے چھپا لیے ہیں۔ ان کو عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر پیش کیا جائے گا۔

ایک بات کا تذکرہ کرنا میں بھول گیا کہ اگلے روز سلطان نے میرے آفس آ کر فیس وغیرہ ادا کر دی تھی۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ میں نے خالد حسین کا کیس لینے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک آدھ روز میں صدیق صاحب بھی مجھ سے ملنے آئیں گے۔ میں نے سلطان کے ذمے بھی متعدد کام لگا دیے۔ مجھے اس کیس کے چند کرداروں کے حوالے سے معلومات درکار تھیں۔ سلطان، خالد کا بے لوث دوست تھا۔ وہ یہ کام بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ کرسکتا تھا۔

☆☆☆

خالد حسین ایک بدقسمت اور حالات کا مارا ہوا انسان تھا۔ اوائل عمری ہی میں سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ گھر اپنا تھا لہٰذا ماں بیٹے کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ماں نے محنت مزدوری کی اور خالد کو نہ صرف پال پوس کر بڑا کیا بلکہ میٹرک تک تعلیم بھی دلا دی۔

خالد پڑھنے میں زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا لہٰذا اس نے تعلیم کو خیر باد کہا اور کام دھندے سے لگ گیا۔ مختلف نوعیت کے مزدورانہ کام کرنے کے بعد مکینکی کی طرف نکل آیا اور سخت محنت کے نتیجے میں وہ ایک اچھا موٹر مکینک بن گیا۔ اس دوران میں اس نے مختلف گیراج بھی تبدیل کیے اور بالآخر صدیق صاحب کے گیراج میں وہ سیٹ ہوگیا۔

بیٹے نے باقاعدہ کمانا شروع کیا تو ماں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ مختار بیگم کی ایک رشتے کی بہن عائشہ حیدر آباد میں رہتی تھی۔ عائشہ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام ثمینہ تھا۔ ایک رات مختار بیگم نے خالد حسین سے کہا۔

''بیٹا! میں نے تمہارے لیے لڑکی دیکھ لی ہے۔''

''لڑکی دیکھ لی ہے۔'' خالد نے الجھن زدہ نظر سے ماں کی طرف دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں امی؟''

''اب تم اتنے بھی ناسمجھ نہیں ہو بیٹا۔'' مختار بیگم نے کہا۔ ''میں تمہاری شادی کرنے والی ہوں، اپنی بہن کی بیٹی سے..... وہ جو حیدر آباد میں رہتی ہے۔''

''اچھا..... آپ عائشہ خالہ کی بیٹی کی بات کر رہی ہیں۔'' خالد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''ثمینہ کی.....؟''

''ہاں۔ میرے ذہن میں وہی لڑکی ہے۔'' مختار بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ثمینہ تمہارے لیے بہت اچھی رہے گی۔ خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے اور سلیقہ شعار بھی.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر غم ناک انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! میرا تو اب چل چلاؤ ہے۔ پتا نہیں، کب اوپر سے بلاوا آجائے۔ میں جیتی آنکھوں تمہارا سہرا دیکھنا چاہتی ہوں اور اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے پوتے پوتیوں کو بھی کھلانا چاہتی ہوں۔''

خالد حسین نے ثمینہ کو اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ وہ بھرے بدن کی مالک ایک جاذب نظر اور پرکشش لڑکی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خالد کی بھی دلی خواہش تھی کہ ثمینہ بیوی بن کر اس کی زندگی میں آجائے لیکن اس نے کبھی اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس ہچکچاہٹ یا احتراز کا ایک نفسیاتی پہلو تھا اور وہ یہ کہ خالد احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ وہ خود کو ثمینہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے رو دھو کر میٹرک کیا تھا جبکہ ثمینہ گریجویٹ تھی۔ پھر وہ ثمینہ کے مقابلے میں کم رو اور ایویں سا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پیشہ بھی اسے ٹارچر کرتا تھا۔ وہ ایک معمولی موٹر مکینک تھا جبکہ ثمینہ کو بڑی آسانی سے ڈاکٹر، انجینئر اور بزنس مین کا رشتہ مل سکتا تھا۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''امی! ثمینہ تو بڑی نخرے والی ہے۔ کیا وہ مجھ موٹر مکینک سے شادی کے لیے راضی ہوجائے گی؟''

''یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔'' مختار بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''جب میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال رہی ہوں تو باقی کی باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے صرف تمہاری رضامندی چاہیے۔ باقی سب کچھ میں خود ہی ٹھیک کرلوں گی۔''

خالد کے دل میں گویا لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اس نے مختار بیگم سے کہا۔ ''امی! میں نے آپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ آج میں جس بھی مقام پر کھڑا ہوں، یہ سب آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ آج تک میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے۔ اس معاملے میں بھی آپ جو فیصلہ کریں گی، مجھے منظور ہے۔''

''شاباش میرے بچے!'' مختار بیگم نے فرطِ جذبات سے کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

اس کے بعد مختار بیگم نے بڑی سرگرمی دکھائی اور ایک سال کے اندر ہی ثمینہ اور خالد کی شادی ہوگئی۔ خالد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، اس کی مسرتوں کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے، دنیا جہان کے خزانے مل گئے ہوں۔

شادی کے بعد بہ مشکل ایک ماہ خیریت سے گزرا ہوگا پھر بدمزگی کا آغاز ہوگیا۔ بیوی اور شوہر میں ان بن رہنے لگی۔ ثمینہ نے گھر کے کاموں کو بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔ ادھر خالد اپنے کام پر روانہ ہوتا، ادھر وہ لمبی تان کر سو جاتی۔ مختار بیگم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ثمینہ کو ہوا کیا ہے۔ دو تین ماہ تک وہ برداشت کرتی رہی پھر ایک روز تنہائی دیکھ کر اس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نے خالد سے بات کی۔

''بیٹا! ثمینہ کو کیا ہوا ہے.....؟''

''کیا ہوا ہے امی؟'' الٹا خالد نے سوال کر دیا۔

''تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا بیٹا.....!''

''آپ کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا نا امی!'' خالد نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو کچھ بھی غلط نظر نہیں آ رہا.....''

مختار بیگم نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''یہ تمہارے ساتھ تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ پھر کریدنے والے انداز میں دریافت کیا۔ ''کیا ثمینہ نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟''

''میرے ساتھ کیا، وہ پورے گھر کے ساتھ انتہائی بدتمیزی اور بے ہودگی کر رہی ہے۔ گھر کا ماحول تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔'' مختار بیگم ایک دم پھٹ پڑی۔ ''میں کوئی بڑی گڑبڑ محسوس کر رہی ہوں..... سچ سچ بتاؤ خالد، معاملہ کیا ہے؟''

''اگر مجھے کچھ پتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''آپ ثمینہ سے پوچھ کر دیکھیں۔''

''ٹھیک ہے..... اب میں اسی سے پوچھوں گی۔'' مختار بیگم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس سے پہلے کہ پانی سر سے اوپر ہو جائے، مجھے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہوگا۔''

مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔ مختار بیگم نے حالات کو درست کرنے کی جتنی بھی کوشش کی اس سے معاملہ اور الجھتا چلا گیا۔ دن پر دن، مہینے پر مہینے اور سال پر سال گزرتے چلے گئے لیکن مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ فساد اور لڑائی جھگڑا روز بہ روز بڑھتا چلا گیا۔ اس دوران میں ثمینہ نے ناراض ہو کر میکے جانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ چھ ماہ حیدرآباد میں رہتی۔ پھر یہ ماں بیٹا منت خوشامد کر کے اسے کراچی لاتے۔ وہ چند روز یہاں گزارتی اور پھر بیک ٹو دی پویلین.....!

مختار بیگم کی آنکھوں کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی لہٰذا وہ اپنی بہو پر کامل نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔ ثمینہ کا کراچی میں جو مختصر قیام ہوتا اس دوران میں اس کا زیادہ تر وقت آس پڑوس میں گزرتا تھا۔ یہ واہیات صورت حال لگ بھگ ساڑھے چار سال تک جاری رہی اور اس کا ڈراپ سین بڑا ڈرامائی ہوا۔ اب کی بار جو ثمینہ روٹھ کر میکے گئی تو وہاں سے طلاق کا مطالبہ آ گیا۔

''خالد بیٹا! دیکھا تم نے۔ وہ کیا بکواس کر رہی ہے؟''

''امی! وہ طلاق چاہتی ہے۔'' خالد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر طلاق میں حیل وحجت کی گئی تو وہ خلع کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔''

''اگر تم میرے بیٹے ہو تو اسے طلاق نہیں دینا۔'' مختار بیگم جوش میں آ گئیں۔ ''اسے جانے دو عدالت میں۔ میں دیکھتی ہوں، وہ کون سا تیر مارتی ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے امی اس گندخانے میں پڑنے کا۔'' خالد نے بیزاری سے کہا۔ ''وہ اگر میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تو اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔''

''وہ پچھلے پانچ سال سے ہمیں ذلیل وخوار کر رہی ہے۔'' مختار بیگم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میں اسے اپنی بھانجی سمجھ کر بیاہ کر لائی تھی۔ اس نے تو ساری حدیں پھلانگ دی ہیں۔ میں اسے اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گی۔''

''امی! میں ثمینہ کے مسئلے کو سمجھ گیا ہوں۔'' خالد نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن افسوس کہ میں بہت دیر کے بعد سمجھ پایا ہوں۔ کاش مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو جاتا تو میری زندگی کے پانچ سال برباد نہ ہوتے۔''

''یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو خالد.....!'' مختار بیگم نے بے حد الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا مسئلہ آیا ہے، تمہاری سمجھ میں؟''

''امی! وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے.....'' خالد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں اسے آزاد کر دوں گا تو وہ بھی خوش رہے گی اور میری زندگی میں بھی سکون آ جائے گا۔''

''یہ..... یہ بات خود ثمینہ نے تمہیں بتائی ہے؟'' مختار بیگم نے بے یقینی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''نہیں!'' خالد نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اس کے رویے سے محسوس کیا ہے۔''

''اونہہ.....'' مختار بیگم نے ناگواری سے کہا۔ ''اور تم کیا چاہتے ہو؟''

''میرا خیال ہے، مجھے ثمینہ کا مطالبہ پورا کر دینا چاہیے۔''

''جب تم اسے چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہو تو پھر کہنے کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔'' مختار بیگم نے افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

پانچ سال کی عذاب ناک ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ طلاق والے واقعے کو اب تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس سانحے کے ایک سال بعد ہی مختار بیگم کا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

انتقال ہوگیا۔ پچھلے دو سال سے خالد حسین تنہائی کی زندگی بسر کررہا تھا۔ سارا دن وہ گیراج میں گزارتا اور رات کو گھر میں آکر سو جاتا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں بیٹھے بٹھائے وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا اور مصیبت بھی ایسی کہ.....

اب اس تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کریں۔ منظور حسین سا بہا سال سے اس گھر میں تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ محمود آباد گیٹ پر تکے کباب کا ٹھیلا لگاتا تھا اور اس کا دھندا خوب چلتا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بڑھاپے میں شادی کر بیٹھے گا۔ اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی جبکہ شکیلہ پینتیس کے آس پاس تھی خیر، انہوں نے شادی کی تھی اس لیے کوئی ان پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ شکیلہ کو منظور حسین کے گھر میں آئے کم و بیش چھ ماہ ہوئے تھے کہ خالد حسین کو ایک رات پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔ اس پر بڑا گھناؤنا الزام عائد کیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ خالد نے شکیلہ پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا ہوگا اسی لیے میں نے اس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم یعنی اپنے موکل کی درخواستِ ضمانت بھی دائر کردی تھی۔ تمام متعلقہ افراد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھے، صرف جج کا انتظار تھا۔ میر محفل کے بغیر وہ محفل بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں جج اپنے چیمبر سے برآمد ہوا۔ اس کی تعظیم میں تمام حاضرین عدالت اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جج جب کرسی انصاف پر براجمان ہوچکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔

''یور آنر! میرا موکل ایک سیدھا سادہ اور امن پسند انسان ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم خالد حسین کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے۔''

''ملزم نے ایک گھناؤنے اور مکروہ جرم کا ارتکاب کیا ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''اگر اس کی درخواستِ ضمانت منظور کرلی گئی تو یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

''میرا موکل بے گناہ ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں اس کی شرافت اور نیک نامی کے لیے متعدد معتبر اور معزز افراد کو عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔ فی الحال..... میرے موکل کی درخواست ضمانت.....!''

''اگر وکیل صفائی اپنے موکل کی بریت کے لیے متعدد افراد کو عدالت میں پیش کرسکتے ہیں تو استغاثہ کے پاس بھی ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کو آگے بڑھایا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوسکیں۔''

وکیلِ استغاثہ نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کردیا تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے ناگوار تو گزری مگر میں پی گیا اور متحمل انداز میں کہا۔

''جناب عالی! معزز عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہی کام کررہی ہے۔ اسی انصاف کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ملزم خالد حسین کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے۔ میرا موکل اس معاشرے کا ایک امن پسند اور شریف النفس شہری ہے۔ اس کیس نے اس کی نیک نامی کو پہلے ہی بہت دھچکا پہنچایا ہے۔''

''نیک نامی..... شریف النفسی..... اونہہ!'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا پھر انگلی سے اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑے خالد حسین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں اضافہ کیا۔ ''نیک نام اور شریف النفس لوگ اس قسم کے کارنامے انجام نہیں دیا کرتے۔''

وکیلِ استغاثہ نے پچھلے دس پندرہ منٹ میں مجھ پر بہت سا قرض چڑھا دیا تھا۔ اس قرض کی فوری ادائیگی بہت ضروری ہوگئی تھی لہٰذا اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''میرے فاضل دوست! آپ ملزم کے کون سے کارنامے کی بات کررہے ہیں؟''

میرے لاعلمی کے انداز پر وکیل استغاثہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ نیم جارحانہ لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ کو اپنے موکل کے کرتوتوں کی خبر نہیں ہے؟''

''ایک منٹ کے لیے فرض کریں کہ خبر نہیں ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ بتا دیں گے تو میرے علم میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''کمال ہے۔'' وہ عورتوں کی طرح ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''آپ جس کیس میں اپنے موکل کی پیروی کرنے آئے ہیں اس کی حقیقت ہی سے آپ واقف نہیں..... میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔''

''میرے محترم دوست!'' میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ بتا دیں گے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ میں نے آپ سے کوئی بہت بڑی فرمائش تو نہیں کر دی۔''

جج اس دوران میں بڑی دلچسپی اور خاموشی سے ہماری نوک جھوک کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ میری بات کے جواب میں وکیلِ استغاثہ نے جوش بھرے انداز میں کہا۔ اس کا روئے سخن میری جانب تھا۔

''آپ کا موکل حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار ہو کر اس عدالت تک پہنچا ہے جو کہ ایک انتہائی سنگین اور قابلِ مذمت جرم ہے۔ کیا مجھے یہ بھی بتانا ہوگا کہ حدود آرڈی نینس کیا ہوتا ہے۔''

آخری جملہ اس نے بڑی تلخی سے ادا کیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حدود آرڈی نینس کی اہمیت کیا ہے لیکن میرے فاضل دوست! میرے موکل نے تو ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو ایک معصوم اور بے ضرر انسان ہے۔''

''یہ کتنا معصوم اور بے ضرر ہے، یہ تو آپ جا کر اس عورت سے پوچھیں جو اس کے ظلم کا شکار ہوئی ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے لفظ چبا چبا کر کہا۔ ''اس وحشی نے شکیلہ کے ساتھ جس درندگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی تفصیل تو مظلومہ ہی بتائے گی۔ اسی کی شکایت پر ملزم کو حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا ہے۔''

''مظلومہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اس نے کن وجوہات کی بنا پر ایسی رپورٹ درج کرائی، اس معاملے کو بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چونک کر بولا۔ ''میری رائے..... کس سلسلے میں؟''

''اس سلسلے میں کہ آپ ملزم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ میرے موکل نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے.....؟''

''جی ہاں..... مجھے پورا یقین ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''ویری گڈ!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پھر تو کام ہی بن گیا جناب۔''

''کام بن گیا۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''کون سا کام بن گیا؟''

میں نے وکیلِ استغاثہ کی الجھن اور حیرت کی ذرا پروا نہ کی اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔

''جنابِ عالی! حدود آرڈی نینس کے حوالے سے احکامِ خداوندی ہے کہ..... ''بدکار (زانیہ) عورت اور بدکار (زانی) مرد میں سے ہر ایک کو سو درے (کوڑے) مارو اور تمہیں اللہ کے معاملے میں ان پر رحم نہیں آنا چاہیے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ (جماعت) کو حاضر رہنا چاہیے۔ بدکار (زانی) مرد سوائے بدکار (زانیہ) عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار (زانیہ) عورت سے بھی کوئی نکاح نہیں کرے گا سوائے بدکار (زانی) مرد یا مشرک کے۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسّی درے (کوڑے) مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں.....''

''وکیل صاحب!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس آرڈی نینس کی تفصیل عدالت کو کیوں سنا رہے ہیں؟''

جج کا سوال بجا تھا۔ میں نے متحمل انداز میں کہا۔

''جنابِ عالی! میں دراصل اس آرڈی نینس میں ''شہادت کی صحت'' پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ استغاثہ کے مطابق میرے موکل نے شکیلہ نامی عورت پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ استغاثہ کو یہ جرم ثابت کرنے کے لیے عدالت میں تین ایسے عینی شاہد پیش کرنا پڑیں گے جن کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں، متقی اور پرہیزگار ہوں، باکردار اور صادق العقول ہوں۔''

''آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' جج نے چشمے کے اوپر سے مجھے گھورا۔ ''اس آرڈی نینس میں تو چار گواہ لانے کی تاکید کی گئی ہے اور آپ تین کی بات کر رہے ہیں.....؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

''تین کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ چوتھا عینی شاہد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کہاں ہے.....؟'' وکیلِ استغاثہ نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''وکیلِ استغاثہ کی جانب جناب عالی!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو میرے فاضل دوست نے اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ انہیں پورا یقین ہے کہ میرے موکل نے شکیلہ نامی عورت پر مجرمانہ حملے کا ارتکاب کیا ہے۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''وکیلِ صفائی بچھے دار باتوں کا سہارا لے کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے جج کی طرف دیکھا۔

''وکیل صاحب!'' جج نے وکیلِ استغاثہ سے کہا۔ ''آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد جج سے مخاطب ہوا۔ ''استغاثہ کو تین چار یا دس بار گواہ پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ فریادی عورت کی شکایت ہی کافی ہے۔ شکیلہ کا دعویٰ ہے کہ اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا ہے اور یہ حملہ ملزم خالد حسین نے کیا ہے۔''

''میرا موکل بے گناہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور مظلومہ شکیلہ کا دعویٰ جھوٹ اور مکاری کے سوا کچھ نہیں۔''

''جناب عالی! بات شکیلہ کے دعوے تک ہی محدود نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس نے زبانی کلامی دعویٰ کیا ہوتا تو پولیس کو اس پر اتنا سنجیدہ ایکشن لینے کی ضرورت نہیں تھی کہ معاملہ عدالت میں آجاتا۔ اس مجرمانہ واردات کے تمام ٹھوس ثبوت پولیس کی تحویل میں ہیں اور مناسب مواقع پر انہیں پیش بھی کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں.....'' اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''علاوہ ازیں، سب سے اہم ثبوت مظلومہ شکیلہ کا طبی معائنہ ہے۔ اس معائنے سے ملزم کے مجرمانہ حملے کی تصدیق ہوگئی ہے لہٰذا اگر ملزم کی ضمانت منظور کی گئی تو یہ فریقِ ثانی کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔''

''جنابِ عالی! وکیل سرکار خوامخواہ میرے معصوم موکل کی ضمانت رکوانے کی کوشش کررہے ہیں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''مناسب وقت آنے پر میں مظلومہ شکیلہ کی عیاری کو بھری عدالت میں بے نقاب کردوں گا۔ سردست میں وہ نکات سامنے نہیں لانا چاہتا۔ ابھی اس کیس کی شروعات ہے۔ میرے قبل از وقت انکشافات کیس کی آیندہ کارروائی پر منفی اثرات ڈال سکتے ہیں۔''

میرے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے ایک بار پھر زور شور کے ساتھ ضمانت کی مخالفت میں دلائل دینا شروع کیے جن میں مظلومہ کے طبی معائنے، بستر کی حالت اور مختلف کپڑوں کے لیبارٹری ٹیسٹ کا بھی حوالہ تھا۔ یہ تمام ایسے پوائنٹس تھے کہ جج نے خالد حسین کی درخواست ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوانے کے احکامات صادر کردیے۔

☆☆☆

آیندہ روز میرے موکل کا سیٹھ صدیق مجھ سے ملنے آفس آیا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ میرے آفس کا ایک چکر لگا چکا تھا۔ وہ پچھلی پیشی پر عدالت میں بھی موجود تھا۔ تاہم عدالتی کارروائی کے اختتام پر میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔

''بیگ صاحب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''میں ایک مکینیکل ذہن رکھنے والا انسان ہوں۔ مجھے قانونی داؤ پیچ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے اس کیس کے بارے میں؟''

''میں پوری طرح مطمئن ہوں صدیق صاحب!'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''مگر خالد تو جیل چلا گیا.....'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''کیس کی نوعیت ایسی ہے صدیق صاحب کہ اس کی ضمانت ممکن نہیں تھی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ فکر نہ کریں۔ وہ جیسے جیل گیا ہے، ویسے ہی رہا بھی ہوجائے گا۔ یہ سب عدالتی معاملات کا حصہ ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ تین چار پیشیوں میں، میں اپنے موکل کو باعزت بری کرالوں گا۔''

''ہوں.....!'' صدیق نے بوجھل سانس خارج کی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

صدیق کی عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کا ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور بال زلفوں کی شکل میں اس کے شانوں کو چھو رہے تھے۔ اس نے سر کے بالوں کو باقاعدہ تیل وغیرہ لگا کر سلیقے سے سنوار رکھا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا لیکن اس کی باتوں سے تجربہ اور دانش مندی جھلکتی تھی۔

میں نے صدیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ میری کارکردگی سے خوش نہ ہوں تو میری طرف سے آپ پر کوئی دباؤ نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو.....''

''ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ شاید کچھ اور سوچنے لگے۔''

''پھر آپ اتنے دل گرفتہ کیوں نظر آرہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی آنکھوں میں مجھے مایوسی کے سایے دکھائی دیتے ہیں۔''

''میں سمجھ رہا تھا کہ خالد کی ضمانت ہوجائے گی۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''شاید اسی بات کا کوئی تاثر ہو میری آنکھوں میں!''

''صدیق صاحب!'' میں نے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''حدود آرڈی نینس کو آپ کوئی معمولی کیس نہ سمجھیں۔ پولیس نے مظلومہ کا طبی معائنہ بھی کرایا ہے۔ علاوہ ازیں استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس واردات کے ٹھوس ثبوت بھی ہیں اس کے پاس۔ ان حالات کی روشنی میں عدالت کسی قیمت پر ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کر ہی نہیں سکتی تھی لیکن.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں نے مظلومہ شکیلہ کی ذات کے حوالے سے جو ریسرچ کی ہے، وہ بڑی کارآمد اور مفید ہے۔ میں اپنی کارکردگی سے کلی طور پر مطمئن ہوں۔ آپ کی دل شکستگی کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ نے اس کیس کی سنگینی اور خطرناکی کو پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''بیگ صاحب! یہ کیس چاہے کتنا بھی ہولناک کیوں نہ ہو مگر مجھے ایک بات کا پورا یقین ہے کہ خالد حسین بے گناہ و بے قصور ہے لہٰذا ہر قیمت پر اسے اس وبال سے باہر آنا چاہیے۔''

''انشاءاللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ''آپ خالد حسین کو بے گناہ سمجھتے ہیں، یہ آپ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ وہ کافی عرصے سے آپ کے پاس کام کر رہا ہے۔ اس کے اعمال و افعال اور کردار آپ کے سامنے ہے۔ وہ آپ کے لیے ایک کھلی کتاب کے مانند ہے لیکن معذرت کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔''

''جی حکم.....!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''صدیق صاحب! بدقسمتی سے عدالت انسانی احساسات اور جذبات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ عدالت کو ہمارے سوچنے اور سمجھنے سے، کوئی سروکار نہیں..... عدالت میں ملزم کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت اور جامع دلائل دینا پڑتے ہیں اور انشاءاللہ! میں اپنے موکل کو باعزت بری کرالوں گا۔ بس، آپ مجھ سے تعاون کرتے جائیں۔''

''میں خالد حسین کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جانتے تو اسے اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے لیکن مجھے اس بات پر مان ہے کہ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ اس کی کوئی بات، زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے صدیق صاحب!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''لیکن ان باتوں کا خالد حسین کی بے گناہی سے کیا تعلق ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''ہے تعلق..... بہت گہرا تعلق ہے جناب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے علم میں یہ بات تو ہوگی کہ خالد حسین نے شادی بھی کی تھی؟''

''جی ہاں۔ خالد نے مجھے اس بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، شادی کے معاملے میں وہ خاصا بدقسمت واقع ہوا ہے۔''

''بدقسمت!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''جی..... میرا یہی خیال ہے۔''

''آپ کن معنوں میں اسے بدقسمت کہہ رہے ہیں، ذرا وضاحت کریں گے؟''

''میں ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ اس کی والدہ نے ایک بہت اچھی جگہ اس کی شادی کرائی تھی۔'' میں نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق خالد کی بیوی ایک پڑھی لکھی اور خوب صورت عورت

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھی لیکن اس بے چارے کو شادی کی شادمانی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ہی گھر میں فساد کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ میاں بیوی اور ساس بہو میں ایک تناؤ کی کیفیت رہنے لگی اور پانچ سال کی تلخ وترش رفاقت کے بعد یہ رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔ ثمینہ نے طلاق کا مطالبہ کیا اور خالد حسین نے فوراً اس کا مطالبہ پورا کردیا۔''

میں تھوڑی دیر کو تھما، اپنی سانس کو ہموار کیا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''طلاق والے اس واقعے کے بعد خالد کی زندگی سونی سونی ہوگئی تھی پھر ایک سال بعد اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد سے یہ بے چارہ دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔''

''اس بے چارے کے بارے میں تو آپ کی معلومات خاصی صحت مند ہیں۔''

صدیق نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''لیکن کیا آپ کو ثمینہ کی بھی کچھ خبر ہے؟''

''ثمینہ کی خبر!'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ ''اس کو کیا ہوا ہے؟''

''خالد سے طلاق کے کچھ ہی عرصے بعد ثمینہ نے اکرام اللہ نامی ایک شخص سے شادی کرلی تھی۔'' صدیق نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''اب اس واقعے کو لگ بھگ ڈھائی سال گزر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت اکرام اللہ سے ثمینہ کے دو بچے ہیں۔''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''اس کا مطلب ہے، خالد حسین کا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیسا اندازہ بیگ صاحب؟'' وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''خالد حسین کو شک تھا کہ ثمینہ کسی اور مرد کو پسند کرتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے اس نے طلاق لی تھی۔ یقیناً وہ مرد اکرام اللہ ہی تھا۔''

صدیق چند لمحات تک متذبذب انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ جب مجھے اس کے انداز سے بے چینی ہونے لگی تو اس نے میرے اطمینان کے لیے یہ شعر پڑھ دیا۔

''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا''

میں نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''صدیق صاحب! میں غالب کے اس شعر کے معنی اور مفہوم سے تو اچھی طرح واقف ہوں لیکن آپ نے جس تناظر میں اسے استعمال کیا ہے، اس کی وضاحت ضروری ہے۔''

''جی ہاں۔ بہت ضرور ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ پھر مجھے سنسنی خیز تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

میں ہکا بکا اسے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کی معلومات کے لیے اتنا بتاتا چلوں کہ حدود آرڈی نینس کے ذیل میں جو کیسز عدالتوں میں زیر سماعت ہوتے ہیں ان کی مکمل سماعت کو الفاظ کی شکل دے کر تحریری انداز میں شائع کرنا ناممکن ہے۔ ایسے معاملات میں وکیلِ صفائی جتنے سفاکانہ انداز میں سوالات کرتے ہیں، مظلومہ کو وہ سب سننا اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ''شرع اور قانون میں تو کوئی شرم نہیں ہوتی'' لیکن ضابطۂ اخلاق اس عدالتی کارروائی کو من وعن حوالۂ تحریر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوعیت کی وارداتوں میں اکثر کیس تو رپورٹ ہی نہیں ہوتے۔ لوگ سوچتے ہیں، عزت پر داغ تو لگ ہی گیا ہے۔ اب عدالت میں جاکر مزید رسوائی اور جگ ہنسائی کا کیا فائدہ ہے۔ اگرچہ متاثرین کے اس رویے سے، ظالم اور جابر کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں اور اسے کھل کھیلنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

اس کیس کی ابتدائی چند پیشیاں تکنیکی کارروائیوں کی نذر ہوگئیں۔ لگ بھگ تین ماہ گزر جانے کے بعد پہلی باقاعدہ کارروائی ہوئی۔ اس روز تمام متعلقہ افراد عدالت میں حاضر تھے۔ جج کرسیِ انصاف پر آکر بیٹھا تو کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ میں نے پچھلی دو ملاقاتوں میں اپنے موکل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے اپنے بیان میں کن امور کا خیال رکھنا ہے۔ خالد حسین نے بہت نپا تلا بیان دیا تھا۔

ملزم کا بیان مکمل ہوا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا اور اس نے بڑے تیکھے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے ملزم سے سوال کیا۔

''تم شکیلہ کو کب سے جانتے ہو؟''

''جب سے وہ میرے پڑوس میں آئی ہے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''میں نے عرصہ پوچھا ہے؟''

''لگ بھگ چھ ماہ.....!''

ملزم نے شکیلہ سے اپنی شناسائی کی وہ مدت بتائی تھی جب وہ منظور حسین سے شادی کرنے سے، بعد اس کے گھر کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سامنے والے گھر میں آباد ہوئی تھی اور یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ شکیلہ اور منظور حسین کی شادی کے کم وبیش چھ ماہ کے بعد یہ افسوسناک واقعہ رونما ہوا تھا جس کی پاداش میں میرا موکل ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے اس وقت کٹہرے میں کھڑا تھا۔

''تم اپنی پڑوسن پر بری نظر رکھتے تھے؟'' وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''لاحول ولاقوۃ!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ میں ایسے کاموں کو گناہ سمجھتا ہوں۔''

''مگر مظلومہ شکیلہ نے بیان دیا ہے کہ تم اکثر اسے ہوس بھری نگاہ سے دیکھتے تھے۔'' وکیلِ استغاثہ نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''تمہارے دیکھنے کے انداز میں بازاری پن ہوتا تھا۔ کئی بار تم نے اسے غلیظ اشارے بھی کیے تھے..... ہوں؟''

''وہ جھوٹ بولتی ہے، بکواس کرتی ہے۔'' ملزم نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یہ سراسر مجھ پر بہتان ہے جبکہ..... جبکہ.....''

''یہ کیا ''جبکہ، جبکہ'' لگا رکھی ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے ڈانٹ بھرے انداز میں کہا۔

''جبکہ..... وہ خود آوارہ اور بدمعاش عورت ہے۔'' ملزم تقریباً پھٹ پڑا۔ ''منظور حسین کی غیر موجودگی میں وہ مختلف مردوں کو گھر میں بلاتی ہے اور ان کے ساتھ گلچھرے اڑاتی ہے..... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو یہ الٹی میری دشمن ہوگئی اور..... اس نے مجھ پر گھناؤنا الزام لگا کر پولیس کچہری کے چکر میں ڈال دیا ہے۔''

''تم نے اسے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

''یہی کہ وہ نازیبا حرکتوں سے باز آجائے۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''اس سے ماحول خراب ہوتا ہے لیکن میری ناصحانہ باتوں کا اس پر خاک اثر نہ ہوا.....''

''سچی بات تو یہ ہے کہ.....'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم شکیلہ کے لیے اپنے دل میں بڑے خطرناک جذبات اور ذہن میں گندی سوچ رکھتے تھے اور اسے ہوس بھری حریصانہ نظر سے دیکھتے تھے لیکن جب اس نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی تو تم اس کے شوہر کے کان بھرنے میں مصروف ہوگئے۔ تمہاری لگائی بجھائی سے منظور حسین اور شکیلہ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی لیکن جب منظور حسین کو اپنی بیوی کی بے گناہی کا یقین آگیا تو اس نے الٹا تمہیں ڈانٹا تھا..... ڈانٹا تھا یا نہیں ڈانٹا تھا؟''

''ڈانٹا نہیں تھا بلکہ ہمارے درمیان اچھی خاصی منہ ماری ہوگئی تھی۔'' میرے موکل نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں نے بھی کہا، خصماں نوں کھاؤ..... جب تمہیں خود ہی اپنی عزت کا خیال نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے۔ اس دن سے میں منظور حسین اور شکیلہ کے معاملے سے لاتعلق ہوگیا تھا۔''

''تم لاتعلق نہیں ہوئے تھے۔'' وکیلِ استغاثہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''بلکہ تم نے ان کے معاملے سے لاتعلق ہونے کی اداکاری شروع کردی تھی اور کسی خاص موقع کے انتظار میں تھے جب تم اپنے دل کے ارمان پورے کرسکو اور پھر وقوعہ کی رات تمہیں یہ موقع میسر آگیا۔ تم کسی بہانے مظلومہ شکیلہ کے گھر میں گھسے اور اس پر مجرمانہ حملہ کردیا۔ اس طرح تم اپنے ناآسودہ جذبات کے جنگل بیاباں کو گل وگلزار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔'' وکیلِ استغاثہ کے طوفانی حملوں کے جواب میں ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کردی ہے۔''

''مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' وکیلِ استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کندھے اچکا دیے۔

اپنی باری پر میں سوال وجواب کے لیے اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری ڈیوٹی ٹائمنگز کیا ہیں؟''

''میں صبح گیارہ بجے گیراج پہنچتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور شام سات بجے میری چھٹی ہوجاتی ہے۔ پھر میں سیدھا گھر آجاتا ہوں۔''

''گھر کتنے بجے تک پہنچ جاتے ہو؟''

''گیراج میرے گھر سے زیادہ دور نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''زیادہ سے زیادہ میں ساڑھے سات تک گھر پہنچ جاتا ہوں۔''

''اس کے بعد تم کیا کرتے ہو؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بس جی، گھر ہی میں رہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گیراج سے واپسی پر میں نہادھو کر صاف لباس پہنتا ہوں، پھر رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک ٹی وی دیکھتا ہوں اور پھر سو جاتا ہوں۔''

''کیا اس دوران میں شکیلہ اپنے گھر پر اکیلی ہوتی تھی؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''جی میرا یہی اندازہ ہے اور عموماً اسی دوران میں، میں نے منظور حسین کے گھر میں الٹے سیدھے آدمی کو آتے دیکھا ہے۔'' ملزم نے تلخی بھرے الفاظ میں جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے، وہ لوگ نہ تو منظور حسین کے رشتے دار ہیں اور نہ ہی شکیلہ کے۔ یہ کوئی اور ہی خطرناک چکر ہے۔''

''وقوعہ کی رات بھی تم نے کسی مشکوک شخص کو منظور حسین کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں..... میں نے کالے بھینسے کو دیکھا تھا۔''

''کالے بھینسے کو؟'' میں نے چونک کر اپنے مؤکل کی طرف دیکھا۔

''جی وکیل صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''مجھے نہیں معلوم، اس بندے کا نام کیا ہے مگر میں نے اکثر اسے منظور حسین کی غیر موجودگی میں شکیلہ کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ وہ ایک لحیم شحیم اور سیاہ رنگ کا آدمی ہے۔''

''وقوعہ کی رات تم کتنے بجے سوئے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''سو کہاں سکا تھا جناب۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! میں کوئی گیارہ بجے حسب معمول سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے شکیلہ کو کھڑے پایا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولی۔

''خالد بھائی! اگر زحمت نہ ہو تو مجھے آپ سے ایک کام ہے.....''

''ان لمحات میں وہ مجھے بہت معصوم اور سلجھی ہوئی نظر آئی۔ پھر زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے ''خالد بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اچانک میرے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ وا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''جی فرمائیں..... آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

''آپ کو پانچ منٹ کے لیے میرے ساتھ گھر پر جانا ہوگا۔'' اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''فریج کو تھوڑا سا کھسکانا ہے۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔''

پتا نہیں، اس وقت میرے جی میں کیا آئی کہ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ آپ اسے میرا جذبۂ ہمدردی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ مکار عورت، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے گھیر کر پھندے کی طرف لے جا رہی ہے۔ بہرحال، میں اپنی سادگی میں اس کے پیچھے ہو لیا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے شکیلہ کے حسب منشا فریج کو کھسکا دیا۔ جب وہ مطمئن ہو گئی تو میں واپسی کے لیے مڑا، اسی وقت شکیلہ نے کہا۔

''رک جائیں خالد بھائی! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے صاف منع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جا کر سوؤں گا۔ اگر چائے پی لی تو نیند اڑ جائے گی۔''

''چلیں، چائے نہیں تو دودھ کا ایک گلاس ہی پی لیں۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں خالد بھائی! میں آپ کو کچھ کھلائے پلائے بغیر تو جانے نہیں دوں گی۔''

سچ

ایک نئے کلرک نے یہ کہہ کر اپنے افسر سے چھٹی مانگی کہ اسے گھریلو کام کاج میں اپنی بیمار بیوی کی مدد کرنا ہے۔

افسر بولا۔ ''مگر تمہاری بیوی نے ابھی ابھی مجھے ٹیلی فون پر بتایا ہے کہ اس کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے اور گھریلو کام کاج میں اسے تمہاری مدد کی بالکل ضرورت نہیں۔''

کلرک نے تعریفی نگاہوں سے افسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس دفتر میں دو اشخاص ایسے ہیں جو سچ بولنے کے شوقین معلوم نہیں ہوتے اور ان میں سے ایک میں ہوں۔ میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔''

☆☆☆

ماں۔ ''بیٹا دیکھنا تو چھت پر کون رو رہا ہے؟''

تھوڑی دیر بعد بیٹا واپس آ کر بولا۔

امی۔ ''رو تو کوئی نہیں رہا۔ ابو چھت پر بیٹھے گا نا گا رہے ہیں۔''

انتخاب۔ نعیم احمد، گجرانوالہ

http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''پتا نہیں، یہ شکیلہ کے بار بار ''خالد بھائی'' کہنے کا اثر تھا یا میری مت ماری گئی تھی کہ میں اس کے بیڈروم میں رک گیا۔ وہ مجھے بیڈ پر بٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''میرے ذہن کو عجیب سی بے چینی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن اس نے پہلی مرتبہ ایسے اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا لہٰذا میں اپنی شرافت سے مجبور ہو کر دل پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ اگلے ہی لمحے لائٹ چلی گئی۔

''یہ کیا ہوا؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''لائٹ چلی گئی ہے۔'' کچن کی طرف سے شکیلہ کی آواز آئی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، میں ایمرجنسی لائٹ آن کرتی ہوں۔''

''میں اپنی جگہ اندھیرے میں بیٹھا رہا لیکن دل میں سکون نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے یہ دل بے سکونی ایک بہت بڑی قیامت کو لے آئی۔ شکیلہ نے ایمرجنسی لائٹ تو آن نہیں کی بلکہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر وہ عقب سے مجھ سے چمٹ گئی اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

''بچاؤ..... بچاؤ..... یہ شیطان میری عزت برباد کر رہا ہے۔ کوئی اس درندے کو گولی مار دے.....''

''ان لمحات میں میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ شکیلہ نے اتنی مضبوطی سے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ بہ قول شخصے، اس نے مجھے جن چمٹا ڈال رکھا تھا۔ اس کا بدن مسلسل میرے بدن سے ٹکرا رہا تھا اور میں نے بڑے واضح انداز میں محسوس کیا کہ شکیلہ کا لباس جسم کے نازک حصوں پر سے پھٹا ہوا تھا۔ اس احساس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس قیامت خیز صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی عملی تگ و دو کرتا، اچانک لائٹ آ گئی۔

''بیڈروم روشن ہوا تو میں شکیلہ کا نیم برہنہ بدن دیکھ کر کانپ اٹھا۔ وہ ہاتھوں سے مجھے مار رہی تھی اور رو رو کر اپنی بربادی کا ماتم کرتی چلی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے کالے بھینسے کو کمرے میں نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ کالے بھینسے نے آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں شور شرابے کی آوازیں سن کر محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے۔ پولیس کو بلا لیا گیا اور ..... منظور حسین بھی کام سمیٹ کر گھر آ گیا۔ پولیس نے مختصر سی تفتیش کی پھر مجھے شکیلہ کو پامال کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔''

''بہت ہی افسوس ناک کہانی ہے۔'' میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ پھر روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے اضافہ کر دیا۔

''ویٹس آل یور آنر.....!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈجارنڈ.....!''

☆☆☆

آیندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں ایک جوان شکیلہ کا بوڑھا شوہر منظور حسین اور دو دیگر پڑوسی اور محلے دار تھے۔ ان تینوں کے بیان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کو ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ دونوں پڑوسی اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے وقوعہ کی رات شکیلہ کے گھر میں شور و غل کی آواز سنی تو اس طرف متوجہ ہوئے جبھی انہیں پتا چلا کہ ملزم خالد حسین نے بہانے سے شکیلہ کے گھر میں گھس کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ بیانات کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔

منظور حسین ایک انتہائی سادہ اور ہونق انسان تھا۔ میرے مختلف سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ شکیلہ سے اس کی پہلی ملاقات تکے کباب کے ٹھیلے پر ہی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس کباب لینے آتی تھی اور جب تک تکے کباب تیار ہوتے، وہ وہیں کھڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان میں ''انڈراسٹینڈنگ'' پیدا ہو گئی۔ شکیلہ نے منظور حسین کو بتایا کہ وہ بیوہ ہے اور اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے۔ بھائی کو اس کی شادی کی بڑی فکر ہے۔ شکیلہ نے جس شخص کو اپنا بھائی بتایا تھا یہ وہی بندہ تھا جس کے لیے خالد حسین نے ''کالے بھینسے'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ بعد ازاں اس بندے کا نام شاہد علی معلوم ہوا۔ شاہد علی اعظم بستی میں رہتا تھا اور دودھ دہی کی ایک دکان چلاتا تھا۔

الغرض شکیلہ اور منظور حسین کی ''انڈراسٹینڈنگ'' اتنی بڑھی کہ ان کے درمیان حائل فاصلے مٹ گئے۔ وہ ایک نقطے پر آ کر مل گئے۔ مطلب یہ کہ ان کی شادی ہو گئی۔ بڑھاپے میں کسی مرد کو جوان اور خوب صورت عورت مل جائے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ منظور حسین کا بھی یہی حال تھا۔ وہ دن رات شکیلہ کے نخرے اور ناز اٹھانے میں لگا رہتا تھا اور اس کے خلاف ایک چھوٹی سی بات سننے کو بھی تیار نہیں ہوتا تھا چنانچہ جب خالد حسین نے اسے شکیلہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

کے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تو اس نے الٹا خالد ہی کو جھڑک دیا تھا۔

اگر معاملہ صرف کالے بھینسے تک محدود ہوتا تو خالد حسین کا تجسس بھی ساتویں آسمان کی سیر کو نہ جاتا۔ اس نے کالے بھینسے کے علاوہ بھی کئی مشکوک افراد کو منظور حسین کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کا پراسرار ''وزٹ'' کرتے دیکھا تھا۔ بہرحال اسی کالے بھینسے کے ہاتھوں پٹ کر خالد حسین وقوعہ کی رات پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔

اس پیشی پر میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔ اگلے ہی لمحے انکوائری آفیسر وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہوگیا۔

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر یا تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کیس کا آئی او عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید اس کا نام ریاست خان یا لیاقت خان تھا۔ بہرحال آسانی کے لیے اس کا نام ''خان صاحب'' فرض کرلیتے ہیں۔

''خان صاحب!'' میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

''پولیس کے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع وقوعہ کی رات یعنی پندرہ دسمبر کی رات سوا گیارہ بجے دی گئی تھی۔'' آئی او نے جواب دیا۔ ''اطلاع دینے والا مظلومہ کا بھائی شاہد علی تھا جو اتفاق سے جائے وقوعہ پر پہنچا تھا اور وہاں بے حیائی اور آبروریزی کے مناظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے ملزم کو زدوکوب بھی کیا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھتا تو شاید ملزم اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ بہرحال، اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھانے فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

آئی او کالے بھینسے کی حمایت سے فارغ ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''ساڑھے گیارہ بجے۔''

''یعنی اطلاع ملنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد.....'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو بالکل یقین نہیں آرہا۔''

''آپ کو شاید اس لیے یقین نہیں آرہا کہ آپ تھانے اور جائے وقوعہ کے درمیانی فاصلے سے آگاہ نہیں ہیں۔'' آئی او نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

''ایسی بات نہیں ہے خان صاحب!'' میں نے طنز کا جواب طنز سے دیتے ہوئے کہا۔ ''میں کراچی کے تمام تھانوں کی لوکیشنز اور محل وقوع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ دراصل پولیس سے ایسی مستعدی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔''

''اس میں پولیس بے چاری کا کیا قصور ہے؟'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

''کوئی نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچتے ہی ملزم کو گرفتار کرلیا تھا؟''

''تو کیا اسے گرفتار نہیں کرنا تھا؟'' وہ کٹہرے میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں نے یہ کہا ہے کہ جائے وقوعہ پر آپ نے کوئی تفتیش بھی کی تھی یا جاتے ہی بیچارے ملزم کو ہتھکڑی پہنا دی تھی؟''

''میں اس کیس کا تفتیشی افسر ہوں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں نے تفتیش نہ کی ہو۔ میں نے بیڈ شیٹ کا معائنہ کیا تھا جس پر مخصوص نوعیت کے دھبے پائے گئے تھے۔ بعدازاں اس شیٹ کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوا دیا گیا تھا۔ میں نے موقع پر موجود چند افراد کے بیانات بھی قلم بند کیے تھے جو مظلومہ کے گھر سے اٹھنے والے شور کی وجہ سے ادھر متوجہ ہوگئے تھے۔ علاوہ ازیں مظلومہ کے شوہر منظور حسین اور بھائی شاہد علی کے اہم بیانات بھی قلم بند کیے گئے تھے۔ مظلومہ کے گھر خصوصاً بیڈروم کے مختلف مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔''

''بہت خوب.....!'' آئی او اپنی کارکردگی بیان کرچکا تو میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ان تمام امور سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل نے مظلومہ شکیلہ کے ساتھ مبینہ زیادتی کی ہے؟''

''آپ بھی کمال کے وکیل ہیں جناب۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مظلومہ کا تار تار لباس اس بات کا گواہ ہے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ مظلومہ کا حلفیہ بیان بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کوئی عورت خوامخواہ اتنا بڑا الزام خود سے منسوب کیوں کرے گی۔ مظلومہ کے بھائی شاہد علی نے بھی موقع کا نظارہ کیا ہے پھر سب سے بڑی بات مظلومہ کا طبی معائنہ ہے.....'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرنے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''طبی معائنے نے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تصدیق کی ہے۔''
میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''مظلومہ کے طبی معائنے سے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی ہی تصدیق ہوئی ہے یا یہ بھی پتا چلا ہے کہ اسے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنانے والا میرا موکل خالد حسین تھا؟''
''جناب! طبی معائنے کی رپورٹ سے یہ کیسے پتا چل سکتا ہے؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''اس امر کا پتا چلانے کے لیے آپ کو مبینہ حملہ آور کا طبی معائنہ بھی کرانا چاہیے تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ نے ملزم خالد حسین کا طبی معائنہ کرانے کی زحمت گوارا کی تھی؟''
''ہم نے اس کی..... ضرورت محسوس نہیں..... کی۔'' وہ نروس ہوگیا۔
''کیوں..... کیوں ضرورت محسوس نہیں کی؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ یہ نہایت ہی اہم تھا۔''
''مظلومہ نے آنسوؤں کی لڑیاں پروتے ہوئے ہمیں بتایا تھا کہ ملزم نے اسے وحشیانہ عمل سے گزارا ہے.....'' وہ لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''حالات و واقعات بھی انہی امور کی نشاندہی کررہے تھے۔ موقع کے گواہان کے بیانات بھی اسی جانب اشارہ کررہے تھے۔ اتنے شواہد کی موجودگی میں ملزم کے طبی معائنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی.....''
آئی او کی احمقانہ وضاحت پر میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! استغاثہ کی پھرتیوں میں بہت سے سقم پائے جاتے ہیں جیسا کہ ابھی ملزم کے طبی معائنے کا ذکر ہوا۔ اگر مظلومہ کا طبی معائنہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مجرمانہ فعل سے گزری ہے یا اسے مذکورہ فعل سے گزارا گیا ہے تو اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ مجرمانہ حملے کا ارتکاب کرنے والا میرا موکل ہی تھا۔ اس امر کی تصدیق کے لیے ملزم کا طبی معائنہ کرانا بھی ضروری تھا بہرحال، میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ آیندہ پیشی پر اس کیس کی مبینہ مظلومہ شکیلہ کو عدالت میں پیش کرنے کے لیے استغاثہ کو پابند کیا جائے۔ میں اگلی پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا چاہتا ہوں۔''
وکیلِ استغاثہ نے چونک کر میری جانب دیکھا جیسے میں ابھی کسی تھیلے میں سے کوئی خطرناک کوبرا نکال کر عدالت کے فرش پر چھوڑ دوں گا۔ میں نے وکیلِ استغاثہ کی حیرت اور الجھن کو جوتے کی نوک پر مارا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا.....!''
اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں اس کیس کی مبینہ متاثرہ شکیلہ کٹہری تھی۔ اس کی عمر پینتیس سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس نوعیت کے مجرمانہ حملوں کا نشانہ بننے والی لڑکیاں اور عورتیں عموماً اپنا بیان تحریری شکل میں دائر کراتی ہیں۔ وہ جس قیامت سے گزر چکی ہوتی ہیں اس کے اثرات انہیں لب کشائی کی اجازت نہیں دیتے لیکن شکیلہ نے جس بہادری اور بے باکی سے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تھا اس سے اس کے کردار کی قلعی کھلتی تھی۔ بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں.....!
شکیلہ نے موسم کی مناسبت سے لان کا ایک خوش نما اور دیدہ زیب سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بھرے بھرے بدن کی مالک ایک حسین عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص نوعیت کی چمک پائی جاتی تھی۔ اس نے اپنے بال جدید انداز میں ترشوا رکھے تھے جنہوں نے اس کی کشش میں چار چاند لگا دیے تھے۔ انہی بالوں کی نمائش اور رونمائی کے لیے اس نے دوپٹے کو سر کے بجائے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس تمام آرائش و زیبائش اور فیشن کا اسے حق تھا لیکن وہ جس معاملے کی سماعت کے لیے عدالت میں پیش ہوئی تھی اس میں احتیاط کی ضرورت تھی۔
وکیل استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد اسے فارغ کیا تو میں سوال و جواب کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے بڑے منفرد انداز میں اپنے کام کا آغاز کیا۔
''شکیلہ صاحبہ! مجھے، پتا چلا ہے کہ ملزم آپ کو بری نگاہ سے دیکھا کرتا تھا؟''
''جی..... آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے۔'' وہ نفرت بھری نظر سے میرے موکل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا تو جی چاہتا تھا اس کی آنکھیں نکال لوں۔''
''پھر آپ نے ملزم کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں اپنے شوہر کو نہیں بتایا تھا؟'' میں نے مظلومہ سے ہمدردی کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔
''میں نے اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔''
''آپ کی کوشش کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''
''اس نے میری شرافت کو کمزوری جانا اور کمینگی پر اتر آیا۔'' وہ ملزم کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''اس نے جب دیکھا کہ میں اس کے ہاتھ نہیں آرہی تو اس نے منظور حسین کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کردیا۔ اس نے میری ذات کے حوالے سے ایسی کیچڑ اچھالی کہ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔''
مظلوم شکیلہ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر کتنی شرم آرہی تھی اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا تاہم میں نے ''شرع اور شرم'' کے معاملات کو بیچ کیے بغیر اس سے کہا۔
''شکیلہ صاحبہ! جب آپ کو پتا چل گیا تھا کہ ملزم اچھے کردار اور اچھی نیت کا مالک نہیں تو پھر آپ کو اسے زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیے تھا۔''
''میں اسے کب منہ لگاتی تھی.....!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔
''وقوعہ کی رات.....'' میں نے جرح کے سلسلے کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ملزم کو بلا کر اپنے گھر لے گئی تھیں۔ آپ کو اپنا فریج کھسکا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا تھا۔''
''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کہانی اسی مکار شخص کی گھڑی ہوئی ہے۔ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔''
''ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ فریج کھسکانے کے لیے ملزم کو اپنے گھر بلا کر نہیں لائی تھیں؟''
''جی نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلادی۔
''پھر یہ شخص آپ کے گھر کے اندر کیسے پہنچا؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''پولیس نے اسے آپ کے گھر میں سے گرفتار کیا تھا نا؟''
''جی ہاں، پولیس نے اسے میرے گھر کے اندر سے گرفتار کیا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''اور جہاں تک اس کے گھر میں داخلے کا سوال ہے تو میں یہی کہوں گی کہ میں اس کی چال میں آگئی تھی۔''
''چال میں آگئی تھی.....کیا مطلب؟''
''یہ لگ بھگ ساڑھے دس بجے میرے دروازے پر آیا تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''دستک کے جواب میں، میں نے دروازہ کھولا تو یہ سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک دیگچہ اٹھا رکھا تھا۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔
''کیا بات ہے؟''
''باجی! میرا فریج صبح سے خراب ہے۔'' یہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس دیگچے میں گوشت ہے۔ اگر آپ اسے اپنے فریزر میں رکھ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''
''منظور حسین نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا ڈیپ فریزر بھی رکھا ہوا ہے جو اس کے کاروبار کی ضرورت ہے۔ تکے، کباب اور بوٹی کا جو تیار مال بچ جاتا ہے اسے محفوظ

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرنے کے لیے ڈیپ فریزر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پتا نہیں، کیا ہوا کہ ان لمحات میں مجھے ملزم پر ترس آ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے مجھے ''باجی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور وہ بھی بڑی تمیز اور شرافت کے ساتھ۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ہوس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

''میں نے اس کے ہاتھ سے گوشت والا دیگچہ لے لیا۔ میری غلطی کہ میں گھر کا بیرونی دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ جب میں دیگچے کو فریزر میں رکھنے کے بعد پلٹی تو مجھے عجیب سا محسوس ہوا تاہم میں اندازہ نہیں لگا سکی کہ وہ عجیب کیا ہے۔ میں نے جلدی سے جا کر دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی پھر مجھے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ مل سکی۔ کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی کسی وحشی مرد نے مجھے اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ میں اپنی بے بسی پر چیخنے چلانے لگی مگر اس پر جیسے شیطان سوار تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے روند ڈالا۔ میں پامال ہو کر رہ گئی۔ اس جنونی نے میری عزت کو تار تار کر دیا۔'' ہلکی سی سسکاری پر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کو تاریکی میں یہ کیسے پتا چلا کہ آپ کے ساتھ مبینہ زیادتی کا ارتکاب کرنے والا اس کیس کا ملزم اور میرا موکل خالد حسین ہی تھا؟''

''میں نے اس کی چالاکی بہت بعد میں سمجھی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب میں اس سے گوشت والا دیگچہ لے کر اندر آئی تو یہ بھی دبے قدموں میرے گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا پھر مجھے محسوس کرائے بغیر یہ بیڈروم میں پہنچ گیا اور جب میں بیڈروم میں داخل ہوئی تو اس نے لائٹ آف کر دی۔ میں یہی سمجھی کہ لائٹ چلی گئی ہے۔ وہ تو جب شاہد بھائی آئے اور انہوں نے میری چیخیں سن کر لائٹ آن کی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا.....''

''تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آ رہی؟'' میں نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

میرے اچانک بدلتے ہوئے انداز اور طرز تکلم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اور تمہارا شاہد بھائی بہت بڑا ڈراما ہو۔ تم لوگ منظور حسین جیسے اکیلے بوڑھوں کو شکار کرتے ہو۔ ایسے بوڑھے جن کے پاس اپنی جائداد وغیرہ ہو۔ یہی تمہارا دھندا ہے۔ ملزم کباب میں ہڈی بن رہا تھا اس لیے تم نے اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کر دیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری.....!''

شکیلہ ہکا بکا مجھے دیکھے۔ چلے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہے۔ اس موقع پر وکیلِ استغاثہ اس کی مدد کو لپکا۔ وہ تیز آواز میں چلایا۔

''آبجیکشن یور آنر..... میرے فاضل دوست الٹی سیدھی باتوں سے مظلومہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''الٹی سیدھی باتیں!'' میں نے جلالی انداز میں کہا۔ ''میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں بڑی احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ میں نے مظلومہ شکیلہ پر اچھی خاصی ریسرچ کی ہے۔''

وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی آپ نے مظلومہ پر جو کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟''

''بہت مضبوط ثبوت، ہیں میرے پاس۔'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''وقت آنے پر وہ ثبوت عدالت میں پیش کر دیے جائیں گے۔''

''وقت تو آیا ہوا ہے، میرے فاضل دوست!'' وکیلِ استغاثہ نے مجھ پر چوٹ کی۔ ''عدالت زبانی کلامی دعووں پر تکیہ نہیں کرتی۔ اگر آپ کے پاس مظلومہ کے خلاف اس نوعیت کے کوئی ثبوت ہیں تو سامنے لائیں۔''

جج بڑی توجہ اور دلچسپی سے ہماری نوک جھوک ملاحظہ کر رہا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے پوائنٹ آف ویو کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جب ٹھوس ثبوت کے حوالے سے وکیلِ استغاثہ نے مجھ پر دباؤ ڈالا تو جج نے مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ مظلومہ پر اپنی جرح جاری رکھیں.....!''

''شکیلہ بیگم!'' میں دوبارہ مظلومہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور خاصے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ سے صرف چھ ماہ پہلے تم نے منظور حسین نامی ایک بوڑھے شخص سے شادی کی تھی؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم ایک خوب صورت اور جوان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

عورت ہو۔ تمہیں ایک سے ایک رشتہ مل سکتا تھا پھر منظور حسین ہی کیوں؟''

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیلِ استغاثہ نے مظلومہ کی حمایت میں کہا۔ ''وکیلِ صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اس سوال کی کوئی تک نہیں بنتی کہ جوان مظلومہ نے بوڑھے منظور حسین سے کیوں شادی کی۔ کوئی کسی بھی عمر میں کسی سے بھی شادی کر سکتا ہے۔''

''تک بنتی ہے اس سوال کی اور میں اسے بھری عدالت میں ثابت بھی کر دوں گا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

''جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ جب تک میں مظلومہ شکیلہ پر اپنی جرح مکمل نہیں کر لیتا، مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ حقیقت کی اصل شکل تک پہنچنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ میں مظلومہ کا اصل روپ عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔''

''آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔'' جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

میں مظلومہ کی جانب بڑھ گیا۔ ''شکیلہ بیگم! میرے سوال کا جواب دو۔''

''یہ شادی شاہد بھائی کی مرضی سے ہوئی تھی۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہراساں لہجے میں بولی۔ ''شاہد بھائی اکثر منظور حسین کی دکان سے تکے کباب لایا کرتے تھے۔ ان میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ بھائی میری شادی کے لیے بھی فکرمند رہتے تھے۔ جب انہوں نے میرے سامنے منظور حسین کا رشتہ رکھا تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح یہ شادی ہوگئی۔''

''جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہد علی نے منظور حسین کو شکار کرنے کے لیے تمہیں آگے بڑھایا تھا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''شاہد نے منظور حسین کے بارے میں اپنی ریسرچ مکمل کرنے کے بعد ہی تمہیں آگے بڑھایا تھا۔ تم ہی منظور حسین کے پاس تکے کباب لینے جایا کرتی تھیں اور منظور سے میٹھی میٹھی باتوں کے علاوہ اپنی بیوگی کا رونا بھی روتی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ منظور حسین کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہمدردی گہری ''ذہنی ہم آہنگی'' میں بدل گئی اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد تم دونوں کی شادی ہوگئی۔''

''آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''سچائی وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔''

''اوکے.....!'' میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا پھر تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ ایک بیوہ عورت ہو..... میرا مطلب ہے، منظور حسین سے شادی سے پہلے بیوہ تھیں؟''

''جی..... یہ سچ ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''کیا میں آپ کے مرحوم شوہر کا نام جان سکتا ہوں؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اشد ضرورت ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم زبان نہیں کھولو گی تو مجبوراً مجھے زبان کھولنا پڑے گی۔''

''پھر آپ ہی زبان کھولے رکھیں۔'' وہ خالص عورتوں والے چڑچڑے پن سے بولی۔ ''اب تک بھی تو آپ ہی بولے جا رہے ہیں۔ ہم عورتیں تو خوامخواہ بولنے کے معاملے میں بدنام ہیں۔''

''حنیف خان.....!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے سابق شوہر کا نام حنیف خان تھا۔ حنیف خان کا تعلق پاک کالونی سے تھا۔ وہ وہاں جنرل اسٹور چلاتا تھا اور ذاتی مکان کا مالک بھی تھا۔ تمہاری حنیف خان سے شادی کوئی ایک سال تک رہی پھر وہ ایک رات اچانک خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ حنیف خان کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا لہٰذا اس کا گھر اور جنرل اسٹور بیچ کر تم اور شاہد علی اعظم بستی شفٹ ہوگئے۔ کسی نئے بوڑھے تن تنہا شکار کی تلاش میں۔ اس بار تم لوگوں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور جلد ہی منظور حسین تمہاری نظر میں آ گیا۔ اگر یہ کیس عدالت تک نہ پہنچتا تو ایک روز بے چارہ منظور حسین بھی بے بسی کی موت مارا جاتا اور تم لوگ اس کا مکان فروخت کر کے کسی نئی مہم پر روانہ

معصومیت

☆ایک اسکول میں نرسری کی ٹیچر بیسویں بچے کو جوتا پہنا رہی تھی۔ جھکے جھکے اس کی کمر بھی درد کر رہی تھی۔ بیسواں بچہ ذرا شرمیلا اور خاموش طبع تھا۔ جب استانی جوتا پہنا چکی تو وہ بڑے سکون سے بولا۔ ''مس جی یہ جوتے میرے نہیں ہیں۔'' استانی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جوتا اتارا ہی تھا کہ بچہ بولا۔ ''یہ جوتے میرے بھائی کے ہیں، آج امی نے کہا تھا کہ تم پہن لو۔''

مرسلہ: راحیلہ رحمان، گجرات

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہوجاتے لیکن.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ یہ کیس جس بھیانک انجام کو پہنچنے والا ہے اس کے بعد منظور حسین کو تم سے شدید نفرت ہوجائے گی۔ ایک طرف تو یہ عدالت دروغ گوئی کی پاداش میں تمہیں کچھ عرصے کے لیے جیل بھیج دے گی، دوسری جانب منظور حسین تمہیں پہلی فرصت میں طلاق دے دے گا اور اس کیس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ میرا موکل تم پر ہتکِ عزت کا مقدمہ بھی کرے گا.....؟''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی تاہم اس کی بات میں زیادہ دم نہیں تھا۔ ''عدالت دونوں طرف کے حقائق کو جانچنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرتی ہے اور..... مجھے یقین ہے، فیصلہ اس کیس کا میرے ہی حق میں ہوگا۔''

وہ چند لمحات کے لیے تھی، ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''حنیف خان میرا شوہر تھا۔ اس کی موت کا سبب دل کا دورہ تھا۔ حنیف خان کی موت کے بعد میں بیوہ ہوئی تھی۔ اب میرا پاک کالونی میں رہنے کو دل نہیں چاہتا تھا چنانچہ ہم نے وہ گھر اور اسٹور فروخت کردیا پھر اعظم بستی میں منتقل ہوگئے۔ آپ خوامخواہ اپنی وکالت کے زور پر مجھے ایک فراڈ اور بدکردار عورت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''میں نہیں شکیلہ میڈم..... حالات و واقعات تمہیں اور تمہارے شاہد بھائی کو ایک خطرناک سنڈیکیٹ ثابت کررہے ہیں۔'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا پھر روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔

''جناب عالی! معزز عدالت کو یہ جان کر یقیناً سخت حیرت ہوگی کہ مظلومہ، متاثرہ شکیلہ بیگم کبھی بیوہ ہوئی ہی نہیں.....''

میرے اس انکشاف پر عدالت میں ایک شور سا اٹھا۔ حاضرین عدالت آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ سب کی نظریں مجھی پر لگی ہوئی تھیں جیسے میں نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے عدالت کا کمرا مچھلی بازار کا منظر پیش کرنے لگا۔

''آرڈر..... آرڈر.....!'' جج کی تحکمانہ آواز ابھری۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔''

عدالت کے کمرے میں جج کے ''آرڈر'' کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھاگئی۔ اسی دبیز خاموشی میں جج کی دبنگ آواز ابھری۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''بیگ صاحب! عدالت آپ سے اس بات کی وضاحت چاہتی ہے کہ آپ نے کس بنا پر یہ کہا ہے کہ مظلومہ شکیلہ کبھی بیوہ ہوئی ہی نہیں؟''

''جنابِ عالی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جس عورت کا پہلا شوہر بہ قیدِ حیات ہو، اس نے کبھی بیوی کو طلاق دی ہو اور نہ ہی کبھی بیوی نے خلع لی ہو، ایسی عورت نہ تو مطلقہ اور نہ ہی بیوہ کہلا سکتی ہے۔ میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ مظلومہ شکیلہ کا پہلا شوہر زندہ ہے اور اس کے بہت قریب ہے.....''

''کون ہے وہ شخص؟'' جج نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''شاہد علی.....!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا۔

''مگر وہ تو مظلومہ کا بھائی ہے؟'' جج کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''نہیں جنابِ عالی!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان لوگوں کی ملی بھگت ہے۔ ان پر تو بہت سی مثالیں صادق آتی ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر عدالت میں مخصوص بھنبھناہٹ کا شور اٹھا۔ جج کو اپنا مخصوص ہتھوڑا استعمال کرکے خاموشی کو واپس بلانا پڑا۔ جب حالات معمول پر آگئے تو جج نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ کس بنا پر اتنا بڑا دعویٰ کررہے ہیں کہ شکیلہ، شاہد علی کی بیوی ہے؟''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ میرے دعوے پر نہ جائیں۔ میں معزز عدالت کو لیاقت آباد المعروف لالو کھیت کا وہ ایڈریس نوٹ کراتا ہوں جہاں چند سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے پرانے پڑوسی جی جان سے میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔''

''یہ کیا بکواس ہے.....؟'' وکیلِ استغاثہ کی غصیلی آواز ابھری۔

میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''یہ بکواس نہیں میرے فاضل دوست بلکہ نوشتۂ دیوار ہے۔''

جج کی آواز ابھری۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ''بیگ صاحب! آپ لیاقت آباد والا ایڈریس متعلقہ عدالتی عملے کو نوٹ کرادیں۔ عدالت اس امر کی تصدیق کرے گی۔'' پھر وہ براہِ راست وٹنس باکس میں کھڑی شکیلہ سے مستفسر ہوا۔

''تم اس بارے میں کیا کہتی ہو.....؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

وہ کٹہرے کی ریلنگ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ شاہد علی میرے بھائی ہیں۔'' پھر وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یا اللہ! اس جھوٹے وکیل پر تو اپنا قہر نازل فرما۔ یہ مجھ شریف عورت پر کتنے گندے گندے الزام لگا رہا ہے۔ پروردگار! اپنے خلاف ایسی باتیں سننے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آگئی.....'' پھر اس نے باقاعدہ سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

مجھے شکیلہ کی ہمت اور ڈھٹائی پر سخت حیرت ہوئی جو سب کچھ اوپن ہو جانے کے باوجود بھی اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک کٹہرے کے فرش پر ڈھیر ہو چکی ہوتی۔

میں نے جج کے حکم کے مطابق لیاقت آباد والے اس گھر کا ایڈریس نوٹ کرا دیا جہاں شکیلہ اور شاہد علی کی شادی ہوئی تھی۔ یہ میری انتھک محنت اور ریسرچ کا ثمر تھا۔ اس سلسلے میں خالد حسین کے دوست سلطان نے بھی میری بھرپور مدد کی تھی۔ وہ خالد کا سچا اور مخلص دوست تھا۔

''جناب عالی!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں جج کو مخاطب کیا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ مظلومہ شکیلہ اور شاہد علی بنیادی طور پر مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ اتفاق سے ان کے ملاپ نے ان کی منفی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور انہوں نے ایک خطرناک منصوبے کے تحت خود کو بھائی بہن ظاہر کر کے تن تنہا مالدار بوڑھوں کا شکار شروع کر دیا۔ حنیف خان ان کا پہلا نشانہ تھا اور منظور حسین دوسرا لیکن قبل اس کے کہ منظور حسین کسی رات زندگی کی بازی ہار جاتا، ملزم کا معاملہ بیچ میں آ گیا۔ اگر ملزم ان کی کھوج میں لگ جاتا تو ان کا بنا بنایا کھیل خراب ہو سکتا تھا لہٰذا انہوں نے پہلی فرصت میں، ملزم کو اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ ملزم کو مجرمانہ حملے کے کیس میں ملوث کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس روز شاہد، شکیلہ کے گھر کے اندر موجود تھا۔ ان دونوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے آپس میں مخصوص ''ملاپ'' کیا پھر منصوبے کے مطابق شکیلہ فریج کھسکانے کے بہانے ملزم کو اپنے گھر بلا لائی اور اسے بہانے سے بیڈ روم میں روک لیا۔ شاہد علی نے منصوبے کو فائنل ٹچ دینے کے لیے لائٹ آف کر دی، اس کے بعد منظور حسین کے گھر کے اندر جو ڈرامہ رچایا گیا اسے سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ.....'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آئندہ پیشی پر مظلومہ کے اصلی شوہر شاہد علی عرف ''شاہد بھائی'' کو بھی عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ دیکھا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اگلی پیشی پر اپنے موکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کو عدالت میں حاضر کروں گا جس کا بیان ملزم کی بے گناہی پر مہر تصدیق ثبت کر دے گا اور جہاں تک اس عورت کے کردار کا تعلق ہے.....'' میں نے ڈنس باکس میں کھڑی شکیلہ کی جانب اشارہ کیا، پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اس عورت نے اب تک اتنے زیادہ شرعی اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کر لیا ہے کہ اس کی باقی عمر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔ اللہ کی پناہ..... اس کا شوہر زندہ ہے اور یہ حنیف خان کو لوٹنے کے لیے اس سے شادی کر لیتی ہے پھر کچھ عرصے بعد اس کی بیوہ بن جاتی ہے۔ اپنے اصلی شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم ہیں اور اس کے ساتھ ہی بیوگی کا سوانگ بھی جاری ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ منظور حسین سے نکاح کر لیتی ہے..... نکاح پر نکاح اور نکاح اور نکاح..... یہ تو سیدھا سادہ حدود آرڈی نینس کا کیس ہے۔ اس حرام کاری پر تو مظلومہ شکیلہ کو سرِعام سنگسار کی سزا سنائی جانا چاہیے.....''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر شکیلہ تیورا کر دھڑام سے کٹہرے کے فرش پر گری اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ متعلقہ عدالتی عملے کے افراد اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے۔ میرے پے در پے حملوں نے شکیلہ کے اعصاب کا کچومر نکال دیا تھا۔ برداشت اور ڈھٹائی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ اس کی شکست کا کھلا ثبوت تھا۔

میں نے روئے سخن جج کی طرف پھیرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''یور آنر! اس مقدمے کا فیصلہ ہو چکا۔ معزز عدالت سے میری پرزور استدعا ہے کہ میرے نوٹ کرائے گئے ایڈریس کی تحقیق اور تفتیش کے ساتھ ہی مظلومہ شکیلہ اور اس کے بے غیرت شوہر شاہد علی کو بھی شاملِ تفتیش کر کے حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ یہ میاں بیوی اب دروغ گوئی سے کام نہیں لے سکیں گے۔''

جج نے میرے حسبِ منشا انکوائری آفیسر کو ہدایات جاری کیں اور دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ.....!''

☆☆☆

آیندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل خالد حسین کو اس کیس سے باعزت بری کر دیا۔ شکیلہ اور اس کے شوہر شاہد علی کو جب پولیس نے کڑی تفتیش سے گزارا تو انہوں نے فرش پر ناک سے لکیریں نکالتے ہوئے اپنے ایک ایک اگلے پچھلے جرم کا اقرار کر لیا۔ ان کے اقبالی بیانات کے بعد میرے موکل کی بے گناہی میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

خالد حسین کی رہائی کے تین روز بعد وہ مٹھائی کے ساتھ باجماعت مجھ سے ملنے آیا۔ باجماعت سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ سلطان اور صدیق بھی تھے۔ خالد حسین ایک نئی زندگی مل جانے پر بے حد خوش تھا۔ اس نے مجھے مٹھائی پیش کرتے ہوئے تشکرانہ انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔''

فرطِ جذبات سے اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سب سے زیادہ احسان مند صدیق صاحب کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ تمہاری پشت پناہی نہ کرتے تو وہ ڈائن شکیلہ تو تمہیں کھا ہی گئی تھی۔''

''صدیق صاحب تو میرے لیے باپ کی حیثیت رکھتے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ عقیدت بھرے انداز میں اپنے سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے یہ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے..... شکیلہ کسی ڈائن سے کم نہیں۔''

''خوش ہو جاؤ کہ اب وہ مکار تمہارے آس پاس کبھی دکھائی نہیں دے گی۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ان دونوں کے اقبالِ جرم کے بعد اب کافی عرصے کے لیے ان کا ٹھکانا جیل ہے۔ منظور حسین میری معلومات کے مطابق شکیلہ کو طلاق دے چکا ہے لہٰذا وہ اس کی زندگی سے بھی نکل چکی ہے۔''

''یہ سب آپ کی کوشش اور مہربانی سے ممکن ہوا ہے وکیل صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!''

''کون سی بات؟'' میں نے دریافت کیا۔

''آپ نے بھری عدالت میں شکیلہ کے سابق کالے کرتوتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جج صاحب سے کہا تھا کہ آیندہ پیشی پر آپ ایک ایسی شخصیت کو عدالت میں حاضر کریں گے جس کا بیان میری بے گناہی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے گا۔ وہ شخصیت کون ہے؟''

''ارے یار..... وہ تو میں نے ایسے ہی شکیلہ کو دباؤ میں لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بعض اوقات اس قسم کے داؤ پیچ کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔''

وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ تینوں تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

رات کو صدیق صاحب کا فون آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بیگ صاحب! میں جانتا ہوں، وہ کون سی شخصیت ہے جسے آپ خالد حسین کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے عدالت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

''بتائیں، کون ہے؟''

''خالد حسین کی سابق اور اکرام اللہ کی موجودہ بیوی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''میرا اشارہ ثمینہ کی طرف ہے۔''

''آپ کا اشارہ درست سمت میں ہے۔'' میں نے کہا۔

صدیق صاحب نے پوچھا۔ ''کیا آپ واقعی ثمینہ کو عدالت تک لے آتے؟''

''جب..... ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والی صورت حال ہو تو کسی معصوم کی زندگی بچانے کے لیے ایسا زہریلا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس دیمک صفت شکیلہ کو اس بات کا علم ہوتا کہ خالد حسین کے اندر مجرمانہ حملہ کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو وہ ایسی حماقت ہرگز نہ کرتی۔ جس اللہ کے بندے کے گھر میں، اس کی آنکھوں کے سامنے پورے پانچ سال تک ہفت پکوان والا دسترخوان سجا رہے اور وہ وہاں سے ایک نوالہ بھی نہ اٹھا سکے، وہ مجرمانہ حملے کا مرتکب کیوں کر ہو سکتا ہے؟''

''ایگریڈ.....!'' صدیق صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ ایک قابل اور عظیم وکیل ہیں۔''

''عظیم صرف خدا کی ذات ہے۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا اور الوداعی کلمات کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

(تحریر: حسام بت)

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دینیات کے کالج سے نکل کر میکا گونی زنانہ بنیانوں کا سیلز مین بن گیا۔ وہ گھر گھر جا کر زنانہ بنیان فروخت کرتا۔ یہ کام اسے اس لیے چھوڑنا پڑا کہ وہ عملی مظاہرہ کرنے کی ناقابلِ تسخیر عادت میں مبتلا تھا پھر میکا گونی والٹرویٹ باکسر بن گیا۔ اس کے اس کیریئر کا باکسنگ کی تاریخ میں ریکارڈ نہیں ملتا۔ اس کے مخالفین کا کہنا ہے کہ اس نے ریفری کے سر پر بوتل توڑ دی تھی کیونکہ ریفری نے مخالف باکسر کو دانتوں سے کاٹنے کے

حیرت انگیز ایجادات کے فوائد اور فسادات کا قصہ

دھماکا خیز

ابوضیا اقبال

خدا کی قدرت ہے کہ دماغ کی کارکردگی کا وجود نہیں بلکہ ثبوت انسان کے عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے... ایسی ہی ایک صلاحیت کا اظہار اس نے بھی کیا مگر اگلی ہی سوچ نے اسے ماحول کی تباہ کاریوں اور زندگی کی ویرانیوں سے بچالیا اس کے باوجود ایک اذیت نے لحد تک اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور یہ سب... اس کے دماغ کی کارفرمائیاں ہی تھیں۔

http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جرم میں اسے نااہل قرار دے دیا تھا۔ بہرکیف 1909ء میں وہ نیواڈا میں نمودار ہوا، جہاں وہ تانبے کی ایک کان میں کام کرتا تھا۔ وہاں اس کی صلاحیت کھل کر سامنے آئی یعنی دھماکا کرنے کی صلاحیت۔ اس نے آتش گیر مادے کو استعمال کرنا سیکھ لیا اور یہ کہ فورمین کے مکان کے صرف اگلے حصے کو اڑانے کے لیے مادے کو کس جگہ رکھنا چاہیے یا تیل کے ایک ڈرم میں سیاہ پاؤڈر بھر دیا جائے تو وہ کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وہ اپنے ساتھ دھماکا خیز ماحول لیے پھرتا تھا۔ وہ خالص آئرش تھا۔ اس کے چہرے پر کشیدگی چھائی رہتی۔ اس کا مزاج روایتی آئرش مزاج تھا یعنی وہ شاعری اور جنگجوئی کا مرکب تھا۔ آئرش مزاج کی علامت ڈیون اوبینین ہے، جس نے جان ڈوفرئی پر جھپٹ کر اس کے وجود میں پانچ گولیاں اتارنے سے پہلے اپنی بوڑھی ماں کوٹریلی کا گلاب نامی نظم سنائی تھی اور جان ڈوفرئی وہ شخص ہے جو پریوں کے وجود پر یقین رکھتا تھا اور جس نے اپنا کانف کو برف توڑنے والے سوئے سے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ میکا گونی آئرش تھا۔

☆☆☆

جیسے ہی آئرلینڈ میں خانہ جنگی شروع ہوئی، میکا گونی نے کچھ بم اچھالنے کی غرض سے ڈبلن کا رخ کیا۔ اس عرصے میں وہ میری نظروں سے اوجھل رہا بلکہ میں اسے بھول ہی گیا مگر ایک دن ہولی گن بار میں میری اس سے ملاقات ہوگئی۔

میکا گونی بہت بدل گیا تھا۔ وہ بوڑھا لگنے لگا تھا۔ جسم کا گوشت جیسے گھل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اس کے پیچھے بدروحیں لگی ہوں۔ اس کے علاوہ اس کے داہنے ہاتھ کے ساتھ بھی کوئی گڑبڑ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی ساخت بگڑ گئی ہے۔ وہ شلجم کی طرح پھولا ہوا تھا اور میکا گونی نے اسے موزے نما کسی اونی چیز میں لپیٹا ہوا تھا۔

''تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا اور ایک ہی سانس میں مزید کہا۔ ''مجھے پانچ ڈالر ادھار دو۔''

میں نے اسے پانچ ڈالر دے دیے پھر گفتگو کا رخ انقلاب کی طرف مڑ گیا۔ ''تم سناؤ، انقلاب کے دوران تمہاری کارکردگی کیسی رہی؟'' میں نے پوچھا۔

''زبردست۔'' اس نے جواب دیا اور پھر تفصیل بتائی۔ ''میں نے تین بکتر بند گاڑیاں تباہ کیں۔ ایک موقع پر میں نے صرف 63 سیکنڈ میں 77 بم پھینکے۔ یہ شاید عالمی ریکارڈ ہے۔''

''تو اسی دوران تمہارا ہاتھ زخمی ہوا ہوگا۔'' میں نے قیاس آرائی کی۔

میکا گونی پریشان نظر آنے لگا لیکن بائیں ہاتھ سے میرا دیا ہوا پانچ ڈالر کا نوٹ، جیب میں رکھنے کے بعد اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔ موڈ خوش گوار ہوگیا۔ خوش گوار آئرش موڈ..... میں آپ کو بتاؤں جب آئرش آنکھیں مسکرائیں تو چوکس ہوجایئے اور جب آئرش قہقہہ سنائی دے تو خود کو مسلح کرلیجیے..... یا شراب کی ایک بوتل سے..... یا آگ بجھانے والے آلے سے۔ اس لیے کہ اس قہقہے کے بعد آپ کو ان دونوں میں سے کسی بھی چیز کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

''یہ تو.....'' اس نے کہنا شروع کیا پھر میرا کوٹ بائیں ہاتھ سے تھام کر سرگوشی میں بولا۔ ''اپنی ماں کے سر کی قسم کھاؤ کہ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا، تم وہ کسی کو نہیں بتاؤ گے۔''

میں نے کہا۔ ''بے فکر رہو، تمہارے معاملے میں میرے ہونٹ سلے رہیں گے۔''

''تم نے زبان کھولی تو مجھے بیس سال کی سزا ہوجائے گی۔''

''ارے بھائی..... میں کہاں کسی سے بات کرتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ سنو، تم جانتے ہو کہ مجھے ہمیشہ سے دھماکے کرنے کا شوق رہا ہے۔''

''مجھ سے زیادہ کون جانے گا یہ بات۔ تم نے ایک بار سائیکل پمپ میں گن پاؤڈر بھر کر میری کرسی کے نیچے رکھ دیا تھا۔ صرف دھماکے کے شوق میں۔''

''میری بات مت کاٹو، تمہیں معلوم ہے کہ میں خانہ جنگی کے زمانے میں ڈبلن میں تھا۔ وہاں میری بن آئی تھی۔ میری پتلون کی جیب میں رسّی سے گھسی گئی نال والا اعشاریہ چار چار ہوتا تھا۔ ٹانگ کے ساتھ ایک ماؤزر بندھا ہوتا تھا اور بم..... بموں کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ ایک بار میں نے ایک بم ملٹری بینڈ والے کی نفیری میں ڈال دیا۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں، اس نفیری کی آواز کا تم تصور نہیں کرسکتے..... ہاہاہا۔''

اچانک میکا گونی کو ایک جانا پہچانا..... چہرہ نظر آگیا۔

http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک ویٹر کا چہرہ..... بس پھر کیا تھا۔ اس نے اٹھ کر ویٹر سے کچھ گفتگو کی۔ اس دوران اس کی رو بہک گئی۔

''اسے دیکھا تم نے۔'' اس نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ ''دیکھنے میں کیسا بچوں کی طرح معصوم لگتا ہے لیکن میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے اسے چھ آدمیوں کو شوٹ کرتے دیکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہم نے ڈن ویلز کی بندرگاہ کو پھونکا تھا..... ارے ہاں، میں کیا کہہ رہا تھا دوست؟''

''یہ کہ تمہارا یہ ہاتھ ایک دھماکے میں زخمی ہو گیا تھا۔''

''ہرگز نہیں، ایسا ہوا ہی نہیں۔ وہ تو معاملہ ہی اور تھا۔'' اس نے تند لہجے میں کہا۔

''جو کچھ بھی تھا، تم مجھے اسی کے متعلق بتا رہے تھے۔''

''ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اورفس سنیما پر حملہ کیا۔ سمجھے؟ میرے ساتھ فلیش گنی بھی تھا۔ گنس میک گرا بھی تھا اور.....''

''آگے تو بڑھو۔''

''خیر، سب سے پہلے تو ہم نے پیٹرول کے کچھ ڈبے لیے پھر میں نے انہیں ڈٹ کر ڈائنامیٹ اسٹکس سے بھر دیا۔ میں نے ہر ڈبے کی کیپ میں ایک ڈیونیٹر لگایا۔ تار باندھے۔ بٹن پریس کیے اور دھائیں..... سمجھے کچھ؟''

''خوب صورت۔''

''کاش تم وہاں ہوتے اور وہ تماشا دیکھتے۔ میلوں تک کوئی ایک ایسی کھڑکی نہیں تھی جس کے شیشے سلامت ہوں۔ دھماکوں کے بعد گھنٹوں وہاں ملبا برستا رہا۔ سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ کتوں نے عادت بنالی تھی کہ منہ کھول کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھتے اور کھانے پینے کی چیزیں خود بخود منہ سے گزر کر ان کے پیٹ میں پہنچ جاتیں۔''

''یعنی تم جانوروں کے لیے مبارک ثابت ہوئے۔''

''ظاہر ہے، بہرحال ہم وہاں سے کھسک رہے تھے کہ سڑک کے دونوں طرف سے ہمیں فوجی گاڑیاں آتی نظر آئیں۔ چنانچہ ہم ایک مکان میں گھس گئے۔ وہاں سے ہم مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ ہم مقابلہ کرنے کے موڈ میں تھے۔''

''بہت خوب۔''

''جیسے بس کے کنڈیکٹروں کے پاس تھیلے ہوتے ہیں نا، میرے پاس ویسے کئی تھیلے تھے جن میں بم بھرے ہوئے تھے اور ہم سب کے پاس گنیں بھی تھیں۔ ہم نے چھت پر مورچا لگالیا۔ کیا بتاؤں میں، وہ کیسا قابلِ دید منظر

ذرا مسکرائیے

✂ اسپتال میں آرتھوپیڈک وارڈ میں زیرِ علاج شوہر کی نصیحت ....

''اگر آپ کی بیوی کے پاس دو مختلف موبائل نمبرز ہیں تو کبھی بھی میری طرح انہیں ''وائف 1'' اور ''وائف 2'' کے نام سے Salve نہ کرنا۔''

✂ جنگ پر جانے سے، پہلے پاؤل کنگ نے اپنی خوب صورت بیوی کو ایک، کمرے میں بند کیا اور چابی اپنے بہترین دوست ''فرگس'' کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں جنگ سے واپس نہ آسکوں تو کمرے کا تالا کھول لینا اور اس سے شادی کر لینا۔''

یہ کہہ کر بادشاہ روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک گھڑسوار بہت تیزی سے اس کے پیچھے آرہا ہے۔ نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ اس کا دوست فرگس ہے۔

پاؤل نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟''

فرگس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ جواب دیا۔ ''آپ غلط چابی مجھے دے کر آگئے ہیں، پلیز درست چابی دیں۔''

✂ لیڈر تقریر کرتے ہوئے۔ ''میرے پاس آج جو کچھ ہے آپ غریبوں کی وجہ سے ہے۔''

ایک شخص نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو اور میں نے تو اپنی کچھ چیزیں پہچان بھی لی ہیں۔''

✂ ایک مقرر جھوٹ کے، موضوع پر لیکچر دے رہا تھا۔ لیکچر دینے کے بعد مقرر نے حاضرین سے پوچھا۔ ''ان میں سے کس کس نے اس کی کتاب کا نواں باب پڑھا ہوا ہے۔''

تقریباً تمام حاضرین نے ہاتھ اٹھا دیے۔

یہ دیکھ کر مقرر نے کہا۔

''میرے مخاطب بالکل صحیح لوگ ہیں کیونکہ میری کتاب کے کل آٹھ باب ہیں۔''

انتخاب.. ریاض بٹ، حسن ابدال

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا۔ گولیوں کی برسات ایسی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پہلی گولی مرنی کو لگی۔ ٹائلوں والی چھت کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ ایک گولی چلادیں تو وہ گولی ہفتوں تک ادھر سے ٹکرا کے ادھر اور ادھر سے ٹکرا کے ادھر پھرتی پھرے گی۔ سوچو تو ..... یہ تو زیادتی ہوئی نا۔ میں اپنے بم خوبی سے استعمال کررہا تھا لیکن ہم تعداد میں ان سے کم تھے۔ وہ دوسری چھت پر چڑھ آئے پھر کیا تھا خوب دوبدو معرکہ آرائی ہوئی۔ ایک چمنی سے دوسری اور دوسری سے تیسری تک جنگ ہوتی رہی۔ بڑا مزہ آیا لیکن وہ پیش قدمی کرتے رہے اور ہم پسپا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے پاس صرف ایک بم رہ گیا۔ تعداد ان کی زیادہ تھی۔ ہم میں سے بیشتر مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ ایک میں خیریت سے تھا، چنانچہ بھاگنے کا سوچنا پڑا۔ موقع ملتا تو میں انہیں دوڑا دیتا۔ میں اپنا آخری بم لے چھپتا چھپاتا، پھسلتا، لڑھکتا پھرا۔ یہاں تک کہ اپنی سانس مجھے اپنی سانس معلوم نہیں ہورہی تھی۔''

''تو تم بچ نکلے؟''

''ہاں، یہ کہنا تو بہت آسان ہے۔ میں چھت پر گٹر کے پائپ سے لپٹے ہوئے پتے کی طرح گھسا ہوا تھا۔ پیٹ کے بل لیٹا میں موقع کا منتظر تھا۔ اندھیرا ہوگیا تھا۔ اچانک مجھے بہت سارے فوجی نظر آئے۔ وہ نیچے سڑکوں کی اور عمارتوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں اپنا آخری بم استعمال کرنے کے لیے مناسب ترین موقع کا منتظر تھا۔ میں نے اپنی انگلی پن کی رنگ میں ڈالی اور بم کو گرفت میں لے لیا۔ میں انتظار کرتا رہا پھر جیسے ہی چند فوجی گچھے کی صورت میں نظر آئے، میں نے بم کی پن کھینچی اور.....''

میں انتظار کرتا رہا لیکن میکا گونی خاموش رہا بالآخر میں نے پوچھا۔ ''تو تم نے ان سب کو ختم کردیا ہوگا؟''

''کوئی بھی نہیں مرا۔ میں بم پھینک ہی نہیں سکا۔ اچانک سرچ لائٹ ناچنے لگی اور مجھے دبکنا پڑ گیا۔ ذرا حرکت کرتا تو مارا جاتا۔ میں تو پھنس کر رہ گیا۔ ایک طرف یہ ڈر کہ سرچ لائٹ کی روشنی میں دیکھ لیا گیا تو گولی لگے گی۔ دوسری طرف یہ خوف کہ چھت سے نہ گر جاؤں اور وہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی منحوس روشنی..... اس میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی ٹارگٹ نظر آجائے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''انتظار کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ گولیاں تیروں کی طرح برس رہی تھیں۔ گھنٹوں بعد وہ لعنتی سرچ لائٹ آف ہوئی اور پھر مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ فوجی تو نیچے کمروں میں دندنا رہے ہیں۔ جس چھت پر میں تھا، اس کے نیچے فوجی مقیم ہوگئے تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں عجیب مشکل میں تھا۔ بم میری مٹھی میں تھا۔ میں نہ حرکت کرسکتا تھا اور نہ ہی کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں تو سانس بھی روک لیتا۔ کچھ کرتا تو تین سیکنڈ میں میرے چیتھڑے اڑ جاتے۔ بم کی پن میں کھینچ چکا تھا۔''

''خدا کی پناہ..... پھر تم نے کیا کیا؟''

''کچھ بھی نہیں، میں وہیں پڑا رہا۔ اس منحوس چھت پر میرے پانچ دن گزرے۔ سونا تو کجا، میں پلک بھی نہ جھپکا سکا۔ میرے اعصاب ٹوٹ گئے۔ میں اتنا بے بس تھا کہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

''پانچ دن.....!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اور راتیں بھی۔'' اس نے اضافہ کیا۔ ''اور اس پر قیامت، موسم بہت خراب تھا۔ جب فوجی وہاں سے ٹلے تو میرا جسم اکڑ کر لکڑی کے تختے کی طرح ہوگیا تھا۔ میں تو چھت سے اترا بھی بڑی مشکل سے۔''

''مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم بچ نکلے۔''

''حیرت تو مجھے بھی ہے۔ میری نسیں اور رگیں تک جام ہوگئی تھیں۔ میرے بازوؤں کے عضلات کو جانے کیا ہوگیا تھا۔ لگتا تھا سوکھے کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ مجھ سے اپنا ہاتھ بھی کھولا نہیں جارہا تھا۔'' میکا گونی نے اپنی بند داہنی مٹھی کو تھپتھپایا۔ ''بم کی پن کے رنگ میں میری انگلی پھنسی ہوئی تھی۔ میں اسپرنگ کو کھینچے رکھنے پر مجبور تھا۔ اسپرنگ نیچے آتا تو بم پھٹ جاتا اور بم میری مٹھی میں بند ہوگیا تھا اور میری مٹھی کھلنے پر آمادہ نہیں تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں دوست، کچھ بھی نہیں۔ میں نے خود کو اپنی قسمت پر چھوڑ دیا اور اب میں یہاں ہوں۔''

''اور بم کا کیا ہوا؟''

''بم اب تک میرے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے اپنے سوجے ہوئے داہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن سنو، کسی سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ اگر تم نے زبان کھولی تو مجھے بیس سال سے کم کی سزا نہیں ہوگی۔ اے..... ایک منٹ رکو تو، تم کہاں بھاگے جارہے ہو۔ اتنی جلدی کیا ہے تمہیں؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

شعبدہ باز

سلیم انور

بعض لوگوں کی انگلیوں میں ایسا ہنر ہوتا ہے کہ کسی کی جیب محفوظ رہتی ہے اور نہ کسی کی تجوری۔ ایسے لوگ بڑی زورآزوری سے دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا جو زمانے سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

آنکھوں میں دھول جھونکنے والے ایک شعبدہ باز کی فنکاریاں

''اگر اسے موقع ملا تو وہ یقیناً تمہیں جل دے جائے گا۔'' سلم گورڈن نے ایشلے سے کہا۔ ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت تیز ہے۔''

ایشلے نے اپنا سگریٹ پرے اچھال دیا۔ ''وہ مجھ سے سیانا پن نہیں کر سکے گا۔'' ایشلے نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''بائی داوے، میں اپنا حصہ کیا طلب کروں؟''

اس بات پر دراز قامت دبلے پتلے زرد رنگت کے حامل گورڈن نے دانت نکالے۔ ''اس سے ففٹی ففٹی کا مطالبہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/

کرنا اور دیکھنا کہ وہ تمہیں کیا آفر کرتا ہے اور ہاں، مجھے ضرور بتانا۔''

سات بجے کے قریب ایشلے نے فورٹی سکستھ اسٹریٹ ہوٹل میں پروفیسر مورگن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''سلم گورڈن نے تمہارے بارے میں مجھے بتایا تھا۔'' پروفیسر مورگن نے دروازہ بند کرنے کے بعد بیڈ کے کنارے پر ایک جگہ کو درست کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''گورڈن کا کہنا ہے کہ تم اس کام میں مہارت رکھتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ منصوبہ کیا ہے۔ اگر تم اس منصوبے میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو تو تم اپنے لیے کتنا حصہ لینا چاہو گے؟''

''پچاس فیصد۔''

مورگن نے ایک سگریٹ سلگانے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایشلے کے مانند وہ بھی جوان، بنا سنورا اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ البتہ اس کے چہرے کے نقوش اور تاثرات میں قدرے درشتی اس بات کا اشارہ تھی کہ اس کی زندگی مکمل طور پر پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

''اب تم میرے شریک کار ہو گئے ہو۔ میں چند الفاظ میں آگے کا منصوبہ بیان کرتا ہوں۔ کل شب میں ہلڈرتھ فیملی کے بچوں کے لیے میجک شو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ تم میرے اسسٹنٹ ہو گے۔ جب میں بال روم میں کمالات دکھا رہا ہوں گا تو تم اوپری منزل پر واقع بیڈ روم کی تجوری کو بھک سے اڑا کر اس کا صفایا کر لینا۔ یہ دو نوک معاملہ ہو گا۔ تم اسے مس نہیں کر سکتے۔''

''وہ کس قسم کی تجوری ہے؟'' ایشلے نے پوچھا۔

''دیوار میں گڑی ہوئی گول تجوری ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اس ملازمہ کے بوائے فرینڈ سے تفصیلات حاصل کی ہیں جو کبھی وہاں کام کیا کرتی تھی۔ میں بعد میں تمہیں وہاں کا مکمل خاکہ بنا کر دوں گا۔ یہ ایک آسان کام ہے۔'' گورڈن نے بتایا۔

''میں اپنے اوزار اندر تک کس طرح لے جاؤں گا؟'' ایشلے نے جاننا چاہا۔

''تم انہیں ایک بیگ میں رکھ کر لانا۔ کوئی بھی تمہیں نہیں روکے گا۔ میں نے بتایا نا کہ تم میرے اسسٹنٹ ہو گے۔ تم دس ٹن کا ٹرک تک لا سکتے ہو اور یہ ہمارے ایکٹ کا حصہ ہو گا۔ تم ٹھہرو، میں کاغذ اور پنسل لے کر آتا ہوں تاکہ تمہیں مکان کا مکمل خاکہ بنا کر دے دوں۔ تم اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا اور اس کاغذ کو ضائع کر دینا۔''

☆☆☆

ایشلے ٹیکسی سے اتر کر مورگن کے پیچھے چل دیا۔

ایسٹ سیونٹی تھرڈ اسٹریٹ پر واقع وہ ایک پرائیویٹ ہاؤس تھا۔ مورگن اس مکان کی براؤن اسٹون کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ایشلے نے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چمڑے کا بیگ تھاما ہوا تھا۔

دروازہ ہلڈرتھ فیملی کے بٹلر نے کھولا۔ ایشلے نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو یہ اس کا دوسرا جرم ہو گا لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا۔ جیسا کہ مورگن نے اسے بتایا تھا کہ یہ ایک اوپن اینڈ شٹ جاب ہے۔

چھوٹے سے بال روم کے ایک گوشے میں ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ مورگن نے اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اپنے آلات سیٹ کرنا شروع کر دیے۔ یہ چیزیں سہ پہر ہی میں وہاں پہنچا دی گئی تھیں..... ان میں خرگوشوں کے پنجرے، سفید چوہے، شیشوں کے بنے ہوئے لائن دار کیبنٹ وغیرہ شامل تھے۔ وہ ان کاموں کو سپروائز کر رہا تھا جبکہ ایشلے اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

نو بجے شو کا آغاز ہو گیا۔

ایشلے نے اپنا بیگ اٹھایا اور سب کو شو میں مگن پا کر عقبی راستے سے بال روم سے باہر نکل آیا۔ مکان کا پورا نقشہ اس نے اچھی طرح سے ذہن نشین کیا ہوا تھا۔ وہ نوکروں کے زیر استعمال زینے کے راستے اوپری منزل تک جا پہنچا۔ کسی نے اسے نہ تو روکا اور نہ ہی کوئی سوال کیا۔ بہ ظاہر تمام نوکر بال روم میں تھے اور مورگن کے ہاتھ کی صفائی اور شعبدہ بازی کے کمالات دیکھنے میں مگن تھے۔ ایشلے ایک چوڑی سی راہداری میں آگے بڑھا جس میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک بڑے سے آراستہ بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا کمرا بھی تھا جو کسی خاتون کی خلوت گاہ تھی۔

اس بیڈ روم میں شیڈ والے دو لیمپ روشن تھے جن سے کمرے کی ہر شے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ایشلے نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے اس کا تالا دبا دیا اور تیزی سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اسے فرنچ پرنٹ کا فریم، خانے دار الماری کی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

بائیں جانب دیوار پر لٹکا دکھائی دیا۔ اس نے فریم اٹھایا تو وہ پوشیدہ دیوار گیر گول تجوری نظر آ گئی جس کی نشاندہی مورگن نے کی تھی۔ ایشلے نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے نمبر چھ کی الیکٹرک ڈرل مشین، کچن کا ایک صابن اور ربر کے دستانے نکالے۔ اس نے ڈرل مشین کے لمبے تار کا پلگ نیچے بیس ساکٹ میں لگا کر بٹن آن کر دیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔

اس نے تجوری کی مرکزی ناب کے اوپر ایک سوراخ کیا اور صابن سے تجوری کے دروازے کے اطراف کے شگافوں کو پُر کر دیا۔ پھر ایک آئی ڈراپر کے ذریعے اس نے احتیاط کے ساتھ سوراخ میں نائٹرو کے قطرے ٹپکا دیے۔ اس نے ڈیٹونیٹر وائر سے ڈبل کنکشن بنایا اور ایک چھوٹا سا فرشی قالین اٹھا کر تجوری کے منہ پر دبایا اور پھر ڈیٹونیٹر کے تار چیک کر دیے۔

ایک ہلکا اور گھٹا گھٹا سا دھماکا ہوا۔

ایشلے نے فرشی قالین نیچے گرا دیا اور تجوری کا مڑا تڑا دروازہ کھول کر اندر رکھا ہوا آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا زیوروں کا چھوٹا بکس باہر نکال لیا۔

وہ اس بکس کو اٹھا کر بیڈ پر لے گیا اور اسے کھول کر اس میں موجود اشیا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ بکس میں موجود جواہرات کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔

اتنے میں کمرے کے دوسرے حصے سے ایک آواز سنائی دی۔

''میں خود بھی حقیقت میں ان جواہرات کو یہاں سے لے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔'' اس آواز نے کہا۔ ''ماں خاص طور پر اپنے نیکلس اور انگوٹھیوں پر شیفتہ ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو اس بکس کو واپس وہیں رکھ دیتی۔''

ایشلے کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔

سرخ زلفوں والی ایک پیاری سی لڑکی خلوت گاہ کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا ایوننگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور گردن کا خم قابلِ توجہ تھا۔

پھر وہ لڑکی چند قدم اندر آ گئی۔

''کیا تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ یہ بکس واپس تجوری میں رکھ دو..... اور دفعان ہو جاؤ۔ اگر تم دو منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گئے تو میں پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گی۔''

ایشلے نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا۔ ''تم مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ میں گرفتار ہونے کے بجائے یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں؟''

لڑکی نے اپنا ہاتھ نمایاں طور پر میز پر موجود ٹیلی فون کی جانب بڑھا دیا۔

ایشلے نے تیزی سے وہ آبنوسی بکس واپس تجوری کے اندر رکھ دیا پھر تیکھی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے بیڈروم کے دروازے کی جانب لپکا اور تالا کھول کر ایک اچٹتی نگاہ اس لڑکی پر ڈالی۔ وہ لڑکی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ بدستور ٹیلی فون پر تھا۔ ایشلے کچھ کہے بغیر خاموشی سے راہداری میں نکل گیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد ایشلے ونٹر گارڈن کے سامنے سے گزر رہا تھا تو سلم گورڈن نے دور سے اسے پکارا۔

جب ایشلے اس کے پاس پہنچا تو گورڈن گویا ہوا۔

''تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ پروفیسر کے ساتھ تمہارے کام کا کیا نتیجہ رہا۔'' ساتھ ہی اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''تمہارے نہ بتانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ..... اس نے تمہیں جل دے دیا؟''

ایشلے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ہماری بات ہی نہیں بنی۔ اس رات ہلڈرتھ فیملی نے ہم دونوں کو مات دے دی۔ ہم اپنے منصوبے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔''

گورڈن نے اپنی کلائی کی گھڑی کی جانب دیکھا۔

''میرے پوچھنے کی ایک وجہ ہے۔'' گورڈن نے کہا۔ ''حال ہی میں پروفیسر مورگن شوگر ڈیڈی کی حیثیت سے پہچانا جا رہا ہے۔ وہ گزشتہ شب اپنی نئی بیوی کے ساتھ لندن کے بحری سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ چڑیا ہے جس کے چکر میں وہ ایک عرصے سے پڑا ہوا تھا۔ شادی سے پہلے وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔ سرخ زلفوں اور نیلی آنکھوں والی اس کی نئی بیوی خاصی اسمارٹ لڑکی ہے۔'' گورڈن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

محفلِ شعر و سخن

❁ کرشن زخمی.....عمرکوٹ، تھرپارکر

مقید کر دیا یہ کہہ کر سانپوں کو سپیروں نے
یہ انساں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے

❁ احمد خان توحیدی.....پاکستان اسٹیل، کراچی

لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی
تو قبر کے لمحات میں قرآن پڑھا کر
آجائے گا اقبالؒ تجھے جینے کا سلیقہ
تو سرورِ کونینؐ کے فرمان پڑھا کر

❁ محمد زریاں سلطان.....اردو بازار، کراچی

لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں
کیا تماشا ہے کہ یہاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

❁ سید کرامت علی.....اسلام آباد

آج لوٹ کر اس کی یاد آئی تو یہ احساس ہوا
اتر جائے جو دل میں وہ بھلائے نہیں جاتے

❁ محمد رمضان.....پشاور

میں رعبِ حسن سے ساکت ہوں وہ شرم و حیا سے مہر بہ لب
دونوں میں جھجک سی رہتی ہے اظہارِ تمنا کون کرے

❁ اظہر حسین پچار.....ہزاری، جتوئی

گھاؤ گنتے نہ کبھی زخم شماری کرتے
عشق میں ہم بھی اگر وقت گزاری کرتے
وقت آیا ہے جدائی کا تو اب سوچتے ہیں
تجھ کو اعصاب پہ اتنا بھی نہ طاری کرتے

❁ ڈاکٹر محمد عنصر عباس ہڈالی.....خوشاب

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

❁ مہرین ناز.....حیدرآباد

جو اس کے چہرے پہ رنگِ حیا ٹھہر جائے
تو سانس، وقت، سمندر، ہوا ٹھہر جائے
وہ مسکرائے تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم
وہ گنگنائے تو بادِ صبا ٹھہر جائے

❁ ساگر تلوکر.....چشمہ بیراج

صبح پھر ہوگی کوئی حادثہ یاد آئے گا
شام پھر آئے گی پھر شام سے گھبرائیں گے

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

اب میری واپسی کا امکان تو نہیں ہے
شاید میں لوٹ آؤں رستے اجال رکھنا

❁ طاہر الدین بیگ.....میرپور خاص

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

❁ محمد جاوید.....تحصیل علی پور

کیوں ایسا ہے کہ اعتبار کی ٹوٹی دہلیزوں پر
جو بہت ہوں اپنے، اپنے نہیں رہتے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر.....نئی منڈی سکھیکی

آنکھ اٹھی محبت نے انگڑائی لی
دل کا سودا ہوا چاندنی رات میں
ان کی نظروں نے کچھ ایسا جادو کیا
لٹ گئے ہم تو پہلی ملاقات میں

❁ مدحت.....کراچی

بادلوں نے تیری زلفوں سے گھٹا مانگی ہے
چاند نے تیرے چہرے سے ضیا مانگی ہے
مانگ لی شفق نے تیرے ہونٹوں سے سرخی
صبا نے تیری آنکھوں سے حیا مانگی ہے

❁ شبانہ حسن.....لاہور

فراموش کر دیا اپنا ماضی، اس سے کہنا
جیت لی میں نے بازی، اس سے کہنا
نہیں آرزو دل کو اس کے پیار کی
اپنی زندگی میں ہوں راضی، اس سے کہنا

❁ اطہر حسین.....کراچی

انسان کے ہونٹوں پہ تو لگ سکتی ہے مہریں
خاموش مگر کوئی کہانی نہیں رہتی

❁ محبوب مصور سومرو.....گوٹھ کوھڑی، لاڑکانہ

درِ یار پہ جانا دعا جیسا لگتا ہے
اور اس کا مسکرانا ہوا جیسا لگتا ہے

❁ زاہد چودھری.....چھور کینٹ

کتنی مانوس سی صدا ہوتی ہے
پلٹ کر دیکھو تو ہوا ہوتی ہے
میں اسے زندگی کی طرح چاہتا ہوں
زندگی بھی تو بے وفا ہوتی ہے

❁ محمد یونس چودھری.....سلطان پورہ، لاہور

ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے لیکن
اے خاکِ وطن! قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

❁ احمد حسن عرضی خان.....قبولہ شریف

یہ گزرتے ہوئے پل ہیں کہ تیری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح رات ہے کاجل کی طرح

❁ ایم اے فاضل فریدی.....مزنگ

یہ آگ میرا جسم جلا ڈالے گی مگر پھر بھی
میں اس کو بجھانے سے بہت خوفزدہ ہوں

❁ محمد ادریس.....کوئٹہ

تم اچھے وقت آپہنچے وگرنہ ہم تو مر جاتے
ارادہ ہو چکا اپنا غمِ فرقت میں یونہی تھا
دکھا کر غیر کو صورت مجھے کیوں رشک سے مارا
کہ میں تو مر رہا دیدار کی حسرت میں یونہی تھا

❁ بلقیس فاطمہ.....لاہور

مدت کے بعد حضرتِ ناصح کرم کیا
فرمایئے مزاج مقدس کی بات چیت
پر ترکِ عشق کے لیے ارشاد کچھ نہ ہو
میں کیا کروں نہیں یہ مرے بس کی بات چیت

❁ عبدالقادر.....سیالکوٹ

دل تو کہتا ہے کہ کہہ دے دل کی اس دلدار سے
پر حیا مانع ہے میں کیونکر کہوں مجبور ہوں
جی دھڑکتا ہے نکل جائے نہ منہ سے حرفِ راز
یار سب ہشیار ہیں اور میں نشے میں چور ہوں

❁ شرمین جلیل.....راولپنڈی

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے
ہمارے وقت میں فرہاد و مجنوں
جو ہوتے دن بسر مل جل کے ہوتے

❁ اسماء عبدالغفار انصاری.....لاہور

اجل نامہ آیا تو چھپنے کی جا نہ ملے گی
جس نے تخلیق کیا اس کی خدائی مار ڈالے گی

❁ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہم سے تو خاک صحرا کی چھانی نہیں جاتی
تو لیلیٰ ہرگز نہیں ہے کیوں، مجنوں میں کہلاؤں

❁ اویس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

یقیں کی حد تک اس گماں میں رہتا ہوں
میں تیری خلوت کے شبستان میں رہتا ہوں

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

نہ جانے دل کو وہی کیوں بھاتا ہے
عمر بھر کا جو روگ لگا جاتا ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال

تجھے خبر ہے تجھے سوچنے کی خاطر
بہت سے کام کل پہ چھوڑ دیتا ہوں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

❁ عامر علیم.....لاہور
آؤ کچھ دیر تذکرہ کرلیں
ان دنوں کا جب آپ ہمارے تھے

❁ امداد علی.....میرپور خاص
ملاقاتیں نہیں ممکن! ہمیں احساس ہے لیکن
تمہیں یاد کرتے ہیں، بس اتنا یاد رکھنا

❁ عبدالغفور خان ساغری خٹک.....اٹک
ماں تیرے بعد بتا کون لبوں سے اپنے
وقتِ رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا

❁ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
کاش کہ بچپن میں ہی تجھے مانگ لیتے
ہر چیز مل جاتی تھی دو آنسو بہانے کے بعد

❁ بشیر احمد بھٹی.....بہاولپور
اشارہ تو مدد کا کر رہا تھا ڈوبنے والا
مگر یارانِ ساحل نے سلامِ الوداع سمجھا

❁ البیلی.....کراچی
تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو
منافقت کا نشاں ہے یہ اگر مگر کرنا

❁ محمد خواجہ.....کورنگی، کراچی
کچھ ہمیں بھی موت کی آرزو تھی عشق میں
راستے کچھ آسان تیری بے رخی سے ہوگئے

❁ محمد یوسف سانول.....نور پور تھل، خوشاب
دوریاں ہوئیں تو غلط فہمیاں اور بھی بڑھ گئیں
پھر اس نے وہ بھی سنا، جو میں نے کہا ہی نہیں

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ.....خانیوال
میں لاکھ محترم ہوئی پر ڈھونڈتی رہی
لذت جو ترے شہر کی رسوائیوں میں تھی

❁ ناصر علی صدیقی.....رحیم یار خان
یہی ہے نا تمہیں ہم سے بچھڑ جانے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے مسئلے کا حل نکالیں گے

❁ محمد شہباز اکرم لوئی.....ڈھپئی پاک پتن شریف
اس کی محبت میں شراکت نہیں قبول مجھے
وہ اگر میرا ہے تو خواب بھی میرے دیکھے

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
اہلِ دل اور بھی ہیں اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں ہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں

❁ محمد رشید سیال.....روہڑی، سکھر
ٹوٹ جاتا ہے غریبی میں وہ رشتہ جو خاص ہوتا ہے
ہزاروں یار بنتے ہیں جب پیسا پاس ہوتا ہے

❁ رضوان تنولی کریڑوی.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
آنکھ پُرنم، اشک زم زم، سانس مدھم، وقت ہے کم
وصال راحت، ہجر ماتم، آہ ہمدم، موت مرہم

❁ احسان سحر.....میانوالی
کچھ خطائیں بخشی نہیں جاتیں
دل سوچ کر توڑا کرو جاناں

❁ شازیہ کمال.....کراچی
ذرا سی بات پر تنہا کبھی یوں چھوڑ جاتے ہیں
محبت کرکے لوگوں سے سنبھالی کیوں نہیں جاتی

❁ اعجاز احمد راحیل.....ساہیوال
کچھ علم ہے کہ تم نے تو گیسو بکھیر کر
شیرازۂ جہاں کو پریشان کر دیا

❁ وقاص حیدر.....لاہور
میں تو سائل تھا صدا دے کر گزرنا تھا مجھے
تو نے کیوں شام تلک بند دریچہ نہ کیا

❁ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
سنا ہے شہر بنے زخمی دلوں کا میلا ہے
چلیں گے ہم بھی مگر پیرہن رفو کرکے!

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
برستی بارشوں سے بس مجھے اتنی سی انسیت ہے
کہ اس طرح کا اک موسم میرے اندر بھی رہتا ہے

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ اپریل 2015

نام : _____

پتا : _____

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''یار، تم سے اتنا سا کام نہیں ہو رہا ہے۔ میرے باپ کی آنکھوں کا آپریشن نہیں کر سکتے ہو۔ کیٹریکٹ ایسی کیا بڑی چیز ہے۔ آدھے گھنٹے کا کام نہیں ہے۔ اتنا بھی فائدہ نہیں ہے تمہارا۔ ایک بڑے میاں نہیں سنبھلتے ہیں تم سے۔'' فون کی دوسری جانب بہت دور امریکا کے نیویارک سے بھی بہت آگے میرٹھ کے کسی اسپتال سے کریم کا فون تھا۔

''ہاں، بڑے میاں نہیں سنبھلتے ہیں مجھ سے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''یار سب بندوبست تیار تھا۔ وہ اسپتال میں داخل بھی ہو گئے تھے۔ رات اچھی گزاری۔ تمہاری امی بھی اسپتال میں ہی تھیں۔ صبح آپریشن سے پہلے دینے والی

مجبوری

ڈاکٹر شیر شاہ سید

خدا نے جانے کیوں ساری کشش، ساری تڑپ ممتا میں ہی رکھ دی... اسی سبب قربانی کا مجسمہ بنے والدین اپنی عمر تمام کر دیتے ہیں... تھوڑی سی تڑپ اگر اولاد کے دل میں بھی ہو تو شاید ماں باپ کو اتنی تکلیفیں نہ جھیلنا پڑیں... وہ جو آنکھوں میں خواب سجائے دیارِ غیر گیا تو گویا ہمیشہ کے لیے غیر ہو گیا اور اس کی راہ تکتے تکتے بوڑھے ماں باپ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

پردیس سدھارنے والے جگر گوشوں کی عنایتوں

کا احوال

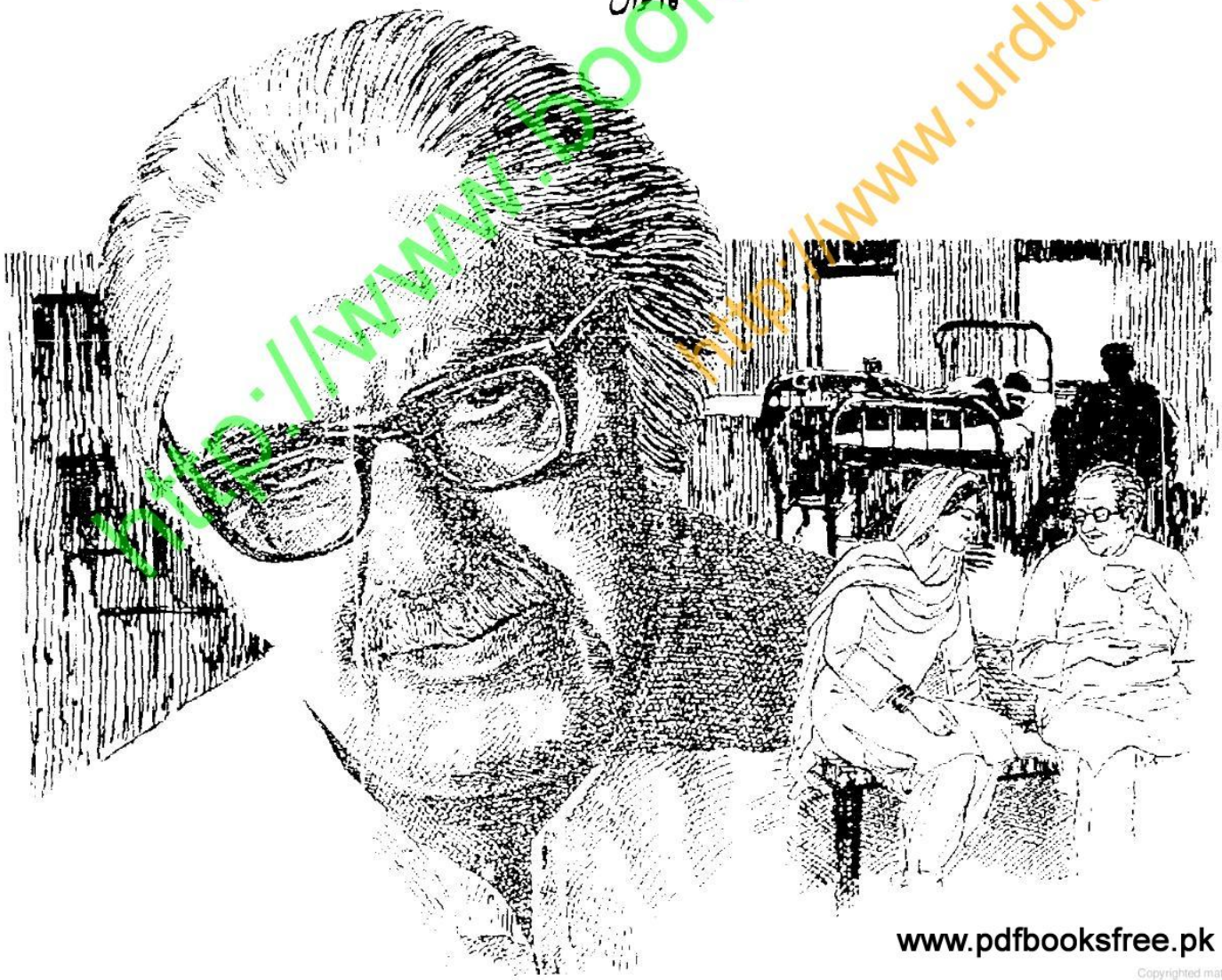

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دوائیں بھی انہیں دے دی گئی تھیں، میں نے ان کی ٹینشن اور گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے رات سے ہی تھوڑا ڈائی زی پام بھی انہیں دے دیا تھا، صبح ہی ان کا آپریشن تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر بھی آئے تھے اور آپریشن ٹیبل پر لیٹ بھی گئے تھے لیکن بس بے ہوشی سے تھوڑا سا پہلے نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپریشن کرانے سے انکار کر دیا۔ سخت شرمندگی کا شکار تھے۔ وہ بار بار اس طرح مجھ سے معذرت کر رہے تھے کہ مجھے بھی شرم آگئی تھی۔ وہ تمہارے بغیر آپریشن نہیں کرائیں گے۔'' فون کے اس طرف کراچی سے میں نے کریم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''یار، میں کیسے آسکتا ہوں؟ سر سے پاؤں تک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ ڈیڈ کو میں نے سمجھا دیا تھا۔ انہوں نے اور امی نے بھی کہا تھا کہ میرے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یار ڈیڈ نے تو کمال کر دیا ہے۔ پتا نہیں حکومت کے کام کیسے کرتے رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا آپریشن نہیں کرا سکتے۔ خود مشکل میں ہیں۔ نہ اخبار پڑھ سکتے ہیں اور نہ دوسرے کام صحیح طریقے سے کر سکتے ہیں مگر آپریشن سے جان جاتی ہے۔ کمال ہے یار، کمال ہے۔'' اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔ ''اچھا میں پھر فون کروں گا۔''

ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ پہلے بھی دو دفعہ آپریشن کا فیصلہ ہوا تھا اور پھر آپریشن آخر وقت میں نہیں ہو سکا کیونکہ وہ تیار نہیں تھے۔ ان کو ڈر تھا، ایک خوف کہ شاید بے ہوش ہو کر ہوش میں نہ آسکیں، میں زبردستی تو آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔

میری کریم سے ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی اسپتال میں کام کر رہے تھے، میں آنکھوں کے شعبے میں تھا اور وہ سرجری کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ ایک سال تک ہم دونوں نے ساتھ ہی کام کیا تھا۔ میں اپنی تربیت کے آخری مرحلوں میں تھا۔ کریم نے بھی امتحان پاس کر لیے تھے اور امریکا جانے کا امتحان بھی پاس کر کے امریکا جانے کے پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کا پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ''یار، وہ ملک رہنے کے قابل نہیں ہے۔'' یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔

اس کے والد حکومتِ پاکستان میں بڑے بیوروکریٹ تھے، گریڈ اکیس بائیس کے افسر، بہت اچھے انسان تھے وہ۔ جب میں سب کام ختم کر کے پاکستان واپس جا رہا تھا تو کریم نے میرے سامنے اپنے ڈیڈ کو فون کر کے کہا تھا کہ میری مدد کریں۔ انہوں نے مدد بھی کی تھی۔ کراچی پہنچ کر میں انہیں ملا تھا اور میرے سارے کام بڑی تیزی سے ہو گئے تھے۔ لندن سے آنے والا سامان کسٹم سے آسانی سے نکل گیا تھا۔ سرکاری نوکری کے ڈھونڈنے اور ملنے میں انہوں نے مدد کی تھی۔ پھر تھوڑے تھوڑے دنوں میں ان کا سیکریٹری یا ان کے آفس سے فون کر کے کوئی نہ کوئی پوچھتا تھا کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔ وہ اور ان کی بیوی بڑے مہربان لوگ تھے۔ پیار سے ملتے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح کام آئیں۔ میں آخر کریم کا دوست ٹھہرا۔

کریم لندن سے، امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں ٹریننگ مکمل کی، پھر ٹمبی سی کے ایک اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ ٹریننگ کے دوران ہی وہ پاکستان آیا اور اس کی شادی اس کے رشتے داروں میں اس کی ہی مرضی سے ہو گئی۔ اس کی شادی کے دوران، میں اور میری بیوی اس کے خاندان کے اور زیادہ قریب آگئے تھے۔

کریم کی ایک بہن بھی تھی، شازیہ۔ اس کی بھی شادی ایک کارڈیولوجسٹ سے ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ کینیڈا میں رہتی تھی۔ کریم کی شادی پر وہ لوگ بھی کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ کریم کے والدین کو اتنا خوش میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زندگی سے بھرپور تھا پورا خاندان۔ اس وقت وہ بڑی پوسٹ پر فائز تھے۔ گھر پر نوکروں چاکروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ تین ہفتے جادو کی طرح سے تھے۔

پھر یکا یک سب کچھ ویسا ہی ہو گیا تھا۔ پہلے کریم اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ٹمبی سی چلا گیا پھر شازیہ بھی کینیڈا چلی گئی اور زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ کریم جاتے وقت مجھ سے کہہ گیا تھا کہ کبھی کبھار اس کے گھر کا چکر لگا لیا کروں۔ کریم نہ بھی کہتا تو شاید میں یہی کرتا۔ اس کے والدین تھے ہی ایسے۔ پیار کرنے والے محبت کرنے والے اور خلوص سے بھرے ہوئے۔ بڑی پوسٹ پر ہونے کے باوجود ان میں کوئی بے جا غرور نہیں تھا۔ میری ان دونوں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔

پھر کریم کے ڈیڈ ریٹائر ہو گئے اور ان کی زندگی کے فرصت کے دن شروع ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے شروع کے مہینوں کے بعد وہ دونوں کینیڈا امریکا کے دورے پر نکل گئے تھے۔ تین مہینے کینیڈا رہنے کے بعد انہوں نے تین مہینے ٹمبی سی میں گزارے اور جب کراچی واپس آئے تو بہت خوش لگ رہے تھے۔

میں ان کے آنے کے دوسرے دن ہی ملنے گیا تھا۔ بہت اچھا وقت گزرا مگر بہت جلد طبیعت اکتا جاتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

وہاں پر بوڑھوں کا کوئی کام نہیں ہے، وہ کب تک اور کتنا ٹیلی ویژن دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ملنے والا ہے اور نہ کوئی بات کرنے والا۔ فون پر کتنا کوئی بات کرسکتا ہے اس کے بعد تو ڈالر لگتے ہیں۔ کینیڈا کی سردی بھی بہت خوف ناک ہے۔ میں نے ڈیفنس میں ان کے بڑے سے گھر میں ان کے ساتھ چائے پی، انہوں نے میری بیوی کے لیے تحفہ اور بچوں کے لیے چاکلیٹ دیے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ ہر دو سال بعد کریم اور شازیہ پاکستان کا چکر مارتے اور یہی دو تین ہفتے ایسے ہوتے تھے کہ ان کے بڑے گھر میں جیسے روشنی سی آجاتی تھی، ان کے اپنے بچے نواسے اور پوتے۔ ان دنوں کی تیاری وہ لوگ سارا سال کرتے رہتے تھے۔ دن گن گن کر ان دونوں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ کریم کا واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ٹمٹی سی میں وہ بہت خوش تھا۔ اچھی آمدنی تھی، کام سے مطمئن تھا بڑا سا گھر اور روزمرہ کی آسائشیں تھیں۔ وہی سب آسائشیں جو امریکا میں ہوتی تھیں۔

''یار مگر یہ سب چیزیں تو یہاں بھی ہیں۔ تم لوگوں کا ماشاءاللہ سے بڑا سا گھر ہے۔ تم اچھے سرجن ہو یہاں بھی خوب کما کھاؤ گے۔''

''نہیں یار کراچی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ تم دیکھ رہے ہو، حالات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد پتا بھی نہیں ہوتا کہ واپسی ہوگی کہ نہیں پھر اسکولوں کالجوں کا حال بگڑتا ہی جارہا ہے۔ ہم لوگ تو گرامر کے پڑھے ہوئے ہیں لیکن اس زمانے میں گرامر کے علاوہ بھی اسکول تھے' اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اگر آبھی جاؤں تو میرے بچوں کے لیے یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے۔''

میں ہنس دیا تھا۔ ''اگر حالات پہلے جیسے ہوجائیں تو تم واپس آجاؤ گے؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''شاید نہیں، میں تو اسکول کے زمانے سے امریکا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ گرامر اسکول کا ہر بچہ یہی خواب دیکھتا ہے۔ پاکستان میں کون نہیں دیکھتا ہے' ہر کوئی دیکھتا ہے چاہے گرامر اسکول کا ہو یا کسی پیلے اسکول کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ گرامر اسکول کے بچوں کے خواب پورے ہوجاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت بھی پتا ہوتا تھا کہ امریکا میں فٹ بال اور بیس بال کے چیمپئن کون ہیں اور امریکن چارٹ پر کون سی فلم۔ ہم لوگ امریکا جانے کے لیے تیار ہورہے تھے اور اسی لیے امریکا چلے بھی گئے تھے۔''

ادب

اردو کے ایک معروف شاعر کو گفتگو کے دوران اپنے ہر جملے میں انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ ٹانکنے کی عادت تھی..... وہ جب انگریزی کا کوئی نیا لفظ سنتے تو فوراً اپنے کسی ساتھی سے اس کے معنی بھی پوچھ لیتے..... ایک دن دورانِ گفتگو ''لٹریچر'' کا لفظ سنا تو اپنے ساتھی سے پوچھ بیٹھے۔ ''یار! یہ لٹریچر کے کیا معنی ہیں؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''دب.....''

اسی شام کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت نے شاعر مذکورہ سے کہا۔ ''عزیزم! سنا ہے تم میرے بارے میں بڑی بک بک کرتے رہتے ہو۔''

''مولانا! یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں تو آپ کا بے پناہ ''لٹریچر'' کرتا ہوں۔'' لٹریچر کی یہ ترکیب استعمال سن کر مولانا دم بخود رہ گئے۔

مرسلہ: بختاور بوچ، لوہی، بلوچستان

محبوبہ

ایک ڈاکٹر کے پاس ہر تیسرے چوتھے دن ایک صاحب مرہم پٹی کروانے آجاتے۔ ایک دن ڈاکٹر سے نہ رہا گیا۔ اس نے اسے ڈسپنسر کے پاس بھیجنے سے پہلے پوچھ لیا۔ ''بھئی۔ آخر تم کیا کرتے ہو؟ تمہیں اتنی چوٹیں کیسے آتی ہیں؟''

وہ صاحب سرد آہ بھر کر بولے۔ ''ڈاکٹر صاحب! اب کیا کرنا ہے۔ جو پہلے کرچکا ہوں، اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

وہ صاحب تھوک نگل کر بولے۔ ''جوڈو کراٹے کی ماہر محبوبہ سے شادی۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، احسن ابدال

تحقیق

ایک تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ساری ساسیں ظالم نہیں ہوتیں اور نہ ہی ساری بہوئیں مظلوم ہوتی ہیں البتہ شوہروں کی مظلومیت متفق علیہ ہے۔

مرسلہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

''پھر حالات کو ذمے دار ٹھہرانا تو صحیح نہیں ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

''ایک طرح سے صحیح ہے لیکن اگر حالات درست ہوتے تو شاید سوچا جا سکتا تھا۔ آخر امی اور ڈیڈی بھی تو یہاں ہی ہے نا....'' اس نے جواب دیا تھا۔ میں دل میں ہنس دیا کسے دھوکا دے رہے ہو۔ کراچی اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔ کراچی دھوکا کھا چکا ہے۔ کراچی کے بیٹوں نے، کراچی کی بیٹیوں نے شہر سے بے وفائی کی۔ ہر ایک نے کراچی کو توڑا ہے۔ جو کراچی میں رہتے ہیں انہوں نے بھی اور جو کراچی سے بھاگ گئے انہوں نے بھی۔ برنس روڈ پر چھابڑی لگانے والے نے بھی اور تین تلوار پر اپارٹمنٹ بنانے والے نے بھی۔ جاہل نے بھی، پڑھے لکھے نے بھی۔ میں نے کچھ کہا نہیں تھا، خاموش رہا تھا۔ یہ کراچی کا غم تھا۔ یہ کراچی کی بات تھی۔ یہ کراچی کا درد تھا۔ یہ کراچی کا نوحہ تھا۔ یہ کراچی کا المیہ تھا۔ ٹمی سی میں رہنے والے کو کیا سمجھ میں آئے گا۔ جس دن ڈیڈ مر جائیں گے اس دن ٹمی سی کا یہ رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔

''یار تم ہی ڈیڈ کو سمجھاؤ'' اس نے مجھ سے کہا تھا ''یہاں کیا کر رہے ہیں، بے کار ہے یہاں رہنا۔ میں نے تو بہت کہا ہے کہ ڈیفنس کا یہ مکان بیچ دیں اور میرے ساتھ ٹمی سی میں رہیں۔ میرے ساتھ، بچی کے ساتھ اپنے پوتوں پوتیوں کے ساتھ۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا مگر یہ کراچی میں پلے بڑھے تھے یہاں ان کے دوست ہیں، رشتے دار ہیں، ان کا جانا پہچانا موسم ہے۔ ٹھیک ہے بارش ہوتی ہے اور پانی کھڑا ہو جاتا ہے یہ تو ان کے بچپن سے ہو رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سخت گرمی میں بجلی چلی جاتی ہے اور ایئر کنڈیشنر پنکھے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ٹمی سی میں تو ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ یہاں ہوتا ہے یہ تو اس کے عادی ہیں۔ گٹر لائن بند ہو جاتی ہے اور گلی میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے اور یہ بھی عجیب نہیں ہے کہ نلکوں میں پانی آنا بند ہو جاتا ہے اور ٹینکوں سے پانی منگانا پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں کہنا بے کار تھا۔ میں نے یہ کہا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو کہا تھا پہلے کراچی میں قتل نہیں ہوتے تھے۔ پہلے کراچی کے بچے پستول نہیں چلاتے تھے۔ پہلے بدمعاش گھروں میں گھس کر عورتوں، لڑکیوں کی عزت پامال نہیں کرتے تھے۔ پہلے کراچی والے رات کے اندھیرے میں بوڑھوں کو مار مار کر انہیں لوٹتے نہیں تھے۔ اب یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کیوں آپ یہاں رہے ہیں؟ چلے جائیں، کریم کے پاس، شازیہ کے پاس۔ اب کراچی میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، مسکرائے تھے، خاموش رہے تھے۔ کریم پھر چلا گیا اور شازیہ بھی چلی گئی تھی۔

ایک رات میں ان سے ملنے گیا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ بڑھاپا ان کے قریب آ گیا ہے۔ باتوں باتوں میں کراچی کی بات چل نکلی، حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ اب تو ان علاقوں میں بھی گڑبڑ ہو رہی تھی جہاں پہلے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پل کے اس طرف کلفٹن اور ڈیفنس میں بھی ڈاکے پڑنے لگ گئے تھے۔ وہ بہت دکھ سے بولے تھے۔ ''یاد ہے تم نے ایک دن کہا تھا کہ کراچی میں اب کیا نہیں ہوتا۔ ہم جب کراچی آئے تھے تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا، چھوٹا شہر تھا مگر سب کچھ موجود تھا۔ ہر مذہب کے لوگ، امیر غریب سب رہتے تھے اور ان کو ضرورت کے مطابق چیزیں بھی ملتی تھیں۔ پانی بھی ملتا تھا۔ گٹر لائنیں بند نہیں ہوتی تھیں۔ بارش کا پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔ اسکول بند نہیں ہوتے تھے۔ لوگ قتل نہیں ہوتے تھے۔ یہ تو اب ہو رہا ہے، اس لیے ہو رہا ہے کہ کراچی میں ہر فرد نے کراچی سے دھوکا کیا ہے۔ جو پڑھ لکھ گیا ہے وہ کراچی چھوڑ گیا ہے۔ جو ان پڑھ ہے وہ ان کی نقل کر رہا ہے۔ جو قانون توڑ رہے ہیں ٹریفک کے قانون سے بلڈنگ کے قانون تک۔'' انہوں نے بہت دکھ سے کہا تھا۔ ''کراچی ختم ہو جائے گا۔'' میں نے پہلی دفعہ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی دیکھی تھی۔

ایک رات آنٹی کا فون آیا تھا کہ انکل گر گئے ہیں۔ میں فوراً انہیں دیکھنے گیا تھا۔ وہ ٹھیک تھے کوئی خاص بات نہیں تھی مگر میں نے کہا کہ میں ان کی آنکھوں کا معائنہ کروں گا۔ مجھے لگا کہ جیسے انہیں دیکھنے میں کوئی تکلیف ہو رہی ہے۔

دوسرے دن میں نے ان کا اپنے کلینک میں تفصیلی معائنہ کیا۔ ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا تھا۔ انہیں فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ آپریشن کرا لیں گے اگر ضرورت ہے۔

اسی رات میں نے کریم کو فون کر کے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں آپریشن کا پلان کروں، وہ خود بھی آ جائے گا۔ میں نے آپریشن پلان کر لیا مگر کریم نہیں آ سکا۔ اس کی مصروفیت تھی۔ آپریشن نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا تھا۔ کریم اور شازیہ دونوں کے بچوں کے اسکول کا وقت تھا۔ وہ دونوں نہیں آ سکتے تھے۔ آپریشن پھر ملتوی ہو گیا تھا۔

آپریشن اتنا مشکل نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ضروری تھی۔ میں نے ان کے گھر جا کر انہیں سمجھایا کہ آپریشن کرالیں۔ اگر کریم اور شازیہ نہیں ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے، میں تو ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے آپریشن تو میں روز کتنے ہی کرتا ہوں۔ اگر وہ لوگ مصروف ہیں، ان کے بچے اسکولوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اگر دونوں میں سے کسی کو بھی چھٹی نہیں ملتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ پریشان ہوتے رہیں۔

میں نے پھر کریم کو فون کر کے بتایا اور اس دن وہ اسپتال میں داخل بھی ہوگئے مگر آپریشن تھیٹر تک جانے کے بعد آپریشن سے انکار کردیا۔ ان کے چہرے پر وحشت عیاں تھی۔ وہ بار بار بیٹھ جاتے تھے۔ انہوں نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑا تھا، ان کے ہاتھ پسینے میں شرابور تھے۔ انہوں نے بڑی شرمندگی سے کہا تھا کہ نہیں آج آپریشن نہیں کراؤں گا۔ ان کا آپریشن پھر کینسل ہوگیا تھا۔

اسی روز شام کو میں اور نغمہ ان کے گھر گئے۔ گیٹ نوکر نے کھولا۔ ڈیفنس کے اس بڑے سے بنگلے میں ایک عجیب قسم کا سناٹا تھا۔ ہو کا عالم۔ باہر لان میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ دروازے کو دھکا دے کر ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ بڑے سے لاؤنج کے آخری سرے پر کریم کی امی بیٹھی ٹی وی پر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی تھیں، بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا، نغمہ کو پیار کر کے اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔

انکل کہاں ہیں؟ میں نے سوال ہی کیا تھا کہ وہ لاؤنج کے برابر والے کمرے سے نکلے۔ میں اٹھ کر گیا ان سے ہاتھ ملایا۔ ان کے چہرے پر ابھی تک ایک عجیب قسم کا تاثر تھا جیسے شرمندہ سے ہوں۔ انہوں نے میرا ہاتھ زور سے پکڑلیا اور بڑی شرمندگی سے دوبارہ بولے۔ ''مجھے معاف کردیا ہے نا.... تمہیں بہت تکلیف دی ہے میں نے۔ بہت پریشان کیا ہے۔ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔''

مجھے افسوس ہوا تھا۔ تھوڑی سی شرمندگی بھی۔ وہ ایک طرح کے احساسِ جرم کا شکار تھے اور مجھے ایک عجیب قسم کا احساس ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ سے مجھے پکڑ کر اسی کمرے میں لے گئے جہاں سے وہ نکل کر آئے تھے۔

''یہ کریم کا کمرا تھا اور اس کے برابر میں شازیہ کا کمرا ہے، شازیہ نے تو چلے ہی جانا تھا۔ اتنی دور میں نے سوچا نہیں تھا۔ بیٹیاں تو چلی جاتی تھیں مگر کریم کیوں چلا گیا تھا۔ دیکھو ہم نے یہ کمرا چھوا تک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمیں یقین تھا کہ وہ آجائے گا۔''

میں پہلے کبھی اس کمرے میں نہیں آیا تھا۔ بڑا سا بستر تھا جس کے سرہانے ایک بڑا سا پوسٹر تھا۔ بروس اسپرنگ، پھٹی ہوئی جینز پہنے سر کے گرد رومال باندھے گٹار لیے کھڑا تھا۔ باتھ روم کے دروازے پر ایک چمپینزی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس کے ہاتھ میں ٹوتھ برش تھا جس پر پیسٹ لگا رہا تھا۔ بستر کے برابر میں پڑھنے کی ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر کریم کی پرانی کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ ٹیبل کے اوپر ''ہیرالڈ'' کے کسی پرانے ٹائٹل کو پھاڑ کر دیوار پر چپکایا گیا تھا۔ ٹائٹل پر ایک مردہ فاختہ کی تصویر تھی جس کے اوپر امن کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس ٹائٹل کے ساتھ ہی پاکستان کا ایک جھنڈا بھی ذرا سا نیچے کر کے لگا ہوا تھا۔ الٹے ہاتھ کی دیوار پر ایک فریم میں کریم کی بچپن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار پر ایک اور بڑا سا پوسٹر مائیکل جیکسن کا لگا ہوا تھا جس میں اس نے دونوں ہاتھ کریم کی تصویر کی طرف اٹھائے ہوئے تھے یہ اس کی ناچتی ہوئی تصویر تھی۔ پوسٹر کے نیچے موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ ''آئی ایم بیڈ آئی ایم بیڈ۔'' (I am bad, i am bad) میں نے یہ کمرا پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے سے گھر کا یہ نیچے کا کمرا تھا۔ اب تو کریم پہلی منزل کے ایک بڑے سے کمرے میں ٹھہرتا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے ان کی چبھتی ہوئی مضبوط سی آواز آئی۔ ''کل میں یہ سارے پوسٹر اتار دوں گا۔ یہ کتابیں ردی میں چلی جائیں گی۔ یہ سائیکل جو کونے میں کھڑی ہے، مالی کے بیٹے کو دے دوں گا۔ یہ چھوٹی چھوٹی سیپیوں کا ڈھیر جو میں نے اور کریم نے ساتھ ساتھ کلفٹن پر جمع کیا تھا جس کو اس نے کبھی کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا، اسے میں سمندر میں دوبارہ پھینک آؤں گا۔ یہ اس کے اسکول کے زمانے کے ڈاک کے ٹکٹوں کا البم بھی رکھنا بے کار ہے۔ یہ گھر کے پرانے اخباروں اور کاغذوں کے ساتھ بک جائے گا۔ یہ کمرا اور اس کمرے کی چیزیں اب کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ ان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ رشتہ ہے جس نے مجھے بار بار تمہارے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ تم پرسوں میرا آپریشن رکھ لو۔ کریم کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دفعہ تم پریشان نہیں ہوگے۔ میں وہاں سے نہیں بھاگوں گا۔''

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آؤ چلو چائے پیتے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ماروی

محی الدین نواب

سولہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک دوسرے کی ہمت، کبھی پھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد او، ماروی، چاچا جھمرو اور چاچی منتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرہ احشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرہ احشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرہ احشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ احشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی بربادکر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا، محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف مجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی معصومیت کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرہ احشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا آکر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور منجھلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا اس کے ساتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کے راستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے ..... ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسائی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچادیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہی تھی، وہ مراد کو حاصل کرکے اور اس کے ساتھ کچھ وقت بتا کر اسے ریڈ الرٹ والوں کو پیش کرنے والی تھی جس کے بدلے اسے اور اس کے ڈیپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز کی رقم ملتی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے گا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب بونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ مراد کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے گھاگ اپلٹن یان تنظیم کی عورتیں سرگرم ہوگئیں۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آتی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ اس کا علاج ہونے لگا مراد پاکستان کے لیے روانہ ہوچکا تھا اور مرینہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس نے آنکھیں کھولیں پہلے چند ساعتوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے؟ پھر یاد آیا کہ وہ تو ائرپورٹ کی وزیٹرز لابی میں تھی۔

وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ ''یا حیرت...! میں یہاں کیسے آ گئی؟''

اس وقت وہ اپنے آرام دہ بیڈ روم میں تھی۔ وقت تماشے دکھاتا ہے۔ بدلتے ہوئے لمحات میں نام بدل دیتا ہے۔ صورت اور مقام بدل دیتا ہے۔ آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو تو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

یہ فوراً سمجھ میں آ گیا کہ وہی سونے اور جاگنے کا قصہ تھا۔ کبھی دماغ سو جاتا تھا اور وہ غائب دماغ ہو کر خود کو بھول جاتی تھی پھر دماغ جاگتا تو وہ ہوش و حواس میں آ جاتی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آ کر یہ سوچ کر جھنجلا گئی کہ ایسے ہی وقت دماغ ناکارہ کیوں ہو گیا تھا؟ جب وہ عبداللہ کبڈی اور ڈاکٹر ٹینی سن کو لندن جانے سے روکنا چاہتی تھی۔

پتا نہیں وہ بیماری کب تک اس پر مسلط رہنے والی تھی؟ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر کا کام ہے تسلی دینا' اس نے کہا تھا کہ اسے زود اثر دوائیں دی جا رہی ہیں۔ جلد ہی مہلک دواؤں کا اثر زائل ہو جائے گا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بڑبڑائی۔ پتا نہیں کب اثر زائل ہو گا۔ مراد عجیب طرح سے دشمنی کرتا آ رہا ہے۔ مجھے ایسی بیماری سے باندھ گیا ہے کہ میں پوری طرح ایکشن میں رہنے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ غائب دماغ ہو کر جیتی ہوئی بازی ہار جاتی ہوں۔ وہ ہار گئی تھی۔ مراد ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے ائرپورٹ میں ذرا فاصلے سے جگنی بائی کی باتیں سنی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی ورشا سے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے تمہیں آج کے دھوکے میں رکھ کر مراد کو پرسوں ہی یہاں سے روانہ کر دیا ہے۔''

وہ دھوکا کھا گئی تھی۔ اس نے ائرلینز ایجنسی سے معلوم کیا تھا کہ ڈاکٹر ٹینی سن بونے کبڈی کے علاوہ اپنے بیٹے کے ساتھ آج کی فلائٹ سے لندن جانے والا ہے جبکہ ڈاکٹر کا بیٹا یعنی مراد دو دن پہلے ہی لندن چلا گیا تھا۔

وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ ''پورا لندن میرے گھر جیسا ہے اور وہ جیسے میرے گھر میں ہی گیا ہے۔''

وہ پریشانی بھول کر مسکرائی۔ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''ہائے مراد! بہت چالاک بنتے ہو۔ بڑی چالاکی دکھا کر گئے ہو۔ اب خود ہی پھنس گئے ہو۔ وہاں مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکو گے۔ میں آج یا کل کسی بھی فلائٹ سے آ رہی ہوں۔''

ایک خیال آیا کہ مراد ''ME'' کے جاسوسوں سے بھی چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ اگر ڈائریکٹر جنرل کو معلوم ہو گا کہ میں ڈاکٹر ٹینی سن کے بیٹے ایمان علی کے پیچھے آئی ہوں تو اس کے جاسوس ایمان علی کو کرید کر اس کے اندر سے مراد کو نکال لیں گے۔

وہ سوچنے لگی۔ ' میں یہ ظاہر نہیں کروں گی کہ ایمان علی کو پکڑنے لندن واپس آئی ہوں۔ پھر بھی بونا کبڈی گڑبڑ کرے گا۔ وہ مراد کا ہم شکل بنا ہوا ہے۔ وہاں MET کے علاوہ دوسرے تمام دشمن اس پر نظر رکھیں گے۔ معلوم کرنا چاہیں گے کہ ایک بونا کس طرح مراد کا ہم شکل بن گیا ہے؟'

مختلف پہلوؤں سے سوچتے رہو تو پریشان کرنے والی اور باتیں بھی سمجھ میں آتی رہتی ہیں۔ ایک خیال آیا کہ ایسے وقت ایمان علی بھی ان کی نظروں میں رہے گا۔ مراد کی کسی غلطی سے حقیقت کھل سکتی ہے۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا مراد کسی دشمن کے ہتھے چڑھ جائے یا بے خبری میں مارا جائے۔ فی الحال تو اسے سیکیورٹی دینے کے لیے جلد سے جلد لندن جانا ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے برطانوی سفیر سے فون پر کہا۔ ''میں کسی بھی پہلی فلائٹ سے لندن جانا چاہتی ہوں۔ کسی بھی فلائٹ میں ابھی سیٹ او کے کرائیں۔''

''میڈم یہی ہو گا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔''

آدھے گھنٹے بعد جواب ملا۔ ''میں نے سیٹ او کے کرا دی ہے۔ کل ایک فلائٹ سے اسرائیل کے شہر تل ابیب جاؤ گی وہاں سے لندن کی کنکٹڈ فلائٹ میں تمہاری سیٹ کنفرم ہو گی۔''

یہ تسلی ہوئی کہ کل رات تک لندن پہنچ جائے گی لیکن یہ بے چینی تھی کہ مراد اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ مرینہ نے دہلی ائرپورٹ میں ورشا کو دیکھا تھا۔ وہ بڑے یقین سے ماں کے خلاف مراد کو پکڑنے وہاں آئی تھی۔ اس کے ساتھ تین بٹے کٹے جوان مرد بھی تھے۔ وہ یقیناً جاسوس ہوں گے یا کسی تنظیم سے تعلق رکھنے والے شوٹرز ہوں گے۔

بہرحال مرینہ کی طرح وہ بھی ناکام ہوئے تھے۔ وہ بھی جان گئے تھے کہ مراد دو روز پہلے ہی لندن چلا گیا ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ بھی ضرور مراد کو وہاں گھیرنے کی کوشش کریں گے، وہ بھی کسی فلائٹ سے لندن جا رہے ہوں گے۔ مرینہ یہ چاہتی تھی کہ اس سے پہلے کوئی مراد تک نہ پہنچے۔ جبکہ تمام دشمنوں کو اس کی اگلی منزل کا پتا معلوم ہو گیا تھا۔

وہ اور زیادہ بے چینی میں مبتلا ہو گئی۔ اپنے فون کو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دیکھنے لگی۔ اس نے نمبر پنچ کیے۔ پھر فون کو کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے زیرلب کہہ رہی تھی۔ ''مراد کہاں ہو...؟ پلیز اٹینڈ کرو۔ فون اٹھاؤ۔ فار گاڈ سیک مجھ سے باتیں کرو۔''

اس کی بے چینی تھم گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں، بولو؟ معلوم ہوتا ہے، ہوش میں ہو۔ غائب دماغ ہوتیں تو کال نہ کرتیں۔ خود کو بھولی رہتیں۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''ہائے مراد.....! کیسے کیسے مظالم ڈھاتے ہو۔ پہلے مجھے نیم مردہ کر کے سکھر کے اسپتال میں پہنچایا۔ دوسری بار بیچ بازار میں بے لباس کر کے تنہا چھوڑ دیا۔ تیسری بار میکرو فلم چھین کر مجھے نقصان پہنچایا اور اس بار مجھے ذہنی مریضہ بنا دیا۔

وہ ہائے کے انداز میں سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ہر بار یہی لگا کہ جان سے مار ڈالو گے یا نفرت سے کبھی میرا منہ بھی نہیں دیکھو گے لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم مجھے اپنے دل سے نہیں نکال سکو گے۔ میں درست کہہ رہی ہوں نا؟''

اس نے کہا۔ ''بولتی رہو، میں سن رہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تمہارے دل میں بھی چور ہے۔ تم ہر بار مجھے زندہ چھوڑ دیتے ہو۔ میں بھی ڈھیٹ ہوں۔ میرا یہ دل ہے کہ تم سے مات کھاتے رہنا چاہتا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''ہاں تم بہت اچھی ہو لیکن سر کا سودا کرنے والی سے صرف نفرت ہی کی جاتی ہے۔''

''مجھ سے کوئی قسم لے لو۔ تم نے مجھے بار بار زندہ چھوڑ کر میرے ضمیر کو جھنجوڑ دیا ہے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پتا نہیں، اب تمہارے دل میں جگہ بنا سکوں گی یا نہیں؟'' پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''آئندہ تم مجھ پر اعتماد کر دیا نہ کرو۔ میں تمہاری باڈی گارڈ بن کر رہوں گی۔ دشمنوں کو تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچنے دوں گی۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''میری یہ بات مانو مراد! تم نے لندن جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ریڈ الرٹ، ڈینجرس ریکٹ اور نہ جانے کتنی ہی دشمن تنظیمیں وہاں تمہارے قریب ہوں گی۔ مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ والوں سے اندیشہ ہے۔ میرے MET ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہیں پہچاننے کے لیے تمہارے آس پاس بھٹکتے رہیں گے۔''

وہ بولا۔ ''میٹ ڈیپارٹمنٹ کی سب سے خطرناک افسر تم ہو اور تم تو میرا نیا چہرہ بھی پہچانتی ہو۔ پہلی دشمن تو تم ہی ہو۔''

''مجھ پر اعتماد نہ کرو۔ میں نے تمہارے ساتھ جتنی خوب صورت راتیں گزاری ہیں ان تمام راتوں کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میری زندگی میں ایک ہی مرد آیا ہے اور وہ تم ہو۔''

وہ بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔ ''میں تمہاری سلامتی کے لیے جان کی بازی لگاتی رہوں گی۔ تم دیکھو گے کہ کسی دشمن کو تمہارے قریب پھٹکنے نہیں دوں گی۔''

''معلوم ہوتا ہے ضمیر بری طرح جھنجوڑ رہا ہے ٹھیک ہے، آنے والا وقت بتائے گا کہ تم میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کیا کرتی رہو گی۔''

''میں کل رات تک وہاں آؤں گی۔ تم سے دور رہا کروں گی لیکن وعدہ کرو۔ فون پر رابطہ رکھو گے۔''

''دور رہو گی تو یہ تمہاری دانشمندی ہو گی۔ یہ بتاؤ، کس فلائٹ سے آ رہی ہو؟''

''ائر انڈیا کی فلائٹ تل ابیب تک ہے۔ وہاں سے دوسری فلائٹ میں لندن جاؤں گی۔''

اس وقت ایک باڈی گارڈ نے دروازے پر دستک دی۔ وہ بولی۔ ''یس کم ان۔''

وہ اندر آ کر بڑے ادب سے بولا۔ ''میڈم! ڈاکٹر سے چار بجے کا اپائنٹمنٹ ہے۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''اوکے۔ جاؤ...''

باڈی گارڈ چلا گیا۔ وہ فون پر بولی۔ ''میں ابھی ایک سرجری کے ماہر کے پاس جا رہی ہوں۔ اپنی اصلی صورت واپس لانا چاہتی ہوں۔ تم نے جو سزا دی ہے، اسے اب ختم کرنے جا رہی ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اوہ، رات گئی بات گئی۔ جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالو۔ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ لندن آؤ۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد فون بند کر کے سوچنے لگا۔ اس وقت وہ لندن میں نہیں تل ابیب میں تھا۔ ڈاکٹر ٹینی سن نے دو روز پہلے اس کے لیے تل ابیب تک جانے کی سیٹ کنفرم کرائی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ''تم پہلی بار میرے بیٹے کی حیثیت سے میری فیملی کے لوگوں سے وہاں ملو گے۔ لہٰذا پہلے تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ میں کبری کے ساتھ وہاں پہنچ کر تمہیں فون کروں گا پھر تم تل ابیب سے لندن آؤ گے۔''

اگرچہ مراد نے اس فیملی کے تمام افراد کے نام اور چہرے اچھی طرح یاد کر لیے تھے، ان کے بارے میں اور بہت سی اہم معلومات حاصل کی تھیں پھر بھی ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ رہ کر ان لوگوں سے ملنا مناسب ہوتا۔ لہٰذا وہ تل ابیب پہنچ کر دو چار دنوں کے لیے رک گیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

ایک ایمانی جذبہ یہ تھا کہ وہاں جانے کا موقع ملا ہے تو وہ بیت المقدس کی تمام چھوٹی بڑی مسجدوں میں نمازیں پڑھے گا اور زیادہ سے زیادہ وقت وہاں گزارے گا۔

اب اتفاقاً یہ ہو رہا تھا کہ مریبہ کو براہِ راست لندن جانے کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ملی تھی۔ وہ دہلی سے تل ابیب اور تل ابیب سے لندن جانے والی تھی۔ یعنی مراد جہاں عارضی قیام کر رہا تھا وہاں پہنچنے والی تھی۔ یہی تقدیر کا تماشا تھا۔ دونوں کے ستارے ٹکرا رہے تھے۔ ویسے یہ اطمینان تھا کہ اس سے سامنا نہیں ہوگا کیونکہ وہ تل ابیب سے دور قبلۂ اول میں عبادت کر رہا تھا اور ڈاکٹر ڈیڈی کی کال آنے تک وہیں رہنے والا تھا۔

وہ بڑے جذبے سے اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ جب سے اس نے دل سے یہ عہد کیا تھا کہ گناہوں سے دور رہنے کے لیے پاک صاف رہے گا اور پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا رہے گا۔ تب سے اس کی زندگی میں ایک معصوم سی اور نامعلوم سی روحانی تبدیلی آئی تھی۔

وہ حج پور سے اب تک آزمائش کے کئی مراحل سے گزر چکا تھا۔ کئی حسیناؤں کی تنہائیوں میں آکر بھی گناہوں سے دور رہا تھا۔ جب بھی اس نے آخری فیصلہ کیا کہ مرجائے گا لیکن حوا کی بیٹی کو بدنیتی سے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تب ہی اس نے قدرت کا کرشمہ اور تقدیر کا تماشا دیکھا تھا، جس مرحلے پر گناہوں سے بچنا ناممکن ہوگیا تھا وہاں نماز نے اسے ممکن بنا دیا تھا۔

کتنے ہی لوگ بڑی دل جمعی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ان کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ کیونکہ نماز تقاضا کرتی ہے، نیک اعمال کا اور یہ کہ نمازی اپنا محاسبہ آپ کرے اور مراد یہی کرتا آرہا تھا۔ نماز کے ساتھ ساتھ اپنی قوتِ ارادی سے اپنے اعمال درست کرتا آرہا تھا۔ اسے دلی آسودگی حاصل ہو رہی تھی اور وہ رفتہ رفتہ اپنی ماروی تک پہنچنے ہی والا تھا۔

اس وقت وہ مسجد عمر بن خطاب میں ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان نرالی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی نماز پڑھتے پڑھتے کیا ہونے والا ہے؟ یہ وہ جگہ ہے، جہاں روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ مسجد میں نمازیوں کے درمیان تھا۔ التحیات پڑھنے کے بعد اس نے دائیں طرف منہ ..... پھیرا تو ایک دم چونک گیا۔ اسے اپنے برابر اپنا ہم شکل ایمان علی نظر آرہا تھا۔ وہ بھی نماز کی حالت میں تھا اور سلام پھیر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ دونوں یکلخت ذرا گھوم کر ایک دوسرے کے روبرو ہوگئے۔ مراد نے فوراً ہی پوچھا۔ ''تم ایمان علی ہو؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم ڈاکٹر ٹمنی سن کے بیٹے ہو؟''

''ہاں، کیا تم انڈیا سے آئے ہو؟''

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں، میں بھی ڈاکٹر ٹمنی سن کا بیٹا ایمان علی ہوں۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

مراد مزے لے رہا تھا۔ ''میں پہلے ڈیڈی کی طرح عیسائی تھا۔ پھر میں نے یہ دین قبول کرلیا ہے۔ پہلے میرا نام روبن سن تھا۔ تمہارا بھی یہی نام تھا نا؟''

''ہاں، مگر تم حیران کر رہے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہاں جس معبود کے آگے سجدہ کرنے آئے ہو، وہ یہی کرتا ہے، جو بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہ دکھاتا ہے۔''

وہ اس کے شانے کو تھپک کر بولا۔ ''فی الحال حیرانی کو بھول جاؤ۔ نماز پوری کرلو۔ بعد میں باتیں ہوں گی۔''

شدید حیرانی ہو اور تجسس پیچھا نہ چھوڑے تو نماز بھی پوری توجہ سے نہیں ہوتی۔ ایمان علی بار بار عبادت میں دل لگا رہا تھا لیکن حیرانی ذہن پر مسلط ہوگئی تھی۔ وہ ان لمحات میں بھول گیا تھا کہ اس کا باپ پلاسٹک سرجری کا ماہر ہے، چہرے بدل دیتا ہے۔

وہ نماز کے بعد مسجد کے صحن میں آکر بیٹھ گئے۔ ایمان علی نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آئینے کے سامنے ہوں اور اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا ہماری دنیا میں ہم شکل نہیں ہوتے؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''کبھی کبھی سننے میں آتا ہے۔ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''کیا محض ہم شکل ہونے پر حیران ہو؟''

''نہیں۔ حیرانی یہ ہے کہ تم بھی میری طرح کسی ڈاکٹر ٹمنی سن کے بیٹے ہو اور تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔''

وہ بُری طرح اُلجھ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم کہتے ہو کہ تمہارا نام بھی رابن سن تھا اور تم نے دینِ اسلام قبول کرکے اپنا نام ایمان علی رکھا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''تم مسجد میں بیٹھے ہو۔ تمہیں جھوٹا نہیں کہوں گا، لیکن میرا خیال ہے، تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور مجھ سے بہت کچھ چھپا کر تفریح کر رہے ہو۔''

''ہاں۔ میں تمہارے بارے میں... جانتا ہوں۔ اگر تم کچھ اور بتاؤ گے تو پھر میں اصل بات بتاؤں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''میں تمہیں اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''یہی کہ تم دین اسلام قبول کرنے کے بعد باپ کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟''

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے چپ رہا، پھر بولا۔ ''جب میں نے دین قبول کیا تو ڈیڈی نے کہا۔ تم میرے لیے مر چکے ہو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں نے سوچا۔ واقعی ان کا عیسائی بیٹا رابن سن ان کے لیے مر چکا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے عیسائی باپ کے گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔''

مراد نے پوچھا۔ ''تمہارے دل نے کیسے گوارا کیا کہ ایک بوڑھے باپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ؟''

''ڈیڈی ایسے بھی بوڑھے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں دفع ہو جاؤں گا تو وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ کئی بیٹوں کے باپ بن کر دکھائیں گے۔ میں نے سوچا کہ ڈیڈی نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اچھا ہے، اب کریں گے تو ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آجائیں گی۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''میں مسلمان ہو گیا۔ ہم باپ بیٹے کی زندگی گزارنے کے طور طریقے الگ ہو گئے۔ مجھے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہاں سے چلا آیا۔''

اس نے ذرا رُک کر کہا۔ ''میں انہیں بہت چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ابھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''مجھے یہ اطمینان ہے کہ ان کی دولت اور جائداد انڈیا سے لندن تک ہے وہ مجھ جیسے جوان بیٹے کے محتاج نہیں ہیں۔ میں نے سوچا، خدانہ کرے جب وہ محتاج ہوں گے، بڑھاپے میں بے یار و مددگار ہوں گے تو ان کی خدمت کے لیے واپس آجاؤں گا۔''

''ایک دو برس نہیں، پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں تم نے کبھی ان کی خبر نہیں لی۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ ڈیڈی میری جان ہیں۔ میں ان کی خیریت معلوم کرتا رہتا ہوں۔ پچھلے دو مہینوں سے اسرائیل میں نئے کاروبار کے باعث مصروف رہا۔ ان کی خیریت معلوم نہ کر سکا۔ ورنہ انڈیا جاتا آتا رہتا ہوں اور دور سے انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے ان کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ میں مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ میرے بھی ڈیڈی ہیں۔ میں ان کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ تم نہیں جانتے، وہ تمہیں اپنی آخری پونجی کی طرح شدت سے چاہتے ہیں۔ ان کی محبت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہو کہ انہوں نے تمہارے جانے کے بعد بھی دوسری شادی نہیں کی۔''

اس نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ مراد نے کہا۔ ''تمہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھتے رہنے کے لیے بڑے جذبے سے میرے چہرے پر تمہارا یہ چہرہ بنایا ہے۔''

اس نے چند لمحوں تک مراد کے چہرے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''ہر شخص کو اپنے پیدائشی چہرے سے محبت ہوتی ہے وہ بار بار آئینے میں خود کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ کیا تمہیں اپنے پیدائشی چہرے سے محبت نہیں تھی؟ یا چہرہ بدلنے کی کوئی خاص وجہ ہے۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں نے حالات سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔''

''پھر تو یہ لمبی کہانی یقیناً دلچسپ ہو گی۔ تم میرے اندر تجسس پیدا کر رہے ہو۔''

مراد مسکرانے لگا۔ وہ بولا۔ ''تم میرا چہرہ اپنا کر ڈیڈ کی زندگی میں میری کمی پوری کر رہے ہو۔ ہم ایک ہی چہرے کے رشتے سے آپس میں بھائی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے حالات سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔''

''درست کہتے ہو۔ بے شک، ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہونا چاہیے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''پلیز اپنی ہسٹری سناؤ۔ میرے بارے میں بھی جو سوالات کرو گے میں جواب دیتا رہوں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''لنچ کا وقت گزر چکا ہے اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کسی ہوٹل میں چل کر کھائیں گے اور میں اپنی روداد سناتا جاؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''ہوٹل میں کیوں؟ میرے گھر چلو، یہاں ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گا۔''

وہ اس کے ساتھ یہان علی کے مکان میں آ گیا، راستے میں اپنی ہسٹری سناتا رہا۔ کھانے کے دوران بھی اس کی روداد جاری رہی۔ وہ بڑی توجہ اور حیرانی سے سن رہا تھا۔

جب مراد خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ''بڑی عجیب زندگی گزار رہے ہو۔ جرائم کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہو اور محبت کے پھول کھلاتے جا رہے ہو۔ میں دعا کروں گا کہ جلد ہی اپنی ماردی کے پاس پہنچ جاؤ۔''

وہ کھانے کے بعد بولا۔ ''ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو؟''

''تمہاری ایک بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مراد نے پوچھا۔ ''کس بات کا؟''

''یہی کہ حسین عورتیں تمہاری تنہائی میں آتی رہیں اور تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ عورت حسین ہو، جوان ہو اور اداؤں سے بھری ہو۔ پاگل بنا دیتی ہو تو.....''

مراد نے پوچھا۔ ''تو.....؟''

''میں تو پھسل جاتا ہوں۔ حسین عورتیں میری کمزوری ہیں۔ تم نے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں بھی نہیں چھپا رہا۔''

''تم یا تو فطرتاً حسن پرست ہو یا تم نے حسین عورتوں کو اپنی کمزوری بنا لیا ہے۔ میری طرح قوتِ ارادی سے کام لوگے تو آسانی سے پاک دامن رہ سکو گے۔ تمہارا صحیح علاج یہ ہے کہ شادی کر لو۔ کسی شریف زادی کو لائف پارٹنر بنا لو پھر گناہوں سے بچتے رہو گے۔''

''خدا کا شکر ہے، اب تک گناہوں سے بچتا آ رہا ہوں۔ پچھلے پانچ برسوں میں چھ حسیناؤں سے شادیاں کر کے طلاق دے چکا ہوں۔''

مراد نے اسے تعجب سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ شادیاں کرتے رہے اور طلاق دیتے رہے؟''

وہ شادی، ازدواجی زندگی کو کھیل تماشا بنانے والی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''وہ یکے بعد دیگرے میری زندگی میں آتی رہیں۔ انہوں نے خود ہی پہلے سے کہہ دیا کہ ازدواجی زندگی سے دل بھر جائے گا یا مزاج بدل جائے گا تو علیحدگی اختیار کر لیں گی۔''

پھر اس نے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ ایسی عورتوں کی طرح میرا مزاج بھی ایسا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ میں کسی ایک عورت کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کسی ایک عورت کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟''

''کیا کروں؟ کمبخت عورتیں بھی میرے مزاج کے مطابق ملتی ہیں۔ تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تم اپنی ماروی کے سوا کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے اور میں اسے منکوحہ بناتا ہوں جو بعد میں منہ پھیر لے۔''

مراد اسے نصیحتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے پھر کسی وقت سمجھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ کیا عورتوں کی باتیں لے بیٹھے ہو۔ ان کا ذکر چھوڑو۔ اپنے ڈیڈی کی بات کرو۔ کیا ان سے ملنے کو جی نہیں چاہتا؟''

وہ بولا۔ ''جوانی میں عورتوں کی باتیں نہیں کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ ڈیڈی آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان کی خبر رکھتا ہوں۔ پھر یہ کہ تم میری کمی پوری کر رہے ہو۔ خدانخواستہ وہ بیمار ہوں گے یا کسی وجہ سے انہیں میری ضرورت ہوگی تو میں ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے پھر انہوں نے عصر کی نماز پڑھی اور ایمان علی اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھومتا رہا۔ ہوٹل سے اس کا سامان اٹھا کر بولا۔ ''تم میرے ساتھ رہو گے پھر جب بھی اسرائیل آؤ گے تو سیدھے میرے پاس آیا کرو گے؟''

مراد نے کہا۔ ''کیا میں ڈیڈی کو کال کروں؟ باپ سے باتیں کرنے کو دل چاہے گا؟''

وہ بولا۔ ''نہیں مراد! ایک عیسائی باپ اور ایک مسلمان بیٹا اپنے اپنے دین اور اپنی اپنی تہذیب کے مطابق الگ الگ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں اسی طرح گزارنے دو۔ ایک بات جو تمہیں نہیں بتائی وہ ابھی بتاتا ہوں۔''

مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''جب انہوں نے مجھے گھر سے نکالا تھا، تب میں نے کہا تھا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب اسی وقت آپ کا منہ دیکھوں گا جب آپ میرا دین قبول کر لیں گے۔ اگر بیٹے سے محبت ہے تو بیٹے کی راہ پر چلیں۔ ورنہ باپ بیٹے، ہم سفر نہیں بن سکیں گے۔''

''میرے دوست! ہمارا دین یہ نہیں کہتا کہ خون کے بنیادی رشتوں کو کاٹ دو۔''

وہ بولا۔ ''ایمان ایک نہ ہو تو دل بے ایمان ہو جاتے ہیں۔ خون کے رشتے محض رسمی لگتے ہیں۔''

مراد نے بحث نہیں کی۔ اس وقت حقیقت معلوم ہوئی کہ بیٹا عیسائی باپ کا منہ کیوں نہیں دیکھتا ہے اور باپ تھا کہ اپنے بیٹے سے شدید محبت کرنے کے باوجود اپنے مذہب سے پھرنا نہیں چاہتا تھا۔

نماز عشا کے بعد ایمان علی اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ کھانے کے دوران بولا۔ ''کبھی ہاتھوں سے پکاتا ہوں کبھی ہوٹل میں کھا لیتا ہوں۔ کوئی خوب صورت گھر والی نہیں مل رہی ہے۔ پچھلے چار مہینوں سے کنوارا ہوں اور گناہوں سے کتراتا آ رہا ہوں۔''

مراد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''تعجب ہے کوئی لڑکی کیوں نہیں مل رہی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ملتی ہیں، یہاں سے تل ابیب تک عیسائی اور یہودی لڑکیاں بہت ہیں لیکن بہت فلرٹ ہیں۔ بیک وقت کئی بوائے فرینڈز رکھتی ہیں۔ میں ایسی لڑکیوں سے دور بھاگتا ہوں۔ یہ کمبخت اوپر سے سدا بہار اور اندر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سے بیمار ہوتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیماری چھوڑ جاتی ہیں۔''

اس نے اپنی تین انگلیوں کو گنتے ہوئے کہا۔ ''ان چار مہینوں میں تین یہودی لڑکیاں پسند آئیں لیکن وہ کورٹ میرج کے لیے راضی نہیں ہوئیں۔ ہائے...! کیا بتاؤں کیسی کافر ادا دالی حسینائیں تھیں۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہارے حال پر ہنسی آرہی ہے، بے شک تم گناہ نہیں کرتے ہو لیکن گناہوں سے بچنے کا یہ طریقہ غلط ہے کہ کسی کو عارضی طور پر منکوحہ بناؤ پھر کچھ عرصہ گزار کر اس سے علیحدگی اختیار کرلو۔''

''اگر میں کسی عورت کی زندگی برباد کروں تو میرا طریقہ کار غلط ہے۔ اگر عارضی ازدواجی رشتہ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے تو غلط نہیں ہے۔ اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہم گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔''

''انسانی فطرت کو سمجھو۔ آدمی جب ایک غلطی کرتا ہے تو ایک کے بعد دوسری غلطیاں کرنے کے لیے طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتا ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ اپنا محاسبہ آپ کرو۔ اپنے آپ کو درست نہ سمجھا کرو۔''

''میری تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ میں غلطی نہیں کر رہا ہوں۔''

''میں نہیں کہہ سکتا تم کہاں تک درست ہو۔ بہتر ہے، علمائے دین سے فتویٰ حاصل کرو۔''

''چلو کرلوں گا۔ پلیز یہ روک ٹوک والی باتیں نہ کرو۔ ایک تو یونہی چار مہینوں سے کنوارا بیٹھا ہوا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''شام کو مرینہ آرہی ہے۔ اسے دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ دیوانے ہوجاؤ گے۔''

''ارے یار! تم نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ گناہ گار بننے کے بعد ہی توبہ کی ہے۔ اس کے بعد کسی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ارادے کا پکا ہوں۔ جب فیصلہ کرلیا کہ گناہوں سے بچنا ہے تو پھر بچ رہا ہوں۔''

پھر وہ ایک ذرا بے بسی سے بولا۔ ''خدا معاف کرے۔ کبھی کبھی بے اختیار اسے یاد کرنے لگتا ہوں اس کی باڈی لینگویج ایسی ہے کہ پاگل کردیتی ہے خدا کا شکر ہے کہ وہ بے وفا ثابت ہورہی ہے اور میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں۔''

''یعنی اب کبھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔''

''میں اپنی قوتِ ارادی سے کہتا ہوں' کبھی اسے اپنی تنہائی میں آنے نہیں دوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے، کل وہ آئے گی تو میں اسے ٹریپ کروں گا اور تمہیں اعتراض نہیں ہوگا۔ یار...! پکی بات کرو میں نہیں چاہتا کہ ہماری دوستی پر حرف آئے۔''

اس نے فراخ دلی سے مسکرا کر کہا۔ ''وہ میری کوئی خریدی ہوئی چیز نہیں ہے۔ تم اسے ہزار بار ٹریپ کرو لیکن نہیں کرسکو گے وہ کہتی ہے کہ اسے میرے سوا کوئی زیر نہیں کرسکے گا۔''

''یہ تو چیلنج کرنے والی بات ہے... ایسا کیا ہے کہ اسے تم زیر کرسکتے ہو، ہم نہیں کرسکتے۔''

''اس کے مزاج میں جارحیت اور بربریت ہے۔ وہ بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ وہ فائٹر ہے...؟ اور وہ بھی خطرناک...؟''

''میں نے اسے کئی بار شکست دی ہے، تب ہی وہ میرے پیچھے پاگل ہوکر دوڑتی رہتی ہے۔''

ایمان علی نے اپنے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔ ''ایسی حسینہ تمہیں ہی مبارک ہو.. میں پھول کو پھول کی نزاکت سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لات جوتے اور اٹھا پٹخ سے سارا رومانس غارت ہوجاتا ہے۔''

''چلو اچھا ہے، اس کی طلب سے باز آرہے ہو، لیکن میرا ایک کام کرو۔''

''ضرور کروں گا، بولو۔''

''میں شاید کل تک لندن چلا جاؤں۔ یہ چاہتا ہوں کہ جب تک لندن سے پاکستان نہ جاؤں تب تک مرینہ یہاں تل ابیب میں رہے، تم اسے دو چار دنوں تک یہاں روک سکو گے۔''

''میں کیسے روک سکوں گا؟''

''تمہیں اس سے کچھ کہنا نہیں ہوگا۔ کل وہ آئے گی تو دور سے اپنی ایک جھلک اسے دکھانا اور گم ہوجانا۔ وہ تمہیں مراد سمجھ کر پیچھا کرے گی۔ اگر چالاکی دکھا سکو تو اسے پورے اسرائیل میں اپنے پیچھے دوڑاتے رہو۔''

وہ بولا۔ ''ایک حسینہ کے ساتھ یہ بڑا دلچسپ کھیل ہوگا لیکن وہ کہیں نہ کہیں تو مجھے پکڑ ہی لے گی۔''

''کوئی بات نہیں، تم اس سے صاف صاف کہہ دو گے کہ مراد علی منگی نہیں ہو۔ ایمان علی ہو۔''

''وہ یقین نہیں کرے گی۔''

''ہاں۔ یہی سمجھے گی کہ میں تمہارے چہرے کے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ خود کو اس سے بھی چھپا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کسی طرح بھی کھیل تماشا کرتے ہوئے یہاں اسے رکنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔''

ایک حسینہ سے کھیل تماشا کرنے کی بات تھی اس لیے وہ راضی ہوگیا۔ ایسے ہی وقت ڈاکٹر ٹمنی سن نے فون پر اس سے پوچھا۔ ''کیا تل ابیب میں ہو؟''

مراد نے ایمان علی کو دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''یس ڈیڈ! کیا آپ لندن پہنچ گئے ہیں؟''

''ہاں، تم کل ہی کسی فلائٹ سے چلے آؤ۔''

''او کے۔ کسی بھی فلائٹ میں سیٹ کنفرم ہوگی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ کیا لندن پہنچ کر آپ کو بیٹا یاد آرہا ہے؟''

ایمان علی گہری سنجیدگی اور محبت سے مراد کے فون کو یوں دیکھنے لگا جیسے ایک مدت کے بعد باپ کو دیکھ رہا ہو۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہاں بیٹے! میرے ایمان علی کی بہت سی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔ پتا نہیں، وہ کہاں ہوگا؟ یہاں ائرپورٹ پر اترتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔''

مراد نے فون کا والیوم بڑھا دیا تھا۔ ایمان علی کے قریب کھسک کر اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ اُدھر باپ بڑے جذبے سے اپنے اندر چھپی ہوئی محبت کو اُجاگر کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میرا روبن سن... میرا ایمان اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اس امید پر آیا ہوں کہ شاید وہ نظر آجائے۔''

وہ ذرا چپ ہوا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''بیٹے مراد! یہ میری عمر کا آخری دور ہے۔ میں مرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھ کر کلیجے سے لگانا چاہتا ہوں۔''

ایمان علی یکبارگی تڑپ گیا۔ باپ کا لہو تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس نے مراد سے فون چھین لیا۔ مراد بے اختیار مسکرانے لگا۔

وہ فون کو اپنے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''کیوں ایسی جذباتی اور تڑپا دینے والی باتیں کر رہے ہیں؟ بیٹے سے اتنی ہی محبت ہے تو اس کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟

''کم آن ڈیڈ...! آپ ابھی بولیں۔ کلمہ پڑھیں گے؟ میں ابھی آپ کے پاس چلا آؤں گا۔ خدا کی قسم کسی بھی پہلی فلائٹ سے آجاؤں گا۔''

دوسری طرف ڈاکٹر ٹمنی سن پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ منہ کھل گیا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ گمشدہ بیٹے کی آواز سن رہا ہے۔

اسے گم ہوئے تقریباً چھ برس ہو رہے تھے۔ یقین کیسے آتا کہ مراد کی آواز سنتے سنتے اچانک بیٹے کی آواز سن رہا ہے۔

اس نے جذبات سے مغلوب ہوکر کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''بیٹے رابن.....'' اسے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''بیٹے ایمان.....! یہ تم بول رہے ہو؟'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہاں تم ہی ہو۔ میں تمہاری آواز تمہارا لب ولہجہ کبھی بھول نہیں سکوں گا۔''

اس نے آواز دی۔ ''مراد! تم کہاں ہو؟ مجھے یقین دلاؤ کہ میرا بیٹا تمہارے فون سے بول رہا ہے؟''

ایمان علی نے کہا۔ ''مراد میرے پاس بیٹھا ہے، میں اس کے فون سے بول رہا ہوں۔ مجھے ابھی جواب دیں میری خواہش پوری کر رہے ہیں یا نہیں؟''

باپ اُلجھن میں پڑ گیا۔ بیٹے نے کہا۔ ''اگر آپ باتیں بنائیں گے مجھے ٹالنے کی کوشش کریں گے تو فون بند ہونے کے بعد پھر کبھی میری آواز نہیں سن سکیں گے۔ میں یہ شہر یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں گا۔''

''نہیں بیٹے! ایسا نہ کہو۔ اب میں تمہیں گم ہونے نہیں دوں گا۔ تمہارے بغیر نہیں جیوں گا۔''

''تو پھر بولیں میری صورت دیکھنے کے لیے کیا کریں گے؟''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''آہ کیا کروں گا؟ بیٹے...! مجھے صرف دو دنوں کی مہلت دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے کلمہ پڑھ کر تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ مجھے اپنی کچھ مجبوریوں سے نمٹنے کا وقت دو۔''

''او کے ڈیڈ! میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ اب سے ٹھیک اڑتالیس گھنٹے بعد فون پر پہلے آپ کے منہ سے کلمہ سنوں گا۔ پھر آپ سے بات کروں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے فون مراد کو دے دیا۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڈ! میں مراد بول رہا ہوں۔ دیکھیے آپ نے مجھے بیٹا بنایا اور میں نے آپ کے بیٹے کو ڈھونڈ نکالا۔''

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''بیٹے! وہ تل ابیب میں ہی رہے گا نا؟ کہیں گم تو نہیں ہوجائے گا؟''

''نہیں ڈیڈ! آپ اطمینان رکھیں۔ ایمان علی نے ایک مسلمان کی زبان سے وعدہ کیا ہے، آپ اس کی دلی خواہش پوری کریں گے تو یہ دو دنوں تک یہیں رہے گا۔''

مراد نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کو

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

حوصلہ اور ایمان عطا فرمائے۔ آپ فون پر کلمہ پڑھیں گے تو وہ پہلی فلائٹ سے آپ کے پاس چلا آئے گا۔ اب میں فون بند کر کے لندن جانے والی کسی فلائٹ میں سیٹ حاصل کرنے جا رہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے ایمان علی کو دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ میں گم تھا۔ مراد سے نظریں ملیں تو وہ مایوسی سے بولا۔ ''ڈیڈی اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔''

''وہ تمہاری خاطر اپنے اندر خود سے لڑتے رہیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ کوئی کٹر عیسائی نہیں ہیں لیکن لندن میں ان کے بے شمار دوست احباب، عزیز و اقارب عیسائی ہیں۔ وہاں عیسائی کی حیثیت سے ان کا ایک سوشل اسٹیٹس ہے۔ وہ اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی سوسائٹی سے نکل کر مسلمان ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

''ایسا ہے تو انہوں نے دو دنوں کی مہلت کیوں لی ہے؟''

''انہوں نے اپنے آپ سے لڑنے اور میری طرف آنے کے لیے وقت لیا ہے۔ دو دنوں تک ان کے اندر شدید جنگ جاری رہے گی۔ پھر وہ بیٹے کو ہار جائیں گے۔ اپنی سوسائٹی میں جو نیک نامی ہے، اسے بحال رکھیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو۔ تم دو دنوں کے بعد ایک بار ضرور ان سے فون پر بات کرو گے۔ ہوسکتا ہے، تمہاری خاطر ان کی زبان پر کلمہ آ ہی جائے۔''

''میں وعدے کے مطابق ضرور ان سے رابطہ کروں گا اور ان کے لیے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگتا رہوں گا۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر وہ اپنے مزاج کے مطابق بولا۔ ''اس خشک موضوع پر بہت سی باتیں ہوگئیں۔ اب بس کرو۔ کتابِ رنگین کا کوئی خوب صورت باب کھولو۔''

مراد سوچ رہا تھا۔ یہ دو دنوں بعد باپ سے مایوس ہو کر پھر کہیں چلا جائے گا۔ اسے نظروں میں رکھنے کے لیے کسی حسینہ کی زلفوں سے باندھ کر رکھنا چاہیے پھر یہ کہیں گم نہیں ہوگا۔

ایمان علی نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ''تم حسن کے شیدائی ہو لیکن جو حُسن میں دیکھ چکا ہوں، وہ ابھی تم نے نہیں دیکھا ہے۔ انڈیا میں ایک ایسی حسین لڑکی ہے، جسے دیکھو گے تو میرا دعویٰ ہے، اس کے دیوانے ہو جاؤ گے۔ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو گے۔ اسی کے ہو کر رہ جاؤ گے۔''

کتابِ رنگیں کا باب کھل رہا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔ ''کیا وہ ایسی بے مثال ہے؟ کون ہے وہ؟ انڈیا میں کہاں رہتی ہے؟''

''میں نے اپنی روداد سناتے وقت جگنی بائی اور ورشا کا ذکر کیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں یار! وہ قدرت کا عجیب تماشا ہوا تھا۔ وہ چھپ کر تمہارا پیچھا کرتی ہوئی رات کو تنہائی میں آئی تھی۔ تمہیں بلیک میل کر رہی تھی۔ تم مجبور ہو رہے تھے، ایسے میں اس کی جوانی خون کے آنسو رونے لگی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ہنسنے لگا پھر للچائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''کیا واقعی وہ بہت حسین ہے؟''

''وہ اتنی حسین اور پرکشش ہے کہ حسیناؤں کے میلے میں سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔'' وہ اس کی طرف جُھک کر بولا۔ ''میں تمہیں گناہوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، وہ تمہارے مزاج کے مطابق ہوگی۔ تمہارے دل میں سما جائے گی۔ اسے دیکھنے کے بعد تم عارضی شادی خانہ آبادی سے باز آ جاؤ گے۔ ہمیشہ کے لیے اس کے ہو کر رہ جاؤ گے۔''

''پھر تو مجھے انڈیا جانا ہی ہوگا۔''

''جانے کی جلدی نہ کرنا۔ پہلے تمہیں میرا کام کرنا ہے۔ کل مرینہ یہاں آ رہی ہے۔''

''مرینہ.....!'' وہ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ''تم تو اس کے حسن کی بھی تعریفیں کر رہے تھے۔''

''ہماری دنیا میں حسن بکھرا پڑا ہے جو بھی حسین ہے، اس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔''

اس وقت اس کے دماغ میں دو حسینائیں سمائی ہوئی تھیں۔ اس نے مراد کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ مرینہ اور ورشا میں کون زبردست ہے؟''

''مرینہ کے حسن میں بارود بھری ہے اور ورشا پھولوں بھری ہے۔ کسی کو کسی سے کمتر نہیں کہا جا سکتا مگر ہاں ورشا اس لیے برتر لگے گی کہ بھی ان ٹچڈ ہے۔ تقدیر نے تمہارے انتظار میں اسے سنبھال کر رکھا ہے۔''

''پھر تو میں کل ہی.....'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر ذرا مایوسی سے بولا۔ ''جلدی نہیں جا سکتا۔ تمہارے کام نے اٹکا دیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرے یار...! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ابھی مرینہ کی طرف توجہ دو۔''

وہ ایمان علی کو مرینہ کے متعلق اور کئی اہم باتیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بتانے لگا۔ ایسے وقت کالنگ ٹون نے اسے پکارا۔ اس نے فون اُٹھا کر ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ ماسٹر کو بوبو اسے یاد کر رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ''یس ماسٹر...؟''

اسے بلال عرف بلّے کی آواز سنائی دی۔ ''میں بلّا بول رہا ہوں۔ ابھی ماسٹر کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے بلّے؟ تم نے ماسٹر کو شکایت کا موقع تو نہیں دیا ہے؟''

''شکایت کیسی؟ میں تو ماسٹر سے انعام حاصل کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے کہ میری ٹریننگ مکمل ہو گئی ہے۔ میں یہاں ٹریننگ حاصل کرنے والوں میں سب سے آگے نکل گیا ہوں۔''

''بہت مبارک ہو۔ تم نے ماسٹر کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ میں نے انہیں زبردست کام کا آدمی دیا ہے۔''

''ماسٹر تو تمہارے فین ہیں۔ اب میری بھی تعریفیں کرنے لگے ہیں۔ لو ان سے باتیں کرو۔''

ماسٹر کو بوبو کی آواز سنائی دی۔ ''ویل ڈن مراد! تم نے بلّے کی صورت میں ایک دوسرا زبردست مراد دیا ہے۔ میں نے بلّے کی ایسی جگہ تقرری کی ہے، جہاں یہ میرے اور تمہارے دشمنوں کی نیندیں حرام کر دے گا۔''

اس نے بتایا کہ وہ بلّے کو لندن بھیج رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''مجھے اپنا پروگرام بتاؤ، تم لندن کب جا رہے ہو؟ اسرائیل میں کب تک رہو گے؟''

مراد کے سامنے مرینہ کی صورت اُبھر آئی۔ وہ آنے والی تھی۔ اسے گھاس نہ ڈالنے کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ماسٹر...! ڈیڈی لندن پہنچ کر مجھے کال کریں گے، تب وہاں جاؤں گا۔ وہ میرے لیے نئی جگہ ہے۔ وہاں نئے مسائل ہوں گے۔ شاید کل یا پرسوں تک جا سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تک دشمن تم سے دور ہیں۔ تم بھی انہیں نظر انداز کرتے ہوئے آرام سے رہو۔''

ماسٹر سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ 'دشمن دور نہیں رہیں گے۔ وہ تو موت کی طرح پیچھے لگے رہتے ہیں۔'

☆☆☆

مرینہ اس وقت طیارے میں تھی۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے جیسے سو رہی تھی لیکن ذہن جاگ رہا تھا اور دشمنوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ تمام دشمن تنظیموں کے جاسوس جانتے تھے کہ وہ مراد سے ملنے کے لیے لندن سے دہلی گئی تھی۔ پھر کہیں گم ہو گئی تھی۔

اس شہر میں صرف مراد کو ہی نہیں، اسے بھی تلاش کیا جا رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ مراد نے اس کا چہرہ تبدیل کرا دیا تھا۔ وہ اسے دہلی میں دیکھتے ہوئے بھی پہچان نہیں پائے تھے۔

پھر موجودہ سفر کرنے سے پہلے ہی اس نے چہرے کی سرجری کرائی تھی اور اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ اکثر ہیرا پھیری کے باعث حواس پر چھا جاتی تھی۔ دشمنوں میں کھلبلی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کہاں گم رہنے کے بعد دہلی واپس آئی ہے؟

MET ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس اپنے ہی تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اچانک پھر لندن واپس جا رہی ہے۔ یوں یقین سے سوچا جا رہا تھا کہ مراد بھی کسی بھیس میں اس کے ساتھ رہے گا یا آگے جا کر وہ کہیں مرینہ سے ملنے والا ہے۔

لہٰذا دو جاسوس اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس جہاز میں اس کے ہم سفر تھے۔ مرینہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ان جاسوسوں کو نہیں پہچانتی تھی۔ اس کے باوجود ان میں سے ایک کو تاڑ لیا تھا۔ دوسرے جاسوس کا تعلق ریڈ الرٹ سے تھا۔ ائرپورٹ سے جہاز کے اندر آنے تک اس جاسوس کی حرکات و سکنات ایسی تھیں کہ وہ بھی مرینہ کی نظروں میں آ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ان جاسوسوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سے فون پر رابطہ رکھا ہوگا۔ یہ خبر آسمان سے زمین پر پہنچ گئی ہوگی کہ وہ ہوائی جہاز سے آ رہی ہے۔

وہ سب اپنے اپنے طور پر محتاط رہ کر بادلوں میں سفر کر رہے تھے۔ ہوائی سفر کے آغاز اور اختتام میں اتنی سختی سے چیکنگ ہوتی ہے کہ کوئی ایک ننھا سا ہتھیار بھی چھپا کر نہیں لے جا سکتا لیکن کسٹم چیکنگ کے بعد باہر آتے ہی مختلف تنظیمیں اپنے اپنے جاسوس اور شوٹرز تک خطرناک اسلحہ پہنچا دیتی ہیں۔

وہ تل ابیب پہنچ گئی۔ پھر کسٹم چیکنگ سے گزر کر وزیٹرز لابی میں آئی تو ایک شخص نے اس کے مطلوبہ ہتھیاروں کے ساتھ بلٹس سے بھرا ہوا ایک بیگ دیا پھر کچھ کہے سنے بغیر یوں چلا گیا جیسے اسے جانتا نہ ہو۔

ایسے ہی وقت مرینہ، مراد کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ اسے ایمان علی کے بہروپ میں پہچانتی تھی اور وہ ایمان علی مسافروں کی بھیڑ میں سے گزرتا ہوا اس کی طرف انجانے میں آ رہا تھا پھر اچانک ہی دوسری طرف مڑ گیا۔ اس عمارت سے باہر جا رہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وہ بیبیوں والی اٹیچی کو کھینچتی ہوئی ادھر جانے لگی۔ عورتوں مردوں اور بچوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ اسے رک رک کر آگے بڑھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایمان علی دوبار اس ہجوم میں گم ہو کر نظر آیا پھر تیسری بار دکھائی نہیں دیا۔

وہ عمارت کے باہر آ کر دور تک نظریں دوڑانے لگی۔ وہ ایک جگہ چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ فطرتاً حسن پرست تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''زبردست ہے، بہت ہی اسمارٹ اور پرکشش ہے۔ آنکھ مچولی کھیلنے کا مزہ آئے گا۔''

مراد نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ ایک خطرناک فائٹر ہے۔ یہ بات یاد تھی۔ اس نے دور سے مرینہ کو دیکھ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے رب نے یہ کیا ستم کیا ہے؟ ایسے تر و تازہ پھول میں بارود بھر دی ہے۔ مجھے محتاط رہنا ہوگا۔''

مرینہ نے فون نکال کر مراد کے نمبر پنچ کیے۔ معلوم ہوا کہ اس کا فون بند ہے۔ اس نے دوسرے نمبر پنچ کیے پھر ناکامی ہوگئی۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ 'کیا کرے؟ اتنے ہجوم میں اسے آواز بھی نہ دے سکی۔ دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا۔ ڈھونڈنے سے ربّ مل جاتا ہے۔ اسے ڈھونڈو۔۔۔'

اور وہ اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ بڑی دیر تک بھٹکنے کے بعد اس نے ڈائریکٹر جنرل کو فون پر مخاطب کیا۔ ''سر! میں ابھی تل ابیب پہنچی ہوں، یہاں دو چار دن رکنا چاہتی ہوں۔ آپ یہاں اپنے سفیر سے بولیں کہ میرے قیام کے سلسلے میں کسی طرح کی قانونی رکاوٹ نہ ہو۔''

ڈائریکٹر جنرل خوش ہو گیا کہ اب وہ چھپ نہیں رہی تھی۔ خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں ابھی فون کرتا ہوں۔ وہاں تمہیں ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔''

اس نے مرینہ سے رابطہ ختم کر کے اس جاسوس کو فون پر مخاطب کیا جو مرینہ کے پیچھے دہلی سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مرینہ نے اچانک ہی وہاں رکنے کا پروگرام بنایا ہے۔ یقیناً اپنے یار سے وہیں ملاقاتیں کرے گی۔ اس پر نظر رکھو۔ وہاں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے اور جاسوس ہیں۔ وہ کسی وقت تم سے رابطہ کریں گے۔''

عشا کا وقت ہو گیا تھا۔ ایمان علی اسے اپنی تلاش میں لگا کر ایک مسجد میں آ گیا۔ وہاں مراد موجود تھا۔ دونوں نماز ادا کرنے کے بعد کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایمان علی نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، وہ مجھے تلاش کر رہی ہوگی؟''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ سوچ کر مزہ آ رہا ہے کہ آج اس کی نیند اڑ جائے گی، جب تک اسے نظر نہیں آؤ گے وہ جاگتی اور بھاگتی رہے گی۔''

''اب مجھے کہاں جانا چاہیے۔ وہ کہاں ہوگی؟''

وہ دونوں مسجد سے کچھ فاصلے پر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد چاہتا تھا' وہ اُلجھی رہے۔ تل ابیب سے باہر نہ جائے۔ اس نے اپنے فون کی سم بدلتے ہوئے کہا۔ ''ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے مرینہ کے نمبر پنچ کیے اور وائڈ اسپیکر کو پوری طرح کھول دیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر بیل جاتی رہی پھر مرینہ کی پُرجوش آواز سنائی دی۔ 'ہائے مرینہ کی جان! کتنا تڑپاتے ہو۔ سچ بولو، فون کیوں بند رکھا تھا؟''

''میری مجبوری ہے۔ ابھی پھر بند کر دوں گا۔''

''مجبوری کیا ہے' مجھے بتاؤ۔ میں دور کر دوں گی۔''

''تم اپنی بات کرو۔ تم نے کہا تھا' پہلے کسی فلائٹ سے تل ابیب جاؤ گی پھر وہاں سے لندن جاؤ گی۔ میرا خیال ہے تم ابھی تل ابیب میں ہو۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو؟''

''میں تو لندن میں ہوں۔''

''جھوٹے کہیں کے۔ مجھ سے کیوں چھپ رہے ہو؟ جب میں وعدہ کر چکی ہوں کہ تمہاری مرضی کے خلاف قریب نہیں آؤں گی۔ ہم آئندہ پیار سے اور اعتماد سے ملتے رہیں گے تو پھر مجھ سے آنکھ مچولی کیوں کھیل رہے ہو۔ سچ بولو ابھی کہاں ہو؟''

''تم بولو کہ تم کہاں ہو؟''

''میں شیرٹن میں ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے کہاں جاؤں؟''

اس نے پوچھا۔ ''مجھے ڈھونڈنے کے لیے؟''

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں لندن میں ہوں اور تم مجھے وہاں ڈھونڈنا چاہتی ہو؟''

وہ اس کا جواب سُن کر مایوس ہو گئی۔ اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی پیار بھری ادائیں اسے متاثر نہیں کر سکتی تھیں اور وہ اپنے اس جھوٹ بولنے والے کا پیچھا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر بڑے اعتماد سے بولی۔ ''مرینہ کی جان! تم تل ابیب میں ہو۔''

وہ جیسے پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ۔ کک' کیا کہہ رہی ہو؟ کک کیا تم خواب میں مجھے وہاں دیکھ رہی ہو؟''

''پلیز مراد! مجھ سے نہ چھپو۔ میں نے یہاں تمہیں ائرپورٹ پر دیکھا ہے۔''

مراد نے فون بند کرتے ہوئے ایمان علی سے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''میں سم بدل رہا ہوں۔ وہ سمجھے گی کہ میں اس کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ اس لیے گھبرا کر فون بند کر دیا ہے۔''

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں ابھی کھانا کھانا ہے اور گہری نیند سونا ہے۔ کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے مجھے لندن جانا ہے۔ اس کے بعد چاہوں گا کہ تم پھر کہیں اسے اپنی جھلک دکھا کر چھپ جاؤ۔ کسی بھی طرح اسے دو چار دنوں تک یہاں سے جانے نہ دو۔''

''میں کوشش کروں گا۔ ابھی کہیں چل کر پیٹ بھرتے ہیں۔''

وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگے۔ مرینہ ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ مراد نے اچانک رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دوبارہ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے چور کو پکڑ لیا ہے اسی لیے اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا تھا۔

اس کی آواز سننے کے بعد وہ سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ سوچ رہی تھی، ہوٹل میں بیٹھے رہنے سے وہ نہیں ملے گا۔ اسے جا کر پکڑنا ہوگا لیکن کہاں جائے؟

ایک خیال آیا کہ وہ نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ تل ابیب اور حیفہ میں معلوم کرنا ہوگا کہ مسجدیں کہاں کہاں ہیں؟ وہ اُدھر کہیں نظر آ سکتا ہے اور مسلمان فیملی کے محلوں میں بھی تلاش کرنا ہوگا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی، اپنے ہینڈ بیگ میں سے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کو نکال کر چیک کیا۔ دو بھرے ہوئے میگزین رکھے۔ پھر بیگ کو شانے سے لٹکا کر ہوٹل سے باہر آ گئی۔

ہوٹل کے اندر اور باہر گائڈ گھومتے پھرتے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے آنے والوں کو اپنی راہنمائی میں پورے شہر کی سیر کراتے ہیں۔ یار کو ڈھونڈنے کے لیے ایک گائڈ ضروری تھا۔ وہ اسے مسلمان فیملیز میں لے جا سکتا تھا۔

وہ اپنی رینٹڈ کار کے پاس آئی تو ایک گائڈ نے آ کر پوچھا۔ ''میڈم! میں ایک مستند اور رجسٹرڈ گائڈ ہوں۔ تل ابیب اور حیفہ کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ ان شہروں کی تاریخی حیثیت بھی جانتا ہوں۔ پلیز میری خدمات حاصل کریں۔''

مرینہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''اس شہر میں کتنی مسجدیں ہیں؟''

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں مسلمان ہوں۔''

''الحمدللہ، میں بھی مسلمان ہوں۔ کبھی اس شہر میں تین مسجدیں تھیں، شہید کر دی گئیں۔ حیفہ میں ایک مسجد ہے۔ حیفہ دور نہیں ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔''

مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا ان دو شہروں میں مسلمانوں کی الگ آبادی ہے؟''

''نہیں مسلمانوں کو یکجا ہو کر رہنے نہیں دیا جاتا، ہر مسلمان کے مکان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں یہودیوں اور عیسائیوں کے مکانات ضرور ہوتے ہیں۔ یہ اسرائیلی حکمرانوں کی سیاسی حکمتِ عملی ہے۔ کیا آپ کو سیاست سے دلچسپی ہے؟''

''نہیں۔ یہ بتاؤ، یہاں مسلمانوں کے ریسٹورنٹ ہوں گے، جہاں ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت پکایا جاتا ہے؟''

''جی ہاں، تل ابیب میں چار اور حیفہ میں ایک ریسٹورنٹ ہے۔ آپ کو وہیں کسی ہوٹل میں حلال کھانا چاہیے۔''

وہ اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آؤ بیٹھو، مجھے ان ہوٹلوں کی طرف لے چلو۔''

وہ دوسری طرف سے آ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ''میرا نام نظام ہے۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ دو آدمی آپ کے پیچھے لگے ہیں۔''

مرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ان دونوں کو کیسے تاڑ لیا؟ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ میرے ہی پیچھے ہیں؟''

''ابھی ایک گھنٹا پہلے آپ ہوٹل میں آئی تھیں تو وہ دونوں ہوٹل کے اندرونی لابی میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ میں وہاں ایک مسافر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل قریب ہی ایک صوفے پر تھے۔ ان میں سے ایک آپ کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ''اس نے یہاں کمرا لیا ہے۔ مراد چھپ کر اس کمرے میں ملنے آئے گا۔''

یہ ایسی اطلاع تھی کہ اس نے تعریفی نظروں سے گائڈ کو دیکھا پھر کہا۔ ''تھینک یو نظام! تم نے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ تم میرے مزاج اور میرے مطلب کے آدمی ہو۔''

وہ عقب نما آئینے میں دیکھنے لگی۔ ہوٹل سے ایک موٹر سائیکل پر دو سوار چلے آ رہے تھے اور وہ مسلسل تعاقب میں تھے۔

اس نے پوچھا۔ ''نظام! کیا انہوں نے تمہیں میری کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا ہوگا؟''

''جب میں اس کار میں بیٹھ رہا تھا۔ تب میں نے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.urdutube.net/
http://www.bookstube.net/

ہوٹل کے بائیں طرف سے موٹر سائیکل میں انہیں آتے دیکھا تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں انہوں نے مجھے آپ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔''

''اور میں یقین سے کہتی ہوں' وہ ابھی تم پر گولیاں چلائیں گے۔ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرے ساتھ مراد بیٹھا ہوا ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں بچنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں سیٹ کے نیچے دبک کر بیٹھنے کی جگہ ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''تم روزی کمانے میرے پاس آئے ہو لیکن موت بھی ساتھ آئی ہے۔''

وہ بڑی بے باکی سے بولا۔ ''موت پیدا ہوتے ہی ساتھ لگ جاتی ہے پھر تمام عمر ساتھ چلتی رہتی ہے۔''

''میں نہیں چاہتی تم حرام موت مرو۔ ابھی آگے کہیں جیسے ہی گاڑی روکوں تم فوراً دروازہ کھول کر باہر دوڑتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا۔''

''شکریہ میڈم! ہم فلسطینی بزدل نہیں ہیں۔ پیدا ہوتے ہی گولیاں چلنے کی اور بم دھماکوں کی آوازیں سنتے ہیں اور اب تک سنتے اور جھیلتے چلے آرہے ہیں۔''

وہ اپنی سیٹ پر نیچے کی طرف کھسکتے ہوئے بولا۔ ''وعدہ کریں اگر میں بچ جاؤں گا تو آپ مجھے کچھ زیادہ انعام دیں گی۔''

''میں تمہارے دونوں ہاتھ نوٹوں سے بھر دوں گی۔ ہوشیار! وہ قریب آرہے ہیں۔''

نظام کھڑکی سے اور نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل قریب آرہی تھی۔ مرینہ نے انہیں گولیاں چلانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے کار کی رفتار بڑھائی تو انہوں نے بھی رفتار اور بڑھا دی۔ یہ مرینہ نے جھانسا دیا تھا۔ اس نے اچانک رفتار سست کی تو موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔

اس طرح وہ آگے جا کر کار کے سامنے آگئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پیچھے آکر فائر کرتے' مرینہ نے یکبارگی رفتار بڑھا کر موٹر سائیکل کو ٹکر ماری۔ ایسا حملہ ان کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ دونوں بائیک سے اچھل کر سڑک پر اور فٹ پاتھ پر گرے پھر وہاں سے لڑھکتے ہوئے ذرا دور تک چلے گئے۔

ان کے ہاتھوں سے اسلحہ چھوٹ گیا تھا، ان کی تو جان پر بن آئی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ان کے ریوالور اور پستول دکھائی نہیں دیے۔ مرینہ جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ وہ تو ان کی قبر تک انہیں دوڑانے والی تھی۔

وہ کار سے نکل کر ان پر گولیاں چلانے لگی۔ پہلے صرف انہیں زخمی کرنا چاہتی تھی۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ بھاگنے والی عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ دونوں بھی ٹکراتے ہوئے گرتے پڑتے جا رہے تھے۔

کئی ہوٹلوں کے سامنے کھانے پینے والوں کے لیے میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہیں ایک میز پر مراد اور ایمان علی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے دور ایک کار کو موٹر سائیکل سے ٹکراتے دیکھا۔ ٹکرا کر گرنے والوں کو احتجاج کرنا چاہیے تھا، لیکن وہ مجرموں کی طرح بھاگ رہے تھے۔

تب ان دونوں نے مرینہ کو کار سے نکل کر فائر کرتے ہوئے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ''ایمان! تم مرینہ کی نظروں میں نہ آؤ۔ ہوٹل کے اندر جا کر چھپ جاؤ۔''

بائیک سے گر کر بھاگنے والے مراد کی طرف آرہے تھے اور بار بار لوگوں سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک بھاگنے والا جب قریب سے گزرا تو مراد نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ گرا، دوسرے کے منہ پر اس کا ایک گھونسا پڑا۔ وہ دوسری طرف گھوم کر چکرا گیا۔ چند ساعتوں تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے بھاگ رہا تھا پھر پیچھے کیسے گھوم گیا؟

مرینہ نے ان کے گرے ہوئے ریوالور اٹھا کر ان کے پیچھے دوڑ لگائی تو اسے مراد نظر آگیا۔ اس کے اندر جیسے بجلی بھر گئی۔ جہاں موت کا بازار گرم تھا' وہاں اچانک ہی زندگی کا ساتھی مل گیا تھا۔ اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔ ''ایمان! میں آرہی ہوں، میرے پاس اسلحہ ہے۔''

وہ بولتے بولتے اچانک لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے ہاتھ پر آکر لگی تھی۔ یار کو پانے کی خوشی مہنگی پڑ گئی تھی۔ ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا تھا۔

پھر کئی سمتوں سے فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ معلوم ہوا کہ مرینہ کا پیچھا کرنے والے صرف وہ دشمن نہیں تھے جانے کتنے چھپ کر چلے آئے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مرینہ ہوٹل سے نکل کر جہاں جا رہی ہے، وہاں مراد ضرور ہوگا۔

بارود اور لہو کا ہر کھیل مراد کے لیے ہی تھا۔

وہ زمین پر لڑھکتی ہوئی، فٹ پاتھ سے گزرتی ہوئی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

ایک ہوٹل کے اندر آئی پھر فوراً ہی کمر بیلٹ سے دوسری گن نکال لی۔ وہ کئی ہتھیاروں کو زیور کی طرح پہن کر رہنے کی عادی تھی۔

اس نے ہوٹل کی چوکھٹ پر لیٹے ہی لیٹے مراد کی طرف دیکھا، وہ وہاں سے دو رفٹ پاتھ کی میز اور کرسیوں کے پیچھے زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے فائرنگ ہو رہی تھی اور وہ نہتا تھا۔ مرینہ نے آواز دی۔

''ایمان! یہ لو.....''

یہ کہتے ہی اس نے ایک ریوالور کو اس کی طرف پھینکا' وہ ریوالور زمین پر پھسلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اسے اٹھایا پھر ایک میز کو گرا کر اسے اپنے سامنے دیوار بنا لیا۔ اپنے دائیں بائیں سے کرسیاں کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لیں' اب کوئی گولی سیدھی آ کر اسے لگنے والی نہیں تھی۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ دوسری طرف کے فٹ پاتھ کے ساتھ جو دکانیں تھیں، وہاں سے ایک شوٹر گولیاں چلا رہا تھا۔ اس نے مرینہ کو ایک ہوٹل کی چوکھٹ پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے دیکھا پھر اس کا نشانہ لیا۔ اسی لمحے میں مراد نے اسے نشانے پر رکھ کر ایک ہی گولی سے اسے اڑا دیا۔ ایک طویل عرصے سے دن رات ہتھیار پکڑتے پکڑتے یہ مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

دوسرا شخص ایک دکان کی چھت کے سرے پر آ کر مراد کی طرف گولیاں چلانے لگا۔ وہ تمام گولیاں آ تو رہی تھیں لیکن میز اور کرسیوں سے ٹکرا کر اپنی سمت بدل رہی تھیں۔

اب وہ گدھا گاڑی والا اناڑی نہیں تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے ہوئے بھی بیچ نشانہ لیتا تھا۔ کوئی سا بھی ہتھیار ہو اس کے ہاتھوں میں آ کر کھلونا بن جاتا تھا۔ اس نے ریوالور کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر جم کر نشانہ لیا۔ چھت کے سرے سے ایک چھپے ہوئے دشمن کی آخری چیخ سنائی دی۔ وہ اوپر سے گرتا ہوا، دکان کے چھجے پر سے لڑھکتا ہوا فٹ پاتھ پر آ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ مرینہ نے مراد کی طرف ایک ہوائی بوسہ اچھالتے ہوئے کہا۔ ''جیو میرے یار! مرینہ تم پر یونہی نہیں مرتی ہے۔''

وہ نہیں جان سکتی تھی کہ جس ایمان علی کا پیچھا کر رہی تھی، وہ بدل گیا ہے۔ وہ اس پر صدقے واری ہوتی ہوئی ہوٹل کے اندر آ گئی۔ اسی لمحے میں ایک گولی آ کر چوکھٹ سے ٹکرائی۔ اگر وہ پیچھے ہٹنے میں ایک ساعت کی بھی دیر کرتی تو مراد کو بوسہ دینا مہنگا پڑ جاتا۔ وہ گولی اس کا بوسہ لے چکی ہوتی۔

وہ پتا نہیں کیسا شخص تھا۔ وہ خطرناک بلا اس کے لیے پاگل ہو جاتی تھی۔ ادھر حملہ کرنے والوں میں دو مر چکے تھے اور وہ بائیک والے دونوں شوٹرز فٹ پاتھ اور سڑک پر زخمی پڑے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آ گئی تھیں۔

لاؤڈ اسپیکر سے کہا جا رہا تھا۔ ''ہم وارننگ دے رہے ہیں، فائرنگ بند کرو اور ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیر لیا ہے۔ یہاں سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا۔''

مرینہ کی نظروں سے دور ایک شوٹر محاصرہ توڑ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ اسے گولی مار دی گئی۔ آخری شوٹر نے چیخ کر کہا۔ ''میں ہتھیار پھینک کر آ رہا ہوں۔ مجھ پر گولی نہ چلائی جائے۔''

فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ میدانِ جنگ سرد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر سے گولی نہیں چل رہی تھی۔ مسلح سپاہی گھیرا تنگ کرتے کرتے وہاں آ گئے، جہاں مرینہ ہوٹل میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے پولیس افسر کو آئی ڈی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم مرینہ دلاور اے میٹ آفیسر فرام لندن ہیڈ آفس۔''

پولیس افسر نے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بولی۔ ''یہاں ایک شخص میری مدد کر رہا تھا۔ ساتھ والے ہوٹل کے سامنے چھپا ہوا دشمنوں کی فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دے رہا تھا۔''

افسر نے کہا۔ ''میں ابھی اسی ہوٹل سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس کے پاس اسلحہ ہو۔ آپ خود چل کر دیکھ سکتی ہیں۔ ہم نے ہر ایک کی تلاشی لی ہے۔''

وہ پولیس والوں کے ساتھ چلتی ہوئی اس ہوٹل کے سامنے آئی۔ ''میز اور کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ مراد نے انہیں ڈھال بنایا تھا۔ اب وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوٹل والوں نے کہا کہ وہ پچھلے دروازے سے نہیں چلا گیا ہے۔

وہ دوڑتی ہوئی پچھلے دروازے سے باہر آئی ادھر ایک تنگ گلی کے ساتھ رہائشی مکانات تھے' لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جھنجلا گئی' کیسا ہرجائی تھا۔ پاس آتے آتے پھر دور ہو گیا تھا۔

پولیس افسر نے آ کر پوچھا۔ ''پتا نہیں کون تھا؟ سب نے دیکھا ہے اس نے بڑی جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ وہ میری مدد نہ کرتا تو میں تنہا ماری جاتی۔''

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ مراد مجبور ہو کر اس سے ملے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بغیر چلا گیا ہے۔ وہاں رہتا تو پولیس تھانے کے چکر میں پڑ جاتا اور یوں دشمنوں کی نظروں میں آجاتا۔ اب تک کسی نے اسے ایمان علی کے بہروپ میں نہیں پہچانا تھا۔ صرف مرینہ پہچانتی تھی اور پہچان کر بھی دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ ایمان علی کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ وہ اسے تلاش کرنے ہوٹل سے نکلی تھی اور صحیح منزل تک آپہنچی تھی لیکن دشمنوں کی عداوت نے منزل کو پھر اس سے دور کر دیا تھا۔ گائڈ نظام نے آکر کہا۔ ''میڈم! میرے لیے کیا حکم ہے؟''

مرینہ نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''تم بہت اچھے ہو اور دلیر بھی ہو، لیکن میرے ساتھ گائڈ بن کر رہو گے تو تمہاری شامت آجائے گی۔ مجھ سے دور ہی رہو۔''

اس نے گائڈ کو پانچ سو ڈالرز دیے۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں خطرات سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اگر آپ ساتھ رکھنا چاہیں تو حاضر ہوں۔''

اس نے نظام کو دیکھتے ہوئے سوچا پھر کہا۔ ''ابھی ایک شخص مجھ پر حملہ کرنے والوں پر گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے لیے فائٹ کر رہا تھا۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا؟''

''میں دور سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔''

''کیا اسے صورت سے پہچان سکو گے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''وہ بہت دور تھا، پھر وہ میز اور کرسیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔''

وہ ذرا مایوس ہوئی پھر بولی۔ ''اس کا نام ایمان علی ہے وہ دہلی سے آیا ہے اسے لندن جانا ہے۔ پتا نہیں یہاں کیوں رک گیا ہے۔ اگر تم اسے تلاش کرو گے اور مجھے اس کے بارے میں اطلاع دو گے تو تمہیں ایک ہزار ڈالر دوں گی۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں اسے جی جان سے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

وہ پھر ایک بار مراد کے قریب ہونے کے لیے اندر ہی اندر مچل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کسی بھی طرح اس کے کسی پتے ٹھکانے پر پہنچاؤ گے تو میں پانچ ہزار ڈالرز بھی دوں گی۔''

''پھر تو میں اسے صبح تک ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''وہ پکا نمازی ہے۔ مسجدوں کے آس پاس ضرور ملے گا۔ مسلمانوں کے ہوٹلوں میں کھانے کے لیے جاتا ہوگا۔''

''سمجھ گیا میڈم! میں اسے یہاں کے تمام مسلم گھرانوں میں بھی تلاش کروں گا۔''

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ مارچ 2015ء کی جھلکیاں

استاد ادیب

اردو ادب کی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

خزانہ

دنیا بھر میں اِدھر اُدھر مدفون خزانوں کا تذکرہ

ستم گار

خبر داران بدنام ترین شہروں سے دور رہیں

خیرہ سیانا

اس نے چھوٹے بھائی کو دل بھر کر ستایا جواباً چھوٹے نے بھی وار کر دیا جس سے وہ عمر بھر تلملاتا رہے گا۔ ایک سبق بھری سچ بیانی

لمحہ الفراق

مرحوم علی سفیان آفاقی کی آخری تحریر جسے آپ محفوظ رکھنا پسند کریں گے

ان کے علاوہ

طویل سرگزشت ''سراب'' جس کے پیچ و خم نے قارئین کو مسحور کر رکھا ہے۔ دنیا بھر سے دلچسپ و معلومات بھرے قصے، سبق آموز واقعات اور دل کو چھو لینے والی سچ بیانیاں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وہ اپنی رینٹڈ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ دل اس پر اٹک گیا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے فون پر مراد سے رابطہ کرنا چاہا۔ اس کے دونوں نمبر پنچ کیے پتا چلا کہ وہ دونوں نمبر بند ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس سے کترا رہا ہے۔ اس سے یہ کہہ چکا تھا کہ وہ اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں سے ایک ہے اس کی کمپنگی کا ثبوت فرنچ لینگویج کے ذریعے مل چکا تھا۔

وہ آسانی سے اس پر بھروسا کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ہتھیلیوں پر انگارے بھی رکھ کر قسم کھائے گی' تب بھی اس پر اعتماد نہیں کرے گا۔ ہاں، کبھی اس کی محبت اور وفاداری کا ثبوت ملے گا' تب اس سے ضرور دوستی کرے گا اور تب تک اس سے دور رہا کرے گا۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جاتے ہوئے زیر لب بڑبڑانے لگی۔ ''وہ اسی لیے مجھ سے ملے بغیر چلا گیا ہے۔ فون کی سم بھی بدل دی ہے۔ لیکن ایک بات ہے مجھ سے دور رہنے کے باوجود میرا دیوانہ ہے۔ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے، ابھی اس نے میری ہی خاطر حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں اسے جلد ہی منالوں گی۔ کسی بھی طرح پھر اس کے دل میں جگہ بنالوں گی۔''

وہ بہت ہی ضدی اور مضبوط قوتِ ارادی والی عورت تھی۔ مرتے دم تک اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

گائڈ نظام ائرپورٹ میں کام کرنے والے چند اہم افراد سے شناسائی اور دوستی رکھتا تھا۔ اس نے ایک جونیئر افسر سے کہا۔ ''دو روز پہلے ایمان علی نام کا ایک شخص دہلی سے یہاں آیا تھا۔ کیا یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اسے یہاں کتنے دنوں تک قیام کی اجازت ملی ہوگی؟''

افسر نے پوچھا۔ ''یہ جاسوسی کیوں کر رہے ہو اور کس کے لیے کر رہے ہو؟''

نظام نے کہا۔ ''بیچاری ایک خاتون اس کے عشق میں مبتلا ہے۔ اسے تلاش کر رہی ہے۔ میں اس سے نیکی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس افسر نے عارضی قیام کرنے والے مسافروں کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا، وہ دہلی سے آنے والا ایمان علی دوسرے دن صبح دس بجے کی فلائٹ سے لندن چلا جائے گا۔

نظام نے فوراً ہی مرینہ سے فون پر کہا۔ ''میڈم آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔ وہ ایمان علی کل دس بجے کی فلائٹ سے لندن جانے والا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا؟''

''میری اطلاع ناقص نہیں ہوگی۔ آپ اپنے ذرائع سے معلوم کرسکتی ہیں۔ کل لندن جانے والے مسافروں کی فہرست میں ایمان علی کا بھی نام ہے۔''

''تھینک یو نظام! تمہارے ایک ہزار ڈالرز پکے ہوگئے۔ اگر وہ مجھے مل جائے گا میں اس سے باتیں کرسکوں گی تو تمہیں پانچ ہزار ڈالرز ضرور دوں گی۔''

اس نے سفارت خانے کے ذریعے معلوم کیا' نظام کی اطلاع درست نکلی۔ وہ سوچنے لگی۔ ''مراد کو لندن ہی جانا تھا۔ پتا نہیں یہاں تین دنوں کے لیے کیوں رک گیا تھا۔ کل ائرپورٹ پر اسے پکڑوں گی تو وہ حیران رہ جائے گا۔''

وہ اسے پکڑنے کے خیال سے مسکرانے لگی۔ یقین سے سوچنے لگی۔ ''وہ مجھ سے فون پر بات کرتا ہے تو کل روبرو بھی بات کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی۔ ''مراد مجھ سے یونہی کتراتا ہے۔ میں اس کے دل میں گھسی ہوئی ہوں۔ آج اس نے حملہ کرنے والوں سے میری خاطر جنگ لڑی ہے۔ ہائے مراد! تم پر قربان ہو جاؤں۔ مجھ سے ایک بار تو ملو۔''

دوسرے دن ملنے کی بے چینی تھی۔ اس نے وہ رات سوتے جاگتے گزاری۔ دوسری صبح پانچ بجے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ریڈ الرٹ، ڈینجرس ریکٹ اور دوسری تنظیموں نے اس ہوٹل کے ملازموں کو اچھی خاصی رقم دی تھی۔ وہ اس کے لیے مخبری کر رہے تھے۔ صبح چھ بجے ان ملازموں نے اطلاع دی کہ مرینہ نے ناشتے کا آرڈر دیا ہے۔

اس اطلاع سے سب ہی چوکنے ہوگئے۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ پتا نہیں کب سے جاگ رہی ہے اور مراد سے رابطہ رکھتی آ رہی ہے۔ تبھی صبح ناشتا کرنے والی ابھی ضرور کہیں باہر جائے گی۔

پھر تو سب ہی اٹھ بیٹھے۔ بستر چھوڑ کر اپنے ساز و سامان سے، ہتھیاروں سے لیس ہوکر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے ہوٹل کے آس پاس پہنچ گئے۔

مراد اور ایمان علی نے طے کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ اس کے وہاں سے روانہ ہونے تک ایک دوسرے سے فون کے ذریعے رابطہ رکھیں گے۔

ایک تو وہ ہم شکل تھے۔ لوگ انہیں حیرانی اور دلچسپی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سے دیکھتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اچانک کہیں مرینہ سے سامنا ہوسکتا تھا۔ اس سے کسی بھی طرح یہ حیرت انگیز حقیقت چھپانا چاہتے تھے کہ تل ابیب میں ایک نہیں دو ایمان علی ہیں۔ ابھی وہ دونوں اسے بھٹکانے کے سلسلے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ اور وہ ایک وقت میں ایک ہی ایمان علی کو دیکھ کر دھوکا کھاتی چلی آرہی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ مرینہ ائرپورٹ جانے کے لیے ہوٹل سے نکلی تو کتنے ہی انجانے دشمن اس کی کار سے فاصلہ رکھ کر تعاقب کرنے لگے۔ وہ اناڑی نہیں تھی۔ تعاقب کرنے والوں کو ان کے طریقہ کار سے تاڑ رہی تھی۔

نظام نے فون پر کہا۔ ''میڈم! میں ائرپورٹ پر ہوں لیکن ایمان علی کو صورت سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہ یہاں موجود ہوگا۔ آپ جلدی آنے کی کوشش کریں۔''

وہ تعاقب کرنے والوں پر نظر رکھتی ہوئی' تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی بولی۔ ''میں آرہی ہوں۔ راستے میں ہوں۔''

اس نے فون بند کرکے کار کی رفتار بڑھادی۔ ایمان علی ایک پیٹرول پمپ میں ٹنکی فل کرا رہا تھا۔ اس نے مراد سے فون پر پوچھا۔ ''کیا ائرپورٹ پہنچ گئے ہو؟''

مراد نے جواب دیا۔ ''ابھی پہنچا ہوں۔ کسٹم چیکنگ سے گزرنے کے بعد اندر جاؤں گا۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ مجھ سے تو کبھی چھپ کر نہیں رہو گے؟''

''کبھی نہیں۔ ڈیڈی کلمہ پڑھیں یا نہ پڑھیں' میں ان سے ملوں یا نہ ملوں لیکن تم سے چھپ کر نہیں رہوں گا۔ فون پر ہمارا رابطہ رہے گا اور ہم ضرورت کے وقت ملتے رہیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''خدا تمہیں خوش رکھے اور تمہیں سلامتی دے اور مرینہ کو تمہارے پیچھے دوڑاتا رہے۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ پھر ایمان علی نے کہا۔ ''سلامتی کیسے ملے گی؟ تم تو یہاں سے جارہے ہو اور میرے پیچھے مرینہ کو اور جانے کتنے دشمنوں کو لگا چکے ہو۔''

وہ یقین سے بولا۔ ''جب تک وہاں مرینہ رہے گی کسی دشمن کو تمہارے سائے تک پہنچنے نہیں دے گی۔ اپنے مزاج کے مطابق رومانٹک باتیں سوچو۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ ہندوستان میں پیدا ہوکر تمہارا انتظار کررہی ہے۔''

اس نے ایمان علی کا اسٹیئرنگ انڈیا کی طرف گھما دیا۔ وہ اسی طرح بہلا کر اسے اپنے کام کے قابل بنا سکتا تھا۔ وہ واقعی خیال رنگینی میں گم ہوکر بولا۔ ''درشا..... ہائے! میں یہاں ہوں اور پھول انڈیا میں کھل رہا ہے۔ میں تمہاری مرینہ کو یہاں زیادہ سے زیادہ تین دنوں تک روکوں گا۔ اس کے بعد دیارِ معشوق کی طرف روانہ ہوجاؤں گا۔''

مرینہ تیزی سے کار ڈرائیو کررہی تھی۔ جلد سے جلد مراد کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ آگے جانے والی ٹھٹک گئی۔ کھڑکی کے باہر اس کی نظر تھی۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ دوسری سڑک کے پیٹرول پمپ پر وہ نظر آرہا تھا۔

اس نے حیران ہوکر کار کی رفتار سست کی۔ اسے اچھی طرح دیکھا۔ پوری طرح یقین کیا کہ وہ ایمان علی کے بہروپ میں مراد ہی ہوسکتا تھا۔

وہ فون پر باتیں کرتا ہوا اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ مرینہ ٹریفک کے ہجوم میں چیخ کر اسے پکارتی تو آواز وہاں تک نہ جاتی اور وہ اپنی کار فوراً ادھر نہیں لے جاسکتی تھی۔ ون وے پر تھی۔

اسے آگے کہیں کٹ ملتا تو اس راستے پر جاسکتی تھی۔ وہ تڑپ گئی۔ اس کے سامنے مراد گاڑی اسٹارٹ کرکے جا رہا تھا۔ وہ رفتار بڑھاتی ہوئی آگے' کسی کٹ یا موڑ کی طرف جانے لگی۔

وہ پیچھے بھاگتے بھاگتے اسے پکڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ آگے جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا لیکن اس نے اپنے فرینڈ یار کو کار میں بیٹھ کر کسی اور راستے پر جاتے دیکھا تھا۔ یعنی وہ ائرپورٹ پر نہیں جارہا تھا۔ جبکہ فلائٹ کی روانگی کا وقت ہورہا تھا۔

وہ اگلے کٹ پر اپنی گاڑی کو اس سڑک پر لے آئی۔ تیز رفتاری سے سیدھی سڑک پر جانے لگی لیکن مشکل یہ تھی کہ سڑکیں صرف سیدھی نہیں جاتیں۔ اکثر دائیں بائیں سے کئی سڑکوں کی شاخیں نکلتی رہتی ہیں۔

اس نے ایک جگہ رک کر پریشان ہوکر سوچا۔ کدھر جائے، دائیں یا بائیں؟ یا پھر سیدھی دوڑتی رہے۔ پتا نہیں وہ کتنی دور نکل گیا ہوگا؟ جانے کہاں گیا ہوگا؟

اس نے فون نکال کر رابعہ کیا۔ خلاف توقع مراد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، کیا تمہیں نیند نہیں آتی۔ صبح ہوتے ہی کال کررہی ہو۔''

وہ بولی۔ ''بہت پہلے ہی صبح ہوچکی ہے۔ آٹھ بج کر تیس منٹ ہوچکے ہیں اور تمہاری بس بجے کی فلائٹ ہے۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''اوگاڈ! تم یہ تک جانتی ہو کہ میں دس بجے کی فلائٹ سے جانے والا ہوں؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میری دیوانگی کا اندازہ کرو کہ تمہیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

کتنی شدت سے چاہتی ہوں۔''

''ہاں، مگر تمہاری معلومات درست ہونے کے باوجود غلط ہوگئیں۔ میں جانے والا تھا۔ اب نہیں جارہا ہوں ایک ضروری کام سے رک گیا ہوں۔''

''یہی میں دیکھ رہی ہوں۔ تم ائرپورٹ کے بجائے سی پورٹ کی طرف جارہے تھے۔''

عجیب حالات تھے کہ وہ صحیح معلومات بھی حاصل کر رہی تھی اور ان دونوں کے درمیان بھٹک بھی رہی تھی۔ کامیاب ہوتے ہوتے ناکامی کے موڑ پر آگئی تھی۔

ایمان علی نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''بائی گاڈ.....! تم مجھے حیران کررہی ہو۔ یہ بھی جانتی ہو کہ میں ابھی کن راستوں سے گزر رہا ہوں؟''

وہ فاتح کے انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر فون کو دیکھا وہ بند ہوگیا تھا۔ مراد نے حیرانی سے رابطہ ختم کردیا تھا۔ مرینہ کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ابھی ایک فلائٹ سے جارہا ہے۔

اب وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایمان علی اسے بھٹکانے میں کہاں تک کامیاب رہے گا۔ اس نے فوراً ہی ایمان سے فون پر پوچھا۔ ''کیا تم سی پورٹ کی طرف جارہے ہو؟''

اس نے پوچھا۔ ''ہاں، تم کیسے جانتے ہو؟''

''میں نہیں جانتا۔ وہ بلائے جان ہم سے زیادہ جانتی ہے۔ تمہارے پیچھے لگی ہے۔ اسے کسی طرح ڈاج دو۔''

''نو پرابلم۔ ابھی اسے بھٹکاؤں گا۔''

وہ اپنی کار کو ایک جگہ روک کر اسے لاک کرکے پھرتی سے ایک گلی میں گھس گیا۔ تیزی سے دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا دوسری سڑک پر پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جانے لگا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھتے ہوئے فون پر رینٹڈ کار والوں سے کہا۔ ''پلیز مسٹر...! سی پورٹ روڈ پر آپ کی کار کھڑی ہے۔ اسے لے جائیں۔ میں ابھی آکر دوسری کار لے جاؤں گا۔''

وہ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد کامیاب ہوگئے۔ مرینہ اپنی ذہانت اور حاضر دماغی کے باوجود ایمان علی کے پیچھے بھاگتی رہ گئی اور وہ جہاز میں آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اِدھر یہ جارہا تھا۔ اُدھر ایمان علی گم ہوگیا تھا۔ اور وہ ان دونوں کے درمیان بھٹک رہی تھی اور صرف وہی نہیں اس کے پیچھے اور بھی کئی دشمن پیٹرول پھونکتے جارہے تھے۔

جہاز فضا میں بلند ہوکر پرواز کررہا تھا۔ وہ آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے مسافروں کے درمیان تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ ویسے انگاروں پر چلنے والوں کو آرام کہاں ملتا ہے؟ ایک مصیبت جاتی ہے تو دوسری شامت آجاتی ہے۔ ستارے گردش میں ہوں اور خطرے کی گھنٹی سنائی نہ دیتی ہو تو بے خبری میں معلوم نہیں ہوتا کہ آرام حرام ہوگیا ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ دشمن بھی ہم سفر ہیں۔ وہاں ایک ایسا شخص تھا، جو اس کے تمام دشمنوں کا باپ تھا۔ اسی نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز لگائی تھی اور بے شمار دشمنوں کو اس کے پیچھے لگادیا تھا اور وہ تھا 'سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ' کا سربراہ میکی براؤن۔

مراد جہاں بیٹھا ہوا تھا، وہیں آگے والی سیٹ پر وہ اپنے ایک دست راست کے ساتھ بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ وہ دشمن ابھی یہ نہیں جانتا تھا کہ جس کی ہلاکت کا وہ متمنی ہے، وہ خطرناک دشمن پیچھے ہی ایک سیٹ پر موجود ہے۔ مراد کی زندگی اسے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ جہاں جہاں اس کی موجودگی کا شبہ ہوتا تھا وہاں اس کے شوٹرز اور جاسوس پہنچ جاتے تھے۔ یہی تو قدرت کا تماشا ہے کہ اسے اس کی موجودگی کا شبہ نہیں ہورہا تھا۔

میکی براؤن بہت نقصان اٹھا رہا تھا لیکن جرائم کی دنیا میں صرف ایک اکیلے شخص سے مات کھا کر اپنی ناک نیچی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر آنے والے دن یہ یقین ہوتا تھا کہ مراد آج ضرور مارا جائے گا، جو لاکھوں ڈالرز خرچ ہورہے ہیں، ان کے نتیجے میں ایک نہ ایک دن تو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

اب تو دوسری تنظیموں کے سربراہ اور شوٹرز بھی ضد میں آگئے تھے کہ ایسی کیا بات ہے کہ وہ ہتھے نہیں چڑھ رہا اور مارا نہیں جارہا۔ وہ ان تمام مجرموں کے برسوں کے تجربات کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔

میکی براؤن اپنے دست راست مارٹن واکر سے باتیں کررہا تھا۔ دوسری قطار میں اس کی بیوی، ایک جوان بیٹی، دو جوان بیٹے اور ایک چار برس کی خوب صورت سی گڑیا جیسی بیٹی تھی۔

گویا اس کا پورا خاندان وہاں موجود تھا۔ جہاز کے پُرسکون ماحول میں پھول کھلنے کی توقع نہیں تھی۔ زہر گھلنے کے آثار تھے۔ مراد نے اس پیاری سی باربی ڈول کو پیار سے ذرا پچکارا تو وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

ایمان علی کے بہروپ میں وہ بھی بے انتہا خوبرو ہوگیا تھا۔ صرف بچی ہی اس کی طرف کھنچی ہوئی نہیں آئی بلکہ اس کی ماں، بہن اور دونوں بھائی بھی اسے تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور باربی ڈول کو اس کی گود میں دیکھ کر مسکرا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

رہے تھے۔

بعض اوقات عجیب حالات درپیش ہوتے ہیں۔ جو پورا خاندان اس کے لہو کا پیاسا تھا، وہ انجانے میں اسے پسند کر رہا تھا۔ ایک ننھی سی بچی نے ان کے درمیان ایک ذرا سی اپنائیت پیدا کر دی تھی۔ وہ جانی دشمن کی ایک معصوم سی بچی تھی لیکن جو بائیس برس کی تھی، وہ بھی پہلی نظر میں ایمان علی کی خوبروئی اور اسمارٹنس پر دل ہار گئی تھی۔ اس جوان بچی کو سب ہی ڈریم گرل کہتے تھے اور واقعی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اسے خوابوں میں آنے والی حسینہ کہا جاسکتا تھا۔ ڈریم گرل نے اپنی ماں کے قریب جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''مام! تم دیکھ رہی ہو، یہ کتنا ہینڈسم ہے میرا دل کھنچا جا رہا ہے۔ پلیز اس سے دوستی بڑھائیں۔''

ماں نے سر گھما کر مراد کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ہوں۔ ہینڈسم اور اسمارٹ تو ہے۔''

پھر وہ بیٹی کو تنبیہی انداز میں بولی۔ ''تم بہت جلد باز ہو۔ خبردار اسے آئیڈیل اور لائف پارٹنر بنانے کی جلدی نہ کرنا۔''

''مام! پہلے اس سے فری تو ہونے دیں۔ کھل کر اس سے باتیں کروں گی پھر سوچوں گی کہ کیا کرنا ہے؟''

مام کے دو جوان بیٹے مراد کے ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ اس نے ایک بیٹے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر قریب آکر بولا۔ ''یس مام؟''

وہ بولی۔ ''تم دونوں یہاں آکر بیٹھو۔ میں میڈونا کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔''

وہ بہن کو بے زاری سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ اس ہینڈسم سے فلرٹ کرے گی۔''

ماں نے سختی سے کہا۔ ''نو آرگیومنٹس۔ اپنے بھائی کو بھی یہاں بلاؤ۔''

بیٹوں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ ماں اور بہنوں کی سیٹوں پر آ گئے۔ ماں اور بیٹی مراد کے پاس آ گئیں۔ باربی ڈول پہلے ہی مراد سے لگی ہوئی پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی۔ میکی براؤن نے اپنے فیملی ممبرز کو سیٹیں بدلتے دیکھا تو پہلی بار اس کی آنکھوں نے مراد کو بھی دیکھا۔

اسے کہتے ہیں، قسمت کا کھیل، وہ جس کا لہو اچھالنا چاہتا تھا، اسے اپنی آنکھوں سے بیوی اور بیٹی کے قریب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں اس بات کی اہمیت نہیں تھی کہ اس کے بیوی بچے کسی اجنبی مسافر میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے دستِ راست سے مراد کے متعلق بہت اہم گفتگو میں مصروف تھا۔

میڈونا مراد کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہماری باربی تم سے بہت متاثر ہوگئی ہے۔ بہت شریر ہے۔ تمہیں پریشان تو نہیں کر رہی ہے؟''

وہ بولا۔ ''ناٹ ایٹ آل۔ بہت پیاری اور معصوم ہے۔ میں اس کی باتوں سے انجوائے کر رہا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے یہ چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی گڑیا ہمیشہ میرے پاس رہے۔''

ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ ہمیں بہت پریشان کرتی ہے۔''

باربی نے اپنی ننھی بانہیں مراد کی گردن میں ڈال کر اسے چومتے ہوئے کہا۔ ''میرے بابا مجھے اسی طرح چوم کر کہتے ہیں آئی لو یو۔ میں بھی تم کو آئی لو یو کہتی ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''میری ننھی گڑیا آئی لو یو ٹو۔''

میڈونا نے چھوٹی بہن کو گلے لگا کر پیار کرتے دیکھا تو دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ ''میرا نام میڈونا ہے سب مجھے ڈریم گرل کہتے ہیں۔''

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کوئی شک نہیں ہے۔ تم اتنی خوب صورت ہو کہ تمہیں ڈریم گرل ہی کہنا چاہیے۔''

وہ چاہتی تھی کہ مصافحہ طویل ہو جائے۔ ایسی مضبوط مردانہ گرفت تھی کہ وہ اور زیادہ گرفتار ہو گئی تھی۔ اس کی توقع کے خلاف مراد نے جلد ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

ماں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مارتھا ہے... مسز مارتھا براؤن۔ یہ اگلی سیٹ پر میرے ہزبینڈ میکی براؤن بیٹھے ہیں۔''

نام ایسا تھا کہ مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ سر گھمائے اپنے دستِ راست سے باتیں کر رہا تھا۔ سر گھمانے کی وجہ سے چہرہ کسی حد تک نظر آ رہا تھا۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ اس نے اپنے سب سے بدترین جانی دشمن کی صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اب اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا تھا اور یقین سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہی خطرناک شخص ہے۔

اس نے سوچا۔ 'یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ وہی میکی براؤن ہو۔ دنیا میں اس نام کے کتنے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ میری بے پروائی ہے۔ مجھے کبھی اس کی کوئی تصویر تو دیکھنی تھی۔'

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

یہاں موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں طیارے سے اترتے ہی ماسٹر کو بوبو سے کہوں گا کہ وہ میرے موبائل فون پر میکی براؤن کی تصویر Send کردے۔'

وہ سوچ رہا تھا۔' یا خدا.....! اگر یہ وہی ہے تو میں اس وقت سب سے بڑے دشمن کے بالکل قریب ہوں۔ ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی البرٹ نے مجھے ہلاک کرنے کے لیے شوٹرز کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ اسے تو میں نے اس کے بہنوئی برنارڈ کی طرح جہنم میں پہنچا دیا۔ ان بہنوئی اور سالے کے بعد یہ دوسرا سالا میکی براؤن سربراہ بن کر میرے پیچھے پڑا ہے۔'

ماں بیٹی اسے اپنی باتوں میں اُلجھا رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔ ''مجھ سے دشمنی کی ابتدا اسی خاندان نے کی ہے اور شاید اسی خاندان کی عورتوں اور بچوں کے درمیان ابھی بیٹھا ہوں۔'

اس نے باربی ڈول کو پیار سے سہلاتے ہوئے سوچا۔' یہ بچی بہت ہی معصوم، بہت ہی پیاری ہے خدا کرے اس کا باپ میرا دشمن نہ ہو۔ یہ کوئی اور میکی براؤن ہو۔ ورنہ ایک معصوم بچی کو یتیم بناتے ہوئے مجھے بڑی تکلیف ہوگی۔'

وہ خیالات سے چونک گیا۔ میڈونا اس کی طرف جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''تم نے جواب نہیں دیا؟''

وہ بولا۔ ''سوری میرا دھیان دوسری طرف تھا۔''

میڈونا نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں لندن میں رہتا ہوں۔ ویسے انڈین شہری بھی ہوں۔ کیا تم بھی لندن میں رہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں اپنی مام اور باربی کے ساتھ لندن میں رہتی ہوں۔ میرے پاپا اور دونوں بھائی سسلی میں رہتے ہیں۔''

مراد کا ماتھا ٹھنکا۔ ریڈ الرٹ کا ہیڈ کوارٹر سسلی میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پاپا اور بھائی کیا کرتے ہیں؟''

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ایکسپورٹر اور امپورٹر ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''بائی دا وے، کس قسم کا مال ایکسپورٹ اور امپورٹ کرتے ہیں؟''

وہ ایک ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ نہیں بتاؤں گی۔ کچھ پرسنل باتیں صرف اپنوں کو بتائی جاتی ہیں۔''

مراد نے اپنے مزاج کے خلاف عاشقانہ انداز میں اسے دیکھا پھر اس کے قریب جھک کر کہا۔ ''اگر اپنا سمجھو گی، اپنا بناؤ گی تو میں ہمیشہ اپنا بن کر رہوں گا۔''

وہ خوشی سے کھل گئی۔ اپنی تعریف سننے کی عادی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا میں اچھی لگتی ہوں؟''

''اچھی سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہو۔ ایک تو تم ویسے ہی حسین ہو۔ لیکن جانے کیسی کشش ہے تمہارے اندر کہ بڑی دیر سے تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہوں۔''

''میں بھی تمہیں دیکھتے ہی تمہارے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ پہلی ملاقات میں ایک دوسرے کو سمجھے بغیر نہ محبت کی جاتی ہے، نہ شادی کی جاتی ہے۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''یہ سمجھو کہ شادی کے بعد ہی کوئی اپنا کہلاتا ہے۔ جو میرا جیون ساتھی ہوگا، اسی کو پرسنل باتیں بتاؤں گی۔''

وہ بولا۔ ''محبت سچی ہو تو شادی کے بغیر بھی اعتماد اور اپنا پن قائم ہو جاتا ہے۔''

وہ باپ کی طرف ایک نظر ڈال کر بولی۔ ''لیکن پاپا کہتے ہیں کہ میں جسے پسند کروں گی، اسی سے شادی کریں گے۔ لیکن شادی سے پہلے داماد کو اپنا رازدار بنایا جائے گا اور اسے اپنے گھر کے معاملات بتائے جائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''پھر تو ہماری بات نہیں بنے گی۔ کسی لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزارنے سے پہلے اس کے مزاج کو، عادات کو اور اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔''

اس نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''ابھی تم اپنے اور اپنے باپ اور بھائیوں کے بارے میں کچھ نہیں چھپاؤ گی تو لندن پہنچتے ہی تم سے شادی کروں گا۔ ورنہ اس سفر کے اختتام پر ہماری یہ اپنایت بھی ختم ہو جائے گی۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ مراد نے بچی کو چومتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس گڑیا سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہوگا اور...'' وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اور... تم سے بھی بچھڑنا ہی ہوگا۔''

میڈونا نے بے اختیار اپنا ہاتھ مراد کے ہاتھ پر رکھا، جیسے بچھڑنے والے کو پکڑ رہی ہو۔ مراد نے کہا۔ ''تمہارے پاپا کہتے ہیں۔ کسی کو داماد بنانے کے بعد اپنا رازدار بنائیں گے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، کیا وہ داماد بننے کے بعد راز فاش نہیں کرے گا؟ ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے گا؟''

''نہیں.....'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میرے پاپا صرف اعتماد قائم رکھنے والوں کے لیے بہت اچھے ہیں۔ وہ دھوکا دینے والوں کے لیے موت بن جاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، تم داماد بن کر ایک بیٹے کی طرح ان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے
خون آنا، ٹھنڈا گرم لگنا اور
دیگر تکالیف کے لیے

10 پرابلم
1 حل

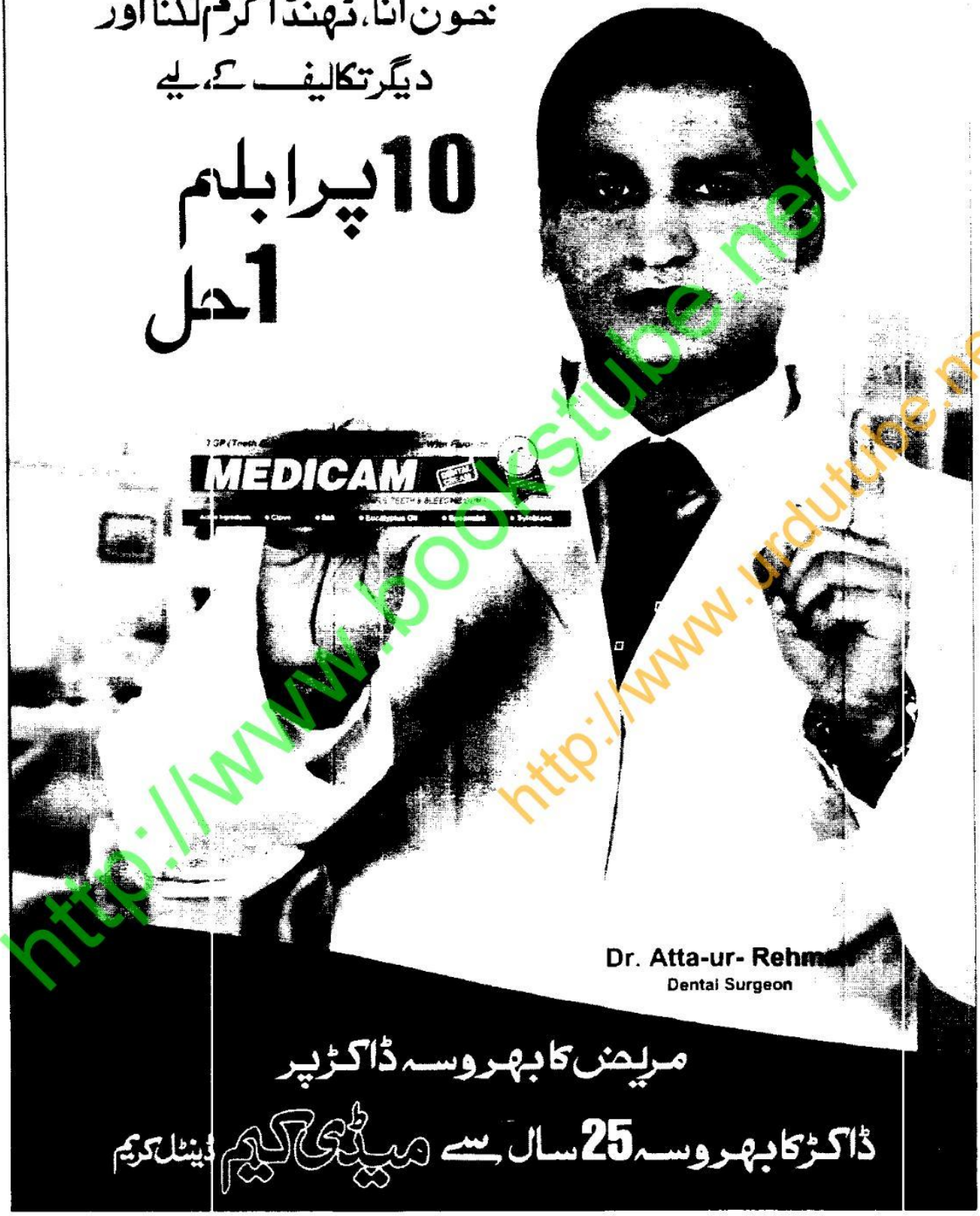

Dr. Atta-ur- Rehm
Dental Surgeon

مریض کا بھروسہ ڈاکٹر پر
ڈاکٹر کا بھروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کریم

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

کا اعتماد قائم رکھو گے تو وہ تمہیں سر پر بٹھاتے رہیں گے۔''

مراد کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے جانی دشمن کی فیملی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنے اصولوں کے مطابق ہی تمہیں لائف پارٹنر بنا سکوں گا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ہم اس سفر کے اختتام تک دوست رہیں گے پھر ایسے بچھڑ جائیں گے جیسے کبھی نہیں ملے تھے۔''

اس کا ہاتھ مراد کے ہاتھ پر تھا۔ اس نے مضبوطی سے اسے جکڑ لیا۔ وہ ایمان علی جیسے ہینڈسم جوان مرد کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ماں کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مراد کی طرف جھک کر دھیمی سرگوشی میں بولی۔ ''میں ابھی سب کچھ بتاؤں گی تو مجھ سے شادی کرو گے؟''

''تم آج یا کل جب بھی کہو گی' شادی کروں گا۔''

''تم یہ بات پاپا کو نہیں بولو گے کہ میں نے شادی سے پہلے تمہیں رازدار بنا لیا ہے؟''

''میں ان سے، تمہاری مام سے اور بھائیوں سے ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا۔ مجھے تمہاری شدید محبت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے مجھ پر اندھا اعتماد کر رہی ہو۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''شکریہ۔ اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ تم میرے سچے جذبوں کو اور میرے پیار کی گہرائی کو سمجھ رہے ہو۔ میری ایک بات مانو پھر میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔''

''تمہاری بات ضرور مانوں گا۔ بولو۔''

''ابھی مجھے اپنے سینے سے، اپنے دل سے لگا کر ایک کِس کرو۔ مجھے سب کے سامنے یقین دلاؤ کہ تم بھی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو۔''

مغربی تہذیب میں جوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو سرِ عام چومتے ہیں۔ یہ ان کی نظروں میں بے حیائی نہیں ہے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ سرِ عام دنیا والوں کو اپنے پیار کے رشتے کا گواہ بناتے ہیں۔

وہ بھی جہاز میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اور اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو بتانا چاہتی تھی کہ مراد اسے پروپوز کر چکا ہے۔

وہ الجھ گیا۔ پھر وہی گناہ کی دعوت تھی۔ دعوت قبول کرنے کے لیے یہ کہا جا سکتا تھا کہ رات کالی کرنے اور منہ کالا کرنے والا مطالبہ نہیں تھا۔ وہ صرف دھڑکنوں سے لگ کر دل میں اتر جانے والا ایک بوسہ طلب کر رہی تھی۔

دل کو سمجھایا جا سکتا تھا کہ یہ صرف بدن سے بدن کو لگا کر ایک کِس کر کے وہ اس فیملی کے اور جانی دشمن کے بہت سے راز معلوم کر سکتا تھا۔

بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے صرف ایک چھوٹا سا مطالبہ پورا کرنا تھا لیکن دل میں ایمان تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا گناہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں یہاں سب کے سامنے ایسا نہیں کر سکوں گا۔''

وہ ہنس پڑی۔ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''کیا ہو تم...؟ لڑکیاں نہیں شرماتیں۔ تم شرما رہے ہو۔''

''سوری۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ ہمارے دین میں شرم و حیا کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ تم نہیں سمجھو گی' دین و ایمان کے بغیر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔''

''اوگاڈ...! تم تو کسی مذہبی پیشوا کی طرح بول رہے ہو۔''

پھر وہ اس سے مُک کر بولی۔ ''ہم جوان ہیں۔ جوانی کی باتیں کرو۔ میں مانتی ہوں' شرم و حیا لازمی ہے لیکن مجھ سے محبت ہے تو میرا دل رکھو۔ چھپ کر پیار کر لو۔''

مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''کوئی نہیں دیکھے گا۔ میں ابھی اٹھ کر ٹوائلٹ کی طرف جاؤں گی۔ تم چند سیکنڈ کے بعد وہاں آ جانا۔ وہاں ہم جتنا بھی وقت گزار سکتے ہیں گزار لیں گے۔''

واہ کیا بات ہے۔ شیطان جب بہکاتا ہے تو گناہ پر عمل کرنے کے راستے بھی دکھاتا ہے اور طور طریقے بھی سمجھاتا ہے۔ وہ بولا۔ ''میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں مسلمان ہوں۔ ہم ان مسلمانوں میں سے ہیں جو شادی سے پہلے کسی لڑکی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔''

''پلیز میری بات مان لو۔ مجھے صرف سینے سے لگا کر پیار کرو گے تو تمہارے ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''پہنچے گا۔ ایک چھوٹی سی غلطی کے بعد پھر غلطیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے' تم ابھی مجھے رازدار نہ بناؤ۔ جب تمہارے بزرگ ایک مسلمان کو اپنا داماد بنانے پر راضی ہو جائیں' تب میں شادی کے بعد ہمراز بن جاؤں گا۔''

وہ مایوس ہو گئی۔ اس وقت یہ خواہش دل میں مچل رہی تھی کہ کسی طرح اس کی دھڑکنوں سے لگ جائے اور مراد نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے باپ کی حقیقت فوراً ہی معلوم کرنا ضروری نہیں ہے۔ طیارے سے اترنے کے بعد وہ ماسٹر کو بو سے میکی براؤن کی تصویر حاصل کر لے گا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فی الحال یہ اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ وہی اس کا جانی دشمن میکی براؤن ہے۔ سفر کے اختتام تک جانے انجانے میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ کوئی بھی کسی کو زندگی کے اختتام تک پہنچا سکتا تھا یا پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ سب اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔

وہ مراد کو بڑی لگن سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ''تم ایک گبرو جوان ہو۔ لڑکیاں تم پر مرتی ہوں گی۔ کیا تم نے آج تک کسی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے؟ مجھے یہ بالکل فطرت کے خلاف لگ رہا ہے۔ یقین نہیں آرہا ہے کہ تم اب تک کنوارے ہو۔''

وہ بولا۔ ''آئینہ تم سے جھوٹ نہیں کہتا ہوگا کہ تم کس قدر حسین اور پرکشش ہو۔ یقین کرو، میرا دل تمہاری طرف کھنچا جارہا ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں ہاتھ لگانے سے انکار کررہا ہوں۔ اسی طرح پہلے بھی کئی حسین اور جوان لڑکیوں سے دور رہا ہوں۔''

''پھر تو تم بہترین شوہر ثابت ہوگے۔ مجھے یقین ہوگیا ہے، دنیا کی حسین ترین لڑکیوں پر بھی مجھے ترجیح دیتے رہوگے۔ میں ابھی پاپا سے بات کروں گی۔''

اس نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر کہا۔ ''پاپا! میں آپ کے پاس آکر ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''باپ کی جان! میں ضروری باتیں کررہا ہوں۔ تم سے گھر میں باتیں ہوں گی۔''

''میں آپ کی ضروری باتیں جانتی ہوں۔ وہ کمبخت مراد آپ کے سر پر سوار رہتا ہے۔ ایک مدت کے بعد ہم یہاں آئے تھے تو آپ ملنے آگئے۔ بعد میں پتا چلا کہ آپ کو تل ابیب میں مرینہ کی آمد کا پتا چلا تھا۔ آپ اس کے پیچھے مراد کو پکڑنے اور گولی مارنے آئے تھے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں پاپا! آپ کی زندگی میں ہماری کوئی اہمیت ہے بھی یا نہیں؟ کیا آپ ابھی تھوڑا سا وقت مجھے نہیں دے سکتے؟ میں آپ سے ناراض ہوجاؤں گی۔''

باپ نے کہا۔ ''میری لاڈلی بولتی ہے تو چپ ہونا بھول جاتی ہے۔ جسٹ اے منٹ میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔''

میکی براؤن نے اپنے دست راست سے اور مشیر خاص سے کہا کہ وہ پچھلی سیٹوں پر چلے جائیں، وہ دونوں فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ وہ ان کی جگہ چلی گئی۔ باپ نے اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''ہاں بولو۔ تمہاری ضروری باتیں کیا ہیں؟''

وہ بولی۔ ''میں نے اپنے لیے ایک لائف پارٹنر پسند کرلیا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوگاڈ! اتنی سی بات کے لیے، تم نے کتنی ساری باتیں سنا ڈالیں۔ شادی یہاں تو نہیں ہوجائے گی۔ تمہیں گھر چل کر اس مسئلہ پر بولنا چاہیے۔''

''پاپا! میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ چاہتی ہوں۔ یہاں سے لندن پہنچ کر شادی ہوگی۔''

باپ نے حیرانی سے کہا۔ ''تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو اور لندن پہنچ کر کس سے شادی کروگی؟ لڑکا کہاں ہے؟''

اس نے ایک انگوٹھے سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا آئیڈیل ہمارے پیچھے بیٹھا ہے۔ پلیز ابھی اسی وقت بات پکی کریں۔''

میکی براؤن نے سر گھما کر مراد کو دیکھا۔ وہ اب سے پہلے بھی اس پر نظر ڈال چکا تھا۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔ ''کون ہے یہ؟ تم اسے کب سے جانتی ہو؟''

''ابھی اسی جہاز میں اسے دیکھا ہے۔ یہ ایک پکا مسلمان ہے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میرا ہاتھ بھی شادی کے بعد پکڑے گا۔ مجھے ایسا ہی لائف پارٹنر چاہیے۔ یہ کسی بھی حسین عورت کو گھاس نہیں ڈالتا ہے۔''

باپ نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ تمام اہم باتیں میں معلوم کرلوں گا۔ کیا یہ جانتا ہے کہ ہم یہودی ہیں؟''

''میرا خیال ہے جانتا ہوگا۔''

وہ مراد کے متعلق ناگواری سے سوچ رہا تھا۔ اپنے دشمن کو نہیں پہچان رہا تھا اور نہ پہچاننے کے باوجود اسے پسند نہیں کررہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''نہیں بیٹی! اسے ابھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم یہودی ہیں۔ جو کفر مسلمان ہوتے ہیں وہ یہودی عورتوں سے شادی نہیں کرتے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے پاپا! میں مسلمان ہوجاؤں گی۔''

باپ نے سختی سے کہا۔ ''بکواس مت کرو، اپنے باپ دادا کے دین سے پھرنے کی بات کررہی ہو۔ شرم نہیں آتی؟ تم میرا غصہ جانتی ہو؟''

''جانتی ہوں۔ میں اس کی خاطر دین اسلام قبول کروں گی تو آپ مجھے گولی ماردیں گے۔''

''میں اپنی بیٹی کو سزائے موت نہیں دوں گا۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''جس کے لیے تم اپنے دین سے پھروگی اسے گولی ماردوں گا۔''

وہ ایسا کہتے وقت مراد کو تیز چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی سے دور تھا۔ ان کی باتیں نہیں سن

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

رہا تھا لیکن اس کی چبھتی ہوئی نظروں نے سمجھا دیا کہ اسے محتاط رہنا چاہیے۔

وہ باپ کو سمجھانے منانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ''پلیز پاپا! شادی کے بعد بیٹیاں پرائی ہوجاتی ہیں۔ میں اس سے شادی کروں گی تو آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ میں آپ سے دور چلی جاؤں گی۔ جب آپ بلائیں گے تو دوڑی چلی آؤں گی۔''

''میں نے تمہاری پرورش اس لیے لاڈ پیار سے نہیں کی ہے کہ ایک دن پرائی کردوں۔ یہ اپنی ڈائری میں لکھ لو کہ تم کبھی پرائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے گھر والوں سے پرایا ہوکر میرا گھر داماد بن کر رہے گا۔ تم اپنا مذہب نہیں چھوڑو گی وہ مسلمان اب یہودی بنے گا۔ تم اسے دل وجان سے پسند کررہی ہو۔ باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔''

پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''مارتھا! تم پیچھے جاؤ اور اس جوان کو یہاں بھیج دو۔''

اس نے گویا حکم دیا تھا۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ سیٹیں تبدیل ہوگئیں، مارتھا پیچھے آگئی۔ مراد، میڈونا اور میکی براؤن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

دو جانی دشمن پہلی بار ایک دوسرے کے برابر ہوکر بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ میکی براؤن نے پہلے تو اسے توجہ سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ایمان علی۔ میں مسلمان ہوں اور میرے ڈیڈی عیسائی ہیں۔ میرے مسلمان ہونے پر ڈیڈی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب ان سے صلح ہوگئی ہے۔''

اس نے ناگواری سے مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم نے اپنے باپ دادا کا مذہب کیوں چھوڑ دیا؟''

''میں نے اپنا نام ایمان علی رکھا ہے۔ میرا ایمان مجھے دینِ اسلام کی طرف لے گیا۔ میں نے اسے قبول کرلیا۔''

''کیا تم میری بیٹی سے محبت کرتے ہو؟''

''آپ کی بیٹی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے ابھی محبت تو نہیں ہوئی ہے لیکن میں پسند کرتا ہوں۔ مس میڈونا ایسی ہیں کہ جو انہیں دیکھے گا چاہنے لگے گا۔''

''کیا تم میری بیٹی سے شادی کرو گے؟''

''انکار نہیں کروں گا، لیکن لندن پہنچ کر سوچوں گا۔ ڈیڈی سے مشورہ کروں گا۔''

''تم باپ بیٹے جو بھی فیصلہ کرو، میری بیٹی اسی وقت تمہاری دلہن بنے گی، جب تم ہمارا مذہب قبول کرو گے اور میرے یہودی داماد کہلاؤ گے۔''

''سوری، میں دین اسلام سے نہیں پھروں گا۔''

''جب تم باپ کے مذہب سے پھر سکتے ہو تو اسلام سے بھی پھر سکتے ہو۔''

''میرے اللہ نے میری پہچان مجھے دے دی ہے۔ یہ مرتے دم تک رہے گی۔''

میڈونا نے کہا۔ ''پاپا! آپ ایمان سے مذہبی معاملے میں نہ بولیں۔ مجھے ایک مسلمان جیون ساتھی منظور ہے۔''

''مجھے منظور نہیں ہے۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''سنو ایمان! اگر یہ تمہاری شریک حیات نہ بنی تو روتی رہے گی اور میں اس کے آنسو دیکھ نہیں سکتا۔ رلانے والوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔''

مراد نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ ابھی کچھ بولنا ضروری نہیں تھا۔ دشمن طاقت کے غرور میں اُچھل رہا ہو تو چپ رہ کر اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھنا دانشمندی اور حکمت عملی ہے۔

اس نے بیٹی کو تھپک کر کہا۔ ''میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔ تم ذرا صبر سے دو چار دنوں تک انتظار کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد یہ تمہارا یہودی شوہر اور میرا یہودی داماد بن جائے گا۔''

مراد مسکرانے لگا۔ وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''نو پاپا! میں جبر و تشدد نہیں چاہوں گی۔''

مراد نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا۔ ''اپنے باپ سے بحث نہ کرو، انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ مجھے یہودی کیسے بنائیں گے؟''

وہ وہاں سے اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف آکر مارتھا سے بولا۔ ''پلیز آپ اپنے شوہر اور بیٹی کے پاس جائیں۔''

وہ اٹھ کر بیٹی کے پاس آئی پھر شوہر سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

مراد کی خاموشی کے باعث میکی براؤن خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے چیلنج کرنے سے وہ اندر ہی اندر سہم گیا ہے۔ دھونس میں آگیا ہے۔ میں ایک ہفتے کے اندر اسے اپنا یہودی داماد بنالوں گا۔''

وہ سسلی کا بے تاج بادشاہ تھا۔ یورپ میں مجرموں کی اتحادی تنظیموں نے اسے اور مغرور بنا دیا تھا۔ کسی کی زندگی چھین لینا، کسی کا مذہب بدل دینا اس کے لیے بچوں کا کھیل تھا۔

مارتھا نے خوش ہوکر کہا۔ ''چلو اچھا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی جو چاہتی ہے آپ وہ لاکر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ جوان بھی اس کے پیچھے دم ہلاتا پھرے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میڈونا چپ تھی۔ وہ باپ کے پیار بھرے انداز کو اور ایک جابر میکی براؤن کی سفاکی کو خوب سمجھتی تھی۔ باپ ہر حال میں ایمان علی کو بیٹی کی جھولی میں لاکر ڈالنے والا تھا۔ بیٹی اس کے ارادے سے اسے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ سوچ کر چپ تھی کہ جیسے بھی ہو اس کی آرزو پوری ہوگی۔ وہ ایمان علی کی شریک حیات بن جائے گی۔

مراد نے لندن پہنچ کر طیارے سے باہر آتے ہی ماسٹر کو بو سے فون پر کہا۔ ''میں میکی براؤن کا صورت آشنا ہونا چاہتا ہوں۔ آپ فوراً اس کی تصویر میرے فون پر Send کریں۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''میں نے آج تک میکی براؤن کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ اس سے پہلے اس کا بھائی میکی البرٹ ریڈ الرٹ کا سربراہ تھا۔ اس کی تصویر میرے پاس تھی۔ تم نے اسے ہلاک کردیا۔ اس کے بعد یہ میکی براؤن سربراہ بن گیا۔ میں اب تک اس کی تصویر حاصل نہ کرسکا۔''

اس نے کہا۔ ''ماسٹر! ابھی ایک میکی براؤن میرے قریب ہے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں' کیا یہ وہی میرے سر کی قیمت لگانے والا دشمن ہے۔''

ماسٹر یہ سن کر لرز گیا کہ مراد اپنے جانی دشمن کے قریب ہے۔ شاید مارا جاسکتا ہے اور اس خوشی سے بھی لرز گیا کہ مراد اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

وہ تڑپ کر بولا۔ ''مراد تم اس کے قریب ہو اور وہ زندہ ہے...؟ ابھی تک سانسیں لے رہا ہے...؟''

''پہلے تصدیق تو ہو کہ یہی میرا دشمن ہے؟ پھر یہ کہ یہاں سرِ عام گولی چلانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ ایسا کروں گا تو چاروں طرف سے گھیر لیا جاؤں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ میکی کی تصویر کہاں سے حاصل ہوسکتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''لندن کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے ریکارڈز میں اس کی تصویر ہوگی۔ مرینہ سے کہو وہ اپنے ذرائع ستعمال کرکے وہاں سے حاصل کرلے گی۔''

وہ فون بند کرکے سوچ میں پڑ گیا۔ میکی براؤن لگیج ہال سے اپنا سامان لینے پھر کسٹم چیکنگ سے گزرنے کے لیے اپنی فیملی کے ساتھ آگے آگے جارہا تھا۔ مرینہ مراد کے دو فون نمبر جانتی تھی۔ مراد نے ان میں سے ایک سم ایمان علی کو دے کر کہا تھا۔ ''اسے رکھو، کبھی ضرورت کے وقت مراد بن کر اس سم سے بول سکو گے۔''

اس وقت مرینہ کی مدد حاصل کرنا ضروری ہوگیا تھا، اس نے ایمان علی سے فون پر کہا۔ ''اپنے فون میں میری سم لگاؤ اور اس سے بولو کہ تم میکی براؤن کی تصویر دیکھنا چاہتے ہو۔ MET ڈیپارٹمنٹ میں تمام بدنام زمانہ مجرموں کی تصویریں اور ان کی ہسٹری موجود رہتی ہے۔ تم اس کی ہسٹری نہیں چاہتے ہو۔ صرف تصویر دیکھنا چاہتے ہو۔ اسے فوراً ایک تصویر تمہارے فون پر Send کرنا چاہیے۔ جیسے ہی وہ تصویر تمہیں ملے، تم اسے میرے فون پر Send کردو۔''

اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے میرے بھائی؟''

مراد نے کہا۔ ''میں یہاں سے مرینہ کو کال کروں گا تو وہ کوڈ نمبر سے معلوم کرلے گی کہ میں لندن سے بول رہا ہوں۔''

''آل رائٹ میں ابھی اسے کال کرتا ہوں۔''

ایمان علی نے مراد سے رابطہ ختم کرکے فون کی سم بدلی۔ پھر مرینہ کو کال کی۔ وہ رابطہ ہونے پر بولی۔ ''مراد! کیوں پریشان کرتے ہو۔ میں نے صبح آٹھ بجے تمہیں سی پورٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تم کہیں چھپ گئے۔''

مراد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے آنکھ مچولی نہیں کھیل رہا ہوں۔ اپنے اہم معاملات میں کہیں مصروف ہوں۔ ویسے بھی تم سے کہہ چکا ہوں، تم نے میرا اعتماد کھودیا ہے۔ جب تک پہلے کی طرح اعتماد بحال نہیں ہوگا، میں تم سے دور رہوں گا۔''

''میں پھر سے تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہوں گی لیکن پلیز مجھ سے منہ پھیر کر نہ جایا کرو۔''

''میں زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔ ابھی ایک ضرورت سے مجبور ہوکر رابطہ کیا ہے۔ میں میکی براؤن کو اس کے چہرے سے پہچاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کی کوئی تصویر Send کرسکتی ہو؟''

''میں اپنے ڈیپارٹمنٹ والوں سے ابھی معلوم کرتی ہوں۔ اگر ہمارے ریکارڈ روم میں اس کی ہسٹری فائل ہوگی تو تصویریں بھی ہوں گی۔''

''تم ڈیپارٹمنٹ والوں سے معلوم کرو۔ میں آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔''

وہ بولی۔ ''جسٹ اے منٹ۔ فون بند نہ کرنا۔ اگر تصویر مل جائے گی تو میں اسے لے کر تمہارے پاس آؤں گی۔''

''سوری۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ مجھ سے ملنے کی بات نہ کرو۔ تصویر موبائل فون پر Send کرو۔''

''پلیز مراد! میں آؤں گی۔ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ فاصلہ رکھ کر باتیں کروں گی پھر چلی جاؤں گی۔''

ایمان علی سوچنے لگا۔ اس نے پہلی بار مرینہ کو تل ابیب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے ائرپورٹ میں دور سے دیکھا تھا۔ ایسا اجلا نکھرا ہوا سا حسن تھا۔ ایسی البیلی اور متوالی چال چلتی تھی کہ دل لے کر چلی جاتی تھی۔ اس وقت اسے قریب سے دیکھنے کو دل مچل گیا۔

اس نے کہا۔ ''میں تم سے فاصلہ رکھ کر مل سکتا ہوں۔ لیکن ہمارے ملنے کا نتیجہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔''

''میں جانتی ہوں، ایسا ہوگا۔ پہلے میں تصویر حاصل کروں گی پھر تمہیں بتاؤں گی کہ ہم کہاں سلامتی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔''

دونوں نے یہ طے کرلیا کہ کسی محفوظ جگہ ملاقات کریں گے۔

ایمان علی کو یوں لگ رہا تھا کہ بڑے دنوں کے بعد ایک حسینہ سے ملاقات ہونے والی ہے اور وہ اس کے ساتھ کچھ رومانٹک لمحات گزارنے والا ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف آتا ہے۔ ایمان علی کی شامت آرہی تھی، وہ ایک خطرناک بلا کی طرف جارہا تھا۔

میکی براؤن اپنی بیٹی کی خوشیاں پوری کرنے کے لیے یہ طے کرچکا تھا کہ ایمان علی (مراد) کو اپنا داماد بنائے گا اور اس سے پہلے اسے یہودی بنائے گا۔ مراد نے بڑے سکون سے اور خاموشی سے اس کا یہ چیلنج قبول کیا تھا۔ میکی اسے داماد بنانے سے پہلے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے وزیرزلابی میں ڈاکٹر ٹینی سن سے ملاقات کی۔ مراد نے کہا۔ ''یہ میرے ڈیڈی ہیں اور ڈیڈی یہ مسٹر میکی براؤن ہیں۔''

ڈاکٹر دشمن میکی براؤن کا نام سن کر چونک گیا۔ مراد نے اسے آنکھ ماری۔ اشارے سے سمجھایا کہ وہ کسی طرح کی حیرانی اور پریشانی ظاہر نہ کرے۔ پھر اس نے دشمن کی پوری فیملی سے ڈاکٹر کو متعارف کرایا۔ میکی براؤن نے کہا۔ ''مسٹر ٹینی سن! میں اسی ہفتے میں ان کی شادی کردینا چاہتا ہوں۔ شادی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ آپ کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ابھی سے تیاریاں شروع کردیں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''مسٹر براؤن! آپ تو شادی کی بات ایسے کررہے ہیں جیسے حکم دے رہے ہوں۔ مجھ سے بھی پوچھنا چاہیے کہ میں اتنی جلدی بھولا نا چاہتا ہوں یا نہیں؟''

وہ ڈاکٹر ٹینی سن کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی سے نہیں پوچھتا۔ جو حکم دیتا ہوں اس کی تعمیل ضرور ہوتی ہے۔''

اس نے دور تک ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''ذرا اپنے چاروں طرف دیکھیں۔ سیکیورٹی گارڈز کی وردیوں میں خطرناک شوٹرز کی فوج ہمیشہ میرے چاروں طرف رہتی ہے۔''

وہ بجا کر بولا۔ ''ابھی حکم دوں گا تو یہ تمہارے بیٹے کو یہاں سے گن پوائنٹ پر لے جائیں گے۔''

مراد نے مصلحتاً عاجزی سے کہا۔ ''مسٹر براؤن! آپ ناراض نہ ہوں۔ ڈیڈی نہیں جانتے آپ کون ہیں۔ میں جان گیا ہوں۔ شادی اسی طرح ہوگی، جس طرح آپ چاہتے ہیں۔''

وہ خوش ہوکر مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''میں ایسا ہی تابعدار داماد چاہتا تھا۔ یہ مجھے مل گیا ہے۔''

وہ کچھ اور بولنا چاہتا تھا لیکن بونے مراد کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ بونا قدآور لوگوں کی بھیڑ میں نظر نہیں آیا۔ پھر ان کے درمیان سے گزرتا ہوا مراد کے سامنے آکر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہائے ایمان علی! ہم تمہیں لندن میں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

میکی نے گرجدار آواز میں کہا۔ ''تم۔ مراد علی منگی... تم... تم وہی ہو۔ میرے مخبر کہہ رہے تھے کہ تم انڈیا کے شہر دہلی میں ہو لیکن مراد نہیں ہو۔ مراد اچانک بونا نہیں ہوسکتا۔ یہ کیا چکر ہے؟ تم بونے کیسے ہوئے؟ یہاں کیسے آگئے؟''

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ ''جیسے سب آتے ہیں ویسے ہی میں بھی ہوائی جہاز سے کل ہی آیا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ عبداللہ کبڈی ہے۔ میرے بچپن کا دوست ہے۔ یہ بے چارہ مراد کا ہم شکل ہوکر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ پتا نہیں کتنے انجانے لوگ اس کے بارے میں چھان بین کرتے رہتے ہیں کہ یہ مراد ہے بھی یا نہیں؟''

میکی براؤن نے بونے کو سر جھکا کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''بڑے موقع سے ہاتھ آئے ہو۔ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ تمہارے چہرے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کراؤں گا۔ ہوسکتا ہے مراد کے بونے ہونے کا راز معلوم ہوجائے۔''

اس نے مسلح گارڈز کو حکم دیا۔ ''اس بونے کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو اور ہمارے اڈے پر اسے پہنچادو۔''

مراد نے کہا۔ ''پلیز اسے زبردستی نہ لے جائیں۔ یہ میرا جگری یار ہے۔ میرے استقبال کے لیے یہاں آیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''زیادہ مت بولو۔ ورنہ تمہیں بھی باپ سے جدا کرکے لے جاؤں گا۔ تم جاؤ اور شادی کی تیاریاں کرو۔''

''میں اپنے دوست کے بغیر شادی کی تیاریاں نہیں کروں گا۔ آپ اس کے ساتھ مجھے بھی لے چلیں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

http://www.bookstube.net/
http://www.edutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

وہ اسے گھور کر بولا۔ ''میں اسے صرف چھ گھنٹے اپنے ایک اڈے میں رکھوں گا۔ یہ مراد علی منگی ثابت نہ ہوا تو اسے تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''تو پھر میں بھی چھ گھنٹے تک اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔''

''ہرگز نہیں۔ میں جو حکم دے رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔''

''آپ خوامخواہ چیخ رہے ہیں۔ جب میں آپ کے تمام احکامات کی تعمیل کر رہا ہوں تو مجھے ضدی اور باغی نہ بنائیں۔''

میکی براؤن نے حقارت سے کہا۔ ''اچھا تو تم مجھ سے بغاوت بھی کر سکتے ہو؟ کیا بدی اور کیا پدی کا شوربا۔''

پھر اس نے گارڈز کو حکم دیا۔ ''اسے بھی لے چلو۔''

مراد نے ڈاکٹر کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''ڈیڈ! آپ پریشان نہ ہوں گھر جائیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

ڈاکٹر ٹمنی سن کو مراد پر پورا بھروسا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ ''او گاڈ! ان کی مدد فرما.....''

ڈاکٹر کی پریشانی یہ تھی کہ مراد اور عبداللہ کبڈی کے لیے لندن نئی جگہ تھی۔ وہ وہاں کھل کر ہر جگہ دشمنوں سے موت کی آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتے تھے۔

ایسے وقت ننھی سی باربی ڈول دوڑتی ہوئی آ کر مراد کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ وہ بولی۔ ''تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میری گڑیا...! میں نہیں جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

میڈونا نے کہا۔ ''پاپا! ہم ان کے ساتھ کار میں بیٹھیں گے۔''

مارتھا نے بھی یہی کہا۔ میکی نے بونے کو اور مراد کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ میرا ہونے والا داماد ہے۔ اس کے ساتھ چلو لیکن یہ بونا میری گاڑی میں بیٹھے گا۔''

مراد اس کی فیملی کے ساتھ ایک کار کی طرف جانے لگا۔ باربی اس کی گود سے اتر کر دوڑتی ہوئی کار کی طرف جانے لگی۔ عبداللہ کبڈی اس وقت میکی براؤن اور اس کے دو جوان بیٹوں کے ساتھ دوسری گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ان کی شامت آ گئی۔ ایک گولی بہت ہی خاموشی سے آ کر میکی کے جوان بیٹے کو لگی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ گرتے گرتے باپ سے لپٹ گیا، اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے۔

دوسروں کا لہو اچھالنے والے باپ کا کلیجا صدمے سے پھٹ گیا۔ وہ اس کے ساتھ زمین پر گر کر اس سے لپٹ کر چیخیں مارنے لگا۔ ''رونی! میرے بچے! نہیں تم نہیں مر سکتے۔''

سخت سیکیورٹی میں رہنے والا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موت اچانک آ کر جوان بیٹے کو لے جائے گی۔ یہ غرور خاک میں مل گیا کہ موت دوسروں کے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں۔ ماں بھی اپنی چھاتی پیٹتی ہوئی دوڑتی ہوئی آ کر بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ کئی مسلح گارڈز نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ اندازہ کر رہے تھے کہ گولی کس سمت سے آئی ہے وہ سب کسی نادیدہ شوٹر کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر کر رہے تھے۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی، دوسری سمتوں سے بھی جوابی فائرنگ ہو سکتی تھی لیکن نہیں ہو رہی تھی۔ میڈونا اور مراد فائرنگ سے بچنے کے لیے کار کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ وہ بھائی کی ہلاکت پر مراد سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے مراد سے بڑی دیر تک لپٹے رہنے کا موقع مل رہا تھا۔

اچانک مراد نے چیخ کر پوچھا۔ ''باربی کہاں ہے؟''

میڈونا بھی پریشان ہو کر کار کے باہر دور تک دیکھنے لگی۔ دور اس کے ماں باپ اور گارڈز رونی براؤن کی لاش کو اٹھا کر ایک دیوار کی آڑ میں لے گئے تھے۔

مراد کار سے نکل کر دوڑتا ہوا ادھر گیا۔ باربی اپنے ماں باپ کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان لمحات میں مراد کو دلی صدمہ پہنچ رہا تھا۔ وہ چیخ کر تمام گارڈز سے بولا۔ ''باربی کہاں ہے؟ اسے ڈھونڈو۔''

ماں باپ کا ایک صدمہ اور بڑھ گیا۔ ننھی گڑیا نظر نہیں آ رہی تھی۔ مراد نے میکی سے کہا۔ ''مجھے گن اور گاڑی دو۔ تمہارے دشمن اسے لے جا رہے ہیں۔''

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ ''وہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ مجھے بھی ایک گن دو۔''

وہ بیٹے کی لاش کے پاس سے اٹھ کر گارڈز سے بولا۔ ''او گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہیں گن دو اور فوراً چلو۔ وہ ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔ کم آن ہری اپ۔''

وہ مراد اور کبڈی کے ساتھ دوڑتا ہوا ایک گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ ایک گارڈ نے ان دونوں کو اسلحہ دیا۔ ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے جانے لگا۔ مراد اور کبڈی پچھلی سیٹوں پر تھے۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

میکی براؤن ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر غصہ سے بڑبڑا رہا تھا۔ ''اس شہر میں آج تک کسی نے مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ آہ میرا بیٹا رونی میری آنکھوں کے سامنے مارا گیا ہے۔ وہ دشمن مجھ سے چھپ نہیں سکے گا۔ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔''

وہ کسی نادیدہ دشمن کو چیلنج کر رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کون میری گڑیا بیٹی کو لے گیا ہے؟ کون اتنی دلیری دکھا رہا ہے؟ میں اسے ایسی موت ماروں گا کہ مجھ سے دشمنی کرنے والے اس کا انجام دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے۔''

مراد جہاز میں سفر کرنے کے دوران بڑی خاموشی سے میکی براؤن کے غرور کو اور اس کی فرعونیت کو برداشت کرتا آرہا تھا۔ وہ اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس مغرور کو زندہ رکھ کر مُردوں سے بدتر بنانا چاہتا تھا۔

اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ آج یا کل کسی وقت بھی موقع پاکر باربی کو اغوا کرے گا تو وہ فی الحال اسے داماد بنانا اور یہودی بنانا بھول جائے گا۔ پھر اپنے جانی دشمن کو دشمنی کا مزہ چکھانے کے لیے پہلے اس کے کسی بیٹے کی لاش گرائے گا۔

اس نے بہت کچھ سوچا تھا لیکن اس سے پہلے کوئی اور اس کا دشمن آگیا تھا اور وہ وہی کر رہا تھا' جو مراد نے سوچا تھا۔

میکی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ بیٹے کے صدمے سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ بٹن کو دبایا تو آواز آئی۔ ''اپنی بیٹی کی زندہ واپسی چاہتا ہے یا اس کی بھی لاش بھیج دوں؟''

وہ تڑپ کر بولا۔ ''وہ معصوم بچی ہے اسے ہاتھ نہ لگانا میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''ابھی کسے مہنگی پڑ رہی ہے؟ رسی جل گئی' پر بل نہیں گئے۔ ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ آج ایک بیٹا گیا ہے کل دوسرا جائے گا۔ تمہارے سنڈیکیٹ چلانے والے دونوں بازوؤں میں سے ایک ٹوٹ گیا ہے۔ دوسرا بھی جائے گا پھر تم رہ جاؤ گے۔ تمہارے سامنے بیوی اور جوان بیٹی بھی جائے گی، آخر میں تمہاری باری آئے گی۔''

وہ چیخ کر بولا۔ ''کون ہو تم؟ میں تمہاری ماں کی قبر سے بھی تمہیں نکال لاؤں گا پھر ایسی موت دوں گا کہ.....''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''شیخ چلی کی طرح ہوائی محل نہ بناؤ۔ حساب کرو کہ اب تک اپنے کتنے شوٹروں کو میرے ہاتھوں ہلاک کرانے کے بعد بیٹے کی لاش تک پہنچے ہو۔ اب ماتم کرو اور سوچو کہ یہ موت کا فرشتہ پہلے ہاتھ نہیں آیا تو اب کیسے آئے گا؟''

میکی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں ہوں تمہارا پچاس لاکھ ڈالر مراد علی منگی۔''

وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ''مراد.....! تم مراد علی منگی ہو؟''

مراد اور کبڈی ایکدم سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ کر فون کی طرف حیرانی سے تکنے لگے۔ یہ حیران ہونے کی بات تھی۔ کوئی خود کو مراد علی منگی کہہ رہا تھا یعنی وہ کوئی دشمنوں کے گروہ سے نہیں تھا۔ مراد کا حمایتی اور دوست تھا اور اس کے دشمنوں کا دشمن تھا۔

میکی براؤن کہہ رہا تھا۔ ''تم نے اپنی یہاں موجودگی ظاہر کی ہے۔ اب میں محتاط رہوں گا۔ اب تم میری کسی اولاد تک پہنچ نہیں پاؤ گے۔ اب میری طرف آنے سے پہلے کفن پہن کر آنا۔''

وہ دوسری طرف سے بولا۔ ''ابے او چیلنج کرنے والے! ابھی تیری ننھی بیٹی کو کفن پہنا کر بھیج دوں؟''

''اپنی بیوی کا فون نمبر بول۔ میں اس سے بات کروں گا۔''

''تم صرف مجھ سے بات کرو گے۔''

''اگر فوراً نمبر نہ دیا تو فون پر بیٹی کی آخری چیخ سنے گا۔''

وہ مجبور ہو گیا۔ اس نے نمبر بتائے۔ اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسری طرف اس کی وائف مارتھا نے کال اٹینڈ کی۔ اسے ایک اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ''تمہاری گڑیا میرے پاس ہے۔''

وہ میڈونا سے لگی بیٹھی تھی۔ بیٹے کی ہلاکت پر آنسو بہا رہی تھی۔ فوراً ہی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تڑپ کر بولی۔ ''تم کون ہو؟ کیوں میری معصوم بچی کو لے گئے ہو؟ وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کی آواز سناؤ۔''

''آواز سن لوگی۔ تم لہو اُچھالنے والی فیملی کی اماں جان ہو۔ یہ بولو کہ جوان بیٹے کی حرام موت کیسی لگی؟''

وہ چیخ کر بولی۔ ''ایک ماں کی کوکھ اجاڑنے والے تم انسان نہیں درندے ہو۔''

''ایسے ہی وقت یہ حساب کرو کہ تمہارے شوہر اور بیٹوں نے اب تک کتنی ماؤں کی کوکھ اجاڑی ہیں؟''

اسے چپ لگ گئی۔ وہ بولا۔ ''میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ برنارڈ میرے ملک کا ایک اہم راز چرانے آیا تھا۔ میں نے اسے جہنم میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد تمہارے بدمعاش

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خاندان کے تمام جیالے میری جان کے پیچھے پڑ گئے۔''

وہ ایک ذرا رُک کر بولا۔ ''میرے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز لگائی گئی ہے۔ کیا میری ماں نے مجھے تکلیف سے جنم نہیں دیا ہے، ایک تم ہی دنیا میں اکیلی ماں ہو جس کے بیٹوں کے سر کی قیمت کوئی نہیں لگائے گا؟ دیکھو تمہارا بیٹا کتنا گیا گزرا تھا۔ کسی نے اس کی قیمت نہیں لگائی۔ وہ صرف ایک نوٹ کی قیمت پر مارا گیا ہے۔''

وہ بالکل ساکت ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ شاید اسے دوسری ماؤں کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ فون پر بول رہا تھا۔ ''اس بیٹے کے لیے جلدی سے رو دھو کر فارغ ہو جاؤ۔ کل دوسرے کے لیے ماتم کرنا ہے۔''

وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ چیخ کر بولی۔ ''نہیں بیٹے! نہیں۔ بس کرو، اس کی جان نہ لینا۔ میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی، میرا دم نکل جائے گا۔''

''کیا تمہارا شوہر اپنے دوسرے بیٹے کی سلامتی کے لیے مجھ سے دشمنی سے باز آ جائے گا؟ میں اپنے اس سوال کا جواب جانتا ہوں۔ وہ اپنے بہنوئی برنارڈ کا، اپنے بھائی میکی البرٹ کا انتقام ضرور لے گا اور اپنے بچوں کی ہلاکت پر تمہیں رونے کے لیے چھوڑ دے گا۔ وہ کتا ہے اس کی دم ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی۔''

ماں نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میڈونا! یہ فون پر مراد بول رہا ہے اور سچ بول رہا ہے۔ تمہارے پاپا کے بھائی اور بہنوئی مر چکے ہیں۔ ان ہلاک ہونے والوں کا انتقام لینے کے لیے وہ اپنے زندہ بیٹوں کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟ دوسرے بیٹے کو کہاں چھپاؤں؟''

مراد نے کہا۔ ''تم اپنے شوہر کی عقل کا ماتم کرتی رہو۔ میں تم سے کہہ دوں کہ میں میکی براؤن کے خاندان کے کسی مرد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ صرف تم ماں اور دو بیٹیاں سلامت رہو گی۔ تمہاری گڑیا بیٹی زندہ ہے تم اپنے بنگلے میں پہنچو گی تو وہ تمہیں ہنستی کھیلتی ملے گی۔''

وہ شکریہ کے الفاظ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن ادھر سے فون بند ہو گیا۔ مارتھا نے فوراً ہی بنگلے کا ٹیلی فون نمبر پنچ کیا۔ تھوڑی دیر میں ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ مارتھا نے پوچھا۔ ''کیا ہماری بیٹی بار بی وہاں ہے؟''

ملازم نے کہا۔ ''یس میڈم! ایک شخص کار میں آیا تھا۔ وہ بے بی کو چوکیدار کے پاس مین گیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

مارتھا خوشی کے مارے میڈونا سے لپٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

مرینہ نے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے میکی براؤن کی تصویر حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مراد نے اس مغرور جانی دشمن کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ ویسے وہ تصویر مرینہ اور ایمان علی کی ملاقات کا ذریعہ بن رہی تھی۔

ایمان علی نے فون پر پوچھا۔ ''کیا تصویر مل گئی؟''

''ہاں، یہ تصویر میرے فون میں ہے۔ تمہیں Send کر سکتی ہوں لیکن نہیں کروں گی۔ تصویر مل جائے گی تو پھر تم مجھ سے نہیں ملو گے۔''

مرینہ سے دور رہنا تھا اور اس سے ملنے کی بھی خواہش تھی۔ اس نے کہا۔ ''جہاں کہو گی، ملنے آ جاؤں گا۔ لیکن پہلے بھی کہہ چکا ہوں، تمہارے پیچھے دشمن بھی چلے آئیں گے۔''

وہ بولی۔ ''بڑی مصیبت ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ میرے ہی ذریعے تمہاری شہ رگ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس ہوٹل کے اندر اور باہر کئی جاسوس دن رات مجھے نظروں میں رکھتے ہیں۔ میں ہوٹل سے نکلتی ہوں تو وہ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔''

''پھر ملاقات کیسے ہو گی؟''

''کانٹوں میں گلاب کھلتا ہے۔ ہم بھی کانٹوں سے گزرتے ہوئے کہیں ملیں گے۔''

''پھر جہاں ملیں گے، وہاں بھی دشمن ہوں گے۔''

''تم ہمارے ملک کے سفارت خانے میں آ جاؤ۔ وہاں کئی ضرورت مند جاتے آتے رہتے ہیں۔ تم بھی جاؤ، وہاں تمہیں رازداری سے کسی کمرے میں بٹھایا جائے گا پھر میں تنہا وہاں آؤں گی اور وہاں سے تنہا واپس جاؤں گی تو دشمنوں کو مایوسی ہو گی۔''

''میں کس طرح وہاں سے واپس آؤں گا؟''

''جس طرح کئی ضرورت مند وہاں جاتے ہیں اور آتے ہیں، اسی طرح تم بھی واپس آؤ گے تو کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔''

یہ طے ہو گیا کہ ملاقات کے لیے سفارت خانہ محفوظ رہے گا۔ مرینہ نے برطانیہ کے سفیر سے کہا۔ ''آپ کے آفس میں ایک شخص ایمان علی آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد میں آؤں گی، ہم جس کمرے میں ملاقات کریں گے، وہاں اور کوئی نہ آئے، تمام سیکیورٹی گارڈز کو محتاط رہنے کی تاکید کریں۔''

اس کی ہدایات پر عمل کیا گیا۔ پلاننگ کے مطابق پہلے ایمان علی وہاں گیا۔ اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد مرینہ آ گئی۔

اور ایسے آئی جیسے خزاں میں بہار آتی ہے۔ وہ پچھلے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

کئی مہینوں سے خزاں رسیدہ تھا۔کوئی معشوق اس کی تنہائی میں نہیں آئی تھی اب آئی تو وہ بھول گیا کہ بندوق کی گولی آئی ہے۔وہ اسے ڈارک کلر کے بلاؤز اور اسکرٹ میں دیکھ کر سحر زدہ ہو رہا تھا۔آدمی سمجھ نہیں پاتا کہ موت میں کتنی کشش ہوتی ہے۔وہ قریب آئی پھر ذرا فاصلہ رکھ کر بولی۔''میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔تمہارے دل میں ابھی رنجش ہے۔میں ایک غلطی کر کے پچھتا رہی ہوں۔''

مراد نے ایمان علی کو سمجھایا تھا کہ کبھی مرینہ سے سامنا ہو تو رومانٹک نہ ہونا۔گہری سنجیدگی اختیار کیے رہنا۔ آہ...!مگر وہ خوبصورت بلا کتنے پیار سے بول رہی تھی۔وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اور قریب ہو کر بولی۔''مراد...!میں فاصلہ رکھوں گی مگر دل نہیں مان رہا ہے۔''

ایمان کا بے ایمان دل بھی نہیں مان رہا تھا۔

وہ بول رہی تھی۔''ہم جوان ہیں اور ایک مدت کے بعد تنہائی میں مل رہے ہیں۔فار گاڈ سیک۔ایک بار۔صرف ایک بار اپنی دھڑکنوں سے لگا لو۔''

ایک بھرپور حسینہ دعوت دے رہی تھی۔وہ ہواؤں میں اُڑنے لگا۔اس وقت وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی ایسی اچھوتی دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی جسے اب تک کسی نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔وہ ہاتھ آنے کے لیے سیدھی ایمان علی کے پاس آ گئی تھی۔

اب تبدیلی یہ آئی تھی کہ مرینہ پہلی بار اپنے مراد کو بڑی چاہت سے بڑی لگن سے دیکھ رہی تھی۔اندر سے خوش ہو رہی تھی کہ وہ تمام شکایتیں بھول کر پھر اس کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

وہ اس عاشق کے سامنے ادھر سے ادھر چلتی ہوئی خود کو مختلف زاویوں سے دکھاتے ہوئے بولی۔''کیسی لگ رہی ہوں؟''

ایمان علی کو اچانک مراد کی باتیں یاد آئیں۔عقل نے سمجھایا' وہ قریب ہونا چاہتی ہے' تم دور ہو جاؤ۔

وہ کشمکش میں رہ کر اسے تکنے لگا۔اس نے پوچھا۔ ''اس طرح مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔''خدا نے عورت کو ایسا بنایا ہے کہ اسے دیکھتے ہی عابد اور زاہد اپنی توبہ توڑ دیتے ہیں لیکن میری توبہ نہیں ٹوٹے گی۔میں تم سے فاصلہ رکھوں گا۔یہاں سامنے بیٹھو اور مجھے میکی براؤن کی تصویر دکھاؤ بلکہ اسے میرے فون میں ابھی' اسی وقت Send کر دو۔''

مرینہ نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ایمان علی کے فون میں تصویر ٹرانسفر کر دی۔اسے تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر فون کو جیب میں رکھ لیا۔دلچسپی سامنے والی میں تھی۔مشکل یہ تھی کہ محبت کی اور لگاوٹ کی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔فی الحال یہی غنیمت تھا کہ وہ نگاہوں کے سامنے تھی اور دل میں پھول کھلا رہی تھی۔جہاں بارود کی بُو ہو، وہاں خوشبو نہیں ٹھہرتی۔مرینہ کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے ملکی سفارت خانے میں دشمنوں کا کوئی مخبر نہیں ہوگا۔جبکہ شیطان کے چیلے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔یہ خبر باہر تک پہنچ گئی کہ وہ ایک کمرے میں کسی شخص سے تنہائی میں باتیں کر رہی ہے۔پھر تو مجرمانہ دستور کے مطابق جو ہونا تھا وہی ہوا۔

یکبارگی کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ تڑاتڑ کی گونجتی ہوئی فائرنگ ہوئی۔مرینہ تو ایسی سچویشن کی عادی تھی۔دروازہ کھلتے ہی وہ صوفوں کے درمیان فرش کی طرف چھلانگ لگاتی ہوئی گر پڑی۔ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جوابی فائرنگ کی۔ایسے وقت ایک گولی ایمان علی کو آ کر لگی۔ وہ صوفے سے لڑھک کر فرش پر تڑپنے لگا۔

مرینہ کی فائرنگ کے باعث ایک شوٹر مارا گیا۔ دوسرے نے اندر آنے کی ہمت نہیں کی۔واپس بھاگنے لگا۔ اس نے اپنے یار دلدار کو گولی لگتے دیکھی تھی۔وہ سمجھ رہی تھی کہ مراد جی دار ہے۔گولی کھانے کے باوجود اٹھ کر دشمنوں پر گولیاں چلائے گا لیکن وہ بے چارہ ایمان علی ایسے خطرناک کھیل کا عادی نہیں تھا۔فرش پر لڑھکنے کے بعد پھر نہ اٹھ سکا۔

مرینہ دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑے اندھا دھند فائر کرتی ہوئی چیختی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔''کتو! کمینو! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

اس کی طوفانی فائرنگ سے دو شوٹرز مارے گئے۔ باقی فرار ہو گئے۔مسلح سیکیورٹی گارڈز بھی گولیاں چلا رہے تھے۔وہ دوڑتی ہوئی ایمان علی کے پاس آئی۔اس کی پسلی کی طرف سے خون بہہ رہا تھا۔وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

وہ اسے دیکھنے اور جھنجوڑنے لگی۔''مراد! حوصلہ کرو' کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ایک ہی گولی لگی ہے، تم تو گولیاں کھا کر بھی لڑتے رہتے ہو۔اُٹھو مراد...!''

دو سیکیورٹی گارڈز دوڑتے ہوئے آئے۔وہ بولی۔ ''اسے فوراً اٹھاؤ، گاڑی میں ڈالو میں اسے اسپتال لے جاؤں گی۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

گارڈز اسے اٹھا کر دوڑتے ہوئے ایک بڑی سی ویگن کار میں لے آئے۔ اسے ایک سیٹ پر لٹا دیا۔ مرینہ سیٹوں کے درمیان اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی بے ہوشی نے پریشان کر دیا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی۔ ایمان علی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ موت سے لڑنے والے کو حیرانی سے مُردہ حالت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے مراد کو گولیوں سے چھلنی ہوتے اور دشمنوں سے لڑتے دیکھا تھا۔ اب وہی مراد صرف ایک گولی کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا، جبکہ گولی پسلیوں سے لگ کر گزر گئی تھی۔ اسے بوٹ دی سے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔

وہ اس کے چہرے کو چھو کر سوچنے لگی۔ یہ مراد ہی ہے۔ دہلی کے ایک فارم ہاؤس میں اس نے مراد کو اسی چہرے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سے مقابلہ کیا تھا اور کیا شیر مرد ہے۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ یہ، یہ وہی مراد ہے لیکن اتنا کمزور کیسے ہو گیا ہے؟

اس نے ایمان علی کے سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سنیں۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا کر اس کی گردن تک پہنچی۔ اس کے پسینے کی مہک کو اپنی سانسوں میں کھینچنے لگی۔ بس آگہی کے وہی لمحات تھے۔ پھر وہ اُٹھنے لگا۔

اپنے مرد کے پسینے میں بھیگنے والی کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ اب یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ اسی چہرے والے نے فارم ہاؤس میں اس سے فائٹ کی تھی۔ کسی اور کی مجال نہیں تھی کہ اسے شکست دے کر نکل جاتا۔ پھر یہ کہ اسی چہرے والے نے پچھلی رات ہوٹلوں کے سامنے حملہ آوروں سے مقابلہ کیا تھا۔ کیا وہ جوان و لیر مرد یہی تھا؟

وہ الجھتی ہوئی نظروں سے ایمان علی کو دیکھ رہی تھی۔ بہت سی باتیں الجھا رہی تھیں اس کے باوجود اپنے مرد کی تنہائیوں سے گزرنے والی اسے مراد ماننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اسے لے کر اسپتال پہنچی۔ ڈاکٹر اس کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ وہ دشمنوں کی طرف سے محتاط تھی۔ دو مسلح گارڈز اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ''مرینہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہمارے سفارت خانے میں غضب کی فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ تم کسی شخص سے وہاں ملنے گئی تھیں۔''

وہ بولی۔ ''ہاں، میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مراد ہے لیکن یہ کوئی اور ہے اور مراد کے دھوکے میں ایک گولی کھا چکا ہے۔ یہ بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ آئندہ بھی دشمن اسے مراد سمجھتے رہیں گے۔''

جان انتھونی نے کہا۔ ''ڈونٹ وری۔ یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ یہ خبر تیزی سے پھیل رہی ہے کہ مراد لندن میں ہے۔''

''کیا واقعی؟''

''یہ سچ ہے۔ اس نے میکی براؤن کے ایک بیٹے رونی براؤن کو گولی ماری ہے۔ یہ ریڈ الرٹ والے کئی خطرناک تنظیموں کے اتحادی ہیں۔ مراد کو یہاں میکی براؤن کی قوت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ مرنے کے لیے لندن آیا ہے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ مراد نے ہی میکی براؤن کے بیٹے کو گولی ماری ہے؟''

''خود مراد نے میکی سے فون پر کہا ہے اور یہ کہ جلد ہی اس کے دوسرے بیٹے جیکی براؤن کو بھی مار ڈالے گا۔ یہاں تمام تنظیموں کے جاسوس اور شوٹرز حرکت میں آ گئے ہیں اور مراد کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

یہ پیچیدہ اطلاع تھی کہ مراد لندن میں ہے اور وہ تمام دشمنوں کو وہاں اپنے پیچھے دوڑا رہا ہے۔ مرینہ تیزی سے چلتی ہوئی ایمرجنسی وارڈ میں آئی۔ ایمان علی کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اسے ایک کمرے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ جب وارڈ بوائز کمرے سے چلے گئے تو مرینہ نے قریب آ کر اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی نقاہت سے بولا۔ ''اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''تم مراد نہیں ہو، پھر مراد بن کر مجھ سے کیوں مل رہے ہو؟''

''میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ جو پوچھنا ہے، وہ مراد سے پوچھو۔''

''وہ اپنے فون کی سم بدل دیتا ہے۔ مجھ سے رابطہ نہیں ہوتا۔''

''میں ابھی بات کرتا ہوں۔''

وہ اپنے فون پر اس سے رابطہ کرنے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا وہ ابھی لندن میں ہے؟''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ہاں۔'' پھر اپنے فون پر بولا۔ ''کیا ابھی کہیں تنہا ہو؟''

مراد نے کہا۔ ''ہاں، جو کہنا چاہتے ہو، کہہ سکتے ہو۔''

''مجھے گولی لگی ہے۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مرینہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مجھے اسپتال لے کر آئی ہے۔ بھید کھل گیا ہے۔ تمہارا ناٹک نہیں چلے گا۔ میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ اب تمام دشمن مجھے مراد سمجھتے رہیں گے۔ آج ایک گولی نے اسپتال پہنچایا ہے کل دوسری گولی قبرستان پہنچا دے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میرے دوست! یہ کیا ہو گیا؟ میں تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لیے جان لڑا دوں گا۔ مرینہ سے بات کراؤ۔''

اس نے فون مرینہ کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولی۔ ''مراد! کیوں ایسے ناٹک کر کے مجھے پریشان کر رہے ہو۔ تم نے اس بیچارے کو بھی مصیبتوں میں ڈال دیا ہے۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''اپنے گریبان میں جھانک کر خود سے پوچھو۔ تمہیں اپنی بے وفائی اور دوغلا پن معلوم ہوگا۔ اگر تم میرے سر کا سودا کرنے دبلی نہ آتیں تو میں تم سے دشمنی نہ کرتا۔ تمہاری ایسی کمینگی کے باوجود میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ صرف اس لیے کہ کئی بار میرے بُرے وقت میں کام آ چکی ہو۔''

''پلیز مراد! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں آئندہ بھی تمہارے کام آتی رہوں گی۔ جو غلطی مجھ سے ہو چکی ہے اس کی تلافی کرتی رہوں گی۔ تم جلد ہی پھر سے مجھ پر بھروسا کرنے لگو گے۔''

''میں تم سے دور رہنے کے لیے یہ ناٹک کھیل رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں میرے محسن کا بیٹا ایمان علی اسپتال پہنچ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں جب تک اس کا علاج ہو رہا ہے اور جب تک اس کا زخم نہیں بھر جاتا' تم محافظ بن کر اس کے ساتھ رہو۔ اگر وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''میں اس کا ہم شکل نہ بنتا۔ تم سے دور رہنے کے لیے اسے استعمال نہ کرتا تو اس پر یہ مصیبتیں کبھی نہ آتیں۔''

''ٹھیک ہے میں اس کی حفاظت کروں گی لیکن لندن آنے کو دل مچل رہا ہے۔ وہاں تم ایک ہو اور دشمن ہزار ہیں۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''میں نے میکی براؤن کے بیٹے کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ مجرموں کی دنیا میں کھلبلی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے ڈھونڈتے رہیں گے اور میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

جس نے بھی دشمن کے بیٹے کو گولی ماری تھی' وہ مراد کا نام استعمال کر رہا تھا۔ اس لیے مراد فی الحال مرینہ سے یہی کہہ رہا تھا کہ اسی نے وہ واردات کی ہے۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ''دشمن اس دھوکے میں رہیں گے کہ میں لندن ہی میں ہوں۔ تم سے بھی کہہ رہا ہوں۔ یہاں آؤ گی تو مجھے نہیں پاؤ گی۔ تمہیں ایمان علی کو سیکیورٹی دینی ہوگی۔''

''تم جو کہو گے' وہ کروں گی۔ پلیز میری بات مانو' ایمان علی کی فکر نہ کرو۔ یہاں دشمنوں کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی ہوگی کہ تم یہاں نہیں لندن میں ہو۔ تمام مکھیاں اڑ کر ادھر جا رہی ہوں گی۔''

اس نے مراد کو مطمئن کرنے اور اپنی بات منوانے کے لیے کہا۔ ''ایمان علی کے سر سے خطرہ ٹل رہا ہے آئندہ بالکل ہی ٹل جائے گا۔ پلیز صرف اتنا بتا دو کہ لندن سے کہاں جاؤ گے؟ کیا ماروی کے پاس...؟''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''تم پھر میرے پیچھے آؤ گی۔''

''وعدہ کرتی ہوں' پیچھا نہیں کروں گی۔ پلیز۔ سچ بولو؟''

وہ بولا۔ ''ہاں کل تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میرے پیچھے پاکستان آؤ گی تو پھر سے دشمنی مول لو گی اور اس بار تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں تمہارے اور ماروی کے درمیان دیوار نہیں بنوں گی۔ یہ وعدہ کرو کہ ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے فون پر باتیں کرو گے۔''

''میں نے ماروی سے کہا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہارے اطمینان کے لیے وہاں اس سے چھپ کر ہفتے میں ایک بار باتیں کر لوں گا۔''

''چلو یہی سہی بس اتنا چاہتی ہوں کہ اس کے پاس جا کر مجھے نہ بھولو۔ فون پر ہی سہی ضرور مجھے یاد کرو۔''

مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ ڈاکٹر ٹمینی سن کے بنگلے میں اس کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اسے آرام سے بیٹھ کر اچھا وقت گزارنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ شامتیں' آفتیں آتی جاتی رہتی تھیں۔

عبداللہ کبڈی نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر کہا۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے جس نے خود کو مراد کہہ کر اتنی بڑی واردات کی ہے۔ میکی براؤن کے بیٹے کو ہی اُڑا دیا۔ جو کام تمہیں کرنا تھا وہ کر رہا ہے۔''

وہ ایک گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ وہ کون ہے۔ میں اس کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''میکی براؤن نے تمہیں اچھی طرح

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جکڑ لیا تھا اگر آج اس کا بیٹا مارا نہ جاتا۔ اس کے گھر میں ماتم نہ ہوتا تو وہ تمہیں داماد بنانے تک یہاں میرے پاس آنے نہ دیتا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''وہ تو مجھے بھی پکڑ کر لے جا رہا تھا۔ اب وہ دوسرے بیٹے کی سلامتی کی فکر میں ہوگا۔''

وہ چائے کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''مراد...! وہ کوئی بھی ہو۔ اس نے مراد بن کر ہمیں بھی میکی براؤن کی دشمنی سے فی الحال دور کر دیا ہے۔ وہ کمبخت تمہیں داماد بنانا بھول گیا ہوگا۔ یہ اچھا موقع ہے ہمیں کسی بھی فلائٹ سے پاکستان جانا چاہیے۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں آتے ہی میکی براؤن تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔ ہمیں واپس جانا چاہیے۔ میں انڈیا جاؤں گا تم دونوں پاکستان چلے جاؤ۔''

مراد تو اسی دن میں ماروی کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ وہاں جانے سے پہلے حالات اسے الجھاتے جا رہے تھے۔ ہر نئے دن کوئی نئی بات کوئی نئی الجھن پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ آئندہ حالات اور بدتر ہوئے، ناموافق ہوئے تو وہ دو تاریخ سے پہلے ماروی کی دہلیز تک نہیں پہنچ سکے گا۔

فون کے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ ایک نیا انجانا نمبر تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ پھر بولا۔ ''ہیلو کون؟''

دوسری طرف سے بلی کی میاؤں سنائی دی۔ آواز آئی۔ ''یہ میری بلی ہے سلام کر رہی ہے۔''

پھر ایک بلے کی غراہٹ سنائی دی۔ آواز آئی ''اور یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تمہارا [illegible] ہے۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ مراد علی منگی کا رول تم ہی ادا کر رہے ہو۔''

ڈاکٹر اور کبڈی چونک کر فون کی طرف دیکھنے لگے۔ بلے نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، میں نے کیسی ٹریننگ حاصل کی ہے؟''

''زبردست۔ تم نے میکی براؤن کے بیٹے کو اڑا کر پورے جرائم کی دنیا میں کھلبلی پیدا کر دی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''ہمارا ماسٹر کو بو میکی خاندان کا دشمن ہے۔ رونی براؤن کے مرڈر پر خوشی سے ناچ رہا ہے۔ اس نے مجھے ایک لاکھ [illegible] انعام کے طور پر دیے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''ماسٹر دل والا ہے۔ یہاں تمہاری رہائش کے تمام اخراجات وہی برداشت کر رہا ہوگا؟''

''ہاں اس نے کہا ہے کہ میکی کے پورے خاندان کو خاک میں ملانے تک مجھے اسی شہر میں رہنا ہے اور دشمنوں کو تم سے دور رکھنے کے لیے مجھے یہاں مراد علی منگی کہلانا ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ ماسٹر میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ مجھے ماروی تک پہنچانے کے لیے یہاں تمہیں مراد بن کر رہنے کو کہہ رہا ہے۔ اب میں اطمینان سے پاکستان جا سکوں گا۔''

''یار...! یہ بلی مجھ سے اون چھین رہی ہے۔ پہلے تم ہی اس سے بات کرو۔''

بشریٰ عرف بلی کی آواز سنائی دی۔ ''بھائی جان! السلام علیکم۔ آپ کی مہربانیوں سے ہم کیا تھے' کیا ہو گئے ہیں۔ کہاں سے کہاں آ گئے ہیں۔ پہلے کراچی شہر کے پسماندہ علاقے میں تھے آج لندن کے ایک مہنگے اپارٹمنٹ میں آ گئے ہیں۔ میں نے تو کار چلانی بھی سیکھ لی ہے۔ تھوڑی انگریزی بولنے لگی ہوں۔ ایک مہینے میں فرفر بولنے لگوں گی۔''

بلے کی آواز سنائی دی۔ ''ارے اسے بھی کچھ بولنے دے۔ آپ ہی بولتی چلی جا رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''تو چپ کر۔ بھائی جان کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ان کی مہربانیوں سے کتنی شاندار زندگی گزار رہی ہوں۔ ہم دونوں دو کوڑی کے تھے۔ آج ہمیں ڈالرز اور پاؤنڈز مل رہے ہیں۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خوش رہو بشریٰ! ابھی تم جو کچھ بھی ہو، وہ بلے کی محنت اور مہارت سے ہو۔ میں نے تو اس کے مزاج کے مطابق اسے صحیح جگہ پہنچایا تھا۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں شاد و آباد رہو اور پھلتے پھولتے رہو۔ شادی کے بعد پھلنے پھولنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال بچے ہوتے رہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''یہ دعا یاد رکھوں گی۔ آپ کی شادی کے بعد ماروی کو یہی دعائیں دوں گی۔'' مراد ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ ''بھائی جان! میں کہہ نہیں سکتی کہ آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین ہوں لیکن [illegible] کہتا ہے کہ ہمیں آپ سے دور رہنا چاہیے۔''

''وہ درست کہتا ہے۔ جب حالات سازگار ہوں گے تو ہم ضرور کہیں ملیں گے۔''

بلے نے اس سے فون لے کر کہا۔ ''یہ بتاؤ' پاکستان کب جا رہے ہو؟''

''تم نے یہاں آ کر میری جگہ لے کر مشکل آسان کر دی ہے۔ میں کل ہی کسی فلائٹ سے جانے کی کوشش

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کروں گا۔ سیٹیں مل جائیں گی تو تمہیں اطلاع دوں گا۔''

وہ بولا۔ ''میں نے بونے مراد کا بہت چرچا سنا ہے، کیا وہ لندن میں رہے گا؟''

''نہیں میرے ساتھ جائے گا۔ میں عبداللہ کبڈی اور اپنے ڈاکٹر ڈیڈی سے تمہیں متعارف کراؤں گا۔ تمہیں ان سے اچھی طرح واقف ہوجانا چاہیے۔ پہلے میں سیٹیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں پھر ان سے بات کراؤں گا۔''

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ماروی نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ بے چینی سے منتظر تھی۔ آہٹ پہ کان تھے' در پہ نظر تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ ''شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی...''

☆☆☆

ماروی خوشی سے اچھل پڑی۔ مراد فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ شام کی فلائٹ سے آرہا ہے، وہ خوشی سے جھوم کر بولی۔ ''سچ کہہ رہے ہو نا؟ ابھی کہاں ہو؟''

''میں لندن میں ہوں۔ جہاز ایک گھنٹے بعد یہاں سے پرواز کرے گا۔ میں وہاں شام چار بجے تک پہنچوں گا۔''

وہ فون کو منہ کے قریب لاکر دھیمی سرگوشی میں بولی۔ ''کیا اسی پلاننگ کے مطابق آرہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ تم اپنے سامنے ایک بونے مراد کو دیکھو گی۔ میں مراد کے دوست اور باڈی گارڈ کی حیثیت سے آرہا ہوں میرا نام ایمان علی ہوگا۔ یہ یاد ہے نا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''مجھے سب یاد ہے۔ میں ائرپورٹ پر تمہیں ریسیو کرنے نہیں آؤں گی۔ محبوب اور معروف صاحب حیران ہونے کے لیے وہاں جائیں گے اور بونے مراد کو دیکھیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ ''میرا جی چاہتا ہے، زور زور سے قہقہے لگاؤں، ہائے مراد! کتنے انتظار کے بعد آرہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''جہاز کی روانگی کا وقت ہورہا ہے میں فون بند کررہا ہوں۔ پاکستان پہنچ کر کال کروں گا۔''

اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ بند ہوگیا۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر منتی کے پاس آئی وہ ننھے شہزاد کا لباس بدل رہی تھی۔ وہ منتی سے لپٹ کر بولی۔ ''چاچی! ہائے چاچی! مراد آرہا ہے۔ وہ آج ہی شام کو یہاں آجائے گا۔''

منتی نے خوش ہوکر پوچھا۔ ''کیا اس نے فون کیا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے چاچی کو چھوڑ کر شہزاد کو بیڈ سے اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بابا آرہے ہیں۔ وہ تمہیں سینے سے لگا کر یہاں پپی لیں گے۔''

منتی اسے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے بچی کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے لینے ائرپورٹ کون جائے گا؟ محبوب کو تو اطلاع دو۔''

وہ شہزاد کو چاچی کی گود میں دے کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی پھر فون کو اٹھا کر محبوب کے نمبر پہنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر محبوب کی آواز سنائی دی۔ ''محبوب کی جان! کیسی ہو؟''

''میں بہت خوش ہوں.. یا اللہ! کیا بتاؤں' آج تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔''

''تم خوش ہوتی ہو تو میری عید ہوجاتی ہے، بائی داوے آج کس بات پر اتنی خوش ہو؟''

''آج مراد آرہا ہے۔ آج ہی شام کی فلائٹ سے آرہا ہے۔''

محبوب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ماروی کی جو خوشی اس کے لیے عید ہورہی تھی' اچانک ماتمی ہوگئی۔ وہ اسے لندن کی فلائٹ کے بارے میں بتا رہی تھی پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ اسے ریسیو کرنے جائیں گے نا؟''

وہ ذرا اٹک کر بولا۔ ''آں۔ ہاں۔ ضرور جاؤں گا وہ ایک طویل عرصے کے بعد آرہا ہے۔ ضرور جانا چاہیے۔ میں اس کا استقبال کروں گا۔ اسے گلے لگاؤں گا۔''

یہ خوب جانتا تھا کہ کس دل سے گلے لگائے گا۔ ماروی کہہ رہی تھی۔ ''میں چاہتی ہوں معروف صاحب کو بھی ائرپورٹ پر لے جائیں۔ بڑی بڑی ہستیوں کو دیکھ کر مراد بہت خوش ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں معروف صاحب کے ساتھ اسے ریسیو کرنے جاؤں گا' لیکن ہم اسے کیسے پہچانیں گے؟ وہ تو یہاں چہرہ بدل کر آئے گا۔''

''نہیں۔ وہ کسی بہروپ میں نہیں ہوگا۔ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ آئے گا۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ اس کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوچکا ہے۔ پولیس اسے دیکھتے ہی گرفتار کرلے گی۔''

واقعی یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ وہ اصلی چہرے کے ساتھ آرہا ہے۔ صرف دشمن ہی نہیں' قانون کے محافظ بھی اس کے جانی دشمن تھے۔ وہ کسی حال میں بھی اپنی زندگی اصلی چہرے کے ساتھ گزار نہیں سکتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ماروی نے کہا۔ ''میں نے اپنے خدشات ظاہر کیے تھے لیکن مراد کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس نے یقین سے کہا ہے کہ وہ کسی قانونی گرفت میں نہیں آئے گا۔''

محبوب نے کہا۔ ''تعجب ہے۔ اس کی خود اعتمادی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ ماروی! ابھی کال کر سکتی ہو تو اسے سمجھاؤ' وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آرہا ہے۔''

''میں نے اسے سمجھایا ہے لیکن وہ اپنے معاملے میں بہت پُراعتماد ہے۔ میری نہیں سن رہا ہے۔ میں دعائیں مانگ رہی ہوں کہ پولیس والوں کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔''

پھر وہ بڑی اپنایت سے بولی۔ ''محبوب صاحب! خدانخواستہ وہ گرفتار ہوگا تو آپ ہیں نا۔ آپ اس کا مقدمہ لڑیں گے۔''

''ہاں، ضرور۔ میں اس کا مقدمہ لڑوں گا۔ ویسے تم یہ شرط ہار گئی ہو۔ وہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ اب مجرم نہیں رہا ہے۔''

''پلیز۔ ابھی یہ باتیں نہ کریں۔''

''میں اپنے اطمینان کے لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں' عدالت کے فیصلے تک وہ مجرم ہی کہلائے گا اور فیصلہ تو برسوں میں ہوگا۔ اس سے پہلے ابھی ایک ہفتے بعد دو تاریخ کو ہماری شادی ہو جائے گی۔''

ماروی جتنی خوش تھی، اتنی ہی اداس ہوگئی۔ شرائط کے مطابق مراد دو تاریخ سے پہلے ثابت نہیں کر سکے گا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آیا ہے اور آئندہ ایک بے داغ اور پارسا آدمی کی طرح امن و امان سے رہنے والا ہے۔ شرائط کے مطابق اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ گناہوں سے باز آچکا ہے۔ اب مرینہ سے یا کسی بھی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ کسی ثبوت اور معتبر گواہوں کے بغیر اپنی پارسائی ثابت نہیں کر سکے گا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ خوشیوں پر پریشانیاں حاوی ہو رہی تھیں۔ وہ فون پر کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

محبوب نے کہا۔ ''ماروی! تم چپ ہو' یہ اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ تمہیں مراد کی حمایت میں ناکامی ہو رہی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب بھی کہہ رہا ہوں کہ میری دلہن بننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرتی رہو۔ اب پورے سات دن رہ گئے ہیں۔''

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی جیسے مراد کو اپنے اندر جذب کر رہی ہو۔ وہ دل توڑنے والی باتیں سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''دو تاریخ ابھی دور ہے۔ مجھے آج خوش ہونے دیں۔ میں شام کو انتظار کروں گی۔ آپ اسے ائرپورٹ سے یہاں لائیں گے۔''

''اطمینان رکھو۔ آج تم اس سے ضرور ملو گی۔ میں اسے سیکیورٹی دوں گا۔ پولیس والوں کی نظروں سے بچا کر اسے کلرڈ شیشوں کی کار میں چھپا کر لاؤں گا۔''

محبوب نے رابطہ ختم ہونے کے بعد انٹیلی جنس کے افسر حماد صدیقی سے فون پر کہا۔ ''آج لندن سے آنے والی چار بجے کی فلائٹ سے مراد آرہا ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''اچھا، وہ لندن پہنچا ہوا تھا؟ وہاں سے آرہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے' بڑے۔ بے ہاتھ مار رہا ہے۔''

''یہی میں سوچ رہا ہوں۔ وہ بڑی دولت کما رہا ہے۔ تب ہی یہاں سے انڈیا گیا۔ انڈیا سے اور نہ جانے کتنے ملکوں میں رہنے کے بعد لندن گیا ہے۔ وہ لاکھوں ڈالرز کے اخراجات کہاں سے پورے کر رہا ہوگا؟''

حماد نے کہا۔ ''سیدھے سادے کاروبار سے اتنی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ مجرمانہ زندگی گزارنے والے بڑے بڑے ہاتھ مارتے ہیں اور بڑی عبرتناک موت مرتے بھی ہیں۔''

''ہم سوچ رہے تھے کہ وہ چھپنے کے لیے چہرہ بدل کر آئے گا' ماروی نے ابھی بتایا ہے کہ وہ کسی روپ بہروپ کے بغیر آرہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہاں اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔''

حماد نے کہا۔ ''وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے۔''

''میں نہیں چاہتا کہ اسے ائرپورٹ پر ہی گرفتار کیا جائے۔ میں اسے ماروی کے پاس لے جاؤں گا۔ کچھ ایسا کرو کہ آج اسے گرفتار نہ کیا جا سکے۔''

''ایسی کوئی بات ہوگی تو میں ایک دن کے لیے اس کی گرفتاری کو ٹال دوں گا۔''

محبوب کے اندر یہ کھلبلی تھی کہ مراد کی موجودگی سے شادی ملتوی نہ ہو جائے۔ اس نے کہا۔ ''میں بہت ٹینشن میں ہوں۔ فرض کرو، وہ ثابت کر دے کہ مجرمانہ زندگی چھوڑ چکا ہے تو تم کیسے ثابت کرو گے کہ وہ آج بھی مجرم ہے؟''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو حماد! اس کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے ہی ماروی میری دلہن بن سکے گی۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ ہم پہلے کچھ روز اسے ڈھیل دیں گے۔ پھر مختلف ہتھکنڈوں سے اسے مجرم ثابت کر دیں گے۔ یہ سب دو تاریخ سے پہلے ہی ہوگا۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''تھینک یو حماد!'' اس نے فون بند کردیا۔ بڑی بے چینی سے سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جیسے جیسے دو تاریخ قریب آرہی تھی' یہ اندیشہ بڑھتا جارہا تھا کہ رقیب بہت ہی ضدی ہے' ہزار رکاوٹوں کے باوجود رنگ میں بھنگ ڈالنے آجائے گا۔

وہ اُٹھ کر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ دماغ میں شور مچاتے ہوئے خیالات کی یلغار تھی۔ اگر ماروی دو تاریخ کو اس کی دلہن نہ بن سکی تو کیا ہوگا؟ وہ اس کے عشق میں مسلسل ناکامیاں برداشت کرتا آرہا تھا۔ اب قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اب اسے ایک ذرا ہیرا پھیری سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی اعلیٰ ظرفی اور نیک طبیعت کے مطابق مراد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ حماد کے ساتھ یہ طے کرنے والا تھا کہ پہلے مراد کو مجرم ثابت کرکے جیل میں پہنچایا جائے۔ دو تاریخ کو ماروی سے نکاح پڑھایا جائے۔ پھر دیانتداری سے مقدمہ لڑتے ہوئے ثابت کیا جائے کہ وہ نہ تو مجرم ہے اور نہ ہی اس نے عالی جناب کو قتل کیا ہے۔ وہ دشمن بھی تھا اور دوست بھی..... رقیب بھی تھا اور حبیب بھی جہاں بے انتہا دولت ہو اور ایلیٹ کلاس والے ساتھ ہوں وہاں سچے جھوٹے ثبوت اور گواہوں کے ذریعے مقدمہ جیت لیا جاتا ہے۔ محبوب نے یہ یقین کرلیا تھا کہ مراد کو بعد میں عدالت سے باعزت طور پر بری کرالے گا۔ وہ ایک طویل مدت کے بعد رقیب بن کر یہ قدم اٹھا رہا تھا اور پہلی بار اپنے اندر چپ چاپ یہ تسلیم کررہا تھا کہ وہ اب تک اپنی ماروی کو احسانات کی زنجیروں میں جکڑتا آیا ہے۔ آخر وہ بھی انسان تھا۔

آخر کب تک شرافت اور دیانت داری سے دل جیتنے کی کوششیں کرتا رہتا؟

ماروی کے اندر ایسی خوشیاں بھر گئی تھیں کہ وہ سکون سے ایک جگہ بیٹھ نہیں پارہی تھی۔ مراد کے سامنے جانے کے لیے کبھی ایک لباس پسند کررہی تھی۔ کبھی دوسرا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا پہنے؟

دوپہر کو سمیرا آئی۔ اس نے کہا۔ ''ماروی! میں شرمندگی کے باعث تمہارے پاس نہیں آتی ہوں۔ ابھی بہت بڑی خوش خبری سن کر آئی ہوں۔ مبارک ہو ماروی! تمہارا مراد آرہا ہے۔''

ماروی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میں نے تمہیں اسی دن معاف کردیا تھا۔ تم آگئیں' یہ اچھا کیا۔ دو گھنٹے بعد مراد آنے والا ہے۔ اب میں تمہیں ڈنر کے بعد ہی جانے دوں گی۔''

وہ بولی۔ ''تمہارے اس پیار بھرے رویے سے میرے دل کا بوجھ کم ہورہا ہے۔ میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''آؤ بیٹھو۔ آج تو خوب باتیں کرو، وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ تم سے باتیں کرتی رہوں گی تو وقت جلدی گزر جائے گا۔''

سمیرا نے کہا۔ ''تم کتنی خوش ہو ماروی! میں دعائیں مانگتی آرہی ہوں کہ مراد کی ہو۔ مراد کی ہی رہو۔'' پھر اس نے ماروی کا ہاتھ تھام کر بڑے دُکھ سے پوچھا۔ ''دو تاریخ کو کیا ہوگا؟''

ماروی نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر چپ رہی، پھر بولی۔ ''مراد آرہا ہے۔ وہ چٹان ہے۔ مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ وہ کسی حال میں مجھے پرائی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں جانتی' کیا ہونے والا ہے۔''

''ماروی! وہ آتے ہی خطرات سے دوچار ہوگا۔ قانون کے محافظوں سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ کیا تم اپنے حالات کے تاریک پہلوؤں کو دیکھ رہی ہو؟ سمجھ رہی ہو؟''

''میرے دیکھنے سمجھنے سے حالات نہیں بدلیں گے۔ کیسا نصیب ہے کہ خوشیاں اور صدمات ایک ساتھ مل رہے ہیں۔ جو ہونا ہے، وہ آج کل میں سامنے آہی جائے گا۔''

جو ہونے والا ہے، وہ جلد یا بدیر ہو ہی جاتا ہے۔ ماروی کا جو وقت نہیں گزر رہا تھا' وہ بھی گزر گیا لندن سے آنے والا طیارہ رن وے پر اتر گیا۔ محبوب اور معروف اسے ریسیو کرنے آئے تھے۔

معروف تجلی نے کہا۔ ''تم ناحق ٹینشن میں ہو۔ اگر وہ واقعی اصلی چہرے کے ساتھ آرہا ہے تو ہمارے ساتھ کوٹھی تک پہنچ نہیں پائے گا۔ پولیس اسے لے جائے گی۔''

محبوب نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں چاہتا۔ ماروی بہت خوش ہے۔ میں نے حماد سے کہا ہے کہ آج اسے پولیس نہ پکڑے۔ کل گرفتار کرلے کوئی بات نہیں...''

وہ باتیں کرتے ہوئے وقت گزار رہے تھے۔ جہاز سے اترنے والے مسافر کسٹم چیکنگ سے گزر کر باہر آرہے تھے۔ مراد بھی اپنے سامان کی ٹرالی دھکیلتا ہوا آرہا تھا۔ عبداللہ کبڈی اس قدآور ایمان علی (مراد) کے پیچھے ہونے کے باعث دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مراد نے محبوب کے قریب آکر ٹرالی روکی تو کبڈی نے اس کے پیچھے سے آگے آکر کہا۔ ''سائیں! السلام علیکم!''

محبوب اور معروف اسے دیکھتے ہی شدید حیرانی کے باعث ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ دونوں کے دماغوں کو جھٹکا پہنچا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کبڈی نے محبوب کے سامنے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا' آپ سب مجھے دیکھتے ہی حیران رہ جائیں گے۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کریں گے۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''میں خود اپنا ماتم کرتا رہا ہوں۔ پہاڑ جیسا تھا' سکڑ کر بونا ہو گیا ہوں۔''

محبوب نے اپنے ہم شکل سے مصافحہ نہیں کیا تھا اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ معروف نے کہا۔ ''تم مراد کے ہم شکل ہو اور خود کو مراد کہہ رہے ہو لیکن مراد نہیں ہو سکتے۔''

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''میں ایک ناقابل انکار حقیقت ہوں۔ آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔''

معروف نے کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ کوئی چھ فٹ سے گھٹ کر تین چار فٹ کا نہیں ہو سکتا۔ ایسا آج تک نہیں ہوا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

وہ بولا۔ ''جیسا کبھی نہیں ہوتا' ویسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے اور جب ہو جاتا ہے تو اسے قدرت کا تماشا کہتے ہیں۔''

وہ محبوب سے بولا۔ ''سائیں...! آپ سب انکار کرتے رہیں گے۔ تب بھی یہ تماشا آنکھوں کے سامنے رہے گا۔''

معروف نے کہا۔ ''عقل جھنجوڑ رہی ہے۔ پوچھ رہی ہے' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''معروف صاحب! آپ نہیں مانیں گے۔ ایسا کالے جادو سے ہو گیا ہے۔ ایک شیطان صفت جادوگر نے مجھے یہ تماشا بنا دیا ہے۔''

''ہم جادو کو نہیں مانتے۔ عدالت بھی نہیں مانے گی۔''

''اچھا ہے۔ عدالت نہ مانے اس طرح مجھے مفرور مجرم مراد علی منگی تسلیم نہیں کیا جا سکے گا۔ اسی اعتماد سے میں یہاں آیا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم بالکل مراد کے لہجے میں بول رہے ہو۔ صورت شکل بھی وہی ہے لیکن کون آج کے دور میں یقین کرے گا کہ یوں ہاتھی سے چوہے بن گئے ہو؟''

''کسی کے یقین نہ کرنے سے اور آپ کے بھی یقین نہ کرنے سے میں مراد ہوں۔ مراد ہی رہوں گا۔''

مراد ٹرالی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے محبوب سے اور معروف سے مصافحہ کرتے ہوئے خالص برطانوی انگریزوں کے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر! یہ میرا جگری دوست ہے۔ میں ڈاکٹر ٹمنی سن کا بیٹا ہوں۔ میرے ڈیڈی عیسائی ہیں اور میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میرا نام ایمان علی ہے۔''

وہ کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں میرے فادر اور کئی چشم دید گواہ ہیں۔ ایک بلیک میجک جاننے والے وچ ڈاکٹر نے اسے بونا بنا کر اس پر ظلم بھی کیا ہے۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''اور یہ عجیب سی بات ہے کہ اس پر ظلم تو ہوا ہے' ساتھ ہی نیکی بھی ہوئی ہے۔''

معروف نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی ہم بیک وقت نیکی اور ظلم کیسے ہو گیا؟''

''نیکی اس طرح کہ اب کوئی دشمن اسے مراد علی منگی تسلیم نہیں کرتا۔ اسے مجرموں کی دنیا سے نجات مل گئی ہے اب یہ اسلحے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔''

وہ چیلنج کے انداز میں بولا۔ ''آپ دیکھیں گے کہ یہاں قانون کے محافظ یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہی مطلوبہ مجرم مراد علی منگی ہے' کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح جادوگر نے اس کے ساتھ نیکی کی ہے؟''

مراد اور معروف نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ مراد نے کہا۔ ''اور اس پر ظلم یہ ہونے والا ہے کہ یہاں اس کے اپنے بھی اسے مراد تسلیم نہیں کریں گے۔''

کبڈی نے کہا۔ ''میں اپنی ماروی کے متعلق سوچتا رہا۔ یہاں آنے سے کتراتا رہا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ صرف اسی کا خیال بار بار آتا ہے' وہ مجھے دیکھے گی تو بچپن کی محبت فنا ہو جائے گی۔''

یہ بات محبوب کے حق میں تھی۔ اس کے دل نے اور دماغ نے کہا۔ ''اللہ کرے یہ مراد ہی ہو۔''

اسے مراد تسلیم کرنے سے ہی بات بننے والی تھی، اس نے سوچا۔ ''میں ابھی اسے آزماؤں گا۔ خدا کرے' ماروی بھی اسے بونا ہونے کے باوجود تسلیم کر لے۔''

کبڈی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا جگری یار ہے۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ مجھے یہاں آ کر ماروی سے ملنا چاہیے۔ بچپن کی محبت پائیدار ہوتی ہے۔ ماروی مجھے دیکھ کر منہ نہیں پھیرے گی۔''

محبوب اور معروف نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ یہ سنہری موقع ہے۔ اسے ماروی کے سامنے لے جانا چاہیے۔

انہیں پورا یقین تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی دور بھاگے گی۔ بچپن کی محبت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ماروی اسے تسلیم کر کے' اسے گود میں اٹھا کر عشق کرنا شروع کر دیتی۔

محبوب نے کبڈی سے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو'

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

کبڈی نے کہا۔''سول اسپتال کے پیچھے اور ایک بوتیک کے سامنے اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی.....''

وہ بتانے لگا کہ دونوں ہم شکل پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ کر کس طرح حیران ہوئے تھے اور ان کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟ پھر انہوں نے دوسرے دن تین تلوار کے سامنے ملاقات کی تھی۔ وہاں سے ایک فلیٹ میں گئے تھے۔ مراد نے محبوب کو زلیخا کی کہانی سنا کر یقین دلایا تھا کہ وہ زلیخا کا قاتل نہیں ہے۔

محبوب نے اس سے اور کئی طرح کے سوالات کیے۔ اسے صحیح جوابات مل رہے تھے۔ معروف نے کہا۔''تم میرے ساتھ اسلام آباد گئے تھے؟''

وہ بولا۔''آپ کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اکیلا ٹرین میں پنڈی گیا تھا، وہاں ریلوے اسٹیشن سے ہم مرگلہ گئے تھے۔''

وہ دونوں اس سے گزری ہوئی باتیں پوچھ رہے تھے، اس کا جواب سن کر یقین ہو گیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ معروف نے محبوب کو ایک طرف لے جا کر کہا۔''یہ مراد نہ بھی ہو تو ہماری بلا سے۔ تقدیر تم پر مہربان ہے۔ اسے لے چلو پھر اس کے لیے ماروی کی نفرت دیکھو۔ اب تو وہ دل و جان سے تمہاری منکوحہ بنے گی۔''

محبوب اندر ہی اندر مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ اس نے کبڈی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔''ہمیں ماننا پڑے گا کہ تم ہی مراد ہو۔ تم میری اور مراد کی وہ باتیں بول رہے ہو، جو صرف مراد جانتا تھا۔ گھر چلو، وہاں چاچی، چاچا اور ماروی تمہارا صحیح امتحان لیں گے، وہ مراد کو بچپن سے جانتے ہیں۔''

کبڈی محبوب سے اور قریب ہو کر بولا۔''یہ دیکھتا آرہا ہوں کہ پہلے سب ہی انکار کرتے ہیں پھر مجھے مراد تسلیم کر لیتے ہیں۔ ابھی گھر جاؤں گا تو سب ہی مان لیں گے۔ لیکن ماروی...؟ وہ بھی تسلیم کر لے گی لیکن میں اس کے قابل نہیں رہا ہوں۔ اس سے بہت اونچا تھا۔ اب برابر بھی نہیں رہا ہوں۔''

کبڈی نے سرد آہ بھری۔ محبوب نے اپنی مسرتوں کو چھپاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔''دل چھوٹا نہ کرو۔ چلو اس کا سامنا کرو۔ بچپن کی محبت دل سے نہیں جاتی۔''

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ معروف اور مراد پچھلی سیٹ پر آ گئے۔ وہ دونوں انگلش لینگویج میں بول رہے تھے۔ محبوب نے عقب نما آئینے میں مراد کو دیکھ کر کار آگے بڑھاتے ہوئے سوچا۔' یہ بالکل مراد کی طرح قد آور اور باڈی بلڈر ہے لیکن مراد ایسی روانی سے انگریزی نہیں بول سکتا' جیسے یہ بول رہا ہے۔

اس نے کبڈی سے پوچھا۔''یہ کون ہے؟''

''یہ ایمان علی ہے۔ یہ دوست بھی ہے اور محسن بھی ہے۔ میں انڈیا میں دشمنوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہاں اسی نے پناہ دی۔ ہم دن رات ساتھ رہتے تھے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ آئندہ بھی ساتھ رہیں گے۔ اسی لیے یہ میرے ساتھ آیا ہے۔''

مراد نے پچھلی سیٹ سے کبڈی کو کہا۔''لیکن، ساں ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ماروی نے تمہیں مراد تسلیم نہ کیا تو تم یہاں ان پر بوجھ بنے رہو گے' مجھے کسی ہوٹل میں رہنا چاہیے۔''

کبڈی نے کہا۔''ہرگز نہیں۔ تمہارے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تمہیں ہوٹل میں نہیں رہنے دوں گا۔''

مراد نے اس سے کہا۔''مراد! موجودہ سچویشن کو سمجھو ابھی وہاں جا کر تم بڑی مشکلات سے دوچار ہوتے رہو گے۔''

کبڈی نے کہا۔''اور تم مجھے مشکلات میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ نہیں ایمان علی! ہرگز نہیں' ہم جہاں رہیں گے جس حال میں رہیں گے ساتھ رہیں گے۔''

معروف نے کہا۔''تم لوگ رہائش کے معاملے کو اہمیت نہ دو' بائی دا وے مسٹر ایمان علی تم نے دیارِ غیر میں دن رات مراد کا ساتھ دیا ہے۔ یہاں بھی ساتھ رہو گے۔ ہم مراد کے ساتھ ہی تمہاری رہائش کا انتظام بھی کریں گے۔''

مراد اور کبڈی اسی لیے جان بوجھ کر بحث کر رہے تھے کہ ایک ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے ان کی رہائش کا انتظام ہو جائے۔ کبڈی نے محبوب سے کہا۔''میں سوچ رہا ہوں' مجھے اچانک ماروی کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ آپ گاڑی روکیں اور پہلے فون پر ماروی کو بتائیں کہ میں کیا سے کیا ہو گیا ہوں؟ دیکھنے والوں کے لیے تماشا بن گیا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔''تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ ماروی کو فون پر بتانا مناسب نہیں ہے۔''

پھر محبوب نے دل میں کہا۔''جس طرح اچانک تمہیں دیکھتے ہی ہمیں شاک پہنچا ہے، اسی طرح ماروی کو زبردست دماغی صدمہ پہنچنا چاہیے۔ اب تو یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ مراد ہے اور وہ بھی اسے مراد تسلیم کر لے گی۔''

محبوب ایسے مطمئن ہو گیا جیسے ماروی کے نام کی لاٹری اس کے نام نکل آئی ہو۔ اب وہ ذرا بھی پریشان اور فکرمند نہیں تھا۔ یہ پورا یقین ہو گیا کہ بونے مراد کو دیکھنے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے بعد وہ خود ہی محبوب کی طرف کشاں کشاں چلی آئے گی۔ اس کی منکوحہ بن جائے گی۔

اس نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے بونے مراد کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر سوچا' ماروی کے عشق کا بخار اتر جائے گا۔ وہ اس سے محبت اور ہمدردی کرے گی لیکن بھولے سے بھی اسے اپنا مجازی خدا بنانے کی بات نہیں سوچے گی۔ تھینکس گاڈ...! وہ دو تاریخ سے پہلے ہی میری منکوحہ بن جائے گی۔'

وہ کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوکر پورچ میں رک گئی۔ وہ چاروں کار سے باہر آئے۔ محبوب نے کہا۔ ''معروف صاحب! آپ پہلے جائیں اور اطلاع دیں کہ مراد آرہا ہے۔''

معروف اور مراد پہلے دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ڈرائنگ روم میں ماروی، سمیرا، چاچی اور چاچا بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد نے اندر آتے ہی ماروی کو دیکھا۔ ماروی نے بھی اسے دیکھا۔ دل نے کہا۔ ''یہی میرا مراد ہے۔ وہی قد، وہی جسامت، میرے پیار کی خوشبو، مجھے مل رہی ہے۔''

معروف نے کہا۔ ''مراد آرہا ہے لیکن ماروی! ایک چونکا دینے والی بات ہے۔ پلیز اسے دیکھ کر اپنے دل و دماغ پر قابو رکھو گی۔ تمہیں صدمہ پہنچنے والا ہے۔''

ماروی صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''معروف صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے صدمہ کیوں پہنچے گا؟''

وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کہاں ہے وہ؟ اندر کیوں نہیں آرہا ہے؟ میں جا کر اسے دیکھتی ہوں۔''

وہ باہر جانے کے لیے آگے بڑھی۔ پھر ٹھٹک گئی۔ وہ محبوب کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی حیرت سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کے سامنے محبوب اور مراد دو ہم شکل تھے۔ وہ پہلے بھی انہیں دیکھ چکے تھے لیکن اب ایک قد آور تھا اور دوسرا بونا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ برسوں سے جسے قد آور دیکھتے آرہے تھے، اسے آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں کرسکتے تھے کہ وہ چاند کی طرح گھٹ گیا ہے۔

ماروی نے پریشان ہوکر تقریباً چیخنے کے انداز میں پوچھا۔ ''مراد کہاں ہے؟''

کبڈی سر جھکائے کھڑا تھا۔ محبوب نے کہا۔ ''ماروی! دل مضبوط کرو۔ یہی تمہارا ہمارا مراد ہے۔''

وہ صدمے سے پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''نہیں، یہ کیا مذاق ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں۔ آپ کسی بونے کو مراد بنا کر لائے ہیں؟ آپ کیوں تماشا کررہے ہیں؟''

کبڈی نے سر اٹھا کر ماروی کو صدمے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سچ مچ تماشا بن گیا ہوں۔ میں فون پر تم سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن یہ بتانے کا حوصلہ نہ ہوا کہ ایک ظالم جادوگر نے اپنے شیطانی عمل سے میرے اس ظاہری وجود کو آدھا کردیا ہے۔''

وہ چیخ کر بولی۔ ''بکواس مت کرو۔ میرا مراد پہاڑ تھا۔ آسمان کو چھو لیتا تھا۔ تمہاری طرح تنکا نہیں تھا۔''

چاچی اور چاچا اس کے قریب آکر اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چاچی نے کہا۔ ''میں مانتی ہوں' کالے جادو سے کسی کو مارڈ لا جاتا ہے' کسی کو اپاہج اور کسی کو بونا بنا دیا جاتا ہے۔''

چاچا نے کہا۔ ''یہ جاننے کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری دائی ماں کون تھی؟''

کبڈی نے آگے بڑھ کر چاچی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میں چاچی کے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا۔ میری مرحوم اماں نے بتایا تھا کہ چاچی نے ہی میرا نام مراد رکھا تھا۔''

نئی چاچی حیرانی سے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی۔ سمیرا حیرانی اور بے یقینی سے کبھی بونے مراد کو اور کبھی ماروی کی حیرانی اور پریشانی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ غصہ کرنا بھول کر بونے کو سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ بونا چاچی اور چاچا کے ساتھ گزارنے والی زندگی کی ایسی باتیں بتا رہا تھا، جو صرف مراد ہی جانتا تھا۔

وہ دونوں بوڑھے اس سے طرح طرح کے سوالات کررہے تھے اور وہ صحیح جوابات دے رہا تھا۔ ادھر مراد اور ماروی کی نظریں بار بار مل رہی تھیں۔ اس نے سب کی نظریں بچا کر ماروی کو آنکھ ماری تو وہ ورا ہی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اپنی مسکراہٹ کو چھپانے لگی۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہی اس کا مراد ہے۔

اُدھر چاچی اور چاچا کو بھی یقین ہوگیا۔ انہوں نے بونے کو مراد تسلیم کرلیا اور یہ تو کرنا ہی تھا۔ مراد اور ماروی نے انہیں بھی اپنا رازدار بنا رکھا تھا۔ وہ سب بڑی کامیابی سے سوچے سمجھے ہوئے ڈرامے کو پلے کررہے تھے۔

چاچی گھٹنے ٹیک کر بونے کو گلے لگا کر رو رہی تھی۔ ''ہائے میرے بچے! تم ہی ہمارے مراد ہو۔ ہائے ہائے تم کیسے قطب مینار تھے آج تمہیں گلے لگانے کے لیے گھٹنے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.youtube.net

ٹیک رہی ہوں۔''

سمیرا، محبوب اور معروف انہیں دیکھ رہے تھے۔ ماروی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''چاچی! کیا آپ کو پوری طرح یقین ہوگیا ہے؟ کیا جادو سے ایسا ہوسکتا ہے؟''

وہ فرش سے اٹھ کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں بیٹی! یہ ہمارا مراد ہے۔ تم جادو ٹونے پر یقین کرو یا نہ کرو۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ کسی شک و شبہے کے بغیر ہمارا مراد ہے۔''

''جب تم کہہ رہی ہو تو میں بھی اس سے ایسی باتیں پوچھوں گی، جو صرف مراد ہی جانتا ہے۔ پھر ہمارے درمیان کوڈ ورڈز ہیں۔ انہیں بھی مراد کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

پھر اس نے کبڈی سے پوچھا۔ ''اگر تم مراد ہو تو ہمارے درمیان ہونے والی خفیہ باتیں بتاؤ گے؟''

کبڈی نے کہا۔ ''ہاں جو پوچھو گی، جواب دوں گا۔ مگر وہ باتیں سب کے سامنے کہنا مناسب نہیں ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ، میں تنہائی میں تمہاری اصلیت معلوم کروں گی۔''

وہ ڈرائنگ روم کے باہر لاؤنج کی طرف جانے لگی۔ عبداللہ کبڈی اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ہوا جانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا، بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا جا رہا ہو۔

معروف مجلی نے زیرلب مسکرا کر محبوب کو دیکھا۔ محبوب کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ سب ہی دیکھ رہے تھے مراد اور ماروی بے جوڑ ہوگئے تھے۔ نہ ایک دوسرے کے عاشق و معشوق ہوسکتے تھے۔ نہ میاں بیوی بن سکتے تھے۔ محبوب کی یہ حالت تھی کہ اگر تنہا ہوتا تو خوشی کے مارے ناچنے لگتا۔

معروف نے مراد سے کہا۔ ''مسٹر ایمان علی ہمارے ساتھ آپ بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ آئیں بیٹھیں۔''

مراد ان کے ساتھ ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ معروف نے کہا۔ ''چاچی اور چاچا نے تسلیم کرلیا ہے۔ یہ واقعی مراد ہے۔ جو سچ ہے، اسے ماننا پڑتا ہے۔ ابھی ماروی بھی تسلیم کرلے گی۔''

محبوب نے کہا۔ ''اس بے چارے کے ساتھ کیا ہوگیا ہے؟ اس پر جتنا بھی افسوس کریں، اس کی حالت پر جتنا بھی ماتم کریں، یہ اپنے قد کی طرف نہیں آئے گا۔''

سمیرا نے کہا۔ ''جس ظالم جادوگر نے ایسا کیا ہے، وہی اپنے جادو کا توڑ کرکے اسے پہلی حالت میں لاسکتا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ جادوگر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مر چکا ہے۔ ہم نے دوسرے دو بڑے جادوگروں کو بڑی رقمیں دیں۔ انہوں نے اپنے تمام جادو منتر آزما لیے۔ یہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ سچ کہتے ہیں، تقدیر میں جو لکھ دیا جاتا ہے، اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔''

ایک جادوگر اور چمتکار دکھانے والے تانترک مہاراج کے متعلق جو کہانی گڑھی گئی تھی، اس کہانی کو مراد بڑے دلچسپ انداز میں سنانے لگا۔ وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ کبڈی خود کو مراد ثابت کر رہا تھا۔ اس لیے یقین کر رہے تھے کہ اسے کالے جادو کے ذریعے بونا بنا دیا گیا ہے۔

منتی چاچی نے کہا۔ ''ہائے کیا میرا مراد ساری عمر ایسا ہی رہے گا؟ بچپن سے ماروی کو دلہن بنانے کے خواب دیکھتا آیا ہے۔ اب یہ بے جوڑ شادی تو ہو نہیں سکے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ مجھے اپنا دوست اور بھائی کہتا ہے، دن رات مجھے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ میری ہر بات مانتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ اب ماروی کا خیال دل سے نکال دے۔ اب شاید ماروی ہی اسے سمجھا دے گی۔''

مراد محبوب کی اندرونی مسرتوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے اسے سمجھایا ہے کہ حالات سے سمجھوتا کرو۔ ماروی تم سے اب بھی محبت کرے گی لیکن اس محبت کے پیچھے ہمدردی ہوگی۔ وہ تمہیں بے چارہ سمجھ کر چاہے گی، لیکن ایک بونے کی دلہن بن کر کبھی تماشا نہیں بنے گی۔''

معروف نے کہا۔ ''یہ سیدھی سی بات ایک بچے کی بھی سمجھ میں آجائے گی، اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''لیکن وہ تو ماروی کا دیوانہ ہے۔ کہتا ہے، ماروی اسے ہر حال میں قبول کرلے گی۔ اب تو بس وہی اسے اپنا اور اس کا فرق بھلائے گی۔''

منتی نے کہا۔ ''میں اکیلے میں اس سے بات کروں گی۔ اب وہ ایسا نادان بھی نہیں ہے۔ بچپن سے میری بات مانتا آیا ہے۔ عقل کی بات اس کی سمجھ میں آجائے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''اگرچہ وہ بونا بن کر نقصان میں رہا ہے لیکن دوسرے پہلوؤں سے اسے فائدہ بھی پہنچ رہا ہے۔''

وہ محبوب سے بولا۔ ''اس گھر سے باہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ مراد علی منگی ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے کسی طرح ثابت نہیں کرسکیں گے کہ یہ وہی عالی جناب کا قاتل مراد ہے۔ یہ یہاں عبداللہ کبڈی کے نام سے آیا ہے۔ یہ گھر سے باہر کسی کے سامنے تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ مراد ہے۔''

معروف نے کہا۔ ''بے شک۔ اب یہ قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ کوئی اسے مراد علی منگی ثابت نہیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کر سکے گا لیکن ایک اہم سوال پیدا ہوگا کہ یہ مراد نہیں ہے تو ماروی اور چاچی چاچا کے پاس کیوں آیا ہے۔ ان سے بونے کبڈی کا کیا رشتہ ہے؟''

یہ سوچنے کی بات تھی۔ واقعی یہ اہم سوال سب ہی کے ذہن میں آئے گا کہ وہ بونا اگر مراد نہیں ہے تو ماروی سے ملنے اور رشتہ جوڑنے کیوں آیا ہے؟

وہ سب چپ ہو گئے۔ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ سمیرا نے کہا۔ ''میں نے بہت غور سے بعد مراد کو دیکھا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک پہلو سے یہ اچھا ہے کہ اب یہ مجرم نہیں کہلائے گا اور اب مجرمانہ زندگی نہیں گزارے گا۔'' وہ بولی۔ ''محبوب صاحب! یہ امن و امان سے یہاں شریفانہ زندگی گزار سکے گا۔ آپ کوئی ایسی تدبیر کریں جس کے نتیجے میں یہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے دور اس چھت کے نیچے نیک نامی سے رہے۔''

منتی چاچی اور جھمرو چاچا انگریزی نہیں سمجھتے تھے۔ معروف نے محبوب کے کان کے پاس جھک کر بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ بونا تمہارا رقیب ہونے کے باوجود راستے کی دیوار نہیں رہا۔ ماروی تو اب صرف تمہاری ہے۔ اس رقیب سے دل کھول کر ہمدردی کرو۔ ہم ایسی تدبیر کریں گے کہ یہ ہمیشہ یہاں رہے گا اور پولیس کو اس پر مراد ہونے کا کبھی شبہ نہ ہوگا۔''

وہ سب سوچنے لگے۔ ابھی کچھ عرصے تک کوئی دیکھنے نہ آتا کہ وہاں کوئی بونا مراد آیا ہے۔ وہ بونا بھی گھر سے باہر نہ جاتا لیکن آئندہ کبھی پولیس انکوائری ہو سکتی تھی۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے وہ سوالیہ نشان بن سکتا تھا۔

ادھر ٹی وی لاؤنج میں ماروی کبڈی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے کبڈی سے کوئی سوال نہیں کرنا تھا اور نہ ہی کوڈ ورڈز معلوم کرنے تھے۔ اس نے لاؤنج میں آتے ہی کبڈی سے پوچھا۔ ''وہ جو تمہارے ساتھ آیا ہے وہی مراد ہے نا؟''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں، وہ ایمان علی کے نام سے یہاں آیا ہے۔ اگر اسے قریب رکھنا چاہتی ہو' اس سے چھپ کر ملنا چاہتی ہو تو اسی کوٹھی میں میرے ساتھ اس کی رہائش کا انتظام کرو۔''

وہ بولی۔ ''میں نے اور چاچی چاچا نے سوچ لیا ہے کہ مراد کو اپنے قریب اسی چھت کے نیچے رکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ تم نے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہوگا اس کوٹھی سے ملحقہ ایک انیکسی ہے وہ خاص مہمانوں کے لیے ہے۔ کوٹھی کے پچھلے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر انیکسی کا دروازہ ہے۔ میں آسانی سے وہاں جا کر مراد سے مل سکوں گی۔''

''لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ تم دونوں ازدواجی زندگی کب شروع کرو گے؟''

''مراد نے مجھے فون پر کہا ہے کہ فی الحال مجھے محبوب کی دلہن بننے سے روکنا ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہے۔ مرینہ بھی اس کی زندگی سے نکل گئی ہے۔''

کبڈی نے کہا۔ ''ماروی! یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے۔ اب تک کئی عورتیں اس کی تنہائی میں آئیں لیکن اسے گناہ گار نہ بنا سکیں۔''

''میں اپنے مراد کو اچھی طرح جانتی ہوں' وہ جو ارادہ کر لیتا ہے' اس پر سختی سے عمل کرتا ہے لیکن محبوب اسے پارسا تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ ابھی کیا کر سکتے ہیں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں گئی۔ وہاں ننھا شہزاد کھلونوں سے کھیل رہا تھا، وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر کبڈی کے پاس لا کر بولی۔ ''یہ مراد کا بیٹا ہے۔ اب میں اس صدمے سے رونا شروع کرتی ہوں کہ تم ہی میرے مراد ہو مگر بونے ہو گئے ہو۔''

اس نے اپنے پرس میں سے گلیسرین کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس کا ایک قطرہ آنکھوں میں کاجل کی طرح لگایا جائے تو دھاروں آنسو بہنے لگتے ہیں۔ مراد نے بھی ایک قطرہ لگایا۔

پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ چونک کر سر گھما کر ایک سمت دیکھنے لگے۔ ٹی وی لاؤنج سے ماروی کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر لاؤنج میں آئے پھر ان دونوں سے دور ہی رک گئے۔ کبڈی سر جھکائے کھڑا تھا۔ ماروی گھٹنے ٹیک کر اس کے برابر ہو کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''تم ہی مراد ہو۔ مجھے ماننا پڑے گا۔ میں حقیقت سے انکار نہیں کر سکوں گی۔ تم ہی میرے مراد ہو۔''

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

روایت

بابر نعیم

رسم ورواج اور روایتوں کی پاسداری اچھی بات سہی مگر... کبھی کبھی کچھ روایتیں بہت خوفناک ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی روایت کا پابند تھا اور اسے اگلی نسلوں میں بھی منتقل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کا ماحول تباہ ہونے سے بچ جائے یہ اور بات کہ اسے اپنی کوششوں میں کتنے فیصد کامیابی ملی۔

محبتوں کی حفاظت کے لیے خون کی ہولی کھیلنے کا عجب انداز

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ ساری خوشی اور سرشاری غارت ہوگئی جو چند لمحے قبل ایمی کی قربت سے نصیب ہوئی تھی۔ ایک بچے کی پیدائش اور کام کی مصروفیت کے سبب ہم دونوں کو قربت کے لمحات بہت کم میسر آتے تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور اس طرح کے لمحات گزارنے کے لیے پہلے سے وقت طے کرنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ میں بستر میں ایمی کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کی ساتھی ٹیچر پاؤلا کرین کا فون آگیا۔ وہ اس انگلش ٹیچر کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی جس نے حال ہی میں اسکول جوائن کیا تھا۔ کیونکہ ایمی بھی انگلش پڑھاتی تھی۔ اس لیے پاؤلا کا خیال تھا کہ اس کے پاس نئے انگلش ٹیچر کے بارے میں باتوں کا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.pdfbooksfree.net
http://www.urdutube.net

بہت سا ذخیرہ ہوگا۔ وہ اور دوسری ٹیچرز حال ہی میں چھٹیاں گزار کر واپس آئی تھیں اور ان سب کی گفتگو کا موضوع بروس پیٹرز ہی تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سب ہی اس کی مردانہ وجاہت پر مرمٹی تھیں اور اس سے فلرٹ کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ایمی نے فون بند کر کے قہقہہ لگایا اور مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''سوری ڈیئر! اس نے مجھے باتوں میں لگالیا۔ اگر میں اس سے واقف نہ ہوتی تو یہی سمجھتی کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ وہ اپنی باتوں سے ایسا ہی ظاہر کر رہی تھی۔''

مجھے ان فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں ان قیمتی لمحات کو اس طرح ضائع کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے میں نے سنی اَن سنی کردی پھر وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں نے کروٹ بدلی اور چاہا کہ ایمی کو جگائے بغیر ریسیور اٹھالوں لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔ وہ بھی جاگ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔ ایک پولیس آفیسر کی بیوی ہونے کے ناتے وہ جان سکتی تھی کہ رات گئے آنے والے اس فون کال کا مطلب کیا ہوسکتا ہے لیکن وہ فون ڈیڈی کا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے ''مجھے ابھی ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ ڈیوڈ نیلی مارا گیا۔''

''مارا گیا۔ وہ کیسے؟''

''فی الحال اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ اس کی لاش دریا کی طرف جانے والی سڑک پر چٹان کے نیچے ملی ہے۔ ڈنک ہاپکنس وہاں سے موٹر سائیکل پر گزر رہا تھا کہ اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے پانچ منٹ پہلے فون کر کے مجھے بتایا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔''

ایمی بستر سے اٹھی اور تیزی سے چلتی ہوئی بیڈروم کے دروازے تک گئی۔ گو کہ ہماری بیٹی سنڈی چھ سال کی ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود ایمی رات میں تین چار مرتبہ اٹھ کر اسے دیکھنے جاتی جیسے وہ اب بھی ننھی سی بچی ہو۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ ایمی واپس آئی اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کون مرگیا؟''

''ڈیوڈ نیلی!'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''ڈنک ہاپکنس نے چند منٹ پہلے اس کی لاش دریا کو جانے والی سڑک کے کنارے دیکھی ہے۔ فی الحال اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے۔''

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے اسے کسی نے قتل کیا ہے اور یہ کام کسی ایسی شادی شدہ عورت کا بھی ہوسکتا ہے جس سے وہ فلرٹ کر رہا ہو۔ شاید مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے لیکن وہ ایسا ہی تھا۔ اس نے میری بہترین سہیلی کی ازدواجی زندگی تباہ کردی۔''

''اس میں ڈونا کا بھی کچھ نہ کچھ قصور تھا۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر وہ حوصلہ افزائی نہ کرتی تو وہ بھی اسے اس تعلق پر مجبور نہیں کرسکتا تھا۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''مجھے جانا ہے تھوڑی دیر بعد سیل فون پر کال کروں گا تاکہ سنڈی کی نیند خراب نہ ہو۔''

''خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔'' ایمی ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

الویرون کی آبادی تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ مشی گن جھیل سے شمال کی جانب 53 میل کے فاصلے پر تھا۔ رات کے وقت اکا دکا اسٹورز اور شراب خانوں کے علاوہ تمام دکانیں بند ہوجاتی تھیں اور مکان بھی اندھیرے میں ڈوب جاتے تھے۔ ڈیڈی، کاؤنٹی شیرف تھے۔ انہوں نے اطلاع ملتے ہی وہاں ایمبولینس منگوالی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی کاؤنٹی کے میڈیکل ایگزامنر کو بھی بلالیا ہوگا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا سیاہ فام ڈاکٹر تھا جسے علاقہ کی گوری اکثریت نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا تھا لیکن میں سے پسند کرتا تھا۔ میرا تعلق بھی شیرف کے دفتر سے تھا اور میں وہاں سراغ رساں کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ شکاگو پولیس اکیڈمی سے فارغ ہونے اور کرمنالوجی میں چار کورس کرنے کے بعد مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس طرح خوش قسمتی سے مجھے قانون نافذ کرنے والے ادارے میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ میں کسی زمانے میں خاصا قانون شکن واقع ہوا تھا، منشیات، غیر محتاط ڈرائیونگ، چھوٹے موٹے جھگڑے اور دو سال کے دوران ڈیڈی کی حوالات میں دس روز کی قید میرے ریکارڈ کا حصہ تھی۔ یہ ایمی ہی تھی جس نے مجھے اس ماحول سے نجات دلائی۔ ہم دونوں اسکول کے زمانہ سے ہی محبت کرنے لگے تھے پھر اس نے میری سگریٹ نوشی سے بیزاری کا اظہار کردیا۔ گریجویشن کرنے کے چار سال بعد مجھے پتا چلا کہ ڈیڈی کو کینسر ہوگیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ شراب نوشی ترک کردوں گا لیکن میں اس پر قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایمی شکاگو سے واپس آئی اور اس کے مجبور کرنے پر مجھے شراب چھوڑنی پڑی۔

موقع واردات پر پہنچ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میرے دائیں جانب دریا تھا اور پورے چاند کی روشنی نے اس کے پانی کو دودھیا بنا دیا تھا۔ ایمبولینس پہنچ چکی تھی اور اس کے پیچھے کئی کاریں قطار میں کھڑی تھیں۔ مجھے دور سے ہی ڈیڈی نظر آگئے جو ایک پولیس والے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی چٹان کے نیچے کھڑی کی اور ایمبولینس کی طرف چل پڑا۔ مجھے دیکھتے ہی پولیس والا بولے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۔ ''ہائے کیم! اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔''

اس کا نام سولیون تھا اور ہم دونوں ایک ہی ٹیم کی طرف سے فٹ بال کھیلتے تھے۔ ڈیڈی کی مجھ پر نظر پڑی تو بولے۔

''ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر رہا ہے۔''

''اس ڈاکٹر سے کوئی امید رکھنا بے کار ہے۔'' سولیون منہ بناتے ہوئے بولا۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو یہ یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ کوئی سیاہ فام اچھا ڈاکٹر بھی ہو سکتا ہے۔''

''تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارا عملہ اس طرح قتل کی وجہ اور طریقہ جاننے میں کامیاب ہو سکیں گے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو اس وقت تک فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔''

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاش تک گیا اور اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ اس کا سر بری طرح پچک گیا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی پر خون کی تہہ جم چکی تھی۔ نیلی خود بھی کمرشل آرٹسٹ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو مصور کہلوانا پسند کرتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے مقامی لائبریری میں لیکچر دیا کرتا اور زیادہ وقت وین گوف کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن لوگ اس کے کام کا موازنہ اس کے استاد سے کریں گے جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ اگر وہ شیخی خور اور دلکش شخصیت کا مالک نہ ہوتا تو کوئی بھی شادی شدہ عورت اس کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتی۔

سولیون میرے قریب آ کر بولا۔ ''تمہارے ڈیڈی کو چٹان کے پاس سے تین بیئر کی بوتلیں ملی ہیں۔ یقیناً وہ یہاں بیٹھ کر پی رہا ہوگا۔ وہ ہمیشہ نشے میں چور رہتا تھا۔ میں نے اکثر اسے دوپہر کے وقت آدھے کپڑوں میں دیکھا ہے۔ حیرت ہے کہ اس جیسے شخص کو عورتیں کس طرح برداشت کر لیتی تھیں۔''

ڈیڈی ہمارے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''کیم! تم اپنا کام جاری رکھو۔ میرے خیال میں یہ ایک حادثہ ہے لیکن جب تک تم اپنی رائے نہیں بتاؤ گے۔ میں اسے فائنل نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

میں نے اکیڈمی میں رہ کر جرائم کی تحقیق کے جدید طریقوں اور آلات کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا لیکن ہمارے وسائل محدود تھے اور اس مختصر بجٹ میں ان آلات کا حصول ممکن نہیں تھا لہٰذا اس طرح کے کیسز میں ہم روایتی انداز میں تفتیش کرنے پر مجبور تھے، دوسری بات ہمیں یہ بتائی گئی کہ زیادہ تر سراغ رساں اپنے طور پر موقع واردات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور ملنے والے ثبوتوں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے انہیں دستاویزی شکل میں لے آتے ہیں تاکہ وقت آنے پر سرکاری وکیل کو ان سے مدد مل سکے۔ اسی دوران میرا [illegible] جوش کمنگر بھی آ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں نیلی رہا کرتا تھا لیکن وہاں سے ہمیں کوئی قابل اعتراض ثبوت نہ مل سکا۔ اس کے دفتر کی دیوار کے ساتھ تین درجن سے زیادہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی ایسا اشتہار یا بروشر نہیں ملا جو نیلی نے بنایا ہو جبکہ وہ اپنے آپ کو کمرشل آرٹسٹ کہا کرتا تھا۔ جب ہم مکان کے پچھلے حصے کی طرف گئے تو ڈیڈی عقبی صحن میں ایک بڑی ٹارچ کے ذریعے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ ان کے منہ میں پائپ لگا ہوا تھا جبکہ ان کے کینسر کی تشخیص ہو چکی تھی۔ میں اور مما انہیں چند ماہ تک تمباکو نوشی سے باز رکھنے میں کامیاب رہے لیکن انہوں نے آہستہ آہستہ دوبارہ یہ عادت اپنا لی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سائیکل چلاتے ہیں۔ اس لیے ان کی صحت کو کوئی خطرہ نہیں۔

میں اور جوش بھی اپنی چھوٹی چھوٹی ٹارچوں کے ساتھ تلاشی کے عمل میں شامل ہو گئے۔ خزاں رسیدہ گھاس پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ اسی دوران میری ٹارچ کی روشنی گھاس پر پڑی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ ایک ریفلیکٹر تھا جو سائیکل کے پچھلے حصے میں لگایا جاتا ہے اور روشنی پڑنے سے اس کا سرخ رنگ دمکنے لگتا ہے۔

جوش چلتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ''کیا تمہیں کوئی چیز ملی ہے؟''

''نہیں'' میں نے چپکے سے وہ ریفلیکٹر اپنی جراب میں ڈال لیا اور بولا۔ ''میری پاپیاں گر گئی تھیں، انہیں ہی اٹھا رہا تھا۔ تمہیں کچھ پتا چلا؟''

''صرف چند بیئر کے ڈبے۔ لگتا ہے کہ ان کے بغیر وہ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔''

ہم دونوں مکان کی طرف واپس آ گئے جہاں میرے ڈیڈی ڈاکٹر تھامس سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک نظر مکان پر ڈالی اور بولا۔ ''اس کی موت اس طرح واقع نہیں ہوئی جیسا میں سمجھ رہا تھا۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' ڈیڈی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''وہ گزشتہ ایک سال سے میرا مریض تھا۔ شراب

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نے اس کے جگر کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے بحالی مرکز میں جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کی اور بولا۔ ''مجھے اب چلنا چاہیے۔''

اس کے جانے کے بعد ڈیڈی بولے۔ ''کیم! مجھے افسوس ہے کہ تمہیں بستر چھوڑ کر آنا پڑا لیکن مجبوری تھی۔'' پھر انہوں نے جوش کو مخاطب کر کے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم معمول کے مطابق گشت جاری رکھو۔ ہم بھی چلتے ہیں۔''

کار کی طرف آتے ہوئے ڈیڈی نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں۔ بس کچھ تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔''

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ گھر پر سب ٹھیک ہے نا؟''

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ گھر پر کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟''

وہ چلتے چلتے رک گئے اور غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تو یونہی ایک عام سی بات پوچھی تھی لیکن تم ناراض ہو گئے۔ اگر کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو تو مجھے بتا دو۔''

وہ غلطی پر تھے۔ میں نے ساری زندگی انہیں بے وقوف بنایا تھا پھر اب کیوں نہ بناتا۔ میں نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڈی! ہمارے درمیان آؤٹ ڈور موٹر خریدنے پر جھگڑا چل رہا ہے لیکن ایمی پیسوں کا بہانہ بنا رہی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ڈیڈی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں بھی ایمی کی طرح بجٹ کے مطابق چلتا ہوں لیکن تم ہمیشہ سے اپنی ماں جیسے ہو۔ تمہارے نزدیک بجٹ محض کاغذ پر لکھا جاتا ہے اور بعد میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میرے خیال میں تمہاری موجودہ موٹر بھی ٹھیک کام کر رہی ہے۔''

☆☆☆

دوسری صبح میں کاؤنٹی گیا۔ مجھے ایک مقدمہ میں گواہی دینی تھی۔ میں نے ایک ڈرائیور کو نشے کی حالت میں گرفتار کیا جس نے اپنی کار ایک مکان سے ٹکرا کر اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر آفس پہنچا تو لنچ ٹائم ہو گیا تھا۔ میں سیدھا اس کھیے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈیڈی اپنی سائیکل باندھتے تھے لیکن وہ لنچ کے لیے جا چکے تھے۔ ملی کا ریسٹورنٹ حسب معمول گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈیڈی سب سے آخری بوتھ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنے لیے آرڈر دیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اسی دوران نیلی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کہا۔

''میں نے آپ کی میز پر پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تھی۔''

''ہاں! ہم اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ حادثاتی موت ہے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ وہ شراب کے نشے میں اونچائی سے نیچے گرا تھا؟''

''پینتالیس فٹ کی بلندی سے گرنے والا شخص زندہ نہیں بچ سکتا۔ گرتے وقت اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی نے اسے چٹان سے دھکا دیا ہو؟''

''تم نے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھ لی ہے۔''

''لیکن اس سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خود گرا ہے یا اسے دھکا دیا گیا تھا۔''

ڈیڈی نے غصے سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ''میں اپنی رپورٹ مکمل کرنے والا ہوں اور میری نظر میں یہ ایک حادثاتی موت ہے۔ جو لوگ اسے جانتے ہیں، انہیں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ صرف میرے سراغ رساں بیٹے کے علاوہ۔''

میں نے اپنی جیب سے وہ ریفلیکٹر نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' ڈیڈی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''سائیکل کا ریفلیکٹر۔'' میں نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔''

''یہ بھی عام ریفلیکٹر جیسا ہے۔ لال رنگ کا گول۔ جب اس پر روشنی پڑتی ہے تو چمکنے لگتا ہے، البتہ اس میں ایک خرابی ہے کہ یہ درمیان سے کریک ہو گیا ہے۔''

''مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔'' ڈیڈی الجھتے ہوئے بولے۔

''آپ کی سائیکل کا ریفلیکٹر بھی تو ایسا ہی ہے۔ درمیان سے ٹوٹا ہوا۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں ڈیڈی۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ گزشتہ شب یہ ریفلیکٹر مجھے نیلی کے گھر کے باہر پائن کے درختوں کے پاس پڑا ہوا ملا تھا۔ حیرت ہے کہ آپ وہاں گئے اور مجھے نہیں بتایا۔''

''میں اپنی سائیکل پر پورے قصبے کا چکر لگاتا ہوں۔ یہ میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہ ریفلیکٹر کئی دن پہلے کہیں گر گیا تھا لیکن مجھے اس بارے میں وضاحت پیش

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اس ریفلیکٹر کو غور سے دیکھیں ڈیڈی۔ کسی طرح بھی نہیں لگتا کہ یہ کئی دنوں سے وہاں پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لگا ہوا گوند اب بھی اس قابل ہے کہ اگر اسے زور سے دبا کر لگایا جائے تو یہ دوبارہ چپک جائے گا۔ کل صبح بارش بھی ہوگئی اور رات کو اوس بھی پڑی۔ اس صورت میں یہ گوند چند گھنٹوں میں ہی بے کار ہو جاتا۔''

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بوتھ سے چلے گئے اور میں سوچتا رہ گیا کہ کیا واقعی صحیح خطوط پر کام کر رہا ہوں۔

اس روز کے بعد میں نے ڈیڈی کے سامنے ریفلیکٹر کا ذکر نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ خود ہی مجھے حقیقت بتا دیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ ریفلیکٹر کئی روز سے وہاں پڑا ہوا ہو۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ڈیڈی اور ممی ہمارے گھر ڈنر پر آئے۔ ان کی موجودگی میں سنڈی مجھے اور ایمی کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ وہ بھی سنڈی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ کھانے کے بعد میں اور ڈیڈی اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے نکل پڑے۔ ان دنوں بارش اور برف باری کا سلسلہ جاری تھا اور اس کی وجہ سے سڑکوں پر چھوٹے بڑے ٹریفک حادثات ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک حادثہ کی وجہ سے وہ تصویریں میرے ہاتھ لگ گئیں۔

میں اس رات دفتر میں تنہا بیٹھا کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا جبکہ ڈیڈی گشت پر تھے۔ کام کے دوران مجھے کچھ کاغذات کی ضرورت پیش آئی جو ڈیڈی کی دراز میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کاغذات نکالے اور دراز بند کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر ایک تصویر پر گئی جس کا ایک کونا کاغذات کے ڈھیر میں سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہ تصویر نکال لی۔ وہاں چار تصویریں اور بھی تھیں۔ میں اپنی میز پر گیا اور کافی دیر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ تصویریں اس ڈیجیٹل کیمرے سے لی گئی تھیں جو ممی نے ڈیڈی کو ان کی گزشتہ سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ ان تصویروں میں نیلی کے ساتھ دو عورتیں نظر آ رہی تھیں جو شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنے شوہروں سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھیں۔

میں، ڈیڈی سے تنہائی میں ان تصویروں کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا پھر ایک دن میں نے ان کے سامنے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا۔ پہلے تو انہوں نے ٹالنا چاہا لیکن میرے اصرار پر مجبور ہو گئے اور بولے۔ ''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

میں، ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ڈیڈی۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا اور اسے مار دیا۔''

ڈیڈی نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''پہلے میری بات سن لو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

''میں سن رہا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ نے ہی اسے مارا ہے اور یہ سننا میرے لیے آسان نہ ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں کیم، لیکن کم از کم میری بات تو سن لو۔'' انہوں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''تمہارے دادا کو شیرف بنے ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے کہ اس دوران یہاں قتل کی تین وارداتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک شراب خانے میں ہونے والی لڑائی کے نتیجے میں مارا گیا جبکہ دو عورتوں کو ان کے شوہروں نے بدچلنی کے شبہے میں قتل کر دیا۔ ان عورتوں نے بلاؤنٹ نامی ایک کار سیلز مین سے ناجائز تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ تمہارے دادا کو اس کا بڑا دکھ تھا کہ اس شخص کی وجہ سے دو خاندان تباہ ہو گئے اور وہ کسی دوسری عورت کی تلاش میں دندناتا پھر رہا تھا۔ ایک دن انہوں نے بلاؤنٹ کو اپنے بہترین دوست کی بیوی کے ساتھ دیکھ لیا۔ انہیں بلاؤنٹ پر بہت غصہ آیا جو پورے قصبے کا ماحول خراب کر رہا تھا۔ کچھ دن بعد ایک اور واقعہ پیش آیا جب ٹی کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت کا اس کے شوہر کے ساتھ زبردست جھگڑا ہوا۔ بلاؤنٹ اس عورت کے گرد بھی منڈلا رہا تھا اور یہی بات اس عورت کے شوہر کو ناگوار گزری۔ اس کے دو دن بعد ہی بلاؤنٹ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا جو یقیناً ایک حادثہ ہی تھا۔

''دادا نے اسے مار دیا۔''

''دوسرا واقعہ اس کے چند برسوں بعد پیش آیا۔ وہ ایک چند معروف موسیقار میں سے تھا اور جھیل کے کنارے گا بجا کر کچھ کما لیتا تھا لیکن اس نے اپنے فن سے عورتوں کو رجھانا شروع کر دیا۔ جب اس کی وجہ سے تین خاندان تباہ ہوئے تو تمہارے دادا سے برداشت نہ ہو سکا اور ایک صبح وہ موسیقار اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ اسے، رات میں کسی وقت الیکٹرک گٹار کے ذریعے برقی جھٹکا لگا اور وہ ختم ہو گیا۔''

''یہ کارنامہ بھی دادا نے ہی انجام دیا؟''

''پھر سارہ میک بین نامی عورت یہاں آئی۔ وہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پینتیس سال کی خوب صورت عورت تھی جسے اس کا باپ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس قصبے میں چھوڑ گیا تھا لیکن وہ یہاں بھی باز نہ آئی اور اس کی وجہ سے پہلے ہی سال تین طلاقیں واقع ہوئیں۔ اس کی موت بھی آگ لگنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔''

''اور اب آپ بھی اسی روایت پر عمل کر رہے ہیں کیونکہ نیلی کا کردار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس شخص کی وجہ سے لوگ کتنے پریشان تھے۔ شاید تم نے کبھی ان معصوم بچوں کے چہرے نہیں دیکھے جن کے والدین کے درمیان طلاق ہوجاتی ہے۔ اس نام نہاد شرابی آرٹسٹ کو ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ میں نے بہت صبر سے کام لیا۔ اسے تنبیہہ بھی کی لیکن اس نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا کہ میں اس سے حسد کرتا ہوں، یہ سن کر مجھے پاگل ہوجانا چاہیے تھا لیکن جانتا ہوں کہ اس جیسے لوگوں سے ایسی ہی توقع کرنی چاہیے۔''

''آپ نے اسے قتل کردیا؟''

''ہاں! اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' ڈیڈی میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ڈیڈی۔ آپ نے ابھی ابھی میرے سامنے ایک جرم کا اعتراف کیا ہے؟'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس سے بات کر رہے ہو۔'' ڈیڈی نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اس وقت بھی [illegible] تھا جب تم ٹرائی سائیکل چلایا کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اس مردود کو جہنم واصل کرکے میں نے ایک نیک کام کیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ ایک جرم ہے۔ اب میں اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔''

☆☆☆

''کیا بات ہے تم ناشتا کیوں نہیں کر رہے ہو؟'' ایمی نے میری خالی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظر میز پر ڈالی۔ انڈے، توس، مارجرین اور جیلی، یہ سب چیزیں وزن بڑھانے والی تھیں جبکہ میں پچاس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے دل کے دورے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایمی کی بات کا جواب دیے بغیر مگ میں کافی انڈیلی اور ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگا۔

''ڈیڈی! کھا کر تو دیکھیں۔ سب چیزیں بہت اچھی ہیں۔'' سنڈی شوخی سے بولی۔

''اچھا۔ کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

''سنڈی، جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ تمہاری بس آنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں تمہارا بیگ تیار کرتی ہوں۔''

میں نے ان دونوں کے جانے کے بعد ہلکا سا ناشتا کیا۔ اسی اثنا میں ایمی واپس آگئی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ضرور تمہاری پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتی لیکن معلوم ہے کہ اس میں کافی دیر لگ جائے گی۔ اس کے لیے مجھے شام کا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے صف شب کے قریب تمہیں تین مرتبہ بستر سے اٹھتے دیکھا ہے اور ناشتے کی میز پر بھی تم خلا میں نظریں جمائے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ پریشانی کی بات ہے لیکن مجبوری ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم اس پر گفتگو نہیں کرسکتے۔''

مجھے اپنی سوچ پر شرمندگی ہونے لگی۔ نیلی بھی تو شادی شدہ عورتوں کا پیچھا کیا کرتا تھا اور ایمی کئی مرتبہ رات کو دیر سے واپس آئی۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی اور بعد میں وہ لوگ پیزا کھانے چلے گئے تھے۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایمی مجھے ہمیشہ کی طرح معصوم اور پاکیزہ لگی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنے کام پر روانہ ہوگئی۔

دفتر جاتے ہوئے میں اپنے آپ کو کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح ڈیڈی کا سامنا کرپاؤں گا۔ انہوں نے ایک آدمی کا قتل کردیا تھا اور یہ ذمے داری بھی مجھ پر ڈال دی تھی کہ انہیں پکڑوا دوں، اس روز بھی وہ کورٹ گئے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی واپسی گیارہ بجے تک ہوئی۔ انہوں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر تھرماس کھولا اور اس میں سے کافی نکال کر پینے لگے۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''کیا تم نے کبھی سوچا ہے، کہ ایمی تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہے؟''

یہ وہی تکلیف دہ سوچ تھی جو صبح ناشتے کی میز پر مجھے تنگ کر رہی تھی۔ ''آپ کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''ذرا سوچو کہ اگر تم اور ایمی علیحدہ ہوگئے تو سنڈی کا کیا ہوگا؟''

''وہ پہلے بھی کہیں نہیں گئی اور نہ آئندہ مجھے چھوڑ کر جائے گی اور نہ ہی میں اسے چھوڑنے والا ہوں۔ ہم نے ایسا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔''

''میں اور تمہارے دادا بھی اسی طرح سوچتے تھے لیکن بدقسمتی سے ہوتا یوں ہے کہ کسی اجنبی مرد یا عورت کی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آمد سے قصبے کا ماحول خراب ہوجاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ ہونے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ان میں کچھ ایسی کشش ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ ان کی جانب مائل ہونا شروع ہوجاتے ہیں، اگر یہ اجنبی یہاں نہ آتے تو انہیں یہ موقع بھی نہ ملتا۔''

''آپ نے ایک شخص کو قتل کردیا۔''

''میں اسے دوبارہ بھی قتل کرتا۔ وہ کم ازکم دو خاندانوں کو تباہ کرنے والا تھا۔''

''آپ نے ایک شخص کو قتل کردیا۔'' میں نے اپنی بات پھر دہرائی۔

''ٹھیک ہے۔ تم مجھے پولیس کے حوالے کردو کیم!'' وہ منہ میں پائپ دباتے ہوئے بولے۔ ''فون اٹھاؤ۔''

دوپہر کا کھانا میں نے کسی دوسری جگہ کھایا کیونکہ ملی کے ریسٹورنٹ میں ایک بار پھر ڈیڈی سے سامنا ہوسکتا تھا۔ واپس آیا تو میری میز پر ایک فائل رکھی تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں مقامی اخبار میں شائع ہونے والے طلاق کے تین نوٹس لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو خاندانوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں فائل بند کرنے ہی لگا تھا کہ ڈیڈی آگئے اور بولے۔

''تم جانتے ہو کہ ان طلاقوں کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ تینوں خاندانوں کے نو بچے اپنے ماں باپ کو بچھڑتا ہوا دیکھیں گے۔ ان میں سے ایک شخص ناکارہ شرابی ہوگیا ہے۔ ایک عورت کا گزارہ فوڈ اسٹیمپ پر ہے اور وہ اپنے بچوں کا علاج نہیں کرواسکتی اور ایک ذہین طالب علم ان حالات کی وجہ سے نویں جماعت میں ہی اسکول چھوڑنے پر مجبور ہوجائے گا اور ان سب واقعات کا ذمے دار نیلی تھا۔''

''اور آپ نے اسے قتل کردیا؟''

''ہاں، میں نے اسے قتل کیا کیونکہ یہ میرا قصبہ ہے اور یہاں کے لوگوں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنا میرا فرض ہے۔ جو کچھ تم ماضی میں کرتے رہے ہو۔ یہاں کے لوگوں نے اس حوالے سے تمہیں معاف کردیا ہے۔ اس لیے اب یہ تمہارا بھی فرض ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھاؤ۔ ایک بات اور'' ان کی نیلی آنکھوں میں چمک ابھری'' جیسا کہ میں نے گزشتہ شب کیا تھا۔ تم خوش قسمت ہو کہ ایمی بے ایمان نہیں ہے۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ نیلی کی نظر اس پر بھی تھی گو کہ وہ ایسی نہیں تھی لیکن یہ سن کر تمہارا ردِعمل بالکل مختلف ہوتا۔ اسی لیے میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں کوئی جلدی نہ کرو۔''

ڈیڈی کی باتیں سن کر میں اس قدر طیش میں آچکا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ میرے قریب آئے اور فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولے۔

''تمہیں کاؤنٹی کے وکیل کا نمبر معلوم ہے۔ اسے سب کچھ بتادو۔ یہ بھی کہ میں کہاں مل سکتا ہوں اور کسی کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور مجھے پکڑایا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر میں نے باتھ روم میں جاکر اپنا منہ دھویا اور آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا۔ ڈیڈی نے ایک آدمی کو قتل کردیا تھا جبکہ دادا، اس سے بھی زیادہ قتل کرچکے تھے اور اب وہ چاہتے تھے کہ اگر ایسا کوئی واقعہ دوبارہ ہو تو میں بھی اس روایت پر عمل کروں۔

میں جب اپنی سیٹ پر آیا تو وہ جاچکے تھے۔ اس سہ پہر میں نے کئی کام نمٹائے۔ وہ کافی دیر بعد واپس آئے اور میری میز کے پاس کھڑے ہوکر کہنے لگے۔ ''تمہیں پولیس کو اطلاع کردینی چاہیے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ مجھے تمہیں اس معاملے میں گھسیٹنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہنے کا کہ تم بھی وہی کرنا جو میں نے اور تمہارے دادا نے کیا تھا۔ البتہ فون کرنے سے پہلے مجھے تھوڑا سا وقت ضرور دینا تاکہ تمہاری ماں کو ذہنی طور پر تیار کرسکوں۔''

خدا کا شکر

ایک دفعہ حبیب جالب نے ناصر کاظمی سے کہا۔

''جب کبھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی۔''

ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا۔

''میری غزل دیکھ کر آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟''

ناصر کاظمی نے کہا۔ ''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی۔''

مرسلہ۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پھر انہوں نے جھک کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ”بیٹے! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم نے اپنے آپ کو اچھا انسان بنانے کے لیے بڑی محنت کی ہے اور تم مجھ سے بھی بہتر نظر آتے ہو۔“

میرے والد نے کبھی مجھ سے ہمدردی کے دو بول نہیں کہے تھے۔ وہ سیدھی بات کرنے کے عادی تھے اور کبھی کسی نے انہیں بزدل نہیں سمجھا اور نہ ہی وہ اس وقت بزدلی کا مظاہرہ کررہے تھے۔

”میں آدھ گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم مجھے فون کرسکتے ہو۔“

☆☆☆

اس سارے معاملے میں پڑ کر میں یہ بھول ہی گیا کہ مجھے ایمی کو اسکول سے لینا تھا۔ آلویرون ہائی اسکول دس سال قبل قائم ہوا تھا جب تین چھوٹے اسکولوں کو ضم کرکے ایک کردیا گیا تھا۔ ایمی وہاں چھ سال سے پڑھا رہی تھی۔ البتہ سنڈی کی پیدائش کے بعد اس نے ایک سال گھر پر گزارا لیکن میری محدود آمدنی کے پیش نظر اسے دوبارہ یہ ملازمت اختیار کرنی پڑی۔

اسکول کی دو منزلہ عمارت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ میں صدر دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ تقریباً سبھی اسٹوڈنٹس جاچکے تھے اور ٹیچرز دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں باتیں کرتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ میری توجہ ان کی جانب نہیں تھی بلکہ میں اس وقت بھی ڈیڈی اور طلاق کے ان کاغذات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مجھے دکھائے گئے تھے۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ان حالات سے واسطہ نہیں پڑا لیکن ان کے بارے میں سوچ کر اب مجھے اندازہ ہوا کہ ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑ جائے تو کس طرح کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں سب سے زیادہ بچے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ڈرے سہمے کونوں کھدروں میں دبکے رہتے ہیں یا ماں باپ سے التجائیں کرکے انہیں علیحدہ ہونے سے روکتے ہیں اور نیلی جیسے لوگوں کی بدولت جن عورتوں کا گھر اجڑتا ہے۔ ان میں سے کچھ کی شادی ہوجاتی ہے اور کچھ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں۔ میرے ڈیڈی کا جرم یہی تھا نا کہ انہوں نے اپنے لوگوں کو اس درد سے نجات دلانے کی کوشش کی اور اپنے قصبے کو بچانے کے لیے کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک یہی ایک مناسب حل تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نگاہ ایمی پر پڑی۔ وہ سامنے والے دروازے سے آرہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے قلبی اطمینان ہوا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہ رہا تھا تاکہ ایمی اور سنڈی کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگا سکوں۔ میں فرصت کے لمحات سے دل کھول کر لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک اچھا سا ڈنر اور اس کے بعد کوئی عمدہ فلم دیکھنے کا پروگرام بن چکا تھا۔

اچانک ہی ایک شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا جیسے اسے روکنا چاہ رہا ہو۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا اور جواب میں ایمی بھی دلکش مسکراہٹ سے اس کی حوصلہ افزائی کررہی تھی۔ مجھے اس شخص کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ وہی انگریزی کا نیا ٹیچر تھا جس پر ایمی کی شادی شدہ سہیلی نظریں جمائے ہوئے تھی۔

وہ خاصا اسمارٹ اور ہینڈسم واقع ہوا تھا۔ لمبا قد، گھنگریالے سیاہ بال، سفید قمیص، وی گلے کا سوئٹر اور سیاہ پینٹ میں اس کی شخصیت کافی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس میں عورتوں کو تسخیر کرنے کی زبردست صلاحیت ہے اور کنواری تو کیا شادی شدہ عورتیں بھی اس کے سحر سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔

ایمی اپنے کندھے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کرکے رک گئی۔ اس نے اپنی کتاب میں سے ایک کاغذ نکال کر ایمی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنی کتابوں کو سینے سے لگائے اسے دیکھے جارہی تھی۔ یہ ہمارے اسکول کے دنوں کا ایک جانا پہچانا نظارہ تھا۔ اس فرق اتنا تھا کہ ماضی میں اس کی جگہ میں ہوا کرتا تھا۔ پھر ایمی نے اس سے کچھ کہا اور میری کار کی جانب چل دی۔

اس وقت مجھے ڈیڈی کا خیال آیا۔ انہوں نے کیسے کہہ دیا کہ میں اس درد سے آشنا نہیں ہوں جس نے دوسرے کئی خاندانوں کو برباد کردیا تھا۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ باہر سے آنے والے اجنبی ہماری زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں۔ ان کا نہ آنا ہی بہتر ہے اور اگر وہ آجائیں تو کسی طوفان کے آنے سے پہلے ان سے نجات حاصل کرلینی چاہیے۔

مجھے مسٹر بروس پیٹرس پر گہری نظر رکھنی ہے۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اس قصبے میں رہنے والے ہر سچے انسان کے لیے۔ کیونکہ یہی ہماری روایت ہے۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booktube.net/
http://www.urdutube.net/

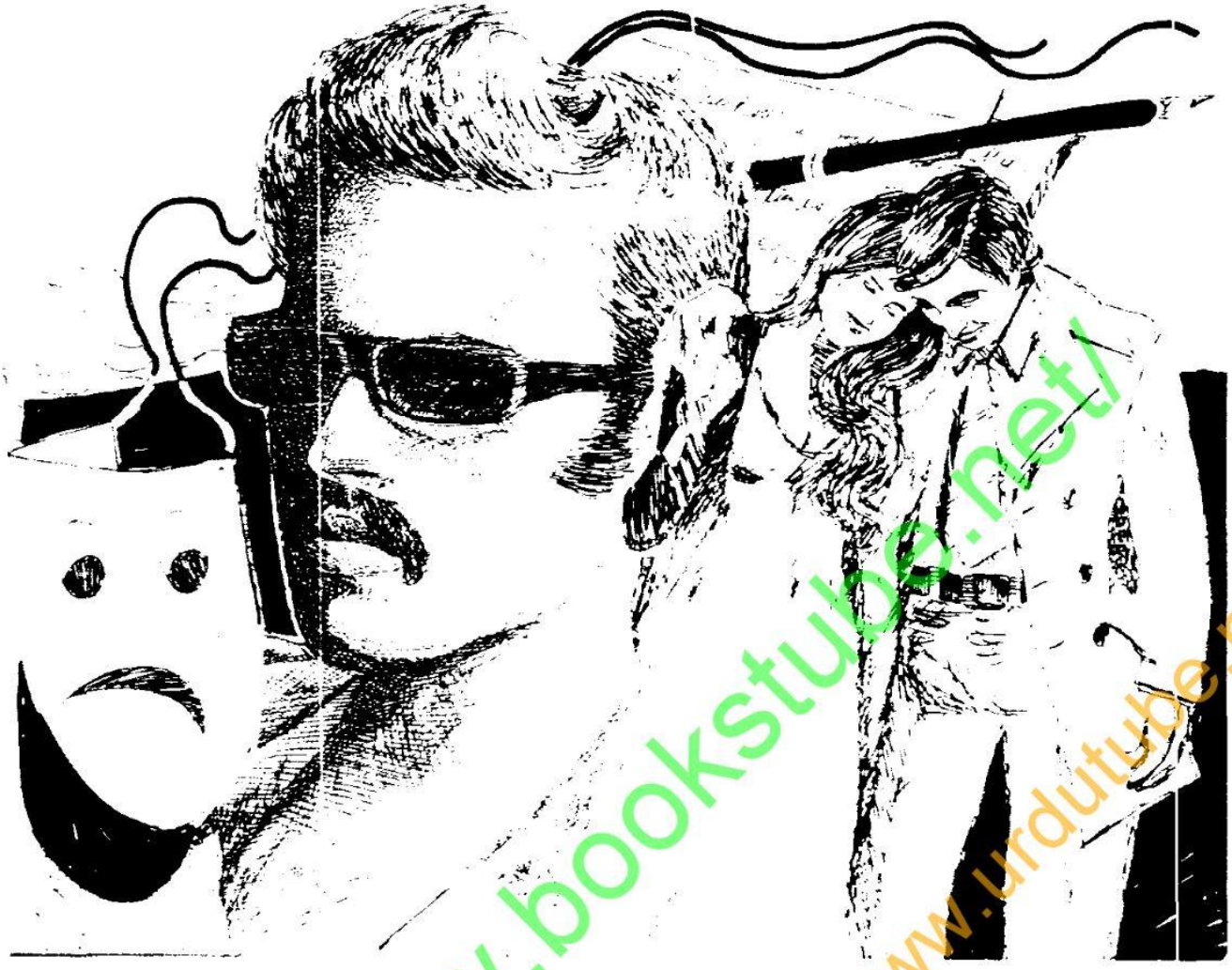

بلا عنوان

شمیم جمیل

دولت انسان کی بنیادی ضرورت سہی مگر... ہوس ایک ایسا زہر ہے جو اچھے بھلے جیون کو تباہ کر دیتا ہے... اس نشے نے نہ صرف اس کی چال بھی لڑکھڑا دی تھی بلکہ چلن بھی مشکوک کر دیا اور اسی شک نے بالآخر سپاہی کو چور تک پہنچا دیا۔

پولیس سے برآمد شدہ ایک بینک تجوری کا دلچسپ احوال

جوالس آئرلینڈ نے لفٹ میں اس شخص کو پہلی مرتبہ منگل کی ایک بھیگی ہوئی سہ پہر کو دیکھا تھا۔ شاید وہ اس لیے نمایاں تھا کہ صرف وہی دونوں برساتیوں کے بغیر تھے۔ اسے تو برساتی کی اس لیے ضرورت نہیں تھی کہ وہ روزانہ اسی وقت پہلی منزل پر واقع بینک میں کام سے جاتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اسی بلڈنگ میں کام کرتا ہو۔

وہ عام سے حرے کا قد آور آدمی تھا لیکن اس کی بھویں سیاہ اور اس قدر گھنی تھیں کہ چہرے پر نظر پڑتے ہی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کسی بھیڑیے کا خیال آجاتا تھا۔ دو روز بعد وہ دوبارہ اسے لفٹ میں ملا۔ اس کی عمر 35 سال سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی اور اس نے شادی کی انگوٹھی بھی نہیں پہن رکھی تھی۔ 28 سال کی عمر میں جوائس ان چیزوں کا بغور جائزہ لے لیتی تھی۔

پچھلے سال اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ تنہا ایک چھوٹے سے بوسیدہ فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کی معمولی تنخواہ کسی اچھی جگہ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ خود معمولی لڑکی تھی اور ابھی تک کسی مرد نے اس سے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب تک اس کی ماں تھی، وہ اس کی ذات میں گم تھی۔ اب اسے شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔

جب تیسری مرتبہ اس شخص سے اس کی ملاقات ہوئی تو یہ خیال اس کے دماغ میں ضرور آیا کہ شاید وہ اسے چاہنے لگا ہے۔ شرمیلا محبوب جو ابھی تک اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا اور دفتر تک اس کا تعاقب کرتا تھا۔ وہ بہت جلد حسین خوابوں میں گم ہوگئی۔ یہ اس کا پہلا خیال تھا مگر فوراً ہی وہ کچھ اور بھی سوچنے لگی..... ممکن ہے وہ شخص اسے لوٹنے کے چکر میں ہو۔

جوائس ہر روز تین بجنے سے چند منٹ قبل ہی پہلی منزل پر واقع بینک جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ ہوتا تھا جس میں صبح سے جمع کیے ہوئے چیک اور نقد رقم ہوتی تھی جسے وہ بینک میں جمع کروانے لے جاتی تھی۔ ورلڈ وائلڈ فنانس میں زیادہ تر لوگ اپنی اقساط کی ادائیگی نقد رقم میں کرتے تھے اور جوائس جمع کروانے کے لیے زیادہ تر نقد رقم لے جاتی تھی۔ یہ معمول ایک عرصے سے جاری تھا۔ جب اس نے کام شروع کیا تھا تو روزانہ جمع کروانے کے لیے چند سو ڈالرز سے زیادہ نہیں ہوتے تھے لیکن اب یہ رقم اکثر اوقات دس ہزار ڈالرز تک پہنچ جاتی تھی۔

آج جمعے کو جب اس نے رقم جمع کروائی تو وہ نو ہزار تین سو پچپن ڈالرز تھی۔ اس نے لفافے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا لیکن وہ شخص اگرچہ آج بھی اس کے ساتھ تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ شاید اس لیے بھی نہیں کہ لفٹ میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ تین اشخاص اور موجود تھے۔ شاید وہ اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب تنہا اس کے ساتھ ہوتا کہ لفافہ چھین کر بھاگ سکے۔

اگرچہ جمعے کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ چھٹی کے دونوں دن اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے اس بات کا تو پورا یقین ہوچلا تھا کہ وہ شخص چور تھا اور موقع کا متلاشی بھی۔ ایک مرتبہ اس نے سوچا بھی کہ احتیاط کے طور پر وہ اپنے منیجر مسٹر میلروز کو اطلاع کردے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہ گئی کہ کہیں وہ اسے بے وقوف قرار نہ دے دے یا اتنی دیر میں اطلاع دینے پر سرزنش نہ کرے۔ مسٹر میلروز طبیعت کے بڑے اکھڑ تھے۔

جوائس کو خیال آیا کہ اسے یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کمپنی نے اس کے لیے کون سی بھلائی کی ہے۔ وہ اتنی محنت اور جانفشانی سے، سارا کام کرتی ہے لیکن اس کا صلہ یہ ہے کہ تین سال سے اس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جبکہ کمپنی کی آمدنی کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ ایک خیال نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن کے دریچوں میں گھس آیا۔

بالفرض ڈاکا پڑ جائے اور وہ شخص رقم لے کر فرار ہوجائے اور بالفرض یہ رقم کسی طرح جوائس آئرلینڈ کے پاس واپس آجائے تو کیا مار ہے؟ کم از کم کمپنی کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ انہیں انشورنس کمپنی سے اتنی ہی رقم مل جائے گی، چور کا بھی کوئی نقصان نہیں۔ نہ وہ رقم کا حق دار ہے اور نہ اسے ملے گی لیکن وہ یقیناً اتنی رقم کی حق دار ہے اور اگر اسے مل جائے تو..... اس رقم سے وہ کیا نہیں کرسکتی۔ دنیا دیکھ سکتی ہے، خوب صورت کپڑے خرید سکتی ہے اور گھومنے پھرنے جاسکتی ہے۔

اتوار کی شب وہ بڑے غور و خوض کے بعد اپنا منصوبہ ترتیب دے چکی تھی۔ جوائس آئرلینڈ..... وہ رقم حاصل کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

☆☆☆

وہ شخص پیر اور منگل کو اسے نظر نہیں آیا اور وہ سوچنے لگی کہ شاید یہ اس کا وہم تھا اور اس شخص نے اسے لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ بدھ کو بھی وہ اسے نظر نہیں آیا حالانکہ اس نے کھانے کے وقفے میں اسے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش بھی کی کہ اگر وہ اسی بلڈنگ میں ہو تو نظر آجائے۔ آہستہ آہستہ وہ سوچنے لگی تھی کہ یہ اس کا واہمہ تھا اور چھوٹی سی تیاری جو اس نے کی تھی، وہ اسے ختم کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔

جمعرات کو پندرہ تاریخ تھی اور اسے معلوم تھا کہ پہلی اور پندرہ تاریخ کو اقساط کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈھائی بجے کے قریب مسٹر میلروز اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور کیشیر سے پوچھا۔

''اس وقت تک کتنی رقم جمع ہوچکی ہے سو؟''

سو، کم عمر خوب صورت سی لڑکی تھی۔ جلدی جلدی اس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

نے اپنا حساب لگایا اور جواب دیا۔ ''تقریباً دس ہزار دو سو پچھتر ڈالرز، مسٹر میلروز۔''

''جوائس! میرا خیال ہے تم فوراً ہی یہ ساری رقم بینک میں جمع کروادو۔ وقت ختم ہونے والا ہے۔'' مسٹر میلروز نے جوائس سے مخاطب ہو کر کہا۔

جوائس نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اپنا بڑا سا پرس اٹھالیا جو اس نے چند روز قبل ہی خریدا تھا۔ لڑکی نے جلدی جلدی چیک اور نقد رقم گن کر بھورے لفافے میں رکھ دی اور جوائس کو لفافہ بینک میں جمع کروانے کے لیے دے دیا۔

جوائس اپنا پرس اور لفافہ لے کر آفس سے نکل کھڑی ہوئی۔ بڑے ہال میں سے گزرتے ہوئے وہ لفٹ تک آگئی۔ وہ اپنے معمولات میں اس شخص کو قطعاً بھول چکی تھی لیکن جیسے ہی وہ لفٹ میں قدم رکھ رہی تھی، نہ جانے کہاں سے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور اس کے ساتھ ہی سوار ہو گیا۔ جوائس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لفٹ میں اس کے علاوہ صرف ایک بوڑھی عورت اور تھی جو ظاہر ہے اس کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے لفافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سینے کے قریب کرلیا۔

لفٹ تیزی سے نیچے اتر رہی تھی اور کسی جگہ بھی نہیں رکی۔ پہلی منزل پر لفٹ کے دروازے کھل گئے۔ باہر گیلری میں خاصی گہما گہمی تھی۔ اس شخص نے مسکرا کر پہلے بوڑھی عورت کو جانے کا راستہ دے دیا۔ اس کے بعد جیسے ہی جوائس باہر نکلنے لگی، اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔

یہ واقعہ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑی ہوئی تھی اور اجنبی شخص وہ بھورا لفافہ اس کے ہاتھوں سے برق رفتاری سے کھینچ کر دوڑ چکا تھا۔ بوڑھی عورت نے چیخنا شروع کر دیا تھا اور کچھ ہاتھ اسے سہارا دے رہے تھے۔

''آپ کیسی ہیں؟'' اسے لوگوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن اندھیرا اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس کا جبڑا ٹوٹ چکا ہے لیکن چند لمحوں بعد وہ بولنے کے قابل ہو گئی۔

''میرا پیسا..... وہ میرا پیسا لے گیا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں، لوگ اسے پکڑ لیں گے۔''

اس نے جبڑے پر ہاتھ رکھا۔ سخت درد ہو رہا تھا۔ پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔

پھر جیسے ہی لوگوں نے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں مدد کی وہ کہنے لگی۔ ''وہ میری ساری رقم لے گیا ہے۔''

اس دوران کسی نے قریب ہی سے پولیس والے کو بلا لیا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں، کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے پوچھا۔

''اس نے میرے منہ پر گھونسا مارا تھا لیکن میرے خیال میں جبڑا ٹوٹا نہیں ہے۔''

''وہ شخص بھاگ گیا ہے لیکن ہم اسے گرفتار کرلیں گے۔ اس کی شکل کیسی تھی؟''

''قد آور، سیاہ گھنی بھویں، سیاہ بال، عمر تقریباً 35 سال۔''

''اسے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ یہ سب کچھ اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا۔

''کتنی رقم تھی؟''

''دس ہزار سے کچھ زیادہ..... مجھے صحیح رقم یاد نہیں رہی۔''

''میرے خیال میں ہم تمہارے آفس چلتے ہیں۔''

☆☆☆

چوری کا سنتے ہی مسٹر میلروز کی بری حالت ہو گئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جوائس کیسی تھی۔ وہ تو افسوس کر رہے تھے کہ ان سے یہ کیسی غلطی ہوئی۔

''ہیڈ آفس میں وہ لوگ کیا کہیں گے، یہی کہ میں یہاں معاملات سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ اتنی بڑی رقم میں نے اکیلی لڑکی کو جمع کرنے کے لیے کیوں دی۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟'' وہ بے چینی سے ہاتھ مسل رہا تھا۔

''لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اس نے بڑی تیزی سے حملہ کیا تھا۔'' جوائس بڑبڑائی۔ اس کا جبڑا سوجنے لگا تھا اور میلروز کا رویہ دیکھ کر اس کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں آرہا تھا۔

پولیس کا آدمی نقصان کی صحیح رقم کے اعداد و شمار لے گیا تھا۔ اس کی ساتھی سو، اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب یہ سارا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تو جوائس نے اپنا بڑا پرس کھول کر دیکھا اور اس میں دس ہزار دو سو پچھتر ڈالرز دیکھ کر اس کا دل کھل اٹھا۔ اصل بھورا لفافہ جس میں رقم تھی اس کے پرس میں حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جس وقت چور نقلی لفافے میں ردی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے ٹکڑے ملیں گے تو اس کی شکل دیکھنے کے قابل ہوگی۔

☆☆☆

جوائس نے وہ شام اپنے گھر پر ہی گزاری۔ اس کا جبڑا دکھ رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے رقم کو گنا اور پھر پلاسٹک میں لپیٹ کر ٹوائلٹ ٹینک میں بڑی حفاظت سے چھپا دیا۔ یہ جگہ اسے سب سے زیادہ محفوظ نظر آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جتنے زیادہ عرصے تک وہ رقم خرچ نہیں کرے گی، اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ بات ضرور تھی کہ ممکن ہے چور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور لفافے میں کاغذ کے ٹکڑوں کے بارے میں بتا دے لیکن اس کی بات پر کون یقین کرے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کسی نے اسے ہال میں لفافہ تبدیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ روزانہ کوشش کرتے ہوئے اسے کافی مہارت ہوگئی تھی۔

پیر کو اس نے آفس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر میلر وز کو اس نے ٹیلی فون کر دیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر اس کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ جبڑے کی سوجن کافی حد تک ختم ہو چکی تھی اور ابھی وہ باہر جانے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

''کون؟'' اس نے انٹر کام پر پوچھا۔

''پولیس، مس آئرلینڈ! ہمیں چند مزید سوالات پوچھنے ہیں۔''

اس نے بزدلانہ کر صدر دروازے کا تالا کھول دیا۔ چند لمحے بعد اس کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی، بغیر کسی پس و پیش کے اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس نے تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن گھنی بھوؤں والا شخص بہت ہوشیار تھا۔ اس نے اپنا پاؤں دروازے میں پھنسا دیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن ایک ہاتھ نے بڑی سختی سے اس کا منہ بند کر دیا۔

''خاموش! ورنہ اس مرتبہ میں تمہارا جبڑا بالکل ہی توڑ دوں گا۔'' اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی جدوجہد کی۔ کئی جگہ اس کے ہاتھوں پر کاٹ کھایا لیکن وہ تندرست و توانا تھا اس لیے کامیاب نہ ہو سکی۔

''مجھے وہ رقم چاہیے۔ میں وہ رقم حاصل کرنے آیا ہوں اور ہر قیمت پر حاصل کر کے جاؤں گا۔'' اس نے بڑی سختی سے جوائس کا ہاتھ مروڑ رکھا تھا۔ شدید تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اس نے جوائس کو تیزی سے دھکا دیا اور وہ سیدھی صوفے پر جا پڑی۔ اس کے ہاتھ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اجنبی کے ہاتھ میں اسے چاقو نظر آیا۔ جوائس کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

''میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا لیکن اگر تم اسی طرح ضد کرتی رہیں تو میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کچھ حاصل کیے بغیر پولیس سے بھاگتا پھروں۔ تمہیں معلوم ہے کہ لفافے میں کوئی رقم نہیں تھی۔''

''حیرت ہے، لفافے میں رقم نہیں تھی لیکن لفافے میں رقم میں نہیں رکھتی۔ میرے ساتھ کام کرنے والی دوسری لڑکی رکھتی ہے۔''

''بے کار باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ رقم تم نے کہاں چھپائی ہے؟'' چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن لہجے میں تھوڑی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔

''میں نے پچھلے ہفتے بھی تمہیں لفٹ میں دیکھا تھا لیکن میں نے یہ بات پولیس کو نہیں بتائی۔'' جوائس نے کہا۔

''کیوں نہیں بتائی؟''

''پتا نہیں کیوں۔''

''اس لیے کہ تم خود رقم چرانا چاہتی تھیں۔''

جوائس نے کہا۔ ''تم نے آخر مجھے ہی کیوں چنا؟''

''میں نے تمہیں ایک روز لفٹ میں دیکھا تھا لیکن اب یہ گفتگو ختم کرو اور یہ بتاؤ کہ رقم کہاں ہے؟'' اس نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں، ہو سکتا ہے دوسری لڑکی نے لفافہ بدل دیا ہو۔''

''کس لیے؟ کیا اس لیے کہ بینک میں کاغذ کے ٹکڑے جمع کروائے جا سکیں۔ فضول وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، جلدی بتاؤ کہ رقم کہاں ہے؟''

جوائس کو معلوم تھا کہ اس کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو وہ رقم اسے دے کر اپنے خوابوں کو چکنا چور ہو جانے دے یا پھر قتل ہونے کا خطرہ مول لے کیونکہ وہ اسے اس طرح تو چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اگر ایک مرتبہ اس نے رقم دے دی تو پھر وہ پولیس کو بھی کچھ بتانے کے قابل نہ رہ سکے گی لیکن اچانک اس کے ذہن میں ایک تیسرا خیال بھی آیا۔

''اگر میں تمہیں اس رقم سے بھی زیادہ رقم فراہم کر دوں تو کیا تم مجھے یہ رقم رکھنے دو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''زیادہ..... کیا مطلب؟''

''اگر میں زیادہ رقم بینک میں جمع کروانے کے لیے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksstube.net/
http://www.urdutube.net

جاؤں اور پھر بھاگ کھڑی ہوں۔''

''اور پولیس کو اپنے پیچھے لگالوں۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میرے پاس اس کے علاوہ چارہ کیا ہے؟ اگر میں تمہیں یہ رقم دے دوں تو میرے پاس کیا رہے گا؟''

''تم بہت بے وقوف ہو، پولیس ذرا سی دیر میں تمہیں پکڑ لے گی۔''

''میں تمہیں ایک پیشکش کر رہی ہوں، تم چاہو تو اسے قبول کرلو۔''

''بولو۔''

''میں تمہیں اس سے بھی زیادہ رقم لادوں گی مگر تم مجھے یہ رقم رکھنے دو گے۔''

''کب؟''

''اگلی پیر کو۔''

اس کی ہچکچاہٹ سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ''لیکن میں تم پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

''میں کرسکتی ہوں، اگر میں پولیس کو کچھ بتاتی ہوں تو میرا اس میں شامل ہونا ضروری ہے اور رقم میرے پاس سے چلی ہی جائے گی۔ وہ چاہے میں تمہیں دوں یا انہیں دوں، ایک ہی بات ہے۔''

''تم مجھے رقم دکھاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تم اسے لے لو گے۔'' اس نے کہا۔

''اگر میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں تو تمہیں بھی مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' جوائس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے اس شخص پر بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے سوچا۔

''یاد رکھنا، میں اور بڑی رقم بھی حاصل کرسکتی ہوں۔ اگر تم مجھے دھوکا دے کر یہ رقم لے گئے تو بڑی رقم سے ہاتھ دھولو گے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' جوائس نے اسے ٹینک میں چھپائی ہوئی رقم دکھادی۔ وہ حیران رہ گیا۔ یہ جگہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔

''میرا خیال ہے کہ میں اس رقم کی حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ ہی ٹھہر جاتا ہوں۔''

''نہیں، نہیں..... تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔''

''کیوں نہیں ٹھہر سکتا؟ یہ سب سے محفوظ جگہ ہے۔ کم پولیس والے مجھے دیکھنے یہاں ہرگز نہیں آئیں گے۔'' اس کی یہ بات تو بالکل ٹھیک تھی۔

''لیکن اگر میرا کوئی ملنے والا آگیا تو؟''

''کوئی فکر نہیں، تم کہہ سکتی ہو کہ تم بیمار ہو یا کوئی اور بہانہ کرسکتی ہو۔''

جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ ٹھہرنا چاہتا ہے تو اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے یا اسے مار کر بھاگ جائے لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے شراب کا گلاس لے آئی اور پھر کھانے کے وقت دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی کہانی سناتے رہے۔ اس کا نام ڈیوڈ تھا۔ کافی عرصہ فوج میں رہا تھا اور اب بہت دنوں سے اسی قسم کی چھوٹی موٹی چوریوں سے اپنا کام چلا رہا تھا۔ کئی مرتبہ جیل بھی جاچکا تھا۔ وہ اس سے اپنے متعلق بات کرتی رہی۔ اپنی ماں کے متعلق اور اپنی تنہائی کے متعلق۔ اور یہ کہ اسے رقم کی ضرورت تھی اور وہ کیا کیا کرنا چاہتی تھی۔ رات زیادہ ہوئی تو وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ جوائس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کے بستر پر سوئے گا لیکن وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

دوسری صبح وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی حد تک مانوس ہوچکے تھے اور ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی شروع ہوچکی تھی۔ وہ اس شخص کو پسند کرنے لگی تھی۔

''پیر کو تمہیں کتنی رقم حاصل ہوجائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے خیال میں دس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہی رقم ہوگی۔''

''میلروز کو کب پتا چلے گا کہ تم رقم لے کر جاچکی ہو؟''

''میرے خیال میں منگل کی صبح کو جب میں کام پر نہیں جاؤں گی۔ پیر کو جب میں بینک میں رقم جمع کروانے جاؤں گی تو بجائے بینک جانے کے میں سیدھی یہاں آجاؤں گی اور پھر پہلے کی رقم ملا کر ہم لوگوں کے پاس بیس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہوجائیں گے۔''

''ہمارے پاس کیا مطلب؟ لیکن تم میرے ساتھ تو نہیں جاسکتیں۔''

''کیوں؟''

''میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔''

''میرے خیال میں پچھلے دنوں سے میں بھی کچھ اچھی نہیں رہی۔'' رات کو انہوں نے سارا پروگرام ترتیب دے لیا۔

☆☆☆

مسٹر میلروز نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ ذرا دیر بعد ہی دفتر کی مصروفیات شروع ہوچکی تھیں۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ڈھائی بجے کے قریب سو، نے جمع شدہ رقم کا حساب لگایا اور کہا۔ ''مسٹر میلروز! دس ہزار نو سو ترانوے ڈالرز جمع ہو چکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''جوائس! میں نے سوچا ہے کہ کم از کم چند روز تک میں تمہارے ساتھ بینک میں رقم جمع کروانے جایا کروں گا۔ تھوڑی بہت حفاظت بہت ضروری ہے۔''

''لیکن میرے خیال میں یہ ضروری نہیں۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''اتنی جلدی چور کا دوبارہ حملہ کرنا مشکل ہے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے لیکن کوئی چور موقع کی تلاش میں ہو سکتا ہے۔ خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں، میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

وہ دونوں خاموشی سے لفٹ کا انتظار کرنے لگے۔ جوائس کا دماغ خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے سوچ رہی تھی۔ ڈیوڈ کار لیے اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جب وہ وقت پر نہیں پہنچے گی تو وہ سوچے گا کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے اور نہ معلوم وہ میرا کیا حشر کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مسٹر میلروز سے کسی طرح جان چھڑا کر بھاگ لے ورنہ زندگی میں یہ سنہری موقع پھر نہیں آئے گا۔

لفٹ خالی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے پہلی منزل تک سفر کرتے رہے۔ پہلی منزل پر لفٹ رک گئی اور پھر جوائس کی نظر ''بی'' پر پڑی عام طور سے بڑی بلڈنگوں میں ایک تہ خانہ ہوتا ہے جس کے ذریعے بلڈنگ سے باہر جا سکتے ہیں۔ جوائس کے دماغ میں تیزی سے خیال آیا اور جونہی مسٹر میلروز لفٹ سے باہر نکلے، جوائس نے ''بی'' دبا دیا۔

''جوائس!'' مسٹر میلروز چلائے لیکن وہ لفٹ تیزی سے نیچے سفر کرتی چلی گئی۔ جوائس نیچے پہنچ کر تیزی سے دوڑتی چلی گئی۔ تہ خانہ خالی تھا اور چند لمحوں میں وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں ڈیوڈ کا انتظار کر رہا تھا۔

ڈیوڈ نے اس کو آتے ہوئے دیکھ کر کار کا دروازہ کھول دیا۔

''مسٹر میلروز بینک تک میرے ساتھ ہی آئے تھے۔ انہیں بڑی مشکل سے دھوکا دے کر آئی ہوں۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''پھر تو وہ عقل مند آدمی ہے۔''

''اب عقل مند ہو گیا ہے۔''

''کتنی رقم ہے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''تقریباً گیارہ ہزار ڈالرز۔'' اس نے دوسرا لفافہ سیٹ پر رکھے پہلے لفافے کے برابر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' جوائس نے پوچھا۔

''مجھے یہاں سے کافی دور ایک چھوٹے سے ہوٹل کا پتا ہے جہاں ہم رات گزاریں گے۔''

''لیکن پولیس مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔''

''یقیناً۔''

''لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں تو مجھے کسی چیز کی کوئی فکر نہیں۔''

وہ دونوں پانچ بجے، ہوٹل پہنچ گئے۔ ڈیوڈ نے رات گزارنے کے لیے ایک کمرا بک کرلیا تھا۔ جوائس ہوا میں اڑ رہی تھی۔ یہ خوشی اسے پہلی مرتبہ ملی تھی۔ وہ ہوٹل میں چاروں طرف گھومتی پھری۔ کچھ دیر سوئمنگ پول پر نظارہ کرتی رہی۔ واپس آئی تو ڈیوڈ ٹیلی فون رکھ رہا تھا۔

''تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟''

''کسی سے نہیں، میں نے کچھ کھانے کے لیے منگوایا ہے۔''

''اوہ۔''

آدھ گھنٹا بعد بھی جب کوئی کچھ نہیں لایا تو وہ دوبارہ فون کرنے کے لیے سوچنے لگی۔ بستر پر کروٹ لے کر وہ ڈیوڈ کے قریب ہو گئی۔

''ڈیوڈ!''

''ہوں.....؟''

''کوئی ابھی تک کچھ لے کر نہیں آیا۔ تم نے کتنی دیر پہلے ٹیلی فون کیا تھا؟''

''ہو سکتا ہے میرا بھول گیا ہو۔''

دروازے پر گھنٹی بجی۔ جوائس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور اچانک جیسے اس پر بجلی گر پڑی۔ سو مسکرا رہی تھی اور اس کے سامنے ''بڑی'' تھی۔

شاید اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی یا پتا نہیں لیکن ڈیوڈ کا زبردست گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ وہ شاید پوری طرح ... ہوش نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس نے فوراً ان دونوں کو ایک دوسرے کی آغوش میں دیکھا تھا اور پھر ڈیوڈ اسے دو پیکٹ بھی دے رہا تھا۔ اس کے پوری طرح بے ہوش ہونے سے پہلے وہ جا چکے تھے۔

وہ جب ہوش میں آئی تو اس کا جبڑا پہلے سے بھی زیادہ بری طرح دکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ پڑی رہی اور سوچنے کی کوشش کرتی رہی۔ بالآخر وہ اٹھی اور ٹیلی فون پر پولیس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

خواجہ باقی باللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا محض تاریکی اور تضادات کا مجموعہ ہے اور یہ چاند، سورج محض روشنی کے وہ استعارے ہیں جو انسان کو اپنے اندر کے اندھیرے دور کرنے پر اکساتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی ایسے ہی انسانوں سے تھا۔ جن کا پیغام اور تعلیمات کے اثرات ایسی ہی تاریکی دور کرنے پر متوجہ کرتے رہے۔ مخلوق خدا کو آپ سے فیض حاصل ہوتا رہا کہ یہی باری تعالیٰ کی منشا تھی۔

اللہ کے پیغام کے امین، روشنی کے مینار ایک ولی کی روداد

سمرقند کے قاضی عبدالسلام حنفی اپنے زمانے کے عالم باعمل اہل فضل وصفا اور صاحب وجد وحال بزرگ تھے۔ یہ تلاش معاش میں اپنا وطن چھوڑ کر کابل پہنچے اور وہیں شادی کرلی۔ یہیں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ قاضی عبدالسلام نے اپنے بیٹے کا نام سید رضی الدین محمد باقی رکھ دیا۔ یہ صحیح النسب حسینی سادات کا خاندان تھا۔ بیٹے کی پیدائش 971 بمطابق 1563ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ سن ہجری کا یہ سال تاریخ میں یادگار ثابت ہوگا اور پیدا ہونے والا بچہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے شہرت اور حضرت خواجہ مجدد الف ثانی کے پیرومرشد ہونے کا شرف حاصل کرے گا۔

قاضی عبدالسلام اپنے بیٹے کی پیشانی بہت غور سے دیکھتے تھے انہیں [illegible] پیشانی میں ایسا نور دکھائی دیتا جس کی شعاعیں شش

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جہت پر محیط تھیں اور جس کی زد میں امیر و غریب، عوام و خواص، راعی و رعایا، حاکم و محکوم اور خورد و کلاں تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتے رہتے۔ ''بیوی! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے گویا میرے گھر میں ایک آفتاب اتر آیا ہے اور آئندہ اس کی توانائی اور روشنی سے ایک زمانہ مستفیض ہوگا۔'' بیوی اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ... ملا دیتی اور دل سے یہی دعا مانگتی کہ خدا شوہر کی زبان مبارک کرے۔

جب خواجہ محمد باقی پانچ سال کے ہوگئے تو باپ نے کامل کی مشہور درس گاہ خواجہ سعد کے مکتب میں داخل کر دیا۔ یہاں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی ضروری مسائل بھی حفظ کرتے رہے۔ دس سال کی عمر میں عربی کی تعلیم شروع کی اور مکتب سے فارغ ہو کر اپنے عہد کے مشہور عالم مولانا صادق حلوائی کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا کی صحبت میں خواجہ محمد باقی کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ استاد کو اپنے ہونہار اور غیر معمولی شاگرد میں معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر ماوراءالنہر چلے گئے وہاں بھی تحصیل علم کا عمل جاری رہا اور تیس سال کی عمر میں خواجہ محمد باقی کا شمار جید علما میں ہونے لگا۔

اب خواجہ محمد باقی کا کسی ایک جگہ دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت تصوف و سلوک کی طرف مائل رہنے لگی اور اس عہد کے نامی گرامی اولیاء کی صحبتوں میں حاضریاں دینے لگے۔ علم تو حاصل کیا ہی تھا اب کمالات باطنی کا اکتساب بھی شروع ہوگیا۔ اس جہد و سعی میں انہوں نے بلخ، بدخشاں، ماوراءالنہر کے دوسرے شہروں اور ہندوستان کے اکثر مقامات کا سفر کیا۔ خواجہ محمد باقی مراقبے میں چلے جاتے اور اللہ کی یاد میں دنیا و مافیہا کو بالکل بھلا دیتے۔

دوران سفر آپ لاہور پہنچ گئے۔ تنہائی کی تلاش میں یہ معلوم نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتے۔ میدان، کوہستان، ویرانہ، قبرستان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں خواجہ باقی نہ جاتے ہوں۔ آپ کی ماں کابل میں تھیں اور بیٹے کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ کسی نے انہیں اطلاع دی کہ اماں میں نے آپ کے بیٹے کو دہلی میں دیکھا تھا۔ کھویا کھویا کسی شے کی تلاش میں گم ادھر ادھر پھر رہا تھا۔

ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے۔ ''اے الٰہ العالمین! میرے بیٹے پر رحم فرما اور جس شے کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے اس سے اس کو نواز دے۔''

دوسری طرف لوگ خواجہ سے کہتے۔ ''جناب، آپ کی ماں آپ کے لیے بہت بے قرار رہتی ہے۔ آپ جلد از جلد اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کیجیے۔''

خواجہ باقی جواب دیتے۔ ''ہاں جب میں اس کو پا جاؤں گا تو ضرور اپنے گھر جاؤں گا۔ ابھی تو اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔'' لوگ ان پر ہنسنے لگتے۔ جنہیں خواجہ باقی سے دلچسپی ہوگئی تھی وہ ان کا پیچھا کرتے اور یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو جاتے کہ ابھی تو خواجہ باقی آبادی میں ہیں اور کچھ دیر بعد ویرانے میں پہنچ گئے۔ ابھی تو انہیں جنگل میں دیکھا گیا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ قبرستان میں نظر آتے پھر دیکھنے میں آتا کہ کوئی شخص کوہستانی سلسلوں میں محو سفر ہے۔ جب پاس جا کر پہچاننے کی کوشش کی جاتی تو یہ خواجہ باقی نکلتے۔

کسی شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ ''جناب! یہ چکر کیا ہے؟ کیا آپ کے پاؤں میں آبلے نہیں پڑ جاتے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''آبلے پڑ کیوں نہیں جاتے!''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر آبلے پڑ جاتے ہیں تو آپ یہ صحرانوردی ترک کیوں نہیں فرماتے؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''جس کو تم صحرانوردی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا بامقصد سفر ہے اور اس تلاش میں چونکہ شوق کی آگ مشتعل ہے اس لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا خیال یا احساس تک نہیں ہوتا۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''بالکل پوچھ سکتے ہو۔ میں اس کا جواب دوں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تو آپ سمجھ لیں کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کس شے کی طلب آپ کو آوارہ و سرگرداں کیے ہوئے ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کسی ولی کامل کی تلاش۔ کسی مرد کامل کی جستجو لیکن یہ کہیں مل ہی نہیں رہا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''جب وہ ابھی تک نہیں ملا تو آگے کیا امید کہ وہ مل ہی جائے گا۔''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''تو اس شوق کو کیا جانے۔ کوشش اور تلاش میرا فرض ہے اب وہ ملے یا نہ ملے یہ میری قسمت۔ اگر میری طلب صادق ہے تو میں اس کو پا کر رہوں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''ایک بات میری بھی مانیے۔ آپ اپنے گھر واپس جائیں جہاں آپ کی ماں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مردِ کامل کی آپ کو تلاش ہے وہ اگر مل بھی گیا تو اس سے آپ کو حاصل کیا ہوگا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ناصح تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ہمت افزائی کرنے والا ایک بھی نہیں ملتا۔ تیری نصیحتوں کا شکریہ میں تلاش اور جستجو جاری رکھوں گا۔''

اس شخص نے برا سا منہ بنایا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔ ''غریب اس کی تلاش میں ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مردِ کامل، اس دنیا میں ایک چیز بھی کامل نہیں پھر یہ مردِ کامل کہاں ملے گا۔ آپ پر اللہ اپنا رحم کرے۔'' خواجہ باقی کو اس شخص کے سوال جواب سے بڑی اذیت پہنچی مگر صبر سے کام لیا۔

اس طلب اور جستجو میں آپ کو کیچڑوں اور دلدلوں سے بھی گزرنا پڑا مگر آپ باز نہ آئے۔

ایک دن اسی صحرا نوردی میں انہوں نے ایک ننگ دھڑنگ شخص کو برفانی علاقے میں سفر کرتے دیکھا، اس پر موسم کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ خواجہ باقی اس حیرت انگیز مشاہدے سے متاثر ہو کر اس فقیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''اے اللہ کے والی! میں کچھ عرصے آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

درویش نے چونک کر خواجہ باقی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اپنی راہ لی۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے چل پڑے۔ درویش نے پلٹ کر خواجہ باقی کو دیکھا اور دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ گویا وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا اور خود بھی دوڑنے لگے۔ دونوں بھاگتے بھاگتے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد درویش ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر تان کر خواجہ کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

خواجہ باقی کو ڈر لگا کہ کہیں یہ ننگ دھڑنگ شخص انہیں زخمی نہ کر دے۔ انہوں نے دور ہی سے کہا۔ ''بابا! میں نے کیا خطا کی ہے جو پتھر تان رکھا ہے؟''

درویش نے غصے میں کہا۔ ''تو میرا پیچھا کیوں کرتا ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کا پیچھا نہیں کیا، میں تو آپ کی صحبت میں رہنے کا متمنی ہوں۔''

درویش نے تنگ کر کہا۔ ''لیکن میں تیری صحبت میں نہیں رہنا چاہتا۔''

خواجہ باقی کو بڑا دکھ پہنچا، بولے۔ ''بابا! زبردستی کی بات نہیں ہے میں تو عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں۔ اگر آپ صحبت میں رہنے کی اجازت دیں گے تو آپ کے پاس رہ لوں گا ورنہ مجبوری ہے۔''

درویش نے کہا۔ ''میں تجھ کو اپنے پاس رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

خواجہ باقی لاجواب ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عرض کیا۔ ''اچھا جناب! میں آپ کے پاس نہیں آؤں گا لیکن دور دور رہ سکتا ہوں۔''

درویش نے پوچھا۔ ''وہ کیوں..... میں تو تیرے سائے تک سے نفور ہوں۔''

خواجہ باقی نے عرض کیا ''میں نے ایک بات آپ کی مان لی ایک بات آپ میری مان لیجیے۔''

درویش نے سکوت اختیار کیا۔ آپ نے اسے درویش کی رضامندی سمجھا اور درویش سے دور دور رہنے لگے۔ اب درویش نے مستقلاً چلنا اختیار کیا..... کبھی تیز تیز اور کبھی آہستہ آہستہ۔ خواجہ باقی عاجز آ گئے لیکن انہوں نے بھی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اس درویش کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دن درویش نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ برف پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ خواجہ باقی نے بھی اس کی اتباع میں بھاگنا شروع کر دیا لیکن سرد ہوائیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گر گئے، درویش نے انہیں مڑ کر گرا ہوا جو دیکھا تو زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ ''میرا مقابلہ کرے گا۔ بڑا آیا مقابلہ کرنے والا۔ اب میں دیکھوں گا تو میرا کس طرح پیچھا کرتا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس راہ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر آپ کی صحبت میں رہنا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے لیے یہی... کافی ہے کہ مجھے آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔''

درویش نے ہنس کر کہا۔ ''اٹھ اٹھ، میں آگے جا رہا ہوں۔ میرا پیچھا کر۔ یوں لیٹے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ شاباش جلدی سے کھڑا ہو جا۔''

خواجہ باقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ کافی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دیر بعد درویش ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ وہاں ایک درخت کے سوا جو درخت تھے وہ چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کے سائے میں کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ خواجہ باقی درویش سے کچھ فاصلے پر آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔

درویش نے بڑی محبت سے انہیں اپنے پاس بلایا۔ ''وہاں کیوں کھڑا ہے میرے پاس درخت کے سائے میں آجا۔''

خواجہ باقی نے درویش کو سوالیہ اور اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ درویش نے کہا۔ ''میری صورت کیا دیکھتا ہے میں نے کہہ جو دیا کہ میرے پاس آجا۔''

خواجہ باقی ہمت کر کے درویش کے پاس چلے گئے اور اس کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پہلے تو انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اس کے بعد ایک زوردار پتھر خواجہ باقی کے منہ پر رسید کر دیا۔ خواجہ باقی چکرا کر گر گئے۔ گرتے ہی درویش نے انہیں ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی نے بچنے کی کوشش نہیں کی کہا۔ ''میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ مجھ کو جان سے مار دیں میں اس کو اپنے حق میں اعزاز سمجھوں گا۔''

درویش نے سر پر ایک ہاتھ اور رسید کر دیا اور کہا۔ ''اگر یہ تیرے حق میں کوئی اعزاز ہے تو میں اس اعزاز سے تجھ کو روز ہی نواز سکتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی مار کو بھی اعزاز ہی سمجھ سکتا ہوں۔''

درویش کو ہنسی آ گئی، کہا۔ ''بھائی تو، تو مزے کا انسان ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں کیا خاک مزے کا انسان ہوں۔''

درویش نے ان کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کر دیا اور پوچھا۔ ''کہو بیٹا کیسی رہی، مزہ آیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی ہر مصیبت برداشت کر لوں گا لیکن آپ کی رفاقت نہیں چھوڑوں گا۔''

درویش نے کہا۔ ''تو اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے چلا جا اور جو کرنا ہے اپنے طور پر کر۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں اپنا وقت اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک آپ اپنا وقت برباد کرتے رہیں گے۔''

درویش نے پوچھا۔ ''اچھا بتا تو چاہتا کیا ہے؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''بابا! مجھے درویش کامل کی تلاش تھی سو وہ آپ کی شکل میں مل گیا۔ اب میں آپ کے ذریعے خدا کو تلاش کروں گا۔''

درویش زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''خدا کو..... کس خدا کو.....؟ یہ کون ہے.....؟ میری تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی میں اس سے واقف ہوں۔''

خواجہ کو درویش کی باتیں اچھی نہیں لگیں، بولے۔ ''تعجب ہے کہ آپ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

درویش نے کہا۔ ''ہاں میں خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ اگر وہ کہیں موجود ہے تو اس سے ملاقات ہونا چاہیے تھی مگر ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو یہ کہتا کہ اس نے خدا کو دیکھا یا اس سے ملاقات کی ہے اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ نہیں ہے..... لا الہ۔''

خواجہ باقی کے دل پر چوٹ سی لگی کہ جس شخص کے پیچھے انہوں نے اتنا وقت برباد کیا وہ کیسی کافرانہ اور ملحدانہ باتیں کر رہا ہے۔

درویش نے کہا۔ ''اب تو تجھے میری حقیقت معلوم ہو گئی۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔''

خواجہ باقی نے یوں محسوس کیا گویا اندر سے کوئی انہیں سمجھا رہا ہے کہ خواجہ باقی درویش کی باتوں میں قطعی نہ آنا۔ یہ فریب ملا سے تعلق رکھتا ہے جو ایسی روش اختیار کرتے اور ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دنیا ان سے دور دور رہے۔ یہ بھی تجھے بھگانے کی خاطر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ خواجہ باقی نے کہا۔ ''بابا! میں نے ایک بار جب یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا تو میری خوش نصیبی یا بدنصیبی کہ مجھے آپ سے کچھ ملتا ہے یا نہیں، میں بہر حال آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔''

درویش آگ بگولا ہو گیا۔ ''او سگِ دنیا، لالچی انسان! تیری سمجھ میں میری باتیں کیوں نہیں آ رہی ہیں۔ کیا میں سمجھانے میں ناکام رہا ہوں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں سگِ دنیا بھی ہوں اور لالچی انسان بھی مگر میں رہوں گا آپ کے ساتھ ہی۔''

درویش نے چڑ کر کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو آ میرے ساتھ چل، میں بھی تیری ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگائے لیتا ہوں۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آپ نے فرمایا۔ ''بسم اللہ، میں تیار ہوں۔''

درویش پہلے تو تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ آپ نے بھی اسی کی طرح چلنا شروع کر دیا پھر درویش نے بھاگنا شروع کر دیا آپ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگے۔ درویش بھاگتے بھاگتے ایک مکان میں گھس گیا۔ خواجہ باقی نے بڑی ہمت کی کہ مکان میں داخل ہو جائیں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی اور دروازے پر بیٹھ کر درویش کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

بڑی دیر ہو گئی مگر درویش باہر نہیں نکلا۔ خواجہ باقی کو شبہ گزرا کہ کہیں یہ مکان درویش کے کسی رشتے دار کا تو نہیں کیونکہ اگر یہ کسی غیر کا گھر ہوتا تو درویش کو دھکے دے کر نکالا جا چکا ہوتا۔ خواجہ باقی نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ خواجہ باقی نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک جوان مشٹنڈا نمودار ہوا اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟''

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ''تقریباً ایک گھنٹا پہلے اس مکان میں ایک درویش داخل ہوا تھا۔ میں اس کے انتظار میں باہر کھڑا ہوں۔''

جوان نے طنزاً کہا۔ ''بھائی کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی درویش نہیں آیا اور پھر وہ یہاں کیا لینے آئے گا۔ کہاں وہ درویش اور کہاں یہ میرا گھر۔ اس کا میرا گھر سے کیا تعلق۔''

خواجہ باقی کو بڑا دکھ ہوا کہ درویش انہیں دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہی درویش کھڑا ہنس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بس دیکھ لیا تیرا عشق، تیری طلب صادق، میں نے تو تیرا ساتھ چھوڑا نہیں اور تو ہے کہ میرے بغیر واپس جا رہا ہے۔''

خواجہ باقی تیزی سے درویش کی طرف مڑے اور فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ انہیں دل کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ ''خواجہ باقی! درویش کو پہچاننے کی کوشش کر، یہ تجھے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔''

یہ درویش کے پاس گئے اور کہا۔ ''بابا! مجھے پریشان نہ کیجیے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

درویش نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ''ہوں..... تو میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑے گا۔ میں پتھر مار مار کر تیری جان لے لوں گا۔ آخر تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔''

خواجہ باقی نے درویش کی ایک نہ سنی اور اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ درویش نے پتھر اٹھا کر مارنا شروع کر دیے۔ خواجہ باقی کا سر اور جسم کے مختلف حصے لہولہان ہو گئے۔ درویش انہیں زخمی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ درویش بھاگ کر ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلے گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ درویش چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے خواجہ باقی کو دیکھتے ہی کہا۔ ''خواجہ محمد باقی آگے آؤ میرے قریب۔''

خواجہ باقی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن وہ درویش کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

درویش نے چوکی چھوڑ دی اور خواجہ باقی کو حکم دیا۔ ''باقی باللہ' چوکی پر بیٹھ جاؤ۔''

خواجہ باقی نے پوچھا۔ ''باقی باللہ..... یہ کیا فرمایا آپ نے۔ باقی باللہ کون؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''تو ہے باقی باللہ۔ میں نے تجھ کو خواجہ باقی باللہ کر دیا۔''

خواجہ باقی کو درویش کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہا۔ ''بابا! کہاں تو آپ مجھ سے بیزار تھے اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھے باقی باللہ کا لقب مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

درویش نے کہا۔ ''خواجہ باقی! جب تو میرے پاس آیا تھا' میں نے تجھے پہچان لیا تھا لیکن میں تجھ کو پختہ کرنا چاہتا تھا۔ تیرے ایمان اور تیرے یقین کو ملحدانہ کافرانہ باتوں سے پرکھنا چاہتا تھا۔ تیری طلب صادق کی آزمائش مقصود تھی پھر میں نے تجھے گالیاں دیں اور پتھروں سے لہولہان کر دیا اور اس طرح میں تیرے پائے ثبات کی استقامت دیکھ رہا تھا۔ تو سارے ہی امتحانات سے بخیر و خوبی گزر گیا اور اس کا مستحق ٹھہرا کہ میں تجھے باقی باللہ کے لقب سے نواز دوں۔''

خواجہ نے وفور جذبات میں کہا۔ ''میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

درویش نے کہا۔ ''شکریہ میرا نہیں اپنے رب کا ادا کر۔''

خواجہ باقی باللہ درویش کے اصرار پر چوکی پر بیٹھ گئے۔ درویش نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر خواجہ باقی باللہ کو دعائیں دیں اور پھر جھونپڑی کے کسی گوشے سے مٹھائی لا کر خواجہ باقی کا منہ میٹھا کیا۔ اس کے بعد درویش نے انہیں اپنی صحبت میں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ باقی کو چند دنوں میں ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ درویش کوئی معمولی شخص نہیں ہے اس نے ریاضت اور مجاہدے کی ایسی تربیت دی کہ خواجہ باقی کا باطن منور ہوگیا۔ ایک دن درویش نے ان سے کہہ دیا کہ ''بابا باقی باللہ! میری ذات سے تمہیں جو فیضان حاصل ہو رہا ہے اس میں تمہاری اماں کی دعاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔''

خواجہ باقی نے پوچھا۔ ''میری ماں کی دعاؤں سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''باقی باللہ! تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے اور دن رات تیرے حق میں یہ دعا کر رہی ہے کہ خدا تجھ کو تیرے مقصد کی حصولیابی میں جلد از جلد کامیاب کرے۔'' خواجہ باقی باللہ کو رونا آ گیا۔ انہیں اپنی ماں کی یاد آ گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد درویش نے آپ کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ لاہور واپس پہنچے اور لوگوں میں گھل مل گئے۔ انہیں اپنی ذات میں نمایاں تغیر محسوس ہونے لگا تھا پھر یہ باتیں دوسرے بھی محسوس کرنے لگے۔

ایک مسجد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو شخص محو نماز تھا اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر کسی کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر اس واہمے کو دل سے نکال دیا کہ ان کے سامنے جو شخص بھی ہوگا اس کی پشت سامنے ہوگی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس شخص نے پھر یہی کیفیت محسوس کی۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنے سامنے کھڑے ہوئے خواجہ باقی باللہ پر پڑیں اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ خواجہ باقی باللہ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ قبلہ رو تھا مگر پشت سے وہ کس طرح دیکھ رہے تھے۔ اس کیفیت کو اس نے دیکھ تو لیا مگر بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ناقابل فہم بات اس کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

نماز پڑھ چکنے کے بعد یہ شخص خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ سے اس حد تک واقف ہوں کہ آپ غیر ملکی ہیں۔ کیا ہیں، کون ہیں میں نہیں جانتا مگر کچھ ایسی بات بھی ہے جو میرے لیے معما ہے اور میں اگر چاہوں بھی تو اس کو پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا نام خواجہ محمد باقی ہے، سمرقند میرا وطن ہے۔ میں خود کابل میں پیدا ہوا۔ تلاشِ حق میں سیاحت کر رہا ہوں۔ مردِ کامل کی تلاش مجھے ادھر ادھر بھگائے پھر رہی ہے، اس کے علاوہ کیا جاننے کی خواہش ہے بیان کرو تاکہ اس کو بھی بیان کر دیا جائے۔''

اس شخص نے رک رک کر کہا۔ ''خواجہ محترم! جب آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوچھوں، اپنا مفہوم کس طرح واضح کروں؟''

آپ نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا۔ ''اے شخص! جو کچھ تو نے دیکھا اس کو اپنے تک ہی رکھ۔ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کیا پوچھنے والا ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ سے میں کیا پوچھنے والا ہوں تو آپ اس کا تسلی بخش جواب دے کر میری پریشانی دور کر دیجیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! ریاضت اور مجاہدے کے بعد اگر خدا کی مہربانی شاملِ حال ہو جائے تو ایسا وقت آ جاتا ہے کہ انسانی سینہ جوشِ انوار سے ابلنے لگتا ہے اور یہ نور ہر بُنِ مو سے ابلنے، چھلکنے لگتا ہے جس سے دیکھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کو دیکھا جا رہا ہے۔''

وہ شخص خاموش ہوگیا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''کیا تو نماز کے لیے مسجد چلے گا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ضرور چلوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر آ میرے ساتھ چل۔'' یہ دونوں ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آج وہ آپ کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ نماز پڑھنے کے دوران اس شخص نے آپ کے سینے سے نکلتی ہوئی ایسی آواز سنی کہ کانپ گیا۔ دل دہل گیا، بہ مشکل نماز ادا کی اور آپ سے پہلے ہی مسجد سے نکل گیا۔

جب آپ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو اس شخص کو منتظر پایا۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، کس کا انتظار ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آج میں کل سے زیادہ پریشان ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں، خیریت تو ہے، وجہ؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس نے جواب دیا۔ ''محترم خواجہ! کل تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ پشت سے مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن آج میں نے آپ کے اندر سے کچھ عجیب وغریب آوازیں سنیں، ایسی آوازیں کہ میرا دل دہل گیا۔ آخر یہ کیا ہے..... آپ کیا ہیں اور یہ سب آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آرہا ہے؟''

آپ نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد فرمایا۔ ''اے شخص، کیا میں نے یہ بات کل ہی نہیں بتادی تھی کہ میرا سینہ جوشِ انوار سے ابل رہا ہے۔ یہ ابال جو آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہی تو نے سن لی اور اس سے بلاوجہ پریشان ہو رہا ہے۔''

وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔ ''محترم خواجہ! آپ مجھے شرفِ بیعت سے سرفراز فرمائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس لائق نہیں ہوں۔''

اس شخص نے مزید اصرار کیا مگر آپ انکار ہی کرتے رہے اور بالآخر آپ نے لاہور کو چھوڑ دیا اور ماوراءالنہر واپس چلے گئے۔ وہاں ماں بھی کابل سے پہنچ چکی تھیں۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور آپ ماں کے سینے سے لگے خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔

آپ کو یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی بزرگ کے دستِ حق کی ظاہری بیعت بہت ضروری ہے اس کے بغیر منزل پانا مشکل ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بہت سارے بزرگوں کی بابت سوچا لیکن کسی طرف طبیعت نہیں راغب ہوئی۔ آخر اس عہد کے نامور ترین صوفی خواجہ امکنگی پر نظر انتخاب پڑی اور انہیں شدت سے ایسا لگا کہ خواجہ موصوف انہیں بلا رہے ہیں۔ آپ نے عالم تصور ہی میں جواب دیا۔ ''پیر مرشد! میں آیا۔ آپ میرا انتظار کیجیے۔''

ایک دن آپ علی الصباح اٹھے اور نماز فجر ادا کر کے خواجہ امکنگی کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ وہاں خواجہ امکنگی پہلے ہی سے آپ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی خانقاہ سے باہر نکلے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آؤ خواجہ باقی باللہ۔ اب تک کہاں رہے؟''

خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔ ''جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میں باقی باللہ ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں ابھی تک کہاں تھا؟''

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ''باقی باللہ! میں نے جو پوچھا ہے اس کو تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

خواجہ باقی باللہ نے اپنی پوری داستان انہیں سنا دی اور کہا۔ ''بس اس درویش نے میری کایا پلٹ دی اور اب میں جو کچھ ہوں اسی درویش کا فیض ہے۔''

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ''ہاں وہ شخص تیری تربیت کی خاطر ادھر بھیجا گیا تھا، اس نے اپنا فرض بہت اچھی طرح پورا کیا۔''

خواجہ باقی باللہ نے عرض کیا۔ ''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ کو کسی دست حق پرست کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میں بیکار محض ہوں۔''

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ''خواجہ باقی باللہ! تو میری خانقاہ میں شب و روز رہ سکتا ہے۔ تو جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے مل جائے گا انشاءاللہ۔'' خواجہ باقی باللہ اسی وقت خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

خواجہ امکنگی نے خواجہ باقی باللہ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا..... اب تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ شب و روز خواجہ امکنگی کے پاس رہتے رہے۔ آخر ایک دن خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ''پیر و مرشد! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اب مجھے کہاں رہنا چاہیے؟''

خواجہ امکنگی نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''فرزندِ من! تو ہندوستان واپس جا، وہاں بڑی ضرورت ہے۔ خدا تیری مدد کرے گا۔''

خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ''مجھے کب روانہ ہو جانا چاہیے؟''

خواجہ امکنگی نے جواب دیا۔ ''میں تو کہتا ہوں تو اسی وقت ہندوستان چلا جا ویسے تیری مرضی، میں حکماً یا جبراً تجھے نہیں بھیج رہا ہوں۔''

خواجہ باقی باللہ یہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ماں نے پوچھا۔ ''کہو بیٹا! کیا خبر لائے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ماں! میں ہندوستان واپس جا رہا ہوں کیونکہ.....''

ماں نے بات کاٹ دی۔ پوچھا۔ ''میں پوچھ رہی ہوں کہ تو ہندوستان کیوں جا رہا ہے، وہاں تجھ کو کس نے بھیجا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ماں یہ میرے پیر و مرشد کا حکم ہے، ماں میں سب کچھ ٹال سکتا ہوں لیکن اپنے پیر و مرشد کا کہنا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نہیں ٹال سکتا۔''

ماں رونے لگیں، بولیں۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ایک بار پھر تجھ سے جدا ہو جاؤں گی۔ افسوس کہ میں تجھ کو روک بھی نہیں سکتی کیونکہ تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے نہیں میرے لیے مانگا ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''ماں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! میں نے خدا سے یہ دعا مانگ رکھی ہے کہ تو میرے بیٹے محمد باقی کے لیے وہی کر، جو اس کے حق میں بہتر ہو کیونکہ میں اس میں خوش ہوں، جو میرے بیٹے کے لیے بہتر ہو۔''

ماں کے پاس سے رخصت ہو کر خواجہ باقی باللہ دوبارہ اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے اپنی ماں سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اب جو میں نے خود کو ٹٹولا تو میں نے اپنے آپ کو اس لائق نہیں پایا، اب میں اس پس و پیش میں ہوں کہ ہندوستان جاؤں یا نہ جاؤں۔''

خواجہ امکنگی نے فرمایا ''یہ وسوسۂ شیطان ہے۔ تمہیں ہندوستان جانا ہے کیونکہ یہ حکم ربی ہے۔ تم اس سلسلے میں استخارہ دیکھ لو، خدا کی مرضی واضح ہو جائے گی۔''

خواجہ باقی باللہ نے اپنے پیر کے مشورے پر استخارہ دیکھا۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا ایک طوطا ان کے سامنے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا اگر یہ طوطا شاخ سے اتر کر ان کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جائے گا تو میں اس کا یہ مفہوم لوں گا کہ ہندوستان کا سفر خدا کی مشیت ہے۔ ابھی آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ طوطا اڑا اور آپ کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنا لعاب دہن طوطے کی چونچ میں ڈال دیا اور طوطے نے آپ کے منہ میں شکر ڈال دی، یہ شکر وہ کہاں سے اور کس طرح لایا تھا، کچھ پتا نہ تھا۔

آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ طوطا خالص ہندوستانی پرندہ ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ میرا ہند جانا حکم ربی ہے، لعاب دہن کا یہ مطلب ہے کہ میں ہندیوں کو اپنی باتوں سے حق کی طرف لے آؤں گا اور طوطے کے شکر دینے کا یہ مطلب ہے ہندیوں کی طرف سے مجھ کو جو جواب ملے گا وہ بہت خوشگوار ہوگا۔

خواجہ باقی باللہ نے اپنا خواب خواجہ امکنگی سے بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''عزیز من! طوطا خالص ہندی پرندہ ہے، ہند میں کوئی شخص تجھ سے روحانی فیض حاصل کرے گا اور تو اس سے فیض یاب ہوگا۔''

آپ نے اسی وقت سفر کی تیاری شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد آپ کابل پہنچے یہ آپ کی جائے مولد اور وطن تھا، کچھ دن کابل میں رہ کر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور میں قیام فرمایا۔ لاہور کے علما اور فضلاء نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا، آپ نے اس شہر میں ایک سال قیام فرمایا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ اس دوران آپ نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ آپ سے پہلے آپ کی شہرت دہلی پہنچ چکی تھی۔

آپ جس قافلے میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک شخص پیدل چل رہا تھا۔ آپ کچھ دور تک گھوڑے پر سوار رہے لیکن پھر اس پر سے اتر پڑے اور اس شخص کو اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔

اس نے کہا۔ ''میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ گھوڑے پر تو میں بیٹھوں اور آپ پیدل چلیں۔ مجھے معاف رکھیے اور مجھ رحم کیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ حکم ربی ہے۔ تو اس پر بیٹھ جا..... میں گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔''

اس شخص نے شرما کر عرض کیا۔ ''حضرت! میں یہ جرأت کس طرح کروں، لوگ طعنے دے، دے کر مجھ کو ہلاک کر دیں گے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا حل نکال لیا ہے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میں اپنے چہرے پر چادر ڈال لوں گا اور تیرے گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔ اس طرح کوئی مجھ کو پہچان بھی نہ سکے گا۔''

آپ نے اس شخص کو اتنا مجبور کیا کہ وہ آپ کی بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے اس شخص کو اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا اور اپنے منہ پر چادر ڈال کر خود پیدل چلنے لگے۔ جب منزل قریب آنے لگی تو آپ نے اس شخص کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس پر خود سوار ہو گئے۔ منزل پر قیام کیا اور اس شخص سے کہا۔ ''ایسا میں نے اس لیے کیا ہے کہ قافلے کے لوگ یہ نہ جان سکیں کہ میں نے پیدل سفر کیا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

منزل پر قیام کے بعد جب پھر قافلہ روانہ ہوا تو آپ نے وہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ دہلی میں داخل ہوگئے۔ یہاں آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ قیام کہاں فرمائیں۔ آپ نے دریائے جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد کی عظیم الشان مسجد کو اپنے لیے پسند فرمایا یہ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔

آپ کی شہرت پروقار انداز میں اس طرح پھیلی جیسے سورج کی کرنیں اس کے طلوع ہونے کے بعد چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ یہ شہرت چھوٹی بستیوں سے بڑی بستیوں تک اور وہاں سے امراء اور شاہی محلات میں داخل ہوگئی۔ یہ دور اکبری کا واقعہ ہے۔ اکبری دور کا وہ حصہ جس میں شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی۔ مغل فرماں روا اکبر کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ بادشاہ خود اپنے عہد کا مجتہد ہے اور اس کو کسی سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں۔ اکبر نے ملحدانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔

آپ نے اپنے معتقدوں، نیازمندوں اور مریدوں کو شریعت کی پابندی اور سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی بار بار نصیحت فرمائی اور انہیں پراثر تحریروں سے اسلامی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ آپ کے نیازمندوں اور عقیدت مندوں میں جو لوگ شامل ہوئے تھے ان میں شیخ فرید بخاری، عبدالرحیم خانخاناں، مرزا قلیچ خان صدر جہان جیسے امرائے شاہی بھی شامل تھے۔

آپ اس عہد کے علماء اور دین دامنگی لوگوں کو سنت نبوی ﷺ اور شریعت مصطفوی ﷺ کی پابندی پر آمادہ اور مجبور کرتے رہتے تھے، اپنے مریدوں کو مرید کرنے سے پہلے شریعت کے احیا اور تبلیغ پر بہت زیادہ زور دیتے تھے، اور کسی کو تو بڑے اصرار اور طویل آزمائش کے بعد مرید کرتے تھے۔

1008ھ بمطابق 1599ء میں خواجہ باقی کی خدمت میں سرہند سے ایک ایسا شخص دہلی آیا جس کے چہرے اور باتوں سے آدمی مرعوب اور دم بخود رہ جاتا تھا۔ یہ شخص ''حج بیت اللہ'' کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ دہلی میں قیام کیا تو کسی نے اس شخص سے خواجہ باقی باللہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ بزرگ شریعت محمدی ﷺ اور سنت نبوی ﷺ کے زبردست عامل اور مبلغ ہیں، یہ صاحب اشتیاق ملاقات میں قلعہ فیروز آباد کی مسجد میں خواجہ باقی کے پاس پہنچ گئے اور اجازت لیے بغیر اندر چلے گئے۔ اس وقت خواجہ باقی باللہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔

آنے والا ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد باقی باللہ نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پوچھا۔ ''کہو، کہاں سے آنا ہوا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب! میں سرہند سے آیا ہوں اور ''حج بیت اللہ'' کو جا رہا ہوں، میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا چیز تھی جو مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی۔''

خواجہ باقی باللہ نے کہا۔ ''بیٹھو، ہم آپس میں تبادلہ خیال کیوں نہ کریں۔''

یہ شخص آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اتنے گھل مل گئے کہ جیسے ازل سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ سرہند سے آنے والا شخص آپ سے درخواست کر رہا تھا کہ ''آپ مجھے بیعت فرمائیں۔''

خواجہ باقی باللہ نے فرمایا۔ ''ایک شرط پر مرید کروں گا۔''

سرہندی نے پوچھا۔ ''کون سی شرط؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے بعد تم میری اولاد کی تربیت کرو گے۔''

سرہندی نے جواب دیا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تب پھر آجاؤ، بسم اللہ، دیر کس بات کی ہے۔''

آپ نے اس سرہندی کو اپنا مرید کرلیا بعد میں یہ سرہندی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ ''میں نے استخارے میں جس ہندی طوطے کو دیکھا تھا اور جس کی چونچ میں، میں نے لعاب دہن ڈالا تھا اور طوطے نے میرے منہ میں شکر ڈال دی تھی وہ شیخ احمد تم ہو۔ تم مجھ سے روحانی تربیت حاصل کرو گے اور میری اولاد تم سے روحانی فیض حاصل کرے گی۔''

اس کے بعد شیخ احمد سرہندی حج کرنے چلے گئے۔

وہ انوار کا سیل جو سینے میں موجزن تھا اور ہر بن مو سے ابلنے لگا تھا مرتکز ہو کر آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ آپ اپنی نظریں نیچی رکھتے اور کسی شے یا شخص کو بغور نہ دیکھتے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ چیز یا شخص اس کا متحمل نہ ہو سکے گا۔

آپ کی خانقاہ میں آنے جانے والوں کا ہجوم رہنے لگا لیکن ان میں ملاقات برسی سے ہوتی تھی۔۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک دن ایک فوجی سردار آپ کے پاس آیا۔ دروازے پر آپ کا خادم کھڑا تھا۔ فوجی سردار نے خادم سے پوچھا۔ ''کیا خواجہ صاحب اندر موجود ہیں؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''ہاں جناب موجود ہیں، جایئے۔ مل لیجیے جا کر۔''

فوجی نے اپنے گھوڑے کی لگام خادم کو دی اور خود اندر چلا گیا۔ خواجہ باقی اس وقت اندر موجود نہیں تھے۔ کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فوجی اندر بیٹھ کر آپ کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد آپ واپس آئے اور اپنے خادم کو اس حال میں کھڑا دیکھا کہ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی اور گھوڑا بار بار دم ہلا ہلا کر پاؤں پٹخ رہا تھا، آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''یہ کس کا گھوڑا ہے؟''

خادم نے بے اختیار آپ کی طرف دیکھا آپ بھی اس سے پوری طرح متوجہ تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو خادم تڑپ گیا، گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔ گریبان چاک کر ڈالا اور لباس کو تار تار کر کے جسم سے دور کر دیا۔ آپ نے گھبرا کر پوچھا ''تو یہ کیا کر رہا ہے؟ ہوش میں آ۔''

خادم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور بار بار یہی رٹ لگائے رکھی۔ ''ہائے مار دیا۔ ہائے قتل کر دیا۔ ہائے میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟''

آپ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''اے شخص ہوش میں آ، تجھ کو میری عدم موجودگی میں محتاط رہنا تھا، مجھ سے نظریں نہیں ملانا چاہیے تھیں۔''

خادم نے ناچنا شروع کر دیا۔ خانقاہ کے لوگوں نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یہ شخص ایک طرف چلا گیا۔ آپ نے اس کی تلاش میں آدمی چھوڑے مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس کی کئی دن تک تلاش جاری رہی مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا اور وہ ایسا لاپتا ہوا کہ پھر کہیں نظر ہی نہ آیا اور ہمیشہ کے لیے ناپید ہو گیا۔ آپ کو اس کی گمشدگی کا دکھ ہوا۔

کئی روز بعد جمعے کے دن آپ نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت بھی سیلِ نو۔ آنکھوں میں مرتکز تھا اور آپ قوت میں پہاڑ ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اس وقت امام خطبہ شروع کر چکا تھا۔ آپ اگلی صف میں چلے گئے۔ امام نے خطبہ پڑھتے پڑھتے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے بھی اسے دیکھا۔ امام کی حالت غیر ہو گئی وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا اور چیخنے چلانے لگا۔

کچھ دیر لوگوں نے انتظار کیا کہ امام ہوش میں آئے تو بقیہ خطبہ پورا کرے مگر اس کو ہوش نہ آیا۔ آخر نمازیوں نے ایک دوسرا خطیب کھڑا کر دیا۔ اس نے خطبہ پڑھا اس کے بعد نماز ادا کی گئی۔

آپ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کئی گھنٹے بعد جب بستر پر آئے تو انہوں نے اپنے بستر پر ایک بلی کو سوئے ہوئے دیکھا۔ آپ نے یہ سوچ کر اس کو نہیں بیدار کیا کہ وہ آپ ہی بیدار ہو جائے تو بہتر ہے مگر کافی دیر تک انتظار کے بعد جب بلی اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تو آپ بستر سے الگ سردی میں کھڑے رہے۔ فجر کی اذان کے بعد بلی چلی گئی لیکن آپ بستر میں جانے کے بجائے مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نمازِ فجر ادا کی۔ خواجہ باقی اپنی ذات سے جانور تک کو اذیت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ اپنے معتقدین میں بیٹھے کسی مسئلے پر غور و خوض فرما رہے تھے کہ چند مہمان اندر داخل ہوئے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے، یہ گرمی کے دن تھے۔ آپ نے مہمانوں کو خانقاہ میں ٹھہرایا۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ مہمان بھوکے تھے آپ کچھ دیر تو مہمانوں سے باتیں کرتے رہے مگر پھر مہمانوں نے کھانے کی خواہش کی۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''بول، کھانے کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ کہاں سے کیا جائے؟''

خادم نے عرض کیا۔ ''جنابِ والا! یہیں پڑوس میں ایک نانبائی رہتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں؟''

آپ نے خادم کو اجازت دے دی۔ ''جا، چند روٹیاں اور نہاری لے آ جو معاوضہ مانگے گا دے، دیا جائے گا۔''

خادم فوراً بھاگا بھاگا نان بائی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''بھائی! ہمارے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاں چند مہمان آ گئے ہیں اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے پیر و مرشد نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ چند روٹیاں اور نہاری لے آؤں۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی اگر نہاری اور روٹیوں کا انتظام کر دے گا۔''

نانبائی نے پوچھا۔ ''میں یہ چیزیں ضرور فراہم کیے دیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارے پیر و مرشد مجھ کو اس کا معاوضہ کیا دیں گے؟''

خادم نے عرض کیا۔ ''جو مانگو گے، دے دیں گے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نانبائی نے کہا۔ ''اگر میں تمہارے پیرومرشد سے دہلی کی حکومت مانگوں، تو؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا دے سکیں گے اور کیا نہیں دے سکیں گے۔ مگر انہوں نے مجھ سے کہا یہی تھا کہ تم نہاری اور روٹیوں کے معاوضے میں جو چیز مانگو گے تمہیں دی جائے گی۔''

نانبائی نے کہا۔ ''لیکن تمہاری بات پر کس طرح یقین کرلوں، میں تو یہ وعدہ خواجہ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

خادم نے کہا۔ ''تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تم نہاری اور روٹیاں لے کر میرے ساتھ چلو، میں اگر یہی بات ان کی زبان سے کہلوا دوں تو تم کھانے کی چیزیں انہیں دے دینا لیکن اگر وہ حیف بیف کریں تو تمہیں اس کا اختیار ہوگا کہ کھانے کا سامان انہیں دو یا نہ دو۔''

نانبائی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، تمہاری تجویز مناسب ہے۔''

نانبائی نے روٹیاں تیار کیں اور پکی ہوئی نہاری میں سے کئی آدمیوں کے لیے نہاری نکالی اور دونوں چیزیں لے کر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''کیا کھانے کا سامان مل گیا؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد مل گیا مگر کھانے کے ساتھ ہی نانبائی بھی آ گیا وہ اس کے معاوضے میں معلوم نہیں کیا لینا چاہتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کو بٹھاؤ ابھی اس کی بھی سن لوں گا۔''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''جناب! میں اس شرط پر کھانے کا سامان لے کر آیا ہوں کہ آپ اس کا وہ معاوضہ ادا کریں گے جس کا میں مطالبہ کروں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے یہ وعدہ کیا تھا اور اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔''

نانبائی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ گئی۔ پوچھا۔ ''کیا سچ؟ میں جو معاوضہ مانگوں گا ملے گا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔''

نانبائی نے روٹیاں اور نہاری آپ کے حوالے کردی اور سرشار لہجے میں بولا۔ ''بخدا میں آپ سے ایک ایسی چیز مانگوں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی اور پھر میں دیکھوں گا کہ خواجہ باقی باللہ اور ایک نانبائی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔''

خواجہ باقی باللہ نے اپنے مہمانوں کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ ان سب نے اس لذیز کھانے کو بڑے شوق سے کھایا۔ نانبائی ایک طرف بیٹھ گیا اور مہمانوں کی فراغت کا منتظر رہا۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے نانبائی کو اپنے پاس بلوایا اور پوچھا۔ ''ہاں تو بتا کہ تجھ کو کھانے کے معاوضہ میں کیا دے دیا جائے؟''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''کیا اجازت ہے کہ میں جو چاہوں مانگ لوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بات کو طول نہ دے، جو کچھ مانگنا ہے مانگ میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔''

نانبائی آپ کی شکل دیکھنے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد بولا۔ ''آپ مجھ کو بھی اپنے جیسا بنا دیجیے۔''

آپ پریشان ہو گئے اور نانبائی سے کہا۔ ''بھائی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔''

نانبائی نے شکایتاً کہا۔ ''واہ جناب! میں نے جو مانگ لیا، مانگ لیا۔ میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے جو کچھ بھی تجھے دینے کا وعدہ کیا تھا، اس پر اب بھی قائم ہوں اور قائم رہوں گا لیکن میری خواہش ہے کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔''

نانبائی نے عرض کیا۔ ''میں کچھ اور کیوں مانگ لوں، آخر اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس میں مضائقہ یہ ہے کہ جو کچھ تو مانگ رہا ہے وہ حیثیت سے زیادہ ہے۔ جس برتن میں جتنی سمائی ہوتی ہے اگر اس میں اس سے زیادہ بھر دیا جائے تو اس کے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ یا تو زیادہ شے چھلک کر بہہ جائے گی یا برتن ہی ٹوٹ جائے گا۔''

نانبائی نے کہا۔ ''جناب آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں جو کچھ مانگ رہا ہوں، مجھ کو وہی ملنا چاہیے ورنہ جانے دیجیے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے، میں صبر کرلوں گا۔''

آپ نے سکوت اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد فرمایا۔ ''افسوس کہ میں تیرا دشمن نہیں ہوں لیکن تو بلند ہے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کروں گا۔"

نانبائی بے حد خوش تھا، بولا۔ "مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

خواجہ باقی باللہ حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔ "میرے پیچھے پیچھے آجا۔"

نانبائی ان کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہوگیا۔ خادم اور مہمان دونوں کی تکرار اور بحث مباحثے کو بڑے غور سے سنتے رہے تھے، اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دیکھیے ہوتا کیا ہے؟

کچھ دیر بعد حجرے کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے دو خواجہ باقی باللہ نمودار ہوئے، شکل صورت، لباس، وضع قطع کسی بات میں سرمو فرق نہ تھا۔ ہاں بس چلنے میں فرق تھا۔ انداز میں فرق تھا۔ ایک تو ہوشیار تھا دوسرا مدہوش اور بے خود تھا۔ وہ پاؤں کہیں رکھتا مگر پڑتا کہیں تھا۔ دوسروں نے انہیں اس طرح پہچانا کہ جو ہوشیار تھا وہ خواجہ باقی باللہ تھے اور جو مدہوش اور بے خود تھا وہ نانبائی تھا۔

نانبائی باہر آتے ہی ڈھیر ہوگیا۔ خواجہ باقی باللہ نے اس کے سرہانے کھڑے ہوکر فرمایا۔ "اے شخص! کیا میں نے تجھ کو آگاہ نہیں کردیا تھا کہ برتن میں اس کی سمائی سے زیادہ بھر دیا جائے وہ چھلک جاتا ہے یا برتن ٹوٹ جاتا ہے چنانچہ تو چھلک بھی رہا ہے اور ٹوٹ جانے کا بھی احتمال ہے۔"

مہمانوں نے کہا۔ "خواجہ! اس کے لیے کچھ کیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اب میں کیا کرسکتا ہوں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اللہ اس پر رحم کرے۔"

نانبائی کی حالت سکرو ہے ہوشی تین دن قائم رہی۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اتنی شہرت ہوئی کہ دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تین دن بعد نانبائی چل بسا، برتن ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

آپ نے دو شادیاں کیں، دونوں سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے بڑے لڑکے کا نام خواجہ عبیداللہ رکھا جو بعد میں خواجہ کلاں کہلائے، دوسرے کا نام خواجہ عبداللہ رکھا جو خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ اگر دل کو اطمینان، یک سوئی اور حضور قلب سے ہمکنار کرنا ہے تو بقدر ضرورت پاکیزہ اور حلال کھانا چاہیے، فضول اور بیہودہ بات چیت سے بچا جائے اور دنیا کے طالبوں سے دوری اختیار کی جائے۔

کسی نے پوچھا۔ "اگر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ذکر میں گزار دوں تو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تو ہزار سال ذکر کرتا رہے مگر تیرا کھانا حلال مال کا نہ ہو تو یاد رکھ تیرا روحانی مقصد کبھی بھی حاصل نہ ہوگا۔"

طبیعت میں سادگی اتنی تھی کہ کتنا ہی ناپسندیدہ کھانا مسلسل کھلایا جاتا آپ کو کھانے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا اور کھاتے رہتے۔ یہی حال لباس کا تھا۔ جیسا مل جاتا پہن لیتے۔ ہاں بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔

ایک دن آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کو جمع کرکے فرمایا۔ "لوگو! عجیب بات ہے کہ میں نے مراقبے میں دیکھا کہ سلسلہ نقشبندیہ کا کوئی نامی گرامی شخص رحلت کرگیا ہے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "کیا مراقبے میں آپ نے اس بزرگ کی صورت دیکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کی صورت بھی دیکھی ہے لیکن اس کو پہچان نہیں سکا۔"

اسی کے دن 25 جمادی الاخریٰ 1012ھ کو عصر کے بعد کوٹلہ فیروز شاہ میں آپ ..... بلند آواز میں اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوگئے۔ اور دو تین گھڑی کے بعد آپ اسی عالم میں عالم قدس چلے گئے۔ آپ کا مزار قبرستان قدم شریف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اب یہ جگہ درگاہ خواجہ باقی باللہؒ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے وفات سے پہلے ہی یہ وصیت کردی تھی کہ آپ کے مزار پر چھت، گنبد یا قبر نہ تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔

آپ کی تاریخ وفات۔ "بحر معرفت بود" 1012ھ اور "نقشبند وقت" 1012ھ سے نکلتی ہے۔

ماخذات

سفینتہ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ طبقات الکبریٰ علامہ شعرانی تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار انوار اولیاء رئیس احمد جعفری خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.urdutube.net
http://www.bookstube.net

یہ سایہ ہمسایہ

ڈاکٹر ساجد امجد

بزرگوں کا قول ہے کہ جہاں دیا نہیں جلتا وہاں بلائیں بسیرا کرتی ہیں مگر یہاں تو گھر کا چراغ جلتے ہی دامن میں ایسی آگ لگی کہ سارا جیون ہی سلگتی . . . راکھ بن کر رہ گیا . . . اچھے پڑوسی بے شک خدا کا تحفہ ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس صورت حال ہو تو حالات کے ساتھ ساتھ حیات کو بھی تباہ کر دیتے ہیں جیسا کہ یہاں ہوا۔

بدنظر کی طلاطم خیز چالوں کا افسوس ناک انجام

''پڑوس کا گھر آباد نہ ہو اس میں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو تو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔''

نسیمہ جب سے بیاہ کر آئی تھی اس کی ماں کے کہے ہوئے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ اس کا پڑوس جانے کب سے غیر آباد تھا۔ وہ اس مکان کی خاموش دیوار کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی پھر وہ ایک دن جھت پر گئی تھی۔ پڑوس کی دیوار اب بھی اس کا منہ چڑا رہی تھی جو اس کے قد سے کہیں اونچی تھی۔ اسے تجسس ہو رہا تھا کہ وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکے۔ دیکھے تو سہی جس گھر میں لوگ نہیں بستے وہ گھر کیسے لگتے ہیں۔ اس نے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید دیوار پر چڑھنے کے لیے کوئی سہارا مل جائے۔ اسے ایک اسٹول نظر آ گیا جس پر وہ بہ آسانی چڑھ سکتی تھی۔ پہلے اس نے اسٹول کو اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھ لیا کہ یہ اس کا بوجھ اٹھا بھی سکتا ہے یا نہیں اور پھر اسے دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا اور کسی نہ کسی طرح اسٹول پر چڑھ گئی۔ منوں مٹی تھی جو ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی آئے گا اور اس کا گلا دبا دے گا۔ وہ گھبرا کر اسٹول سے اتر گئی اور جلدی جلدی چھت سے نیچے اتر آئی۔

اسے بہت دیر تک ماں کا کہا یاد آتا رہا کہ جہاں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ کہیں خالی گھر کی نحوست میرے گھر کا رخ نہ کر لے۔ یہ سوچ کر تو اس کا دم ہی نکل گیا تھا۔ دن کا وقت تھا لیکن وہ اس طرح ڈر رہی تھی جیسے رات ہو گئی ہو اور اس کا شوہر گھر نہ آیا ہو۔ اسے اپنے شوہر پر غصہ آ رہا تھا۔ شادی کے صرف چار مہینے بعد ہی اسے جانے کیا سوجھی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے الگ ہو کر اسے یہاں لے آیا تھا۔ گھر بھی ایسا منتخب کیا تھا جس کا پڑوس خالی پڑا تھا۔ میں اس کے ماں باپ کے ساتھ رہ رہی تھی تو کم از کم تنہائی کا احساس تو نہ ہوتا تھا۔ پڑوس خالی بھی ہوتا تو کوئی مجھے تسلی دینے والا تو ہوتا۔ اسے قرآن کی جتنی سورتیں زبانی یاد تھیں، دل ہی دل میں انہیں پڑھتی رہی۔ دل کو کچھ قرار آیا تو وہ کمرے سے باہر نکلی لیکن اس وقت تک فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے اس سلسلے میں بات ضرور کرے گی۔

اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اب شام ہونے لگی تھی اور اس کا شوہر گھر نہیں لوٹا تھا۔ عام طور پر وہ شام ہونے سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔ اب اس کا خوف تو دور ہو گیا تھا لیکن وہ پڑوس کے متعلق بات کرنے کے لیے ... بے صبری ہو رہی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ابھی شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے ہیں اور اس نے اسے کس گھر میں لا کر ڈال دیا ہے۔ ایک خیال تو یہ بھی آیا کہ وہ گھر کو تالا لگائے اور اپنی ماں کی طرف چلی جائے لیکن شادی کو اتنے کم دن ہوئے تھے کہ وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی پھر اس نے ماتھا پیٹ لیا۔ موبائل سرہانے پڑا تھا اس نے اب تک اسے فون کیوں نہیں کیا۔ بوکھلاہٹ میں اسے یاد ہی نہیں رہا تھا وہ صحن سے کمرے میں آئی لیکن فون کرنے کی نوبت نہ آئی۔ دروازے پر لگی کال بیل نے شور مچا دیا۔ اس وقت افتخار کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ دروازے کے باہر کون ہے اور دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' افتخار نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو بس یونہی ڈر لگ رہا تھا۔''

''ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ڈرنے لگیں تو رہ لیں اکیلی۔''

''آپ اتنی دیر سے جو آئے ہیں۔''

''بھئی دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ صرف ایک گھنٹا ہی تو لیٹ ہوا ہوں۔ پہلے بھی دیر ہوتی رہی ہے لیکن اس طرح خوفزدہ نظر نہیں آئیں جیسے آج نظر آ رہی ہو۔''

''بس یونہی، آج کچھ زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔''

افتخار کے آ جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے پڑوس کو بھول ہی گئی تھی لیکن جب وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو اسے پڑوس کا خالی مکان یاد آ گیا۔

''افتخار! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''یہ جو ہمارا برابر والا مکان ہے کب سے خالی پڑا ہے؟''

''چھ مہینوں سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں اور تم بھی۔ اس سے پہلے کا مجھے پتا نہیں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''امی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر پڑوس کا گھر آباد نہ ہو اس میں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو تو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔''

''ہوا کریں، بلائیں نازل ہوں گی تو وہاں ہوں گی تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔''

''افتخار! ایسا گھر منحوس ہوتا ہے اس کی نحوست کے اثرات ہم پر بھی پڑ سکتے ہیں۔''

''کیسی بچوں والی بات کرتی ہو۔ تمہاری ماں نے ایک بات کہہ دی اور تم نے یقین کر لیا۔ مسلمانوں پر یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

''ہم یہ مکان چھوڑ کر کوئی ایسا مکان نہیں لے سکتے جس کا پڑوس آباد ہو۔''

''تم نے یہ کیا وہم پال لیا ہے کچھ دن اور گزار لو۔ میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔ بدل لوں گا مکان۔'' شادی کے نئے نئے دن تھے۔ وہ زیادہ بحث کر سکتی تھی نہ افتخار سے لڑ سکتی تھی اور پھر وہ خود کہہ رہا تھا کہ یہ خواہش بہت جلد پوری کر دے گا لہٰذا نسیمہ نے چپ رہنے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہی میں عافیت جانی۔

اس دن کے بعد اس نے افتخار کے سامنے اس خالی مکان کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ ضرور سوچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اسٹول پر چڑھ کر جھانک بھی لیا کرتی تھی۔

جب ایک سال ہوگیا اور اس کی گود خالی رہی تو اس کے دل میں یہ بات جانے کہاں سے بیٹھ گئی کہ یہ پڑوس کے گھر کی نحوست ہے جو اس کے گھر تک آگئی ہے۔ اگر یہ گھر آباد نہ ہوا تو وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ یہ خیال ہی اسے طیش میں لانے کے لیے کافی تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر افتخار کے سامنے اس مکان کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''اس مکان میں کوئی تو ایسی بات ہوگی کہ اس کا مالک اسے بنا کر بھول گیا۔''

''تم اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ ہماری بلا سے کوئی اس میں آکر رہے یا اسے بنا کر بھول جائے تمہیں اس سے کیا۔''

''اس کی نحوستیں ہم پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔''

''ہمارے گھر میں کیا فاقے ہونے لگے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے میری ترقی ہوئی ہے۔''

''وہ باہر کی باتیں ہیں، گھروں کی نحوست گھروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔''

''وہی تو کہہ رہا ہوں گھر میں بھی تم نے کیا نحوست دیکھ لی؟''

''افتخار، کیا تمہیں یہ فکر نہیں کہ تم ابھی تک باپ نہیں بن سکے ہو؟''

''ہماری شادی کو کیا دس بیس سال گزر گئے ہیں۔''

''ایک سال بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ گھر خالی پڑا رہا تو دیکھنا دس بیس سال بھی گزر جائیں گے۔''

''اچھا بابا، اب اس بحث کو ختم کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں گھر بدل لوں۔''

''آپ نے پہلے بھی مجھے دلاسا دیا تھا لیکن اب میں زیادہ صبر کرنے والی نہیں ہوں۔''

''کل ہی کسی اسٹیٹ ایجنسی والے سے بات کرتا ہوں۔''

''افتخار، آپ کتنے اچھے ہیں۔''

''میں گھر بدل لوں گا لیکن تمہاری یہ ضد ہے فضول۔''

''ایجنسی والے سے کہہ دیجیے گا کہ جو مکان وہ دیکھے اس کے دونوں طرف کے پڑوس آباد ہوں۔''

''اگر ہمارے شفٹ ہوجانے کے بعد کوئی پڑوس کا مکان خالی کر کے چلا گیا تو؟''

''کچھ دن خالی رہے گا پھر اس میں کوئی کرایے دار آکر بس جائے گا۔ اس مکان کی طرح برسوں خالی نہیں پڑا رہے گا۔''

''اچھا بابا، میں تم سے نہیں جیت سکتا۔ میں کل ہی سے کوشش کرتا ہوں۔''

افتخار نے وعدہ تو کرلیا تھا لیکن اس کے ذہن و دل میں کئی بہانے ایک ساتھ مچل رہے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نسیمہ کو جھٹلائے گا بھی نہیں اور مکان بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ جتنا ہو سکے گا وہ اس معاملے کو ٹالتا رہے گا۔ سب سے بڑا بہانہ یہی تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مکان مل ہی نہیں رہا۔ وہ ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے ساز باز کر کے نسیمہ کو کئی ایسے مکان دکھانے لے گیا جو خود نسیمہ کو پسند نہ آئے۔

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ نسیمہ کی بے تابی بڑھتی جارہی تھی۔ اب تو وہ یہ کہنے لگی تھی کہ مکان جیسا بھی ہو وہ اس میں گزارہ کرلے گی لیکن اب یہاں نہیں رہے گی۔ افتخار اب مشکل میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مکان ملے گا تو لے گا۔ تھک ہار کر اس نے بھی سوچ لیا کہ نسیمہ کی اگر یہی ضد ہے تو وہ یہ مکان چھوڑ دے گا۔ اس نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کرلی۔ مکانوں کی کیا کمی، اسٹیٹ ایجنٹ نے کئی مکان بتادیے اور ایک مکان اسے پسند بھی آگیا۔ گنجان علاقہ تھا۔ آس پاس کوئی بھی مکان ویران اور خالی نہ تھا۔ وہ اس خیال سے گھر پہنچا کہ نسیمہ کو خوشی دکھادے گا۔

''جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ مکان تمہارے مطلب کا مل گیا ہے دیکھنے چلنا ہے۔''

''کیا اس سے اچھا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں؟''

''اس سے تو اچھا نہیں ہے۔''

''پھر بدلنے کا کیا فائدہ۔''

''کیا مطلب؟'' افتخار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم تو اب تک یہ کہتی رہی ہو کہ جیسا بھی گھر ہوگا گزارہ کرلوں گی اور اب یہ کہہ رہی ہو؟''

''میں خوامخواہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اب جو غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ خدا تو ہر جگہ ہے۔''

''کمال ہے، مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے جوتے گھس گئے اور اب کہہ رہی ہو یہی مکان ٹھیک ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''مجھے اس مکان سے نہیں پڑوس سے شکایت تھی جو اب دور ہوگئی۔''

''وہ کیسے؟''

''برابر والے مکان کی صفائی ہورہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کوئی آنے والا ہے۔ آباد گھروں میں بلائیں نہیں اترتیں۔''

''شکر ہے خدا کا۔ میری فکر تو دور ہوئی' میں ایک بڑی زحمت سے بچ گیا۔''

''دیکھا میں کتنی اچھی ہوں۔ آپ کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتی۔''

''دعا کرو جو لوگ بھی آئیں اچھے ہوں۔ برے ہمسایے مصیبت بھی بن جاتے ہیں۔''

''ہم کون سا کسی کے گھر جارہے ہیں۔ ہمیں آباد پڑوس سے مطلب تھا' وہ پورا ہوگیا۔''

ابھی مکان کی صفائی ہورہی تھی۔ نسیمہ بے چینی سے انتظار کررہی تھی کہ کب سامان آئے اور کب یہ گھر آباد ہو۔ وہ دن میں کئی مرتبہ دروازے پر جھانک آتی تھی۔ چھت پر جاکر دیوار کے اس طرف بھی جھانکا۔ مکان تو صاف ہوگیا تھا لیکن سامان کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس کے دل میں وہم نے سر ابھارا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف صفائی ہوئی ہو۔ کوئی رہنے نہ آئے۔ گھر تو پھر اسی طرح خالی کا خالی رہے گا۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے افتخار کو بھی مکان ڈھونڈنے کے لیے منع کردیا تھا۔ اب وہ کس منہ سے کہے گی کہ مکان ڈھونڈو۔ کہنا تو پڑے گا اور کچھ دن انتظار کرلوں شاید کوئی آجائے۔

ایک مہینے کے طویل انتظار کے بعد اس نے دیکھا کہ برابر کے مکان کے دروازے پر سامان کا ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ سامان آگیا۔ اس کا مطلب ہے شام تک اس گھر میں نئے کرایے دار بھی آجائیں گے۔ نحوست بھی دور ہوگی اور اگر لوگ اچھے ہوئے تو آنا جانا بھی لگا رہے گا۔ اس کے دوسرے پڑوس میں صرف دو آدمی رہتے تھے۔ اس لیے وہ وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ وہ دعا کرنے لگی کہ اس مکان میں آنے والے فیملی کے لوگ ہوں۔

دو تین دن بعد اسے محسوس ہوا کہ برابر کے مکان میں کوئی آگیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور اسٹول رکھ کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس نے ایک عورت کو دیکھا جو صحن سے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ معمولی شکل وصورت کی تھی لیکن اس کی ہم عمر تھی پھر ایک آدمی کمرے سے نکل کر صحن کی طرف آیا۔ وہ یقیناً اس کا شوہر تھا۔ معلوم نہیں کوئی اور بھی ان کے ساتھ آیا ہے یا نہیں، وہ سوچنے لگی۔ اس گھر میں کتنے آدمی ہیں، یہ تو جاکر ہی معلوم ہوگا۔ اس نے سوچا اور اسٹول سے اتر گئی۔

اس نے یہ خبر افتخار کو بھی پہنچادی اور یہ اجازت بھی لے لی کہ وہ کسی وقت پڑوس میں ہوآئے۔ ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے کیا خبر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔

نسیمہ نے ہلکا سا میک اپ کیا، کپڑے البتہ قیمتی پہن لیے تاکہ پڑوسیوں پر رعب پڑے۔ وہ گھر سے نکلی اور برابر کے دروازے کی بیل بجادی۔ اس کے جواب میں وہی آدمی دروازے پر آیا جسے وہ چھت سے دیکھ چکی تھی۔

''جی فرمایئے۔''

''میں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں۔''

''واہ، پڑوس تو ہمیں اچھا مل گیا۔'' اس آدمی نے بدتمیزی سے کہا۔ ''اب آپ یہ پوچھیں گی کہ آپ کی بیگم گھر پر ہیں؟''

''یقیناً۔''

''یہی تو ہماری بدنصیبی ہے، کہ وہ اس وقت گھر پر ہیں، آیئے اندر آیئے۔''

نسیمہ اس آدمی کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی یا تو یہ صاحب بدنظر واقع ہوئے ہیں یا مجھے دیکھ کر شوخ بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ جو بھی ہیں ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے گھر آیا جایا جائے۔ اس نے سوچا واپس چلی جائے لیکن یہ سوچ کر اندر چلی آئی کہ مجھے ان سے کیا لینا مجھے تو ان کی بیگم سے سروکار ہے۔ انہیں بھی دیکھ لوں وہ کس طبیعت کی ہیں۔

ان صاحب نے اندر جاکر اپنی بیوی کو اطلاع دی۔ وہ بھی دروازے پر آگئیں اور نسیمہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

''میرا نام نسیمہ افتخار ہے۔ میں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں۔''

''اچھا یہ تو بڑی اچھی بات ہے میں دعا مانگ رہی تھی کہ پڑوس اچھا ہو۔ آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ آپ سے دل لگا رہے گا، میرا نام عنبرین ہے۔''

''آپ کے ساتھ اور کون ہے؟''

''کوئی بھی نہیں بس میں اور میرے میاں ہیں۔ اولاد اللہ نے دی نہیں ہے۔''

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ابھی یہ باتیں یہیں تک پہنچی تھیں کہ عنبرین کے شوہر آ گئے۔ ان کا یوں بے تکلف چلے آنا نسیمہ کو ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس طرح اسے گھور رہے تھے جیسے انہوں نے پہلی بار کسی عورت کو دیکھا ہو۔ بیٹھے بھی ایسی جگہ تھے کہ ان کی آنکھیں مسلسل نسیمہ کو گھورتی رہیں۔

''عنبرین، ان سے ہمارا تعارف بھی تو کروا دو۔ آخر پڑوسن ہیں، ان پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے۔''

عنبرین کو ان کا یہ انداز گفتگو یقیناً پسند نہیں ہوگا لیکن وہ انہیں یہاں سے اٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

''یہ میرے شوہر اعجاز ہیں۔''

''ان سے تو دروازے پر ہی ملاقات ہوگئی تھی۔''

''آپ جب بھی آئیں گی، دروازہ میں ہی کھولوں گا۔''

''اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ پھر آؤں۔''

''کوئی بات نہیں، ہمیں تو فرصت ہی فرصت ہے۔ ہم آجائیں گے۔ مطلب تو ملاقات سے ہے۔ ایسی خوب صورت پڑوسنیں تو قسمت والوں کو ملتی ہیں۔'' اس نے یہ بات اتنی بے ہودگی سے کہی کہ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''اچھا عنبرین، میں چلتی ہوں۔''

''کچھ دیر تو بیٹھو۔ میں نے تم سے چائے تک کے لیے نہیں پوچھا۔''

''نہیں، اب چلوں گی۔''

''اچھا ہم ذرا گھر سمیٹ لیں پھر میں کسی دن آؤں گی۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں شوق سے آؤ۔''

گھر پہنچ کر نسیمہ نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ ایک مرتبہ تو چلی گئی، آئندہ نہیں جائے گی۔ اس گھر کا مرد نہایت بدنظر ہے میل ملاپ رکھا تو اس کی اور ہمت ہوگی۔

وہ مطمئن ہوگئی تھی کہ چلو پڑوس آباد تو ہوگیا، اب میں ان سے ملوں نہ ملوں۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دن دروازے پر بیل ہوئی۔ وہ دروازے پر گئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ پہلے عنبرین پر نظر پڑی اور پھر اس کے میاں پر۔ وہ خود تو عنبرین کے گھر اکیلی گئی تھی لیکن عنبرین اپنے شوہر کو بھی ساتھ لے آئی تھی اور وہ بھی اس وقت کہ افتخار گھر پر نہیں تھے۔

''ارے آپ لوگ، اس وقت تو افتخار گھر پر نہیں ہیں۔ اگر اعجاز صاحب افتخار کی موجودگی میں آئے ہوتے تو ان سے ملاقات ہو جاتی بہرحال آپ لوگ اندر آئیں۔''

''میں تو ان سے کہہ رہی تھی کہ افتخار صاحب کی موجودگی میں جانا چاہیے لیکن یہ مانے ہی نہیں۔ ان کی تو منطق ہی عجیب ہے، کہتے ہیں، پڑوسی رشتے داروں کی طرح ہوتے ہیں ان کے گھر کسی وقت بھی جایا جا سکتا ہے۔''

نسیمہ بھی یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے ہیں، اکیلے تو نہیں آئے۔ اگر افتخار کو معلوم بھی ہوگیا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی بلکہ میں خود انہیں بتا دوں گی کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہمارے پڑوسی ہمارے گھر آئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں آتے ہی اعجاز صاحب نے گفتگو میں پہل کی۔ ان کی بیوی منہ تک رہی تھیں اور وہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔ نسیمہ انہیں نظر انداز کر کے عنبرین سے باتیں کرنے لگی اور وہ بار بار اسے مخاطب کر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایسے کھلے مذاق پر اتر آئے کہ مہذب دیور بھی اپنی بھابیوں سے نہیں کرتے ہوں گے بلکہ انہوں نے تو اظہار بھی کر دیا۔

''میں نے افتخار صاحب کو دیکھا ہے۔ میں عمر میں ان سے دو چار سال بڑا ہی ہوں گا لیکن آپ مجھے اپنا دیور ہی سمجھیں۔ مجھے دیور بھابی کا رشتہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں آج سے اس طرح کے مذاق کیا کروں گا جیسا کہ دیور کرتے ہیں۔''

''آپ تو اجازت کے بغیر بھی وہی کچھ کر رہے ہیں حالانکہ مجھے یہ قطعی پسند نہیں اس لیے کہ میرا کوئی دیور نہیں لہٰذا میں اس کی عادی نہیں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ آپ کو بنا بنایا دیور مل گیا۔''

''مجھے رشتے بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

یہ نوک جھوک جانے کب تک جاری رہتی کہ عنبرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ غالباً اسے بھی اپنے میاں کی باتیں ناگوار لگ رہی تھیں۔

''اچھا بہن، اب ہمیں اجازت دو۔''

نسیمہ تو کچھ نہیں بولی لیکن اعجاز صاحب بول پڑے۔

''ایسی بھی کیا جلدی۔ ہے بیگم کچھ دیر تو اور بیٹھو۔''

عنبرین ان سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ نسیمہ تو روکنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی ہے تو انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ چلی ہی جائے تو اچھا ہے۔ مجبوراً اس کے شوہر کو بھی اٹھنا پڑا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net

وہ پڑوس آباد ہونے کی دعائیں مانگا کرتی تھی، اب یہی پڑوس اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ بد اخلاق بن جائے۔ اپنی پڑوسن کی اس طرح دل شکنی کرے کہ نہ وہ خود اس کے گھر آنے کی زحمت کرے نہ اپنے میاں کو ساتھ لائے۔

افتخار گھر آیا تو نسیمہ نے یہ ذکر تک نہیں کیا کہ کون آیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس سے ملنے نہ چلا جائے بلکہ اسے بھی ساتھ چلنے کو کہے۔

دوسرے دن افتخار دفتر کے لیے نکلا ہی تھا کہ عنبرین آدھمکی۔ نسیمہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔

''معاف کرنا بہن، آپ غلط وقت پر آگئیں میں امی کی طرف جارہی تھی۔''

''ارے چلی جانا، امی ہی کی طرف تو جانا ہے۔ کچھ دیر بعد چلی جانا۔ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرلی جائیں۔''

''جی نہیں، میں ہر کام وقت پر کرنے کی عادی ہوں کسی کے لیے اپنا وقت خراب نہیں کرتی۔''

''چلو تمہیں اس وقت فرصت نہیں تو میں پھر آجاؤں گی۔'' وہ چلی گئی اور نسیمہ مزے سے بستر پر لیٹ کر عنبرین کی بے بسی پر ہنسنے لگی۔

اس دن کے بعد سے نسیمہ نے عنبرین کو منہ لگانا چھوڑ دیا لیکن وہ بھی عجیب عورت تھی۔ اس نے نسیمہ کے گھر آنا نہیں چھوڑا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ نسیمہ کسی بات کا جواب دیتی کسی کا نہ دیتی۔ عنبرین نے کبھی اس کی بے رخی کی شکایت نہ کی بس اتنا ہوا کہ اس نے اپنے میاں کو ساتھ لانا بند کردیا تھا۔

وہ اعجاز کو ساتھ نہیں لارہی تھی لیکن وہ پیچھا چھوڑنے والے کب تھے۔ اس کا دروازے پر کھڑا ہونا عذاب ہوگیا تھا۔ افتخار تو دن بھر ہوتا ہی نہیں تھا گھر کے سودے سلف کے لیے نسیمہ کو ہی گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ اعجاز اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ ایک دن وہ دکان پر کھڑی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو عنبرین کا شوہر اعجاز تھا۔

''بھابی کیا خریداری ہورہی ہے؟''

''گھر میں کچھ چیزیں کم ہوگئی تھیں، وہ لینے آئی تھی۔''

''ارے آواز دے کر مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ میں لاکر دے دیتا۔ اب ذرا ذرا سی چیز کے لیے آپ گھر سے نکلیں گی۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہر وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ کوئی کام کاج نہیں کرتے؟''

''اپنا کاروبار ہے نوکروں نے سنبھالا ہوا ہے۔ کبھی کبھی چلا بھی جاتا ہوں۔''

''اس اطلاع کا شکریہ۔'' نسیمہ نے کہا اور دکان دار سے مخاطب ہوگئی۔ سودا لینے کے بعد پلٹی تو اعجاز صاحب اب بھی وہیں جمے کھڑے تھے۔

''میں کچھ دیر بعد چھت پر آجاؤں گا آپ کو فرصت ہو تو آپ بھی آجایئے گا۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ ایسی بے ہودگی تھی کہ اگر وہ وہاں سے چلا نہ گیا ہوتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ کوئی لڑکا بالا ہوتا تو الگ بات تھی لیکن اس عمر کے آدمی پر یہ چھچھورپن جچتا نہیں تھا۔

یہ اور ایسی بہت سی حرکتیں اس کے بعد بھی جاری رہیں۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہوجائے اس نے سوچا کہ وہ افتخار کو اعجاز کی حرکتوں سے آگاہ کردے پھر خود ہی اس خیال کو رد بھی کردیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ افتخار اس سے جھگڑا کر بیٹھیں۔ میں اپنی جگہ مضبوط ہوں تو پھر کیوں کسی سے ڈروں۔ میں ترنوالہ تو ہوں نہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ افتخار کو بیچ میں کیوں ڈالوں، خود ہی اس کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔

چھوٹی چھوٹی حرکتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں، ایک دن بہت بڑی بات ہوگئی۔ دوپہر کا وقت تھا وہ کچن میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت کون ہوسکتا ہے، ایک عنبرین ہی ہے جو ایسے ناوقت آدھمکتی ہے، اس نے سوچا اور پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو اعجاز صاحب کاغذ کا ایک بنڈل ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ وہ دوپٹے کے بغیر کھڑی تھی اور ۔ بوکھلا کر دروازے سے ہٹنا بھول گئی پھر ذرا ہوش آیا تو دروازے کی آڑ لے کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا خیال ہے آجاؤں اندر؟''

''اس وقت افتخار گھر پر نہیں ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے، اسی لیے تو آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم افتخار سے ڈرتی ہو۔''

''جب وہ ہوں اس وقت آیئے گا۔''

''اچھا تو یہ لے لو۔'' اس نے کاغذ کا بنڈل اس کی طرف بڑھایا۔ غیر ارادی طور پر اس نے وہ بنڈل ہاتھ میں پکڑ بھی لیا۔

''اس میں کیا ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net

''تمہارے لیے سوٹ پیس لایا ہوں، اگر تم اسے قبول کرلو تو ایسے سوٹ پیس روز آیا کریں گے۔'' نسیمہ نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں دبے بنڈل پر ڈالی اور دوسری نظر اعجاز کے مکروہ چہرے پر اور بنڈل ان کے چہرے پر دے مارا۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز سے گلی گونج گئی۔

نسیمہ کا وجود غصے کی بھٹی بنا ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اسے زیادہ غصہ اپنی حماقت پر آرہا تھا۔ اگر پہلے دن ہی اس سلسلے کو روک دیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب بھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اس آدمی کی ہمت کو اوندھے منہ نہیں گرایا تو اس کی ہمت بڑھتی جائے گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں افتخار کو سب کچھ بتادوں .... وہ بے چینی سے افتخار کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ افتخار آیا تو وہ چائے بنانے میں مشغول ہوگئی۔ اس نے سوچا تھا افتخار کے ساتھ چائے پینے بیٹھے گی تو ضرور بات کرے گی لیکن جب چائے بنا چکی تو اس نے اپنا ارادہ ایک مرتبہ پھر بدل دیا۔ اس نے سوچا نہ جانے افتخار کا ردعمل کیا ہو پھر کیا کروں؟ اعجاز صاحب کے حوصلے اس طرح بڑھنے دوں؟ اچانک ایک خیال نے اس کے ارادے کو نعم البدل دے دیا۔ میں عنبرین سے بات کرکے دیکھوں۔ اسے بھی تو معلوم ہو اس کا شوہر کیا حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔ کون بیوی ہوگی جو اپنے شوہر کی ان حرکتوں کو برداشت کرے گی۔ وہ ضرور میری حوصلہ افزائی کرے گی۔ وہ اپنا غصہ چھپا کر افتخار کے ساتھ چائے پینے بیٹھ گئی۔

اس نے وہ رات جیسے تیسے کاٹی اور صبح ہوتے ہی انتظار کرنے لگی کہ کب افتخار گھر سے نکلے اور عنبرین کے گھر جائے۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اعجاز صاحب گھر پر ہوئے تو بھی وہ عنبرین سے ان کی شکایت ضرور کرے گی۔ اس سے کہے گی کہ اپنے میاں کو باندھ کر رکھے۔

افتخار کے دفتر جانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ عنبرین کے گھر پہنچ گئی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت اعجاز صاحب گھر پر نہیں تھے۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

''آج کیسے آنا ہوگیا ضرور کوئی مطلب ہوگا اور نہ کون کسی کے گھر آتا ہے۔'' عنبرین نے بھی اس سے .... بے رخی سے بات کی جس طرح نسیمہ اس سے کرنے لگی تھی۔ نسیمہ نے محسوس تو کیا لیکن اظہار نہیں کیا۔ اس وقت واقعی اس کا مطلب تھا اسی لیے الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''بہن تم نے ٹھیک کہا ہر کوئی اپنے مطلب سے ہی کسی کے گھر جاتا ہے۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ اپنے میاں کو سنبھال کر رکھو ورنہ اس محلے میں تمہارا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ ابھی بات مجھ تک ہے لیکن میرے میاں کو خبر ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''میرے میاں نے ایسا کیا کردیا کہ انگاروں پر لوٹ رہی ہو؟''

''وہ میرا پیچھا کرتے ہیں۔ مجھ سے بے ہودہ مذاق کرتے ہیں۔ کل میرے لیے تحفہ لے کر آئے تھے جیسے میں تحفوں کی بھوکی ہوں۔ ان سے کہنا اپنی حد میں رہیں۔ اگر میں یہ سب اپنے شوہر کو بتادوں تو جانتی ہو کیا ہو۔''

''نسیمہ ایک بات کہوں۔'' عنبرین نے کہا۔ ''برا مت ماننا جب عورت کی طرف سے موقع دیا جاتا ہے تو مرد آگے بڑھتا ہے۔ تم نے موقع دیا ہوگا تو ہی ان کی ہمت ہوئی ہوگی۔ ویسے مجھے پھر بھی یقین نہیں ہے۔ وہ تو کسی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور تم کہتی ہو وہ تم پر مرنے لگے ہیں۔ تمہارا پیچھا کرتے ہیں۔ تمہیں تحفے لاکر دیتے ہیں اور تم رکھ لیتی ہو۔''

''جی نہیں، جو کچھ وہ لائے تھے میں نے ان کے منہ پر دے مارا تھا۔''

''یہ کہہ کر واپس کیا ہوگا کہ یہ کیا اٹھا کر لے آئے کوئی اچھا سا تحفہ لائے ہوتے۔''

''تم تو اس طرح مذاق اڑا رہی ہو جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''توبہ توبہ، تم جیسی سچی عورت جھوٹ کیسے بول سکتی ہے۔ اعجاز آتے ہیں تو میں ان سے پوچھوں گی کہ ایسی پارسا عورت پر کیوں ڈورے ڈال رہے ہو۔''

''تم پوچھو نہ پوچھو میں تو تمہیں اطلاع دے رہی ہوں تاکہ کل کو تم یہ نہ کہہ سکو کہ مجھے تو بتایا ہوتا۔''

عنبرین نے ایسی بے رخی دکھائی تھی کہ بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا۔ اسے بھی جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی تھی۔ اب رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عنبرین کے منہ پر تھوکا اور گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھادیے۔ ابھی دروازہ دور تھا کہ اعجاز گھر میں داخل ہوا۔ اس نے بیوی کی موجودگی میں نسیمہ کی موجودگی پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن نسیمہ کو رکنا پڑا۔

''جاتی کہاں ہو، اب یہ آگئے ہیں ان کے سامنے ہی بات ہوجائے۔'' عنبرین نے نسیمہ سے کہا اور پھر اعجاز سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ آئی ہیں، کہتی ہیں کہ تم انہیں تحفہ دینے ان

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

کے گھر گئے تھے۔ غضب خدا کا میرے لیے تسلی ہے اور دوسری عورتوں کو تحفے بانٹتے پھرتے ہو۔''

''عنبرین، ایک آدھ دفعہ ان سے ملاقات ضرور ہوئی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں انہیں شریف عورت سمجھتا تھا لیکن یہ مجھ پر ایسا گھٹیا الزام لگائیں گی، مجھے نہیں معلوم تھا۔ خدا جانے اس کے پیچھے ان کے کیا مقاصد ہیں۔''

''اعجاز صاحب، یہ گھٹیا الزام نہیں بلکہ یہ گھٹیا حرکت کل آپ کر چکے ہیں۔ میں تو آپ کی بیوی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ آپ کو منع کریں، آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔''

''عنبرین، اس عورت کو یہاں سے نکالو۔ یہ تو خطرناک عورت ہے۔ لڑائیاں کروادے گھروں میں۔ مجھے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ مکان لے کر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ کمال ہے بھئی حد ہوگئی۔ اب تو اس کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی۔ وہ بھی اگر اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے تو ضرور سنے گا۔''

اب وہاں رکنے کا مطلب اپنی مزید بے عزتی کروانے کے مترادف تھا۔ اس نے ان دونوں پر لعنت بھیجی اور وہاں سے نکل آئی۔ گھر پہنچ کر اس کی بے بسی آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔ اس بے بسی میں اب یہ خوف بھی شامل ہوگیا تھا کہ جانے وہ کس کس طرح افتخار کے کان بھرے۔ جو الزام میں نے اس پر لگائے ہیں، وہی الزام وہ مجھ سے منسوب کردے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا منہ کھولے، میں ہی افتخار کو سب کچھ کیوں نہ بتادوں۔ اگر مجھے یہ ڈر ہے کہ دونوں مردوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو تو میں اسے اپنی قسم دے دوں گی کہ وہ صرف سن لے اور اگر اعجاز کچھ کہے تو اس پر اعتبار نہ کرے۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ افتخار کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے اعجاز صاحب کھڑے تھے۔

''آپ کس مٹی کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ ابھی اتنی بے عزتی کر کے آئی ہوں اور پھر چلے آئے۔ اب کون سا تحفہ لائے ہیں؟''

''مجھے شرمندہ مت کریں۔ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ اپنے شوہر سے کچھ نہ کہیے گا خوامخواہ دل برے ہوں گے۔''

''آپ بھی ایسی حرکتیں آئندہ نہ کیجیے گا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ویسے بھی کاروبار کے سلسلے میں، میں کوئٹہ جارہا ہوں مستقل قیام وہیں رہے گا۔'' نسیمہ یہ سن کر دہل سی گئی۔ کیا یہ لوگ گھر چھوڑ کر جارہے ہیں۔ پڑوس پھر خالی ہوجائے گا۔ بلائیں پھر نازل ہوتی رہیں گی۔ اس نے وضاحت ضروری سمجھی۔

''ٹھیک ہے مالک مکان خود آکر رہے گا تو مکان کی دیکھ بھال اچھی طرح ہوگی۔''

''میں مکان نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ عنبرین یہیں ہے، بھائی اس کے ساتھ آکر رہے گا۔'' اعجاز نے کہا اور دروازے سے ہٹ گیا۔

وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اعجاز سے بات کرے لیکن اس نے سوچا کہ اب وہ دفع ہو رہا ہے۔ اگر اس وقت بات بگڑ گئی تو نہ جانے جاتے جاتے کیا کر جائے۔ اس وقت اس کا غصہ ٹھنڈا ہی رکھنا چاہیے۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ اس کا پڑوس اب اس کے لیے محفوظ ہوگیا تھا۔

دوسرے دن سبزی والا گلی میں آیا اور وہ سبزی لینے نکلی تو بے حد خوش تھی۔ اب اعجاز وہاں تھا ہی نہیں جو آکر پوچھتا بھابی کیا خرید رہی ہیں۔

اسے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ بس ایک کانٹا تھا جو کھٹکتا رہتا تھا۔ اعجاز ہمیشہ کے لیے نہیں گیا تھا۔ اسے کبھی نہ کبھی آنا ضرور تھا۔ بس ایک امید تھی کہ شاید آنے کے بعد سدھر جائے۔ پرانی حرکتیں چھوڑ دے۔ وہ عنبرین کے پاس مصلحتاً نہیں گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ راستہ کھل جائے۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ پڑوس آباد ہے۔

اس آزادی کے ساتھ شب و روز گزارتے ہوئے اسے ایک مہینا ہوا تھا کہ اسے وہ خوش خبری مل گئی جس کا انتظار کرتے ہوئے اسے دو سال ہوگئے تھے۔ اس نے یہ خبر سب سے پہلے افتخار کو سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

''آپ مجھے جھٹلاتے تھے لیکن پڑوس آباد ہونے کا نتیجہ دیکھ لیا۔ سب نحوستیں دور ہوگئیں۔ ڈاکٹروں تک نے کہہ دیا تھا کہ میں ماں نہیں بن سکتی۔''

''کیوں ایسی توہم پرستی کی باتیں کرتی ہو۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اس میں پڑوس کہاں سے آگیا۔ یہ تو خدا کی مرضی ہے جب چاہے کسی کو اولاد دے دے۔''

''آپ کو پہلے میری کوئی بات ٹھیک لگی ہے جو یہ لگے گی۔ میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ پڑوس آباد ہونے سے ہمارے گھر کی نحوست ٹلی ہے۔ وہاں چراغ جلا ہے تو ہمارے گھر کا چراغ روشن ہوا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

''اچھا بابا، تم ٹھیک کہتی ہو میری پروموشن ہوئی ہے شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو۔''

''اور نہیں تو کیا۔''

''اس بات پر ایک اچھی سی چائے ہو جائے۔''

''ابھی لائی بنا کر شام کو امی کی طرف بھی جانا ہے۔''

دن پر دن گزرتے رہے۔ اسے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ہفتہ پندرہ دن بعد اعجاز گھر آتا رہتا ہے لیکن ان کی طرف سے شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ جان چھوٹی۔ میری ذرا سی سختی نے اسے سدھرنے پر مجبور کر دیا۔ اب آتے بھی ہیں تو خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔

☆☆☆

ڈیلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ گھر میں نسیمہ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں دو چار دن کے لیے آجاتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد گھر کے کام کاج پھر اسی کو کرنے پڑتے تھے۔ اس نے یہی سوچا کہ وہ افتخار کو لے کر اپنی ماں کے گھر چلی جائے لیکن وہ اس کے ساتھ اس کی ماں کے گھر رہنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کشمکش میں کچھ دن اور گزر گئے یہاں تک کہ ڈیلیوری کا وقت بالکل قریب آ گیا۔

''تم اسپتال جاؤ گی، اس وقت بھی تو مجھے گھر پر اکیلا رہنا پڑے گا۔''

''وہ تو دو تین دن کی بات ہوگی۔''

''میں اس سے زیادہ بھی اکیلا رہ سکتا ہوں۔ دن بھر تو دفتر میں گزر جاتا ہے، رات کا کھانا کھا کر آیا کروں گا۔ آ کر سو جاؤں گا۔ تمہاری دیکھ بھال تو اچھی طرح ہو جائے گی۔ میری مانو تو تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ۔''

وہ پھر بھی نہ مانتی تھی لیکن اس کی ماں نے کہا کہ ہمارے خاندان کے دستور کے مطابق پہلے بچے کی ولادت میکے میں ہوتی ہے اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو بچے پر بھاری ہوتا ہے۔ وہ ایسی باتوں سے بہت ڈرتی تھی لہٰذا افتخار کے بغیر ہی میکے جانے کو تیار ہو گئی۔ اب اسے بچے کی ولادت کے چالیس دن بعد میکے سے واپس آنا تھا۔

☆☆☆

''افتخار صاحب، یہ بھی عجیب لطیفہ ہے۔ ہمیں اس محلے میں آئے اتنے دن ہو گئے ہیں اور آپ سے ملاقات آج ہو رہی ہے اور وہ بھی اتفاقیہ۔ آپ اس گھر سے نکل رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ یہ تو میرے گھر کے برابر والا گھر

نخلے کو دھلا

ایک دھوکے باز شخص نے مشہور کر دیا کہ جو شخص اسے سو روپے دے گا، وہ اسے جنت میں جانے کا ٹکٹ دے گا۔ جواب میں اس کے پاس بے تحاشا بے وقوف اور کمزور عقیدے کے لوگوں نے روپے بھیجے۔

ایک روز وہ اپنے کمرے میں نوٹوں کا ڈھیر سجائے اپنی دولت شمار کر رہا تھا کہ ایک شخص کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا اور بولا۔

''خبردار۔ ساری دولت میرے حوالے کر دو ورنہ.....''

''بکومت۔'' دھوکے باز چلایا۔ ''اگر تم نے مجھے لوٹا تو پھر یقین جانو تم سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔''

''ناممکن۔'' ڈاکو نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی تم سے جنت کا ایک ٹکٹ لے لیا ہے۔''

انتخاب.. ریاض بٹ، حسن ابدال

کترنیں

پولیس۔ ''پارک میں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

آدمی۔ ''ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔''

پولیس۔ ''تو گھر میں جا کر اس طرح بیٹھو۔''

آدمی۔ ''اس کا خاوند اور میری بیوی برا مناتے ہیں۔''

☆☆☆

بیوی۔ ''اخبار میں خبر ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی موٹر سائیکل سے تبدیل کر لی۔ کہیں آپ تو ایسا نہیں کریں گے؟''

شوہر۔ ''میں اتنا بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔ میں کار سے کم میں بات نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

اپنی بیوی کی پسند پر مت ہنسو کہ تم اس کی پسند ہو۔

اور اپنی پسند پر اتنا مت اتراؤ کہ تمہاری بیوی بھی تمہاری پسند ہے۔

مرسلہ۔ سید محی الدین اشفاق۔ فتح پور، لیہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔''

''میں اسے اپنی نالائقی ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے کبھی ملاقات ہی نہ کرسکا۔''

''مجھے اعجاز کہتے ہیں۔''

''میرا نام افتخار ہے۔''

''اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میرا گھر حاضر ہے۔ میری بیوی سے بھی مل لیجیے گا اور ایک ایک کپ چائے بھی ہم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر پی لیں گے۔ ایک دوسرے کو جاننے کا بھی موقع ملے گا۔''

''اعجاز صاحب، پہل تو مجھے کرنی چاہیے تھی کیونکہ آپ میرے دروازے کے سامنے کھڑے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرا گھر اکیلا ہے اور مجھے چائے بنانی نہیں آتی۔''

''آپ اکیلے رہتے ہیں؟''

''ارے نہیں، میری ایک عدد بیوی بھی ہے لیکن وہ آج کل اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔''

''پھر تو میرا حق بنتا ہے۔ آیئے آپ کو چائے پلاتے ہیں۔ میری بیوی میکے نہیں گئی ہے۔''

''پھر کبھی حاضر ہوجاؤں گا۔''

''اب میں کوئی بہانہ سننے والا نہیں۔ اب تو آپ رات کا کھانا میرے گھر کھائیں گے۔ آپ یقیناً ہوٹل کا کھانا کھا رہے ہوں گے لیکن اب نہیں، پڑوسیوں کا بڑا حق ہوتا ہے۔''

افتخار ان کے بے پناہ خلوص کے سامنے بے بس ہوگیا۔ وہ سوچ کر یہی گیا تھا کہ چائے پی کر اٹھ آئے گا لیکن عنبرین نے اس کی جس طرح پذیرائی کی اور جس بے تکلفی سے ملی اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اٹھ جاتا۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا اور کھانے کا وقت ہوگیا۔ اسے کھانا بھی وہاں کھانا پڑا۔ کھانے کے بعد ایک مرتبہ پھر باتوں کا بازار سج گیا۔ اسے کہیں دور تو جانا نہیں تھا کہ جلدی ہوتی خوب جی بھر کر باتیں ہوئیں، جب وہ اٹھنے لگا تو عنبرین سامنے آگئی۔

''آپ کو ہم ایک شرط پر جانے دیں گے۔ جب تک نسیمہ واپس نہیں آجاتی آپ دفتر سے سیدھے ہمارے گھر آئیں گے اور رات کا کھانا کھا کر واپس جائیں گے۔''

''نسیمہ کوئی ایک دو روز میں واپس نہیں آجائے گی۔ وہ ماں بننے والی ہے اور ڈیلیوری کے لیے اپنی ماں کے گھر گئی ہے ابھی تو اسے آنے میں وقت لگے گا۔''

''وہ جب بھی آئے آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔''

''آپ لوگوں کو خوامخواہ کی زحمت ہوگی۔''

''واہ اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ ہم میاں بیوی بھی اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کے ساتھ اچھا وقت کٹ جایا کرے گا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

افتخار کو ان کی بات ماننی پڑی۔ جہاں روز کا آنا جانا ہو وہاں تکلف ختم ہوجاتا ہے۔ عنبرین یوں بھی شوخ مزاج واقع ہوئی تھی۔ جلد ہی دونوں میں ہنسی مذاق شروع ہوگیا۔

افتخار سوچا کرتا تھا کہ نسیمہ ٹھیک کہتی تھی آباد پڑوس واقعی نعمت ہوتا ہے۔ اگر یہ پڑوسی نہ ہوتے تو نسیمہ کے بغیر دن کاٹنا مشکل ہوجاتے۔ کھانا تو خیر ہوٹل پر بھی کھا لیا جاتا ہے لیکن گھر جیسا ماحول کہاں میسر آتا ہے۔

پڑوس کی گہما گہمی میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اسے معلوم ہوا کہ نسیمہ اسپتال میں داخل ہوگئی ہے۔ وہ اسپتال پہنچا تو یہ خوش خبری اس کا انتظار کررہی تھی کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔ دونوں نے مل کر اس کا نام لائبہ رکھا۔

اب نسیمہ کو چالیس دن مزید اپنی ماں کے گھر رہنا تھا۔ یہ چالیس دن بھی پلک جھپکتے گزر گئے، افتخار اسے گھر لے آیا۔ اعجاز صاحب اسی دن کے انتظار میں تھے اب انہیں اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

نسیمہ کو آئے ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا کہ وہ عنبرین کے ساتھ افتخار کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایسے ہی وقت کا انتظار کیا کرتے تھے جب افتخار گھر پر نہ ہوں۔ اس وقت افتخار گھر پر نہیں تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی اس لیے نسیمہ نے انہیں اندر بلالیا۔ اعجاز صاحب کی آنکھیں اب پہلے سے بھی زیادہ بے قابو ہورہی تھیں لیکن نسیمہ کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ عنبرین بھی پہلے سے زیادہ اپنایت سے مل رہی تھی۔ وہ نومولود بچی کے لیے کپڑے اور کھلونے لے کر آئی تھی۔ نسیمہ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ سب کچھ آپ افتخار کی موجودگی میں لائی ہوتیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔''

''ایک ہی بات ہے ملنا تو ہمیں تم سے تھا۔'' عنبرین کے بجائے اعجاز صاحب نے کہا۔

''اگر عنبرین اکیلی آئی ہوتیں تو بات دوسری تھی لیکن آپ بھی آرہے تھے تو افتخار کی موجودگی میں آنا چاہیے تھا۔''

''بہن تمہارا غصہ ابھی کم نہیں ہوا۔'' عنبرین نے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
E-mail : jdpgroup@hotmail.com

http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کہا۔ ''پڑوسیوں کا بڑا حق ہوتا ہے، کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ تمہاری بات بھی رکھ لیں گے افتخار صاحب کی موجودگی میں بھی آجائیں گے۔ کون سے دور رہتے ہیں۔''

''اور تم سے تو بہت ہی قریب ہیں۔'' اعجاز صاحب نے پھر بدتمیزی دکھائی۔ نسیمہ کو خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔ نہ صرف خاموش رہنا پڑا بلکہ ان کے لیے اٹھ کر چائے بنانی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر پینی بھی پڑی۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا اور یہ سوچنے بیٹھ گئی کہ ان آفتوں سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ افتخار گھر پہنچا تو اسے یہ بتانا پڑا کہ برابر والی آئی تھیں اور لائبہ کو یہ کپڑے اور کھلونے دے گئی ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر یہ نہیں بتایا کہ ان کے شوہر بھی ساتھ آئے تھے۔

''تم بھی کسی وقت چلی جانا۔ اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ پڑوسیوں کا اتنا خیال کون رکھتا ہے۔'' افتخار نے کہا تو نسیمہ نے سن لیا۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ جیسے طوفان نے گھر دیکھ لیا۔

''ہمارے نئے پڑوسی ہیں اعجاز صاحب میں نے انہیں کھانے پر بلالیا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کھانے میں کیا ہونا چاہیے؟''

''آپ نے انہیں کیوں بلایا؟''

''کیوں بلایا کا کیا مطلب؟ بھئی پڑوسی ہیں ہمارے۔ مخلص بھی ایسے کہ اب ایسے لوگ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ ہماری بچی کے لیے کپڑے لے کر آئے تھے۔ تم نہیں تھیں تو انہوں نے میرا خیال بھی بہت رکھا۔ ایک وقت کے کھانے پر بلالوں گا تو قیامت نہیں آجائے گی۔''

''میں نے کہہ دیا ہے میں ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

''عمر میں مجھ سے بھی بڑے ہیں۔ میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ سامنے نہیں آؤ گی۔ سبزی والے سے پردہ نہیں کرتی ہو اور ان کے سامنے نہیں آؤ گی۔ مل کر تو دیکھو ایسے باغ و بہار آدمی ہیں کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہے گا۔''

''مجھے معلوم ہے کتنے باغ و بہار ہیں۔''

''بھئی تم ان کے گھر گئی ہوگی اور انہوں نے تم سے بات نہیں کی ہوگی۔ ایک غیر عورت سے وہ کیا بات کرتے۔ اب وہ آئیں گے تو دیکھنا کتنی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے ہیں، وقت بے وقت کام آسکتے ہیں ان سے تعلق رکھنا چاہیے۔ تم مانو نہ مانو مجھے تو ایک اچھا دوست مل گیا ہے اور میں اس کی دعوت کررہا ہوں۔ تیاری کرنا تمہارا فرض ہے، ان کی بیگم بھی ساتھ ہوں گی اس لیے تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

یہ موقع تھا کہ اعجاز صاحب کے کرتوت وہ افتخار کے سامنے بیان کردیتی لیکن اس نے یہ موقع بھی گنوادیا۔

افتخار کا حکم تھا لہٰذا اس نے تیاری شروع کردی۔ شام سے پہلے پہلے کھانا بھی تیار کرلیا اور بے دلی سے تیار ہوکر بیٹھ بھی گئی۔ اسے اگر اطمینان تھا تو یہ کہ اعجاز صاحب، افتخار کی موجودگی میں آرہے تھے۔ اسے امید تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں کریں گے۔

دروازے پر دستک ہوئی افتخار دروازے پر گیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ قہقہوں کی آوازیں آئیں تو اسے بھی صحن میں آنا پڑا۔ عنبرین نے اسے دیکھتے ہی بانہیں پھیلادیں اور اس طرح گلے ملی جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی ہو۔ اعجاز صاحب کی آنکھیں بدستور نسیمہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''یار افتخار، ایک گستاخی کروں۔'' اعجاز نے کہا۔

''یہ کون سی نئی بات ہوگی۔''

''میں تمہاری بیوی کو پہلی بار قریب سے دیکھ رہا ہوں اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہیں بیوی نہایت خوب صورت ملی ہے۔''

''پرائی بیوی سب کو خوب صورت لگتی ہے۔''

''میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن دیور بننے کو جی چاہتا ہے۔ مذاق کرنے میں ذرا آسانی ہوتی ہے۔ میں تو انہیں بھابی کہا کروں گا۔'' یہی بات وہ ایک بار نسیمہ کے سامنے بھی کہہ چکا تھا اب گویا اسے اجازت مل گئی تھی۔ اسی ہنسی خوشی کے ماحول میں وہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔

''بھابی، یہ ایک تحفہ ہے جو میں آپ کے لیے لایا ہوں۔''

نسیمہ کو وہ وقت یاد آگیا جب وہ ایسا ہی ایک پیکٹ اس کے لیے لایا تھا اور اس نے پیکٹ کو اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اب وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ اپنے شوہر کے سامنے اسے یہ پیکٹ قبول کرنا پڑا۔ اعجاز صاحب کی شیطانی مسکراہٹ اس سے کہہ رہی تھی کہ کہو نسیمہ بیگم جیت کس کی ہوئی؟

اس نے یہ پیکٹ نہ صرف قبول کیا بلکہ مجبوراً شکریہ بھی ادا کرنا پڑا۔ بات صرف تحفے کی نہیں تھی اسے تو شرمندگی یہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھی کہ وہ عنبرین کے سامنے اس تحفے کا ذکر کر چکی تھی اور اس کے شوہر کو کھری کھری سنا چکی تھی اور اب وہی تحفہ قبول کر رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ اعجاز صاحب اس جرم میں اکیلے نہیں ہیں، عنبرین بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ورنہ اتنی شکایتوں کے بعد وہ اس کے گھر قدم بھی نہ رکھتی پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ جس طرح میں اپنے شوہر سے مجبور ہوں وہ بھی میری خاطر اپنے شوہر سے کیوں بگاڑے۔ کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ اپنے رویّے سے ظاہر کردے کہ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ تو اس طرح خوش ہے جیسے اپنے شوہر کی فتح کا جشن منا رہی ہو۔ افتخار سے بھی نہایت بے باک مذاق کر رہی ہے۔ کہیں میرا شوہر ہی میرے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ یہ سوچ کر اس کا موڈ بالکل ہی آف ہو گیا۔ میں کیوں اس کھیل کا حصہ بنوں۔

افتخار سے اس کی یہ کیفیت چھپی نہیں رہ سکی تھی، ان لوگوں کے جاتے ہی افتخار نے اس کے رویّے کی شکایت کی۔ ''یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا ان کے آتے ہی؟''

''کچھ بھی نہیں مجھے کیا ہونا تھا۔''

''ذرا اپنے رویّے پر غور کرو، اپنے مہمانوں سے کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کیا بدسلوکی کی ان کے ساتھ۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ان کا دیا ہوا تحفہ قبول کیا اور کیا کرتی۔''

''میں تمہارے رویّے کی بات کر رہا ہوں۔ تم سب کچھ کر رہی تھیں مگر بے دلی کے ساتھ۔ تمہارا رویہ نہایت سرد تھا۔''

''وہ لوگ پہلی مرتبہ آئے تھے مجھ سے ایک ملاقات میں کسی سے بے تکلف نہیں ہوا جاتا۔''

''اوہ تو یہ بات ہے اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔ دیکھتا ہوں کتنی بے تکلف ہوتی ہو۔'' اس وقت تو بات ٹل گئی لیکن دو دن نہیں گزرے تھے کہ افتخار نے ان کے گھر چلنے کو کہا۔

''کیا خیال ہے اعجاز صاحب کی طرف نہ چلا جائے۔''

''کیا ضرورت ہے چھوڑیں بھی۔''

''آج چھٹی تھی پڑے پڑے بور ہو گیا ہوں، کچھ دل ہی بہل جائے گا۔''

''دل ہی بہلانا ہے تو کہیں اور چلتے ہیں۔''

''کیوں، اعجاز صاحب کی طرف چلنے میں تمہیں کیا

پیاری باتیں

☆ اگر بولنے والا یقین سے خالی ہو تو سننے والا تاثیر سے محروم رہتا ہے۔

☆ کسی کے بُرا کہنے سے نہ ہم بُرے ہو جاتے ہیں اور نہ وہ اچھا۔

☆ اپنی زبان سے ہر شخص اپنا ظرف دکھاتا ہے دوسرے کا عکس نہیں۔

☆ دنیا میں کوئی بھی شخص جاہل نہیں۔ کسی نہ کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

☆ سوچ گہری ہو تو فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

☆ انسان کا کردار ایسی مالا ہے، اگر گرہ کھل جائے تو تمام موتی بکھر جائیں۔

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا۔ جتنی کہ اس کی گفتگو۔

☆ تمہارا راز تمہارا قیدی ہے لیکن افشا ہونے کے بعد تم اس کے قیدی بن جاؤ گے۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو اندھیرے میں بھی راستہ دکھاتے ہیں۔

☆ دنیا میں خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم دوسروں کو خوش نہ کریں۔

مرسلہ۔ ناصر خان، کوئٹہ

کیک

ایک فقیر نے ایک بڑی کوٹھی کے باہر بھیک کے لیے آواز لگائی۔ ''اللہ کے نام پر روٹی سالن دے دو۔''

کچھ دیر کے بعد گیٹ کھلا اور ایک آٹھ سالہ لڑکا باہر آیا اور فقیر سے بولا۔ ''بابا! تمہیں روٹی نہیں ملتی؟''

بیٹا۔ ''روٹی کے لیے ہی تو در در بھیک مانگ رہا ہوں۔'' فقیر نے جواب دیا۔

لڑکا بولا۔ ''بابا اگر روٹی نہیں ملتی تو کیک کھا لیا کرو۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، احسن ابدال

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

اعتراض ہے؟''

''میں نے آپ کو تو منع نہیں کیا آپ چلے جائیں۔''

''کسی کے گھر اکیلا جاتا اچھا لگوں گا۔ تم ساتھ ہوگی تو اور بات ہوگی۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ ہو آئیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔''

وہ تیار ہونے لگا تو نسیمہ کو اپنا فیصلہ غلط نظر آنے لگا۔ افتخار کو وہاں اکیلا نہیں جانا چاہیے وہاں عنبرین بھی ہوگی۔ وہ بھی کوئی صحیح عورت نہیں، کبھی نہ کبھی مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میں ہمیشہ تو بہانے نہیں کرسکوں گی۔ جب جانا ہے تو آج کیوں نہیں۔ وہ بھی تیار ہوئی اور افتخار کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ اعجاز صاحب کی تو جیسے مراد بر آئی۔ اس وقت تو اپنے گھر میں تھے ویسے بھی شیر بنے ہوئے تھے۔ بڑی ڈھٹائی سے نسیمہ کے برابر ہی بیٹھ گئے اور ہنسی مذاق شروع کردیا۔ اس وقت وہ انہیں کوئی سخت جواب نہیں دے سکتی تھی۔ افتخار کو دکھانے کے لیے ہر مذاق پر ہنسنا بھی ضروری تھا۔ اسے تو یہ تک نظر انداز کرنا پڑا کہ اس نے افتخار کی نظر بچا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بس اتنا کرسکی کہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

وہ جب تک وہاں رہی، اپنے آپ کو کسی بھیڑیے سے بچانے کے لیے سرگرم رہی۔ گھر پہنچی تو افتخار کی زبان پر اعجاز صاحب اور عنبرین کے قصیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''تم ٹھیک کہتی تھیں۔ آباد پڑوس کی بات ہی اور ہوتی ہے کیا لوگ ملے ہیں ہمیں۔''

افتخار کو ان لوگوں نے ایسا شیشے میں اتارا تھا کہ اب ہر شام اس کی وہیں گزرتی تھی۔ مجبوراً نسیمہ کو بھی جانا پڑتا تھا۔ کبھی وہ آجاتے تھے۔ عنبرین کو ضرور ساتھ لاتے تھے تاکہ نسیمہ کو بھی شریک محفل ہونا پڑے۔ وہ افتخار سے ہنسی مذاق کرتی رہتی تھی اور اعجاز صاحب نسیمہ پر ڈورے ڈالنے میں مشغول رہتے تھے۔ اب انہوں نے زبان درازی کے ساتھ ساتھ دست درازی بھی شروع کردی تھی۔ ذرا موقع ملتا تو وہ نسیمہ کا ہاتھ تھام لیتے۔ نسیمہ نے کئی مرتبہ سرزنش کی لیکن وہ ماننے والے کب تھے الٹا دھمکیوں پر اتر آتے۔

''نسیمہ، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ چپ چاپ میری بات مانو ورنہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں کچھ بھی کر بیٹھوں گا۔''

نسیمہ کے لیے اب خاموش رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ اب ضروری ہوگیا تھا کہ وہ افتخار پر ان کی حقیقت کھول دے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اب وقت گزر چکا۔

''افتخار، آپ بہت پوچھتے ہیں کہ اعجاز صاحب کے سامنے میرا رویہ سرد کیوں ہوجاتا ہے یا میں ان کے گھر جانے سے گریز کیوں کرتی ہوں تو اس کی وجہ میں اب آپ کو بتاتی ہوں کیونکہ اب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ جو آپ کے دوست ہیں، ان کی نظر ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے جب بھی سامنا ہوتا ہے، ان کی آنکھیں میرے جسم کا طواف کرتی رہتی ہیں۔''

''تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ میرے بڑے بھائی سے بھی عمر میں بڑے ہیں اور تم ان کے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہو۔''

''تمہارے بڑے بھائی، مجھ سے ایسا گندا مذاق نہیں کرتے جیسا وہ کرتے ہیں۔''

''مذاق کرنا ان کی عادت ہے۔ اس میں کسی بری نیت کا دخل نہیں ہوتا ہوگا۔''

''افوہ، اب میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے گھر ان کا آنا ٹھیک نہیں۔''

''وہ میرے دوست ہیں، میں ان کو منع نہیں کرسکتا۔''

''وہ آئیں شوق سے آئیں لیکن میں ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

''کیا ہے یار تم تو اس بزرگ آدمی کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔ مذاق تو ان کی بیوی کے ساتھ میں بھی کرلیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہوگیا کہ میں.....''

''آپ صرف مذاق کرتے ہیں، آپ کی آنکھوں میں ہوس نہیں ہوتی۔''

''اگر بقول تمہارے ان کی آنکھوں میں ہوس ہے تو ہوا کرے۔ تمہاری نیت تو صاف ہے نا... تم کوئی بچی نہیں ہو کہ وہ تمہیں بھگا کر لے جائیں گے۔ وہ آئیں گے بھی اور تمہیں ان کے سامنے آنا بھی پڑے گا۔''

''جو باتیں میرے دل میں تھیں میں نے کہہ دیں۔ آپ کہتے ہیں تو سامنے آجاؤں گی۔''

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ان کے سامنے ضرور آئے لیکن کوئی ایسی کمزوری نہ دکھائے جس سے اعجاز کی حوصلہ افزائی ہو۔

افتخار پر ایسا نشہ چڑھا تھا کہ وہ اعجاز صاحب کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جب آتے تھے، ان کے جانے کے بعد وہ اس کی شکایت کرتی لیکن افتخار اسے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جھٹلا تا رہتا تھا۔ اس کی اچھی بھلی زندگی میں زہر گھل گیا تھا۔ روز اس کے اور افتخار کے درمیان جھگڑا ہوتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے وہ بات بھی کہہ دی جو اب تک اس کی زبان پر نہیں آئی تھی۔

''آپ جسے اتنا پارسا سمجھ رہے ہیں وہ صرف مذاق نہیں کرتا، آپ کی بیوی سے دست درازی بھی کرتا ہے۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ اس نے پہلے مجھے تحفہ دینے کی بھی کوشش کی تھی جو میں نے اس کے منہ پر دے مارا تھا پھر اس نے آپ سے دوستی گانٹھی تا کہ گھر میں گھس سکے۔ وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور آپ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔''

''اپنی بات اونچی رکھنے کے لیے اس شریف آدمی پر کوئی اور الزام ہو تو وہ بھی لگا دو۔ اگر تم سچی تھیں تو اسی وقت بتاتیں جب یہ معاملات ہو رہے تھے۔ اب ان کے لیے اٹھ کر تمہیں چائے بنانی پڑتی ہے تو یہ کہانیاں گھڑ لیں۔''

''افتخار یہ کہانیاں نہیں ہیں میرا یقین کرو۔''

''میں نے یقین کیا میرے باپ دادا نے یقین کیا۔ میں انہیں منع کر دوں گا اب وہ یہاں نہیں آئیں گے۔''

اس نے منع کیا یا نہیں بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ دوسرے ہی دن اعجاز صاحب آدھمکے۔ وہ اس وقت لائبہ کو سلانے کے لیے لیٹی تھی اور خود اس کی بھی آنکھ لگ گئی تھی کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ افتخار کے آنے کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا وہ سمجھی کہ افتخار آ گیا۔ نیند میں چلتے ہوئے دروازے پر گئی اور یہ پوچھے بغیر کہ دروازے پر کون ہے، دروازہ کھول دیا اور الٹے قدموں واپس ہو گئی۔ تقریباً صحن تک آ گئی تھی کہ لاشعوری طور پر پلٹ کر دیکھا اور اس کے ہوش اڑ گئے۔ یہ افتخار نہیں اعجاز صاحب تھے جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

''معاف کیجیے گا میں نے دیکھے بغیر دروازہ کھول دیا ورنہ ضرور یہ کہتی کہ ابھی افتخار نہیں آئے ہیں۔ جب وہ آ جائیں تو آیئے گا۔'' نسیمہ نے کہا۔

''ارے ہم اب غیر تو تھوڑی رہے ہیں۔ افتخار بھی آ جائیں گے۔ اس وقت تک ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''میں اس وقت لائبہ کو سلانے کے لیے لیٹی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ وہ سو جائے گی تو اور بھی اچھا ہے آپ جلدی سے اسے سلا کر ڈرائنگ روم میں آ جایئے۔''

اعجاز صاحب نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ نسیمہ بیڈ روم میں آ گئی۔

Oh my God

ڈاکٹر جانسن اور آلپور گولڈ اسمتھ انگریزی ادب کے نہایت مشہور ادیب اور ہم عصر گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں یورپ میں ملحدانہ خیالات کا زور بہت ہو گیا تھا۔ یہ دونوں تردید الحاد کے متعلق ایک بلند پایہ اور معرکۃ الآرا کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے کہ ان دنوں ایک ملحد (خدا کے وجود کا منکر) وہاں آ گیا اور تردید الحاد کی تصنیف کا ذکر سن کر ان کی حماقت پر ہنسا۔ ڈاکٹر جانسن ایک غیر معمولی قامت، اور گرانڈیل جوان تھے۔ ناراض ہو کر بوٹ سے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر لگائی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ (oh my God) ڈاکٹر نے کہا۔ یہ ہے وہ خدا جس کا تم انکار کرتے ہو۔

مرسلہ۔ عاطف شاہین 18، اوڈھ اروتی

لائبہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹ گئی پھر اس خیال سے کانپ گئی کہ اعجاز صاحب کہیں بیڈ روم میں نہ آ جائیں۔ اس نے سوچا وہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ جائے وہ کھا تھوڑی جائیں گے۔ اگر افتخار آ گئے تو وہ اسے میری بدتمیزی سمجھیں گے کہ میں ان کے دوست کو بٹھا کر خود سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس نے جلدی جلدی بالوں میں کنگھی پھیری اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

''آپ کی بیٹی سو گئی؟''

''جی ہاں۔''

''آپ ہیں بڑی ہوشیار۔ بیٹی کو سلا کر آئی ہیں تا کہ ہمیں مکمل تنہائی مل سکے۔''

''اعجاز صاحب، آپ اچھی خاصی عمر کے آدمی ہیں۔ آپ پر یہ باتیں اور ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ پلیز آپ یہاں آیا کریں تو شرافت سے آیا کریں۔''

''آپ کہیں تو بالکل ہی نہ آیا کروں۔''

''یہ اور بھی اچھا ہوگا۔''

''آپ یہ اخبار اٹھا دیں اور خود اپنے بیڈ روم میں جائیں۔ افتخار آئے گا تو میں اس سے بات کر لوں گا۔''

نسیمہ نے سوچا چلو تم روٹھے ہم چھوٹے۔ وہ اٹھی اور اخبار ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اخبار کے بجائے اس کی کلائی پکڑی اور اس زور کا جھٹکا دیا کہ وہ ان کی گود میں جا گری۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں پھر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس نے انہی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ افتخار ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اعجاز صاحب کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھ لیجیے اپنے دوست کے کرتوت اس نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔''

اس وقت اعجاز صاحب بھی دہاڑے۔ ''اس نے گلی سے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں سمجھا کہ تم گھر پر ہو میں آ گیا پھر اس شاطر عورت نے میری سادگی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ تم مجھ ہی کو مجرم سمجھو گے بدنام تو مرد ہی ہوتا ہے۔''

''پلیز آپ اس وقت چلے جائیں۔''

اعجاز صاحب سر جھکا کر ڈرائنگ روم سے نکل گئے اور افتخار بیڈ روم میں چلا آیا۔ نسیمہ بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ کے یہ دوست اچھے کردار کے حامل نہیں۔''

''بالکل کہا تھا اور اسی لیے کہا تھا کہ اگر کبھی پکڑی جاؤ تو الزام انہی پر آئے۔ عنبرین نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم اس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہو مگر مجھے تم پر اعتماد تھا۔ تم نے آج وہ اعتماد بھی ختم کر دیا۔''

''افتخار، تمہیں اس عورت پر یقین ہے مجھ پر نہیں۔''

''سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی تم پر یقین کر لوں۔ وہ دیوار پھاند کر اندر نہیں آئے ہوں گے۔ تم نے دروازہ کھولا ہوگا تو وہ آئے تم اتنی جلدی میں تھیں کہ دروازہ بند کرنا بھی بھول گئیں پھر بھی کہتی ہو یقین کر لوں۔ وہ تو خیر غیر ہیں ان سے کیا شکوہ تم تو میری امانت تھیں اور پھر جب دسترخوان کی طرح خود بچھ گئیں تو کسی کا کیا قصور۔''

''آپ میرا یقین کریں۔ میں سمجھی تھی آپ آئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر چلے آئے۔''

''بس اب بکواس بند کرو۔ اب میں سمجھا کہ تمہیں پڑوس آباد ہونے کی اتنی فکر کیوں تھی۔ تمہیں یہ کھیل کھیلنا تھا۔''

''میں تمہاری بیٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔''

''یہ میری بیٹی نہیں ہے۔ دو سال تک تمہاری اولاد نہیں ہوئی اور پڑوس آباد ہوتے ہی اولاد ہو گئی۔ کیا مطلب ہے اس کا۔''

''بس افتخار، اب ایک لفظ بھی آگے کہا تو منہ نوچ لوں گی تمہارا۔ تمہاری بیوی کی عزت پر کسی نے ہاتھ ڈالا ہے اور تم اس کی حمایت کر رہے ہو۔''

''کس منہ سے خود کو میری بیوی کہتی ہو، چالاک عورت۔'' افتخار نے نسیمہ کے منہ پر اتنی زور کا تھپڑ مارا کہ وہ بیڈ پر گر گئی۔

اتنا شور و غل ہوا تو لائبہ اٹھ گئی، نسیمہ نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

''افتخار اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری غلطی ہے تو بھی مجھے معاف کر دیں۔ اس معصوم کی واسطہ مجھے معاف کر دیں۔''

''میں تم دونوں کا وجود اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔ جیسی ماں، بیٹی بھی ویسی ہی ہوگی۔ اسے اٹھاؤ اور میری بلا سے جہاں چاہو چلی جاؤ۔''

''جب آپ کو مجھ پر اعتماد ہی نہیں تو یہاں رہنے کا فائدہ بھی کیا۔ میں امی کے گھر جا رہی ہوں، اب تم خود لینے آؤ گے تو آؤں گی۔''

افتخار اتنے غصے میں تھا کہ اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جھنجلا کر کمرے سے نکلا اور ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ نسیمہ نے اپنے کپڑے اٹیچی میں رکھے تھوڑا بہت جو زیور تھا وہ ساتھ لیا اور افتخار کو بتائے بغیر گھر سے نکل گئی۔ ٹیکسی کی اور ماں کے گھر پہنچ گئی۔

''ماں، تم نے تو کہا تھا کہ جو پڑوس آباد نہیں ہوتے وہاں بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ مجھ پر تو پڑوس آباد ہونے پر بلائیں نازل ہو گئیں۔''

اس نے ماں کو پوری بات بتائی۔ ماں کا اصرار تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ وہ افتخار کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ اتنے غصے میں تھی کہ خود بھی نہیں گئی اور ماں کو بھی روک لیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب افتخار کا غصہ اترے گا اور اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو وہ خود اسے لینے آئے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

دن پر دن گزرتے گئے پھر ایک دن وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ خوش ہو گئی کہ شاید وہ اسے لینے آیا ہوگا لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔ ایک مرتبہ پھر پچھلی باتیں دہرائی گئیں۔ افتخار کی ماں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایسی بدکردار بہو کو اپنے بیٹے کے ساتھ نہیں رہنے دیں گی۔ نسیمہ کی ماں نے بہت خوشامد کی، بڑے ہاتھ جوڑے لیکن افتخار نے اسے طلاق دے دی۔

''طلاق کے باقاعدہ کاغذات تمہیں چند روز میں مل

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جائیں گے۔ لائبہ میری بیٹی نہیں لیکن پھر بھی رحم کھا کر کچھ نہ کچھ اس کے لیے کہیں دیتا رہوں گا۔''

''مجھے تمہارے چند ٹکوں کی ضرورت نہیں۔ اپنی بچی کو میں خود پال لوں گی۔ اب آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتے ہیں۔'' افتخار کی سنگدلی نے اس کی آنکھوں میں آئے آنسو بھی نہ دیکھے اور اپنی ماں کو لے کر چلا گیا۔

وہ تو مطمئن تھی لیکن خاندان والوں کو چین کہاں۔ الزام اسی پر آیا۔ ہر زبان یہی کہتی نظر آرہی تھی کہ کوئی ایسی بات ہوگی کہ میاں نے چھوڑ دیا۔ بیٹی تک کی پروا نہیں کی۔ قریبی رشتے داروں تک نے اس سے ملنا چھوڑ دیا پھر معلوم ہوا افتخار بیرون ملک چلا گیا ہے۔ بیٹی کے نام پر جو چند پیسوں کا آسرا ہوسکتا تھا وہ بھی نہ رہا۔ اس نے ایک اسکول میں نوکری کرلی اور اپنی بیٹی کی پرورش میں مگن ہوگئی۔

☆☆☆

وہ کسی کام سے دروازے پر گئی تھی کہ اس نے سرخ رنگ کی ایک کار دیکھی جو اس کے دروازے سے کچھ فاصلے پر آکر رکی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی نظریں اس گاڑی پر ٹک گئیں اور پھر ہٹنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی گاڑی سے اس کی بیٹی لائبہ اتری تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکا باہر آیا۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر لڑکا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ نسیمہ نے دروازہ بند کیا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر میں دروازے پر لگی بیل بجی ..... اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

لائبہ کتابیں پھینک کر غسل خانے میں گھس گئی۔ نسیمہ نے کھانا لگا دیا۔ لائبہ یونیورسٹی سے آتے ہی کھانا مانگتی تھی، نسیمہ خیال رکھتی تھی کہ کھانے میں دیر نہ ہو۔ کھانے کے بعد جب لائبہ آرام کے لیے بستر پر لیٹی تو نسیمہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''بیٹی، آج کچھ دیر نہیں ہوگئی تھی؟''

''امی آپ کو پتا ہے بسوں میں کتنا رش ہوتا ہے۔ پائدان پر کھڑی ہوکر آئی ہوں پھر بھی دیر ہوگئی۔'' نسیمہ کے آنسو دل میں اترنے لگے۔ لائبہ نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ آدمی جھوٹ اسی وقت بولتا ہے جب اس نے کسی ایسے راستے کا انتخاب کیا ہوتا ہے جسے وہ خود سمجھتا ہو کہ مناسب نہیں ہے۔

''بس سے اتر کر بھی اچھا خاصا پیدل چلنا پڑتا ہے تھک گئی ہوگی۔'' نسیمہ نے اس کا جھوٹ مزید پکا کرنے کے لیے کہا۔

''اور نہیں تو کیا۔''

''میری تربیت ایسی تو نہیں ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ بولو۔''

''اس میں جھوٹ کیا ہے امی۔'' لائبہ اپنا دفاع کررہی تھی لیکن اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''وہ لڑکا کون ہے جو تمہیں اپنی کار میں یہاں تک چھوڑ کر گیا ہے؟''

''تو آپ نے اسے دیکھ لیا؟''

''ہاں اور یہ بھی دیکھ لیا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔''

''وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔''

''وہاں اور لڑکے بھی پڑھتے ہوں گے۔ وہ سب تمہیں چھوڑنے کیوں نہیں آتے؟''

''فرحان سے میری دوستی ہے، سب سے نہیں۔''

''سب سے کیوں نہیں؟''

علی سفیان آفاقی مرحوم کی آخری تحریر

فلمی الف لیلہ

قسط 237

سرگزشت شمارہ مارچ 2015ء میں ملاحظہ کریں

اسے یقیناً آپ محفوظ رکھنا پسند کریں گے

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

''اس لیے کہ فرحان کو میں پسند کرتی ہوں۔''

''اور وہ؟''

''ظاہر ہے وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔''

''اس سے کہنا اپنے والدین کو میرے پاس بھیجے۔''

''وہ کس لیے امی؟''

''احتیاط کا تقاضا ہے کہ میں یہ بات اس کے والدین تک پہنچاؤں۔ میں نے تمہارے باپ کے مرنے کے بعد تمہاری پرورش بڑی احتیاط سے کی ہے۔ جن بچوں کے سروں پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا ان پر الزام لگتے دیر نہیں لگتی۔ لوگ اندھے نہیں ہیں جو تمہیں اس کے ساتھ آتے ہوئے نہ دیکھتے ہوں۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس کے والدین کی پسندیدگی بھی ضروری ہے۔''

''امی آپ بھی کس زمانے کی بات کر رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں دوستیاں ہوتی ہیں' والدین سے پوچھ کر نہیں ہوتیں۔''

''اگر یہ محض دوستی ہے تو تم کل سے یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔''

''امی' ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔''

''یہ سب باتیں اس کے والدین سے ہوں گی۔ اس سے کہنا اپنے والدین کو میرے پاس بھیجے۔ میں صرف ایک ہفتہ دے رہی ہوں اس کے بعد کچھ نہیں۔''

''امی آپ تو.....''

''جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔''

لائبہ نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ باتیں ناگوار گزری ہیں۔

نسیمہ کو دکھ تو ضرور ہوا تھا کہ اس نے لائبہ کو اداس کر دیا لیکن ..... نصیحت کے لیے یہ ضروری تھا۔ اسے یقین تھا کہ یونیورسٹی کی دوستیاں کھیل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے والدین کو نہیں لا سکے گا۔ میری بات بھی رہ جائے گی اور لائبہ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ لائبہ پر اس لڑکے کی حقیقت کھل جائے گی۔

''مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے والدین آئیں گے۔'' ایک دن لائبہ یونیورسٹی سے آئی تو بہت خوش تھی۔ اس نے آتے ہی خوش خبری اپنی ماں کو بھی سنا دی۔ ''فرحان کے والدین کل ہمارے گھر آ رہے ہیں۔''

''بہت اچھی بات ہے لیکن ایک بات ابھی سے بتا دوں کہ انکار کروں یا اقرار' یہ میرا اختیار ہوگا۔''

''میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں۔ جو آپ کہیں گی وہی ہوگا۔''

اس نے کہنے کو کہہ تو دیا لیکن دل ہی دل میں سوچا وہ اپنی بیٹی کی خوشی ضرور پوری کرے گی۔ وہ لوگ جیسے بھی ہوئے لڑکا تو اچھا ہے' وہ انکار نہیں کرے گی۔

دوسرے دن وقتِ مقررہ پر گاڑی کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ لائبہ کا دروازے پر جانا مناسب نہیں لگا۔ وہ خود دروازے پر گئی۔ سرخ رنگ کی وہی گاڑی دروازے پر کھڑی تھی جو وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ ایک لڑکا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو لائبہ کو چھوڑنے آیا تھا۔ جو مرد گاڑی سے باہر آیا وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن وہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ یہ اعجاز صاحب تھے جن کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی۔ عنبرین کو پہچاننے میں بھی اسے کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ انہیں دروازے سے ہی واپس لوٹا دے بلکہ اسی طرح ذلیل کر کے لوٹائے جیسے وہ اپنے گھر سے نکالی گئی تھی لیکن اسے لائبہ کی خوشی کا خیال آ گیا۔ اعجاز صاحب گاڑی سے اتر کر دروازے تک آ چکے تھے اور غالباً نظر کمزور ہونے کی وجہ سے پہچان نہیں سکے تھے۔ عنبرین بھی اسے غور سے دیکھ ضرور رہی تھی لیکن پوری طرح پہچان نہیں سکی تھی۔ فرحان انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اسے ان لوگوں کو لے کر ڈرائنگ روم آنا پڑا۔

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم نسیمہ ہو؟'' عنبرین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اعجاز صاحب نے اپنا چشمہ صاف کیا۔

''میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں' پہلی نظر میں تمہیں پہچان گیا تھا۔ اس لیے ظاہر نہیں کیا کہ کہیں تم ہمیں دروازے سے ہی نہ لوٹا دو۔''

''جو مزہ گھر میں بلا کر نکالنے میں ہے' دروازے سے لوٹانے میں کہاں۔''

''نسیمہ، تمہاری ناراضی بجا ہے بعض غلط فیصلوں نے تمہارا گھر خراب کر دیا۔ تم ہمیں جو سزا چاہے دے لو۔'' اعجاز صاحب کی جگہ عنبرین نے جواب دیا۔

''سزا... میں کیا دے سکتی ہوں بس اتنی گزارش ہے کہ یہ کہہ کر یہاں سے، باہر چلی جاؤ کہ تمہیں لائبہ پسند نہیں آئی۔''

''ایسا نہ کہو' لائبہ میری نہیں میرے بیٹے کی پسند ہے۔''

''تو پھر یہ سمجھ لو میری طرف سے انکار ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net

''میں یہ بھی سننا نہیں چاہوں گی۔'' عنبرین اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ''ایک غلطی ہم سے ہوئی تھی' دوسری تم کر رہی ہو۔ یہ ہماری نہیں ہمارے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔''

''میری غیرت کا بھی سوال ہے۔ مجھے یہ کہنے دو عنبرین کہ تمہارے شوہر نے میرا شوہر چھین لیا۔ اب میں کس منہ سے کہوں گی کہ وہی شخص میری بیٹی کے شوہر کا باپ ہے۔''

''نسیمہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ نہ ہم اپنی زبان پر لائیں گے۔ یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ یہ شادی کر دو اعجاز حتی الامکان کوشش کریں گے کہ تمہارے سامنے نہ آئیں۔''

''یہ کبھی میرے سامنے نہ آئیں لیکن ان کی آنکھیں بیس سال سے میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ آنکھیں میری بیٹی کو دیکھیں۔ میری طرف سے انکار ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

''نسیمہ دیکھ لو، تم اپنی بیٹی کی خوشیوں کو قتل کر رہی ہو۔''

''مجھے دکھ ہے لیکن میں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔''

باتیں اور بھی ہو سکتی تھیں لیکن اسی وقت لائبہ ناشتا لے کر آ گئی اور عنبرین کے اصرار پر اسے وہاں بیٹھنا بھی پڑا۔ نسیمہ اس سے بھی یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ ناشتا اٹھا کر لے جاؤ۔

نسیمہ نے گردن جھکائے بیٹھی لائبہ کی طرف دیکھا۔ کیا میں اتنی مفلس ہو گئی ہوں کہ اپنی بیٹی کو اس کی پسند کا تحفہ بھی نہ دے سکوں۔ میں نے اسے زندگی میں کیا دیا ہے اب اسے یہ تحفہ دینے سے بھی انکار کر رہی ہوں۔ اعجاز صاحب کا دیا ہوا تحفہ میں نے ان کے منہ پر دے مارا تھا لیکن وہی تحفہ مجبوراً قبول بھی تو کرنا پڑا تھا۔ اس وقت بھی مجبوری ہے۔ عنبرین ٹھیک کہتی ہے کہ مجھے لائبہ کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں اب نوعمر لڑکی نہیں ہوں۔ اعجاز صاحب بھی بڑھاپے کی منزل میں ہیں۔ میں اگر ماضی کو دفن کر دوں تو لائبہ کی خوشی خرید سکتی ہوں۔

لائبہ کمرے سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ عنبرین اور اعجاز صاحب انکار سن چکے تھے' اب ان کا وہاں بیٹھنا فضول تھا۔

''اچھا بہن، ہمیں اجازت دو' میں ناامید نہیں ہوئی ہوں۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دے رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارا انکار، اقرار میں بدل جائے۔''

''میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔ لائبہ کے امتحان ہو جائیں تو پھر ہم بیٹھ کر تاریخ طے کر لیں گے۔'' عنبرین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو الفاظ اس نے سنے ہیں' نسیمہ ہی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اعجاز صاحب بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے میرے سابقہ گناہ معاف کر دیے ہیں۔''

''اعجاز صاحب' میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتی جب آپ کی وجہ سے میرا شوہر مجھ سے چھن گیا تھا۔ میری موت ہی شاید یہ منظر مجھ سے چھین سکے۔ میں آپ کو معاف کرتی ہوں محض اس لیے کہ اب میری بیٹی کی زندگی آپ کے بیٹے سے وابستہ ہے۔''

اعجاز صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس طرح کمرے سے نکلے جیسے اقرار نہیں انکار ہوا ہو۔

لائبہ کے امتحان ہونے والے تھے۔ امتحانوں کے بعد اس کی شادی تھی۔ تیاریاں تو ابھی سے کرنی تھیں۔ نسیمہ کو یہ دکھ گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا کہ اعجاز صاحب سے اس کی رشتے داری ہونے والی ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس سے اس کا دیا ہوا تحفہ قبول ضرور کر لیا ہے لیکن ایک دن وہ اس تحفے کو ان کے منہ پر ضرور مارے گی۔

وقت گزرتا رہا اور شادی کا دن آ گیا' اس دوران کئی مرتبہ اعجاز صاحب سے اس کا سامنا ہوا تھا اور ہر مرتبہ اسے یوں لگا تھا جیسے چشمے کے پیچھے چھپی آنکھیں اب بھی بغاوت پر تلی بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ اب بھی کوئی تحفہ دینے کے لیے بے تاب ہیں۔ لائبہ کی شادی کو صرف ایک ہفتہ ہوا تھا کہ محلے والوں کے ذریعے اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی ماں نے خودکشی کر لی۔ اعجاز صاحب اس وقت گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے عنبرین اور لائبہ کو ساتھ لیا اور نسیمہ کے گھر پہنچ گئے۔ لاش کے سرہانے ایک پرچہ رکھا تھا جس میں لکھا تھا۔

''اس گھر میں آباد نہ ہونا جن کے پڑوس آباد ہوں۔''

اعجاز صاحب کے سوا اس تحریر کا مفہوم کوئی بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سفر در سفر

منظر امام

جسم متحرک رہے یا ساکت... زندگی کا سفر جاری رہتا ہے کیونکہ خواہشوں کا انبار ہو یا خوابوں کی رنگینیاں انسان کو مسلسل سفر پر مجبور کردیتی ہیں لیکن... یہاں عجیب صورت حال تھی، نہ خواہشوں کی زنجیر تھی نہ خوابوں کی کشش... اس کے باوجود قدم کسی پڑاؤ پر ٹھہر نہیں پاتے تھے... تھکن غالب آتی تھی نہ بے زاری قید کرتی تھی۔ ہر اک موڑ پر منزل کا گمان ہوتا رہا لیکن اس کا تعین کرنا ان بے خبر مسافروں کے بس کی بات نہ تھی، بے شک کوئی بھی سفر علم، تجربات و مشاہدات اور سوچ کو گہرائی دیتے ہیں اس کے باوجود وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھے۔ جب دل کسی کے ساتھ کا متمنی ہوجائے تو ہر تمنا اسی کی خوشیوں سے منسوب ہوجاتی ہے۔ اس کے دل کی بھی ہر دھڑکن بس اپنے محبوب کا ساتھ چاہتی تھی مگر تقدیر کی بے حسی کہ اسے کسی اور ہی جہاں میں لے جاکر بسا دیا۔ ایسے میں دل لہو نہ برسائے تو کیا کرے... اتنی طویل مسافت کے بعد جب مسافر کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑے تو کیسے کوئی اس کے درد کی شدتوں کو محسوس کرسکتا ہے۔ وہ بھی محبوب کے دیار سے نارسائی کا غم لیے لوٹا اور اپنی ہی ذات کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہوگیا کہ شاید مقدر کو یہی منظور تھا۔

وحشتوں کے حصار میں قید ایک صحرانورد کی دلدوز داستان

سوائے بادلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سورج کی کرنیں ان بادلوں کو چاندی جیسا روپ دے رہی تھیں۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے طیارے کے اندر کے ماحول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کیونکہ خود میرے اندر یادوں کا ایک سفر بہت تیزی سے طے کر رہا تھا۔ مہربان یادیں۔ بے رحم یادیں..... میرے پاس اب یادیں ہی تو رہ گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو فراموش کرنے اور غزالہ کی یادوں کی پرچھائیوں سے نجات کے لیے اتنی دور کا سفر اختیار کیا تھا۔ غزالہ میری محبت تھی۔ میری بیوی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ زندگی کے کئی مراحل طے کیے تھے۔ کالج جاتے رہے۔ ایک ساتھ ڈاکٹر ہوئے، ایک ساتھ ہاؤس جاب کی پھر ایک ساتھ ایک بڑے ہاسپٹل میں جاب بھی کرلی۔

زندگی اور خدا کی بے شمار مہربانیاں ہمارے ساتھ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksurge.net/
http://www.urdutube.net/

http://www.bookstube.net
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھیں پھر ہماری شادی ہوگئی۔ یہ ایک پیار بھری اور شاندار شادی تھی۔ ہم دونوں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔ اس لیے خوب شاندار انداز میں شادی ہوئی تھی۔

ہم تو ویسے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور اب یہ ساتھ اور زیادہ مستحکم ہوگیا تھا۔ اسی دوران میں غزالہ بیمار ہوئی۔ یہ شادی کے ایک سال بعد کی بات ہے۔ میں اس کہانی میں غزالہ کی یادوں کا عنصر زیادہ شامل نہیں کررہا۔ یہ کہانی تو اس عظیم المیے کے بعد شروع ہوتی ہے جو المیہ میرے ساتھ پیش آیا اور جس نے مجھے برباد کرکے رکھ دیا۔ وہ المیہ تھا غزالہ کی موت۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ہم جس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں جس کو ایک پل کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے، بے رحم وقت کے ہاتھ اسے ہمیشہ کے لیے چھین کر لے جاتے ہیں اور ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

غزالہ کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑے آرام اور سکون کے ساتھ اس دنیا کو خیرباد کہہ گئی تھی۔ خدا نے بس اتنے ہی دنوں کے لیے اسے میرا شریکِ سفر بنایا تھا۔ جانے اس میں خدا کی ایسی کون سی مصلحت ہوگی۔

اس کی موت کے بعد میں بکھر کر رہ گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ ہم جیسے انسانوں کی زندگی کے اثاثے ہی کیا ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اس طرح چھن جاتے ہیں۔

میں نے اپنی جاب چھوڑ دی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ گھر والے بھی سمجھایا کرتے تھے لیکن غزالہ کو بھلا دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک دن میرے ایک دوست صفدر کا فون آگیا۔

''احمر! تم اس وقت کیا کررہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں، میں کیا کرسکتا ہوں۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''میں گھر میں ہوں۔''

''تم ایسا کرو میرے پاس آجاؤ۔ تمہیں کہیں لے کر جانا ہے۔''

''نہیں بھائی، میرا کہیں آنے جانے کا دل نہیں چاہتا۔''

''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ آجاؤ تمہاری ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

میں انکار کرتا رہا لیکن اس نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ بہرحال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ ''ہاں بتاؤ۔ ایسا کون سا ضروری کام ہے؟''

''تمہیں میرے ساتھ کہیں چلنا ہوگا۔'' اس نے بتایا۔

''صفدر تم جانتے ہو کہ میں اب کہیں آتا جاتا نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے لیے دنیا میں ایسا کچھ نہیں رہ گیا۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔ کسی کے جانے سے دنیا ختم نہیں ہوتی۔''

''غزالہ کسی میں سے نہیں تھی۔ وہ صرف غزالہ تھی۔''

''جانتا ہوں۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ تم نے بھابی کی موت کے بعد جو انداز اختیار کیا ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ پاگل پن ہے۔ تم کسی ایک کی یاد کے لیے نہ جانے کتنوں کو دکھ دے رہے ہو۔''

''اچھا بھائی۔ کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے اس کی باتوں سے اکتا کر پوچھا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔

پھر میں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جارہا ہے۔ وہ مجھے ایک شاندار سے دفتر میں لے آیا تھا جہاں ادھیڑ عمر کا ایک باوقار آدمی موجود تھا۔ جس کا نام اوبانگا تھا۔

اس کا نام افریقی جیسا تھا لیکن وہ کسی صورت بھی افریقی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی ہی طرف کا بندہ معلوم ہوتا تھا۔

ہم اس کے دفتر کے خوبصورت کمرے میں بیٹھے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر احمر! سب سے پہلے تو میں آپ کی وہ حیرت دور کردوں جو میرا نام سن کر ہوئی ہوگی۔''

''جی ہاں جناب۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''مجھے واقعی حیرت ہوئی ہے۔''

''اوبانگا میرا اسمِ گرامی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ویسے میرا نام عبدالکریم ہے۔ پورا نام بنتا ہے عبدالکریم اوبانگا۔ میرے دادا کسی زمانے میں ساؤتھ افریقا چلے گئے تھے۔ وہیں انہوں نے تجارت کی بہت کامیاب ہوئے پھر وہیں وہ اوبانگا ہوگئے۔ کس طرح ہوئے، یہ میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد میرے والد بھی اوبانگا ہوگئے اور اب میں بھی اوبانگا ہوں۔''

''بات سمجھ میں آگئی۔''

''ویسے ہمارا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔'' اس نے بتایا۔

اس دوران چائے آگئی تھی۔ چائے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل بات شروع ہوگئی۔

''مسٹر احمر!'' اوبانگا نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہمارا ساتھ دیں۔''

''آپ کا ساتھ دوں..... وہ کس طرح؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''اپنی خدمات پیش کر کے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ ساؤتھ افریقا چلے جائیں۔''

''ساؤتھ افریقا وہ کیوں؟''

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ اس کی ایک این جی او ہے جو افریقہ کے دور دراز علاقوں میں جا کر بچوں اور عورتوں کی فلاح کا کام کرتی ہے۔ اس این جی اوز میں بے شمار ڈاکٹرز بھی ہیں جو افریقا کے پس ماندہ اور غریب بچوں کا علاج کرتے ہیں۔ اس این جی او کے ذریعے جانے والوں کو حکومت کی طرف سے آسانیاں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ معقول معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس نے کچھ دیر رک کر کہا۔ ''آپ کے لیے وہاں جانا بہت ضروری ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''آپ کے بارے میں صفدر صاحب نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ وہاں جا کر مصروف ہو جائیں گے۔ آپ پرانی یادوں کو اپنے ذہن سے جھٹک تو نہیں سکتے لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ آپ کا دل بہل جائے گا۔ کچھ دنوں کے لیے آپ یادوں کی پرچھائیوں سے الگ ہو سکیں گے۔''

''ہاں احمر۔'' صفدر نے بھی کہا۔ ''تمہارے لیے یہ بہت ضروری ہے۔''

''آخر کیوں ضروری ہے؟''

''ایک تو تم ڈاکٹر ہو۔ یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ تمہیں افریقا کے قبائل سے بہت دلچسپی ہے۔ تم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔''

''ہاں، یاد ہے مجھے۔''

''تو تمہیں یہ چانس مل رہا ہے۔'' صفدر نے کہا۔ میکس میں جانتا ہوں کہ تم بچوں سے بھی بہت پیار کرتے ہو۔ تم ڈاکٹر بھی ہو تم ان کے علاج میں ضرور دلچسپی لو گے اور دوسری طرف کچھ عرصے کے لیے مصروفیت تمہیں اداس نہیں ہونے دے گی۔''

بہر حال کئی دنوں کے بحث مباحثے کے بعد میں نے رضا مندی ظاہر کر دی۔ ساری تیاریاں ایک ہفتے میں مکمل ہو گئیں اور میں ساؤتھ افریقا کے لیے روانہ ہو گیا۔

ابھی طیارہ پری ٹوریا کے گابو... انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ یہ ایک طویل فلائٹ تھی۔ طیارے کے مسافروں کی بھی منزل آ چکی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا ائرپورٹ تھا۔ ہر قسم کی جدید سہولیات موجود تھیں۔ ہر طرف چمکتے دمکتے ہوئے چہرے۔ عام طور پر کام کرنے والے اور مزدور وغیرہ سیاہ فام تھے۔ سفید فام بھی تھے لیکن وہ ابھی تک اعلیٰ عہدوں والے لوگ تھے۔

لاؤنج سے باہر نکلا تو ایک آدمی میرے نام کا کارڈ لیے کھڑا تھا۔ وہ سیاہ فام ہی تھا لیکن بہت اسمارٹ تھا اور نیلے رنگ کے یونیفارم میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اپنا تعارف کروایا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ہم دونوں کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہو رہی تھی۔

''میرا نام گانا وانو ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ جس این جی او کے ذریعے یہاں تک آئے ہیں میں ساؤتھ افریقا میں اس این جی او کا نگراں مقرر کیا گیا ہوں۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی گانا وانو۔''

ہم ایک بڑی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ گاڑی گانا وانو ہی چلا رہا تھا۔ صاف ستھری سڑک اور خوبصورت عمارات کے سلسلے دور تک چلے گئے تھے۔

''اس ائرپورٹ کو گابو انٹرنیشنل ائرپورٹ کہتے ہیں مسٹر احمر۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ سینٹری پری ٹوریا سے اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم کچھ ہی دیر میں اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔''

''اور یہ منزل کیا ہے مسٹر گانا وانو۔''

فی الحال تو نیلسن ہوٹل ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں نیلسن کے نام پر بہت کچھ بنا دیا گیا ہے۔ نیلسن پارک نیلسن میوزیم نیلسن ہوٹل، نیلسن شاپنگ مال اور نہ جانے کیا کیا۔ بس ایک ہوا چل نکلی ہے۔ اب دیکھیں سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔''

ہوٹل بہت خوبصورت تھا۔ ہر قسم کی سہولیات موجود تھیں۔ وہاں این جی او کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کچھ مقامی حکام اور ڈاکٹرز بھی تھے۔

رسمی گفتگو اور تعارف کے بعد مجھے تیسری منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھے ایک ہفتے تک اسی کمرے میں رہنا تھا۔ اس کے بعد آگے سفر کرنا تھا۔

جو کمرا مجھے دیا گیا تھا وہ بھی بہت خوبصورت اور آرام دہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی ہوٹل کے سوئمنگ پول کی طرف کھلتی تھی جہاں مرد اور عورتیں سوئمنگ میں مصروف تھے۔

جنوبی افریقا کی کہانی میں بھی بہت نشیب و فراز ہیں۔ اس سرزمین نے بہت سی جنگیں دیکھی ہیں۔ اس کے اصل باسی زولو تھے۔ افریقہ کی ایک جنگجو اور بہادر قوم۔ یہ لوگ اپنی روایات اور اپنے کلچر کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے کہ ڈچ لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔

زولو پہلے بوئروں سے لڑتے رہے پھر انگریزوں کی آمد

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksure.net
http://www.urdutube.net

شروع ہوئی۔ انگریز جہاں جاتے وہاں اپنی ایک کالونی بنانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

زولو لوگوں کے لیے شاکا... کا عہد بہت اہمیت کا حامل ہے وہ 1828-1816 تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے دور میں زولوؤں کو بہت عروج حاصل ہوا۔

پھر انگریزوں نے آ کر ان کو اپنا غلام بنانا شروع کر دیا۔ انگریزوں سے ان کی جنگوں کی داستان بہت طویل ہے۔ انگریزوں سے ان کا آخری معرکہ 1906 میں چیف بام باتھا کی سربراہی میں ہوا تھا اس کے بعد زولو مغلوب ہوتے چلے گئے۔

ساؤتھ افریقا پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ پھر وہی ہوا جو آقا اپنے غلام کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ کالوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ ہوتا رہا۔

ہوٹلوں اور پارکوں وغیرہ میں کتوں کا داخلہ تو شاید ممنوع نہ ہو لیکن کالوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ بہرحال آزادی کے متوالے لوگوں نے ایک طویل جنگ لڑی۔ نیلسن منڈیلا کا نام قابل ذکر ہے پھر انگریزوں نے اس سرزمین کو آزاد کر دیا۔

اب زولوؤں پر ساؤتھ افریقا کے حکمران ہی حکومت کرتے ہیں۔ بہت سے زولو شہر آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے انگریزوں کی لائی ہوئی نئی تہذیب قبول کر لی لیکن آج بھی وہ اپنی روایات اور اپنے کلچر ہی سے وابستہ ہیں۔ شہروں میں رہنے والے زولو Kwazulu اور Nguni کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی بولتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ ساری معلومات مجھے ہوٹل میں آتے ہی معلوم نہیں ہوگئی تھیں بلکہ آہستہ آہستہ معلوم ہوتی رہی تھیں لیکن میں نے کہانی کے بیان کو قائم رکھنے کے لیے کچھ ابتدائی باتیں بتادی ہیں۔

بہرحال میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں نے آواز لگائی۔

''اندر آجاؤ۔''

آنے والی ایک لڑکی تھی جس کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکیس بائیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بہت خوبصورت لیکن اس کے نقوش کچھ مختلف تھے۔ ان میں ایک خاص طرح کا اسرار تھا جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کر سکتے۔ اس نے مکمل سفید لبادا سا پہن رکھا تھا جس نے اس کی شخصیت کو اور بھی دل آویز بنا دیا تھا۔

غزالہ کے بعد وہ پہلی لڑکی تھی جس کو میں اس طرح مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ میری محویت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ ''میرا نام تماچی ہے۔'' اس نے بتایا۔

اب مجھے جیسے ہوش آ گیا تھا۔ ''اور میں احمر ہوں۔''

''ڈاکٹر احمر! آپ کا نام مجھے بتا دیا گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''بہرحال یہاں میں آپ کی گائڈ ہوں اور جنگل میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہم کئی ٹیمیں ہیں جو مختلف علاقوں کی طرف روانہ ہو رہی ہیں۔ آپ کی ٹیم میں چار آدمی ہیں۔ ایک میں، ایک ڈاکٹر برنارڈ۔ چونکیے نہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ کوئی اور ہیں۔ ایک مقامی مزدور اور ایک آپ۔''

''بہت شکریہ تماچی کہ تم نے ذرا سی دیر میں بہت کچھ بتا دیا۔''

''آپ کے پاس ایک ہفتہ ہے مسٹر احمر اگر آپ کہیں تو میں آپ کو پری ٹوریا کی سیر کرا دوں۔''

''ضرور۔'' میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔''

''ہاں، ہر شام کو ہمارے ماہرین لیکچرز دیا کریں گے۔ وہ اس لیے کہ ہم جن لوگوں کے درمیان جا رہے ہیں، ان کے بارے میں معلومات ہو جائے۔''

''یہ اور بھی اچھی بات ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ بتاؤ کہ ہمارے اور ان کے درمیان گفتگو کیسے ہوا کرے گی۔ میرا مطلب ہے کہ ہم ان کی باتیں کیسے سمجھ سکیں گے؟''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہمیں زولوؤں کی زبان کی ٹریننگ دے دی گئی ہے۔ میں کچھ کچھ بولتی اور سمجھتی ہوں۔''

''گڈ..... یہ اور بھی اچھا ہے۔''

''اس وقت آپ آرام کریں۔ میں کل سے آپ کے گائڈ کے فرائض انجام دوں گی۔ اس وقت تو تعارف کے لیے آ گئی تھی۔''

تماچی کے جانے کے بعد میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہت ہی مہذب لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے حسن بھی بہت مختلف پایا تھا۔ اس میں خود اعتمادی بھی تھی اور اس کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ ویسے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ساؤتھ افریقا میں عام طور پر دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک انگریزی دوسری افریقن۔

افریقن زبان ڈچ لوگوں کا تحفہ ہے وہ جب یہاں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آئے تھے تو انہوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے افریقن زبان اور اپنی زبان کا ایک ملغوبہ تیار کرلیا۔ اس کو آج افریقن کہا جاتا ہے۔

دوسری صبح میں نے کمرے ہی میں ناشتا کیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر میں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف خوبصورت دمکتے ہوئے چہرے۔ ہر ملک اور ہر طرح کے لوگ، کچھ دیر بعد گاناوانو بھی آ گیا۔ یہ آدمی بھی مجھے پسند آیا تھا۔ اس میں ایک بے تکلفی سی تھی جو بہت کم لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔

''ہیلو مسٹر احمر۔'' وہ میرے سامنے والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''اپنی گائڈ سے ملاقات کرلی۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اچھی لڑکی ہے۔''

''تماچی ایک پراسرار لڑکی ہے مسٹر احمر۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔ ''وہ ان معنوں میں پراسرار نہیں ہے کہ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہے یا وہ بھوت بن کر غائب ہوجاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر تم اسے پراسرار کیوں کہہ رہے ہو؟''

''یہی تو کسی کو نہیں معلوم کہ اسے پراسرار کیوں سمجھتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو اور یہ ''کچھ نہ کچھ'' خود میں نے بھی محسوس کیا ہے۔''

''اس کے باوجود وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت مہذب، بہت ذہین۔''

اس دوران گاناوانو کے اشارے پر کافی آ گئی۔ ہم کافی پیتے اور سیاست پر باتیں کرتے رہے۔ گاناوانو کی عالمی سیاست پر بھی گہری نگاہیں تھیں۔

کچھ دیر میں تماچی آ گئی۔ اس نے مجھے اور گاناوانو کو لاؤنج میں بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے بھی ایک کپ کافی پی پھر ہم دونوں ہوٹل سے روانہ ہوگئے۔ گاناوانو وہیں رہ گیا تھا۔

ہمارے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر دیا گیا تھا جسے خود تماچی ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

اس نے پری ٹوریا کے بارے میں بتانا شروع کر دیا کہ کب آباد ہوا اور پہلے یہ شہر کیسا تھا اور یہ کیسا ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ساؤتھ افریقا کے بارے میں بتایا کہ اس کے نوصوبے ہیں۔ اس کی باتوں کا انداز بہت دلکش تھا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میوزیم ہے اس کا نام افریقن ونڈر کھا گیا ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے میوزیم کی صاف ستھری عمارت کی طرف دیکھا۔

''یہاں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔'' اس نے بتایا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے یہ کہہ دوں کہ پورے جنوبی افریقا میں دیکھنے کے لائق صرف ایک چیز ہے اور وہ تم ہو لیکن میں اس سے یہ نہیں کہہ سکا۔

جانے کیوں اس قسم کے جذبات میرے سینے میں مچلنے لگے تھے جبکہ غزالہ کی موت کے بعد میں منجمد ہوکر رہ گیا تھا لیکن تماچی نے جیسے مرجھائے ہوئے جذبوں کو شاداب کر دیا تھا۔

''یہاں بہت سے شاپنگ مالز ہیں۔'' تماچی بتا رہی تھی۔ ''خیر تم یہ بتاؤ کیا تم کچھ خریداری کرنا پسند کرو گے؟ میرا مطلب ہے اپنے گھر لے جانے کے لیے۔''

''گھر میں ہے کون جس کے لیے شاپنگ کروں؟'' میں اداس ہوکر بولا۔ ''سوائے ایک بوڑھے ملازم کے۔''

''کیوں کیا تمہاری شادی نہیں ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوئی تھی لیکن وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی۔'' میں نے بتایا پھر میں نے اسے غزالہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''اوہ سوری۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''جانے کیوں کبھی کبھی محبت کرنے والے بہت جلدی ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں۔''

ہم نے لنچ ایک خوبصورت ہوٹل میں کیا۔ اس کے بعد ہم واپس آ گئے۔ تماچی اجازت لے کر اپنے گھر چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس رات ہوٹل میں افریقن گلوکاروں کا ایک میوزیکل کنسرٹ تھا۔ میں بھی اس میں مدعو کیا گیا تھا۔ افریقن موسیقی بھی زبردست ہوا کرتی ہے۔

میں نے بہت انجوائے کیا اس لیے نہیں کہ میں میوزک سن رہا تھا بلکہ اس لیے کہ اس دوران تماچی میرے ساتھ رہی تھی۔ وہ مجھے بتاتی رہی تھی کہ فلاں بینڈ کون سا ہے اور فلاں گلوکار کا کیا مقام ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ایک بات پہلے بھی محسوس کی تھی اور اس رات بھی محسوس ہو رہی تھی اور وہ تھی تماچی کے جسم سے اٹھنے والی ایک عجیب خوشبو۔ اس خوشبو میں ایک سحر سا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کسی قسم کے پرفیوم کی خوشبو نہیں ہے بلکہ یہ کچھ اور ہے۔ اس رات میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''تماچی تم کون سا پرفیوم استعمال کرتی ہو؟''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے؟'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔
''ہاں، بہت زیادہ۔ بہت کشش ہے اس میں۔''
''احمر! کیوں نہ ہم کیفے ٹیریا میں چل کر بیٹھ جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تمہارا دل کنسرٹ سننے کا ہو رہا ہے تو پھر اور بات ہے۔''
''نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو خود اٹھنا چاہ رہا تھا۔''
ہم کیفے ٹیریا میں آ کر بیٹھ گئے۔
''احمر!'' اس نے کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ ''اور بھی کئی لوگ مجھ سے اس پرفیوم کے بارے میں پوچھ چکے ہیں لیکن میرا جواب ہوتا ہے کہ میں نہیں جانتی کہ یہ کیا چیز ہے۔''
''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہت پراسرار سی بات ہے۔ ہر سال ایک خاص تاریخ کو کچھ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھے یہ تحفہ دے کر چلے جاتے ہیں۔''
''کس تاریخ کو آتے ہیں؟''
''میری برتھ ڈے پر۔'' اس نے بتایا۔ ''ڈاکٹر احمر! میں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں اور میرے ساتھ کیا بھید پوشیدہ ہے۔ وہ بہت احترام سے میرے سامنے آ کر جھک جاتے ہیں اور یہ خوشبو کا تحفہ دے کر چلے جاتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتی رہتی ہوں کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں... یہ تحفہ کیوں دیتے ہیں لیکن وہ جو کچھ بھی بتاتے ہیں، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ وہ زولوؤں کی زبان بولتے ہیں کوازولو جو میں نہیں جانتی کیونکہ میں انگریزی یا افریقن جانتی ہوں۔''
''تو تمہیں ان کے زولو ہونے کا اندازہ کیسا ہوتا ہے۔''
''ان کے لباس، ان کے چلنے کے طریقوں اور ان کے انداز سے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ کچھ مختلف لوگ ہوتے ہیں۔ جانے میرے ساتھ یہ کیسا بھید ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پراسرار واقعات میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔''
تماچی کی کہانی میں اب دلچسپی کا عنصر پیدا ہو چلا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھا۔ ''اور کیسے واقعات..... کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی؟''
''ڈاکٹر احمر! میں صرف تم ہی کو بتانا پسند کروں گی۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں تمہارا بھی کردار ہے۔''
''میرا کردار؟'' میں چونک پڑا۔
''یقین کرو کہ میں کئی بار تمہیں خواب میں دیکھ چکی ہوں۔''
''کیا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''مجھے خواب میں دیکھ چکی ہو؟''
''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کئی بار۔ یہ اور بات ہے کہ سب کچھ بہت دھندلا دھندلا تھا۔ جیسے چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہو۔ ہم ایک جنگل کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ اونچے اونچے درخت اور ان کے درمیان گونجتی ہوئی بھیانک آوازیں۔ جانے کون لوگ ہمارے تعاقب میں ہوتے ہیں اور ہم اپنی جانیں بچانے کے لیے دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔''
''ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔
''میں اور تم۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ اور بات ہے کہ تمہارا چہرہ دھندلا دھندلا سا تھا۔ میں تمہیں ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی لیکن یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تم ہی ہو۔''
''عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔
''ایک بات بتاؤ۔ کیا مجھے دیکھ کر تمہیں کوئی احساس نہیں ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔
''تماچی! یہ بہت عجیب سی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنی بیوی کی موت کے بعد میرے لیے زندگی تو ختم ہی ہو کر رہ گئی تھی لیکن تم کو دیکھ کر جانے کیوں ایک بار پھر زندہ رہنے کا حوصلہ ہو گیا ہے۔ میں بہت دیر تک تمہارے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔ جانے کون سی گرہ میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ شاید وہ تمہاری ذات کے حوالے سے ایسا ہی اسرار ہو جیسا تم نے کہا ہے۔''
''بہت عجیب بات ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''شاید کچھ بھی نہ ہو یا شاید بہت کچھ ہو۔''
چار دنوں کے بعد ہماری روانگی تھی۔ روانگی سے دو دن پہلے تماچی نے مجھ سے کہا۔ ''ڈاکٹر احمر! کل شام کو تمہیں میرے پاس آنا ہے۔''
''خیریت؟''
''کل میری برتھ ڈے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہی دن جب وہ پراسرار لوگ میرے پاس آیا کرتے ہیں۔''
''اوہ..... پھر تو میں ضرور آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''کل شام میرے اپارٹمنٹ آ جانا پھر وہاں سے کہیں اور چلیں گے۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کل کا سارا دن ہم کروگر سفاری پارک میں گزاریں گے۔''
''اور اس دوران وہ لوگ آ گئے تو؟''

http://www.pdfbooksfree.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''میں یہی تو تمہیں دکھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ایسا کرو میں خود تمہیں لینے آجاؤں گی۔''
''ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن تم مجھے کسی شاپنگ سینٹر لے چلو۔''
''وہ کیوں؟''
''یوں ہی۔''
''میں سمجھ گئی۔'' وہ مسکرادی۔ ''چلو وڈلینڈ بلیورڈ کی طرف چلتے ہیں۔''
''اب تو میں یہاں کے لیے اجنبی ہوں۔ تم چاہے جہاں بھی لے جاؤ۔''
وہ مجھے ایک بہت خوبصورت شاپنگ مال میں لے آئی۔ بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا۔ میں اس کی برتھ ڈے کے لیے کچھ خریدنا چاہتا تھا۔ ایک دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ہی ایک شوکیس کے سامنے رک گئے۔ اس دکان میں آرٹیفشل جیولریز ملا کرتی تھیں۔ ہم دونوں کی نگاہ ایک نیکلس پر گئی جو عجیب انداز کا تھا۔ کئی دھاتوں کو سانپ کی طرح بل دے کر وہ نیکلس بنایا گیا تھا۔ اس کی بناوٹ ہی تھی جس نے ہمیں متوجہ کیا تھا۔
''کیا تمہیں اچھا لگ رہا ہے؟'' میں نے نیکلس کی طرف اشارہ کیا۔
''ہاں، بہت ہی منفرد ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلادی۔
''آؤ لے لیتے ہیں۔''
''کس کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔
''ظاہر ہے تمہارے لیے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔''
''ڈاکٹر احمر۔'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
لیکن میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لے آیا۔ دکاندار نے مسکرا کر استقبال کیا۔ میں نے اس نیکلس کی طرف اشارہ کردیا۔ ''ہمیں یہ نیکلس پسند آیا ہے۔''
''بہت اچھی پسند ہے آپ کی۔'' اس نے کہا۔ ''پرانے زولوؤں کی دیویاں اس جیسا نیکلس پہنا کرتی تھیں۔ یہ اس کی نقل ہے۔ یہ ایک اور اسرار تھا۔
زولو قبائل کی دیویوں کے حوالے نے ہم دنوں کو چونکا دیا تھا۔ بہرحال ہم نے وہ نیکلس لے لیا اور قیمت ادا کردی۔
میں نے وہ نیکلس اسی وقت تماچی کے حوالے کر دیا۔ وہ بہت دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔ دوسرے دن ہم کروگر سفاری پارک کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ میلوں تک پھیلا ہوا پارک تھا۔ جہاں دنیا بھر کے جانور آزادانہ طور پر گھومتے پھر رہے تھے۔ ایک وسیع و عریض جنگل کا ماحول تھا۔ ہم ایک سفاری ریستوران میں آکر بیٹھ گئے۔ بانسوں سے بنا ہوا یہ ریستوران اپنی مثال آپ تھا۔
''ڈاکٹر احمر! کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں؟'' تماچی نے پوچھا۔
''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''ایسا ہی لگ رہا ہے۔''
''اب تمہیں کچھ اور بھی دیکھنے کو ملے گا۔'' اس نے بتایا۔ ''جو تمہیں حیران کردے گا جب کہ میں اس کی عادی ہوچکی ہوں۔''
''اور وہ کیا ہے؟''
''تم خود ہی دیکھ لینا۔''
ہم لوگ اس ریستوران میں وقت گزار کر جب باہر نکلے تو واقعی ایک حیرت ہمارا انتظار کررہی تھی۔ کم از کم میں تو حیران ہی رہ گیا تھا۔ وہ چار آدمی تھے جو کسی طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آگئے تھے۔ وہ بہت احترام کے ساتھ تماچی کے سامنے جھک گئے تھے۔ وہ قدآور مضبوط جسموں والے لوگ تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تماچی کے بعد انہوں نے مجھے بھی دیکھا اور میرے سامنے بھی اسی طرح جھک گئے جس طرح تماچی کے سامنے جھکے تھے۔ انہوں نے میری تعظیم بھی کی تھی۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنے چمڑے کے تھیلے سے دو شیشیاں نکال کر ہمارے حوالے کردیں۔ ایک تماچی کو دی اور دوسری میری طرف بڑھادی۔
میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ وہی خوشبو ہے جس کے بارے میں تماچی بتا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر تک جانے کیا کیا بولتے رہے پھر الٹے قدموں چلتے ہوئے نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگئے۔
میں حیران اور پریشان سا کھڑا رہ گیا۔
''دیکھ لیا تم نے۔'' تماچی نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ ہے وہ حیرت جس کے بارے میں تمہیں بتا رہی تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں اور میں چاہے جہاں بھی ہوں، یہ میرے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جانے انہیں کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ میں اپنی برتھ ڈے کے دن کہاں پر ہوں۔''
''اور وہ تمہارا تحفہ لے کر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔''
''ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ایک دوسری حیرت یہ ہے کہ انہیں یہ کیسے معلوم تھا کہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو۔ یہ تمہارے لیے بھی خوشبو کا تحفہ لے کر آگئے۔''
''واقعی بہت حیرت کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔
ہم بہت دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرتے رہے پھر شام کے وقت واپس آ گئے۔ تماچی کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ پھر اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا.... اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔ چونکہ کسی قسم کے خطرے کا کوئی امکان نہیں تھا اس لیے میں نے بلا جھجک دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک ایسا آدمی کھڑا تھا جس کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قوی ہیکل انسان تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا۔ اس نے صرف ایک کچھا سا باندھ رکھا تھا۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے دانوں کا ایک ہار پڑا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا خنجر تھا۔

میں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے غصے بھری آواز میں کہا۔ ''تم جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے۔ نہیں جاؤ گے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کی اس بات کا میں کیا جواب دوں۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ''تم سفید روح کے ساتھ جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے۔''

میں کچھ دیر کے لیے تو پریشان اور خوفزدہ ہو گیا تھا پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟''

اس نے اچانک اپنے خنجر والے ہاتھ سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ وہ کچھ اسی قسم کی حرکت کرنے والا ہے۔ اسی لیے میں بھی ہوشیار ہو چکا تھا۔

اس نے حملہ کیا اور میں نے دائیں طرف جھک کر اس کا وار خالی دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گھونسا بھی رسید کر دیا۔ میں نے چونکہ یہ گھونسا اپنی جان بچانے کے لیے پوری قوت سے مارا تھا اس لیے وہ لڑکھڑا کر ایک طرف جا گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ایک لمحے میں اٹھ کر دوڑتا چلا گیا۔

کوریڈور میں لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید اس لیے وہ خوفزدہ ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ پورے ہوٹل میں ایک شور سا ہو گیا تھا۔ این جی او والے اور ہوٹل کے نگران بھی چلے آئے تھے۔ مجھ پر ہونے والا حملہ ہر ایک کے لیے پریشان کن تھا۔

پولیس بھی بلا لی گئی تھی جو میرا بیان اور اس خنجر کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلی گئی تھی۔ ان سب مصروفیات میں تین بج چکے تھے۔ اس لیے دوسرے دن میں بہت دیر تک سوتا رہا۔

جب آنکھ کھلی تو دن کے دو بج رہے تھے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر لاؤنج میں پہنچا تو تماچی میرے انتظار میں تھی۔

وہ بڑی بے تابی سے مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئی۔ ''احمر! تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' اس کی یہ فکرمندی مجھے اچھی لگی تھی۔ کوئی تو ہے جو میرے لیے اتنا فکرمند ہو رہا تھا۔

ہم صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

''آخر کیوں..... وہ آدمی کیوں چاہتا تھا کہ تم جنگل کی طرف نہ جاؤ؟'' اس نے کہا۔ ''وہ تمہیں کیسے جانتا ہے؟ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا؟''

''جانے کیوں لیکن اس کی اس حرکت نے میرے ارادوں کو مضبوط کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخر اس نے مجھے کیوں روکا تھا۔''

''زیوس دیوی کی مہربانی ہے کہ تم کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

''زیوس دیوی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''معاف کرنا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں جانے کیوں یہ کہہ گئی۔''

''تماچی! تم تو کرسچین ہو نا؟''

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کرسچین ہی ہوں۔ اس کے باوجود میرے اندر کچھ اور ہے۔ جانے کیوں بچپن ہی سے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی اور ہوں، کسی اور دیس کی رہنے والی۔ میرے وجود میں کوئی اور ہے۔ اب یہی دیکھ لو جو لوگ میرے لیے ہر سال خوشبو کا تحفہ لے کر آتے ہیں، کیا وہ پراسرار نہیں ہیں؟ کیا ان کا میرے پاس آنا راسرار نہیں ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''اسی طرح مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کہیں باہر سے لا کر اس سوسائٹی میں شامل .... کر دی گئی ہوں۔''

''عجیب سی بات ہے۔''

''اس کے علاوہ ایک بات اور ہے اور وہ یہ کہ تم سے ملنے کے بعد ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اور تمہارے درمیان صدیوں کا رشتہ ہے، ایسا کیوں ہے؟ یہ تو میں نہیں جانتی لیکن ایسا ہے۔''

☆☆☆

ہمارا سفر شروع ہو گیا تھا۔

پری ٹوریا سے آگے تک کا سفر کئی گاڑیوں میں ہوا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا۔ وہ ایک عام سا سفر تھا جیسا گاڑیوں کا سفر ہوا کرتا ہے۔ ہمارے قافلے میں پانچ آدمی تھے۔ ایک ڈاکٹر یعنی میں۔ دوسری میری معاون تماچی، دو مزدور جو سامان لے کر چل رہے تھے۔ اس سامان میں ڈھیر ساری دوائیں تھیں اور ایک جنگل کا گائڈ واگو۔

واگو کا تعلق سوتھو قبیلے سے تھا (سوتھو زولو کی ایک شاخ ہے) وہ ایک دراز قامت خاموش طبیعت سیاہ فام تھا جو جنگل کے راستے کو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہم سوتھو قبیلے ہی کی طرف جا رہے تھے۔

سنا گیا تھا کہ اس قبیلے میں بچوں کی اموات زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ ان اموات کی وجہ ایک مکھی ہوا کرتی ہے۔ انتہائی زہریلی مچھروں کی طرح۔ ڈنک مارنے والی جو اپنے شکار کو بری طرح مار دیتی ہے۔ ان علاقوں میں اور کئی بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم نے ان امراض کی بہت سی دوائیں اپنے ساتھ رکھ لی تھیں۔ ہماری گاڑیاں ایک مقام پر آ کر رک گئی تھیں۔ اب یہاں سے آگے ہمیں پیدل سفر کرنا تھا۔ میرا جنگل میں سفر کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اور ایک جوش کی کیفیت بھی تھی۔

یہ احساس بھی میرے لیے بالکل نیا تھا۔

اپنی محبت کے کھو جانے کے بعد مجھے زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن جب سے تماچی ملی تھی، میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ تماچی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ راستہ بتانے والا گائڈ واگو آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں مزدور تھے۔ اس وقت احساس ہو رہا تھا کہ جنگل کا سفر کیسا ہے۔ کتنا پرکشش اور کتنا بھیانک۔ ہر قدم ایک نیا خوف، ایک نئی امنگ، ایک نیا ولولہ۔

جنگل میں رات کا سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلا قدم کہاں لے جائے گا۔ اگلے موڑ پر کیا ہے۔ اس لیے ہم نے واگو کے کہنے پر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ مزدور اپنے ساتھ خیمے وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ذرا سی دیر میں الاؤ روشن کر کے خیمے لگا دیے گئے۔

مجھ پر اس ماحول کی ہیبت سوار تھی جبکہ تماچی بھی خاموش تھی۔ واگو اور دونوں مزدور الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ واگو نے بلند آواز میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے میں اس کی زبان کہاں سمجھ سکتا تھا۔ تماچی بتا رہی تھی کہ واگو اپنے قبیلے کی کسی جنگ کا حال بتا رہا ہے جس میں خود اس نے بھی شرکت کی تھی۔ تماچی نے بتایا کہ زولو لوگوں کا یہ ایک بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ الاؤ کے گرد بیٹھ کر جنگل کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں اور اس سناٹے میں اپنا خون گرم رکھتے ہیں۔ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

جنگل کی صبح اتنی خوبصورت ہوا کرتی ہے، اس کا اندازہ مجھے پہلے کبھی نہیں تھا۔ ہر طرف پرندوں کی آوازیں اور پتوں پر جمی ہوئی شبنم سے ٹکرا کر آتی ہوئی تازہ ہوا تھی۔ دل خوش ہو گیا تھا لیکن اس وقت واگو نے ایک بات کہہ کر پریشان ہی کر دیا۔ ''آپ لوگ صبح کی اس خوبصورتی پر نہ جائیں کیونکہ ایسی مدہوش کر دینے والی خوبصورتی کے پیچھے بہت خطرے ہوتے ہیں۔''

''وہ خطرے کیا ہوتے ہیں واگو؟'' میں نے پوچھا۔

''دشمنوں کے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ دشمن اپنے زہریلے تیروں کے ساتھ رات بھر درختوں کے پیچھے چھپ کر ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں اور صبح ہوتے ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

''کیا تم کسی کی موجودگی محسوس کر رہے ہو؟'' تماچی نے پوچھا۔

''نہیں اس وقت تو نہیں۔'' واگو نے چاروں طرف جیسے ہوا کو سونگھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''آپ کو تو میرا یہ تجربہ بھی بہت عجیب لگ رہا ہوگا لیکن جب ہم شہر میں ہوتے ہیں تو اپنی صلاحیتوں کو سلا دیتے ہیں اور جب جنگل میں ہوتے ہیں تو ہماری یہ صلاحیتیں جاگ جاتی ہیں۔''

ہمارے ساتھ آنے والے مزدور نے اتنی دیر میں چائے اور ناشتا وغیرہ تیار کر لیا تھا۔ ہم یہ سارا سامان اپنے ساتھ لے کر چلے تھے۔

ابتدا میں یہ بتایا گیا تھا کہ میرے قافلے میں دو ڈاکٹر ہوں گے، ایک میں اور دوسرے ڈاکٹر برنارڈ لیکن برنارڈ کو چونکہ کسی اور طرف بھیج دیا گیا تھا اس لیے صرف میں ہی جا رہا تھا جبکہ تماچی کو نرس یا معاون کے فرائض انجام دینے تھے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

بہت ہی دشوار گزار سفر تھا۔ قدم قدم پر کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان ہم راستہ بناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایسے اونچے اونچے اور جسیم درخت تھے کہ میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ابھی تک کوئی جنگلی جانور سامنے نہیں آیا تھا سوائے سانپوں کے جو درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹے دکھائی دیے یا بہت تیزی کے ساتھ سرسراتے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہوئے ہمارے سامنے سے گزر جاتے۔ درختوں کا ایک طویل سلسلے کو عبور کر کے ہم ایک میدان میں آ گئے۔ یہ ایک لمبا چوڑا میدان تھا جس پر سوائے ریت کے اور کچھ نہیں تھا۔ بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ہم اچانک کسی ریگستان میں آ نکلے ہوں۔

وسیع و عریض جنگل کے درمیان اس ریگستان کی موجودگی حیران کرنے والی تھی۔

واگو نے اس ریگستان کے بارے میں بتایا۔

''یہاں سے ہماری بستی صرف ایک دن کی مسافت پر ہے۔ ہم اس ریگستان کو بھوتوں کا ریگستان کہتے ہیں۔''

''کیوں، کیا یہاں بھوت ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی صاحب۔ بھوت ہوتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ہمارے مرنے والوں کی روحیں اس ریگستان میں آ جاتی ہیں۔''

صرف افریقہ ہی نہیں بلکہ اس قسم کی روایات پوری دنیا میں ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس قسم کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔

بہرحال ہم آگے بڑھتے رہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ میدان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اسے عبور کرنے میں ایک دن تو ضرور لگ جاتا۔ ابھی ہم نے اس میدان میں تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ ایک عجیب بات ہوگئی۔ ایسا لگا جیسے ہزاروں گھوڑے ہماری طرف دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنا گرد و غبار تھا کہ پورا میدان نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم سب خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

دونوں مزدور اور خود واگو نے اپنی زبان میں زور زور سے چلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ کسی قسم کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نے تماچی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ بے پناہ گرد و غبار کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر آہستہ آہستہ جب گرد بیٹھنے لگی تو صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔

وہ ایک لشکر تھا۔ سیکڑوں زیبروں کا۔ وہ زیبرے جانے کس وجہ سے کس طرف سے بھڑک کر دوڑتے ہوئے اس میدان کی طرف آ نکلے تھے اور ان کی یہ دوڑ اس میدان میں بھی جاری تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک ساتھ بھی اتنے زیبرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا۔

واگو نے بتایا۔ ''یہ زیبرے نہیں تھے صاحب۔ یہ ہمارے مرنے والوں کے بھوت تھے جو روپ بدل بدل کر اس میدان میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔'' ہمارا وہ سفر جو کچھ دیر کے لیے رک گیا تھا پھر شروع ہو گیا۔ دونوں مزدوروں نے بلند آواز میں کوئی گیت گانا شروع کر دیا۔ وہ شاید اپنے مرنے والوں کی روحوں کو خوش کرنے کے لیے کوئی مذہبی گیت گا رہے تھے۔ ہم شام تک میدان میں چلتے رہے۔ شام ہونے کے بعد ہم پھر جنگل کے سلسلوں میں داخل ہو چکے تھے اور یہیں ہمارے اس سفر کا ایک مرحلہ ختم ہوتے ہی دوسرے بھیانک سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

اس رات ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔

ہم نے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ کر لیا تھا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے کہ الاؤ روشن کر دیا گیا پھر اچانک ہم پر نیزوں کی بارش ہونے لگی۔

یہ تیر چاروں طرف سے آ رہے تھے۔ واگو نے بلند آواز میں ہمیں مخاطب کیا۔ ''صاحب! یہ تیر ہمیں خبردار کرنے کے لیے ہیں۔ یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے بس جہاں ہیں اسی حالت میں کھڑے رہیں۔ ادھر ادھر چلنے کی کوشش نہ کریں ورنہ چھلنی کر دیے جائیں گے۔''

ہم سب سہمے ہوئے ایک جگہ کھڑے رہے۔ جنگل کا حقیقی اور بھیانک روپ ہمارے سامنے آیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ تماچی اور دوسرے ان آفتوں سے واقف ہوں لیکن میرے لیے تو یہ نیا اور بھیانک تجربہ تھا۔

واگو کی ہدایت کے مطابق ہم سب خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد درختوں نے جیسے جنگلیوں کو اگلنا شروع کر دیا۔ وہ ہر طرف سے نکل نکل کر ہماری طرف آ رہے تھے۔ الاؤ کی بھڑکی ہوئی روشنی میں وہ بہت بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل ایسا ہی تھا جیسے انگریزی فلم کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ یہ چھوٹے قد کے گٹھے ہوئے جسموں والے لوگ تھے۔ ان کی طرح نہیں تھے جن کو میں تماچی کے لیے خوشبو کا تحفہ لے کر آتے ہوئے دیکھ چکا تھا کیونکہ وہ بلند قامت تھے۔

''یہ مسائی massai لوگ ہیں۔'' واگو نے بتایا۔ ''بہت خطرناک ہوتے ہیں۔''

اتنی دیر میں ان لوگوں نے ہمیں پوری طرح گھیر لیا تھا۔ کمانوں اور تیروں سے مسلح ان لوگوں کے چہروں پر وحشت اور ناراضگی تھی۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کچھ بولنا شروع کر دیا۔

واگو اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ پھر وہی شخص آگے بڑھا، اس نے بہت غور سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا جیسے ہمارا جائزہ لے رہا ہو۔ تماچی کے پاس آ کر وہ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

رک گیا تھا۔ اس نے بہت احترام کے ساتھ تماچی کا ہاتھ تھاما اور اسے بوسہ دے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے واگو سے کچھ کہا۔ واگو نے اس کا جواب دیا۔ پھر اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''جناب! یہ لوگ اس بات پر بہت ناراض ہیں کہ ہم ان کے علاقے میں کیوں آئے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے سفید روح کو پہچان لیا ہے اور اس کے احترام میں انہوں نے اپنی کمانیں جھکا دی ہیں لیکن اب ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' تماچی نے پوچھا۔

''یہ لوگ سفید روح یعنی آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں جبکہ دوسروں کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔'' تماچی نے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو کہ سفید روح کا یہ کہنا ہے کہ یہ سب اس کے ساتھی ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جائے گی۔''

واگو نے تماچی کی یہ بات اس آدمی کے سامنے دہرا دی جس پر اس آدمی نے پھر کچھ کہا۔ اس پر واگو نے اس کا ترجمہ کر کے بتایا۔ ''یہ شخص کہہ رہا ہے کہ وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر جائے گا اور جو سردار کا فیصلہ ہو اس پر عمل کیا جائے گا۔''

''احمر۔'' تماچی نے سرگوشی کی۔ ''ایسا کرو تم ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ ورنہ اگر ان لوگوں کے ساتھ گئے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''نہیں تماچی، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں تم واگو اور دوسرے مزدوروں کو بھیج سکتی ہو۔''

تماچی کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ شاید اسے مجھ سے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔ تماچی نے واگو کو بتا دیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

واگو نے اس آدمی سے کچھ کہا پھر ہمارا ایک انجانا سفر شروع ہو گیا۔ جانے کس منزل کی طرف۔ واگو اور دونوں مزدور بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ شاید انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا یہ سفر آسان نہیں ہوگا۔ میری اور تماچی کی یہ کوشش تھی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہیں لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ان جنگلیوں کو ہمارا ساتھ رہنا پسند نہیں ہے۔ وہ تماچی سے تو کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے لیکن مجھ کو بہت کڑی اور غصے بھری نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔

ایک موقع پر ان کی ناراضگی کا اظہار بھی ہو گیا۔

ایک جگہ تماچی لڑکھڑا کر گرنے والی تھی، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ جنگلی اچانک میری طرف اس طرح جھپٹے جیسے مجھ پر حملہ کرنے والے ہوں۔

اس وقت واگو نے نہ جانے کیا کیا بول کر انہیں خاموش کرا دیا پھر واگو نے میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''صاحب! یہ لوگ نہیں چاہتے کہ آپ سفید روح کو چھونے کی کوشش کریں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں غصے سے بولا۔ ''ان اندھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ تماچی گرنے والی تھی۔''

''ان کا کہنا ہے کہ سفید روح اگر گر بھی جاتی تو بھی اس کا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں بہت روحانی طاقت ہے۔''

''میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ ہم لوگ ان کے ساتھ چل کر پھنس گئے ہیں۔'' تماچی نے کہا۔ ''اب بھی موقع ہے، ہم راستے سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''ایسا مت سوچیے گا میڈم۔'' واگو جلدی سے بولا۔ ''آپ کو تو یہ لوگ کچھ نہیں کہیں گے لیکن غصے میں ہم سب کو مار ڈالیں گے۔''

''واگو! پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں پہنچ کر کوئی راستہ نکل آئے جہاں یہ لوگ ہمیں لے جا رہے ہیں۔'' ہم خاموش ہو گئے۔

ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہمارے ساتھ چلنے والے جنگلی ذرا سی دیر کے لیے ہم سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ہم نے رات کے وقت ایک جگہ پڑاؤ بھی کیا۔

سب کچھ پہلے کی طرح تھا یعنی جب ہم نے پہلی بار پڑاؤ کیا تھا اور ہمارے لیے خیمے لگائے گئے تھے۔ کھانے تیار ہوئے تھے۔ الاؤ روشن تھا لیکن فرق یہ تھا کہ اس وقت ہم آزاد تھے۔ اپنی مرضی کے مالک تھے لیکن اس بار گرفتار ہو کر جا رہے تھے ہم قیدی تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری وہ رات بہت بے چین گزری تھی۔

رات گئے تک وہ جنگلی نہ جانے کیا کیا گاتے رہے۔ بہت دیر کے بعد جب خاموشی ہوئی تو پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔

جب میں صبح بیدار ہوا تو ایک نئی چیز میرا انتظار کر رہی تھی۔

واگو نے میرے پاس آ کر بتایا کہ تماچی کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔

یہ بہت پریشان کر دینے والی خبر تھی۔

میں بوکھلا کر خیمے سے باہر آ گیا۔ جنگلی موجود تھے،

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

واگو بھی تھا۔ دوسرے مزدور بھی تھے، صرف تماچی غائب ہو گئی تھی۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

جنگلی حیرت انگیز طور پر بالکل خاموش تھے۔ واگو نے بتایا کہ یہ جنگلی تماچی کو ہر طرف تلاش کر کے واپس آ چکے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ سفید روح کو کوئی جانور اٹھا کر لے گیا ہوگا یا ماگاسی کی روح اپنے ساتھ لے گئی ہو۔

''یہ ماگاسی کی روح کیا بلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے بادشاہ کو ماگاسی کہا جاتا ہے۔'' واگو نے بتایا۔ ''سب سے پہلے بادشاہ کی ستر بیویاں تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھنے کا شوقین تھا اور موجودہ ماگاسی بیسواں ہے۔ اس کے پاس پندرہ بیویاں ہیں۔''

''کیا بکواس ہے یہ سب؟ ان سے پوچھو کہ ماگاسی کی روح کیوں لے گئی ہے اس کو؟''

''میں نے پوچھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے ماگاسی کو نئی نئی بیویاں جمع کرنے کا شوق تھا اسی لیے وہ سفید روح کو بھی اٹھا کر لے گیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے۔'' میں غصے اور رنج سے بے حال ہو رہا تھا۔ ''ان ہی کم بختوں نے اسے غائب کروا دیا ہوگا۔ اسی لیے یہ اتنے اطمینان کے ساتھ یہاں کھڑے ہیں۔''

واگو میری اس بات پر کیا کہہ سکتا تھا۔ تماچی کے غائب ہونے سے وہ بھی اداس اور پریشان ہو گیا تھا جبکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری غزالہ ایک بار پھر مجھ سے جدا کر دی گئی ہو۔ اتنے سے دنوں میں تماچی سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔

واگو نے بتایا۔ ''یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں سفر شروع کر دینا چاہیے۔''

''ان کم بختوں سے کہو کہ سفید روح ہی غائب ہو چکی ہے تو ہم لوگ وہاں جا کر کیا کریں گے۔''

واگو نے میرے کہنے پر جب بات کی تو انہوں نے بہت خوشی سے اجازت دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہی تو ہے۔ جب سفید روح ہی نہیں رہی تو پھر تم لوگ جا کر کیا کرو گے اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک کھٹکا سا ہو گیا۔ آخر کیوں..... یہ لوگ مجھے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت کیوں دے رہے تھے؟ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

میں نے واگو سے کہا۔ ''واگو! ان سے کہو کہ ہم واپس جانا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہم ان کے ساتھ جا کر ان کا گاؤں دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے بیمار بچوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔''

واگو نے جب میری بات دہرائی تو وہ سب سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے میٹنگ کے بعد فیصلہ سنا دیا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور دن کا سفر طے کیا۔ اس دوران تماچی ہر قدم پر یاد آتی رہی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ میں اس کی طرف سے پریشان تو تھا لیکن مایوس نہیں تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ عارضی جدائی ہے۔ وہ مجھ سے ضرور ملے گی۔ ہم دونوں کو جب ایک دوسرے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے موت آ جائے اور میں زندہ رہ جاؤں۔

دوسری دوپہر کو جنگل کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب کھیت دکھائی دے رہے تھے جن میں مکئی کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اور بھی چیزوں کی کاشت کاری ہوتی ہو لیکن مجھے تو ہر طرف مکئی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ میں یہ سب فلموں میں دیکھا کرتا تھا۔ کتابوں میں پڑھا کرتا تھا لیکن یہاں تو سب کچھ نگاہوں کے سامنے ہو رہا تھا بلکہ میں تو خود اس منظر نامے کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ ہم کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ اب جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کو مقامی زبان میں عام طور پر کرال کہا جاتا ہے۔

بانسوں اور پودوں وغیرہ کی مدد سے بنائی ہوئی بڑی بڑی جھونپڑیاں جن کے باہر کھڑے مرد اور عورتیں ہمیں بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ عریاں نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو پتوں اور کھالوں وغیرہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔

ہم سب چلتے رہے۔ چلتے چلتے میری حالت غیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا پیدل سفر نہیں کیا ہوگا لیکن میرے ساتھیوں پر اس طویل سفر کا شاید کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شام کے وقت ہم ایک بہت بڑی بستی میں داخل ہو گئے۔ یہی بستی ان لوگوں کا مرکزی مقام تھا اور ایک بہت بڑا خالی میدان تھا۔ جس کے ارد گرد جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑی جھونپڑی تھی جس کے اوپر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بتایا گیا کہ یہی ان کے بادشاہ ماگاسی کا محل ہے۔

کوئی اور وقت ہوتا یا میں کوئی اسی قسم کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا تو شاید اس صورتِ حال سے بہت لطف اندوز ہوتا لیکن یہاں تو اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ تماچی کی گمشدگی نے بھی اداس اور پریشان کر دیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

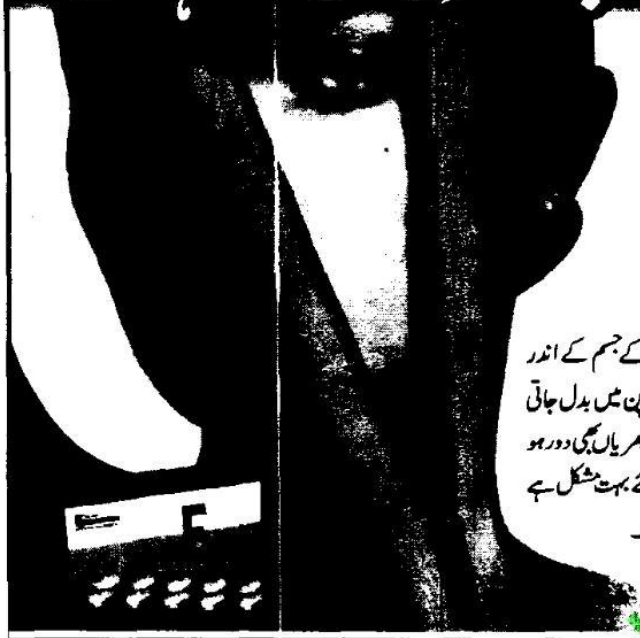

فیئر فیس®

ٹی ٹی کی فیئر فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد حلقے، چہرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ ایٹن اور کریمیں ملتے پھریں لیکن فیئر فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

f www.facebook.com/toptreatments

چھوٹے قد والے دِل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال®

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو مضر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماٹوٹروپن (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

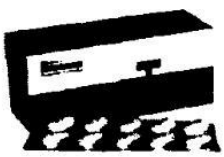

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

HELPLINE

ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب

042-35789145&6, 0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

نہ ملنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

TT

http://www.booksfree.net
http://www.urdutube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دل کو ایک امید سی تھی کہ شاید تماچی اسی بستی میں دکھائی دے جائے۔ کاش وہ لوگ اسے اٹھا کر اپنے ہی لے آئے ہوں۔ مجھے اور واگو کو ایک جھونپڑی میں ٹھہرایا گیا تھا جبکہ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں مزدوروں کو دوسری جگہ دے دی گئی تھی۔

رات کے وقت گھاس پھوس کی بنی ہوئی مشعل روشن کر دی گئی تھی جس کی زرد روشنی بہت اداس اور بے چین کر دینے والی تھی۔ رات کے وقت دو لڑکیاں ہمارے لیے کھانا لے آئی تھیں۔ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے کچھ ضرور کھاتے رہنا تھا۔ اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے۔ میں اپنے گھر، اپنے شہر اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور جنگل میں ایک بھیانک رات گزارنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ اس قسم کے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔ میں نے خود کو بہلانے کے لیے واگو سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ایک وہی میرے لیے مانوس تھا۔ وہ بے چارہ خود بھی اس صورتِ حال سے پریشان ہو رہا تھا۔

اچانک باہر سے رونے اور گیت وغیرہ گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کئی عدد مشعلوں کی روشنیاں چاروں طرف پھیلتی ہوئی دکھائی دیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے واگو؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''شاید یہ کسی قسم کی رسم ادا کر رہے ہیں۔'' واگو نے کہا۔

''صاحب! آپ یہیں رہیں۔ میں معلوم کر کے آتا ہوں۔''

واگو جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی بہت دیر کے بعد ہوئی۔ میں اس دوران ہزار قسم کے اندیشوں میں مبتلا رہا۔ واپس آ کر واگو نے بتایا۔ ''صاحب! یہاں کے ایک وزیر کو سزا دی جا رہی ہے۔''

''کس بات کی سزا؟''

''یہی کہ وہ اپنی بیویوں کو جنسی طور پر مطمئن کرنے کے قابل نہیں رہا۔'' واگو نے بتایا۔ ''یہ یہاں کی بہت قدیم روایت ہے صاحب۔ میں نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔''

''بتاؤ مجھے یہ کیسی روایت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ رسم یہاں کی نہیں ہے صاحب۔ ایک قبیلہ ہے نشوڑا اسی مناسبت سے اس علاقے کو بھی نشوڑا کہا جاتا ہے۔ وہاں بادشاہوں کے ساتھ یہ ہوا کرتا تھا اگر کوئی بادشاہ جنسی طور پر کمزور ہو جائے تو اس کو ایک جھونپڑی میں اس کی بیوی کے ساتھ قید کر دیا جاتا ہے، جس بیوی نے کمزوری کی شکایت کی ہو پھر اس جھونپڑی کو آگ لگا کر دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔''

''میرے خدا! یہ تو بہت بھیانک رسم ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ بادشاہ کو جلایا جا رہا ہے؟''

''نہیں۔'' واگو مسکرایا۔ ''یہاں تک آتے آتے اس رسم میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ بادشاہ کے علاوہ سب کو سزا دی جا سکتی ہے۔ آج یہاں کے ایک وزیر کو سزا دی جا رہی ہے۔ ان دونوں کو جھونپڑی میں اس طرح باندھ کر رکھا جاتا ہے کہ آدمی کا سر اس کی بیوی کے زانو پر ہوتا ہے اور اسی عالم میں جھونپڑی کو آگ لگا دی جاتی ہے اور دونوں جل کر مر جاتے ہیں۔''

''یہ تو بہت ظالمانہ رسمیں ہیں واگو۔''

''ہاں۔'' واگو نے اعتراف کیا۔ ''ہماری آج کی حکومتوں کی کوششوں کے باوجود یہ رسمیں آج تک جاری ہیں۔ شروع شروع میں یہ رسمیں روکنے کی کوششیں بھی کی گئیں پھر ان قبائلیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ حکومت اب ان کے اس طرح کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتی۔''

میں صرف سوچتا ہی رہ گیا۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا۔ بہرحال وہ رات ایسی ہی تھی، کچھ سوتی کچھ جاگتی ہوئی رات۔ خوفزدہ کرتی ہوئی رات۔ صبح کے وقت واگو نے بتایا کہ ہمیں کچھ دیر کے بعد بادشاہ یعنی ماگاسی کے سامنے پہنچنا ہے کیونکہ بادشاہ کو تم سے کام ہے۔

''مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بادشاہ کو بتا دیا گیا ہے کہ تم علاج کرنے والے ہو۔'' واگو نے کہا۔ ''بادشاہ کا ایک بیٹا بہت بیمار ہے۔ بادشاہ اس بچے سے بہت محبت کرتا ہے اور بادشاہ نے اس کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے لیکن اس کی بیماری نے بادشاہ کو غمزدہ کر رکھا ہے۔ اب تم اس کا علاج کرو گے۔''

''میں تو خیر آیا ہی اسی لیے ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن عام طور پر جب یہاں لوگ بیمار ہوتے ہیں تو پھر کیا کرتے ہیں؟''

''مقامی وچ ڈاکٹر جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔'' واگو نے بتایا۔ ''لیکن اس بچے کا علاج کوئی نہیں کر سکتا اس لیے بادشاہ کی خواہش ہے کہ تم اس کا علاج کرو۔''

میرے لیے یہ ایک طرح کا امتحان بھی تھا۔

ان جنگلیوں کے مزاج کا کیا بھروسہ تھا، اگر میرے علاج سے بچہ ٹھیک ہو گیا تو خیر ..... ورنہ یہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ جہاں جنسی کمزوری پر کسی کو جلا دیا جاتا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہے، وہاں کیا نہیں ہوسکتا تھا۔

بہرحال میں نے واگو سے کہا کہ میں بادشاہ کے بچے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایک جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔ کے فرش پر کھالیں بچھی ہوئی تھی۔ ان کھالوں پر بچے کو لٹا دیا گیا تھا۔ اندازے کے مطابق اس کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔

ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی توانا بھی رہا ہو لیکن اس وقت وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ میں اپنا بیگ اپنے ساتھ لے گیا تھا جس میں ہر طرح کی دوائیں بھری ہوئی تھیں۔ میرے اندازے اور تجربے کی رو سے اس بچے کا ملیریا بگڑ گیا تھا اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے فوری طور پر اس کی دیکھ بھال اور اس کا علاج شروع کر دیا۔ دوائیں میرے پاس موجود تھیں اس جھونپڑی میں دو عورتیں بھی تھیں جو بہت حیرت سے میری کارروائیاں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس بچے کو انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ میں بہت دیر تک بیمار بچے کے پاس بیٹھا رہا پھر واگو جھونپڑی میں داخل ہوا۔ میں نے اس کو بتایا کہ جا کر بادشاہ سے کہہ دو کہ دو چار دنوں میں بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر میں نے واگو ہی کے ذریعے وہاں موجود عورتوں کو دوائیں بھی دے دیں تاکہ بچے کو استعمال کراتی رہیں پھر مجھے میری جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔

شام کے وقت واگو نے آ کر بتایا کہ بادشاہ مجھ سے بہت خوش ہے کیونکہ بچے کی طبیعت بہت سنبھل چکی ہے اور اسی خوشی میں بادشاہ نے آج رات ہونے والی خاص تقریب میں مجھے مدعو بھی کیا ہے۔

''یہ کس قسم کی تقریب ہے واگو؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔'' واگو نے بتایا۔ ''لیکن ایک دو آدمیوں سے پتا چلا ہے کہ بادشاہ کی شادی ہونے والی ہے۔'' میرا دل دھڑک اٹھا۔ بادشاہ شادی کرنے والا تھا لیکن کس سے؟ کیا وہ تماچی تو نہیں تھی جو پراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی؟ بہت ممکن ہے کہ بادشاہ اسی سے شادی کر رہا ہو۔

''واگو! کیا بادشاہ کی شادی نہیں ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو چکی ہے صاحب۔'' واگو نے بتایا۔ ''لیکن بادشاہ ہر سال شادیاں کرتا ہے اور کم از کم چار پانچ عورتوں سے۔''

''واگو! کہیں ایسا تو نہیں کہ آج وہ تماچی کو بھی اپنی دلہن بنا رہا ہو؟''

''ہوسکتا ہے صاحب اور نہیں بھی ہوسکتا۔'' واگو نے کہا۔ ''ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ جو ہوتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آ ہی جاتا ہے۔ اب دیکھیں ہماری آنکھوں کے سامنے کیا آتا ہے۔''

☆☆☆

وہ خاص تقریب میدان میں ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اسی میدان میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ہر طرف مشعلیں روشن تھیں جن کی وجہ سے پورے میدان میں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ مذہبی گیت گا رہے تھے۔

بادشاہ کی جھونپڑی کے سامنے ایک بڑا سا الاؤ روشن تھا۔ وقفے وقفے سے اس الاؤ میں کوئی چیز ڈال دی جاتی۔ الاؤ اور تیزی سے بھڑکنے لگتا۔ ناگوار قسم کی ایک تیز بو پورے میدان میں پھیل جاتی۔ جانے وہ کیا چیز ڈال رہے تھے۔ پھر رقص کا سلسلہ شروع ہوا۔ قبیلے کی عورتوں اور لڑکیوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ڈرم نما کوئی چیز ایک خاص آہنگ اور ترتیب کے ساتھ بجائی جا رہی تھیں جس کی لے پر لڑکیاں تھرک رہی تھیں۔ ان کا رقص بہت وحشیانہ اور بہت تیز تھا پھر بادشاہ کی جھونپڑی سے کچھ لوگ باہر آئے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا واگو بتاتا رہا کہ یہ لوگ مذہبی پروہت وغیرہ ہیں اور شادی کی رسومات ادا کریں گے۔ آخر میں بادشاہ اپنی جھونپڑی سے باہر آیا۔ وہ ایک دیوہیکل انسان تھا جس نے صرف ایک کا چھا سا بانڈھ رکھا تھا۔

اس کے گلے میں بڑے بڑے سفید موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں نیزہ تھام رکھا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی اس جھونپڑی سے باہر آئی تھیں۔

واگو نے ان عورتوں کے بارے میں بتایا کہ یہ سب بادشاہ کی بیویاں ہیں اور وہ کم بخت مزید بیویوں کو اپنے حرم میں شامل کرنے جا رہا ہے۔

بادشاہ نے تخت پر بیٹھ کر بولنا شروع کر دیا۔ اس وقت پورے میدان میں خاموشی تھی۔ رقص کرنے والیاں رک گئی تھیں اور گیت گانے والے خاموش تھے۔ صرف بادشاہ کی گرجتی ہوئی آواز پورے میدان میں گونج رہی تھی۔

واگو نے میرے لیے بادشاہ کی تقریر کا ترجمہ شروع کر دیا۔ بادشاہ کہہ رہا تھا۔ ''آج کی رات اس کے لیے بہت مبارک اور مقدس ہے کیونکہ آج کی رات وہ صرف تین لڑکیوں کو اپنی دلہنیں بنا رہا ہے۔ ان میں سے ایک ایسی ہے جس کو دیوتاؤں نے آسمانوں سے اس کے لیے بھیجا ہے۔ اس کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ اس کی ادائیں ہرنی کی طرح ہیں۔ اس کے بال بادلوں کی طرح ہیں اور اس کا رنگ ایسا ہے جیسے دیوتاؤں نے آسمانوں میں رنگ بکھیر

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

دیے ہوں اور اسے سفید روح کہا جاتا ہے۔''

میں نے واگو کا ہاتھ تھام لیا۔ ''واگو! یہ کم بخت شاید تماچی کی بات کر رہا ہے۔''

''جی ہاں جناب۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' واگو نے کہا۔

''واگو! خدا کے لیے کچھ کرو۔''

اس کے ساتھ ہی اندر سے تینوں دلہنیں باہر آ گئیں اور ان میں سے ایک تماچی بھی تھی۔ اسے خاص طور پر سنوارا گیا تھا۔ اس کے بالوں میں کنول کے پھول لگے ہوئے تھے۔ اس بھیانک اور ناقابلِ یقین ماحول کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ وہ ذرا بھی خوفزدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کسی پُرغرور ملکہ کی شان سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ غضب ناک ہو کر اس کی طرف بڑھا اور اسی وقت اس میدان میں قیامت برپا ہو گئی۔ بادشاہ اچھل کر ایک طرف جا گرا تھا۔ اس کے سینے میں ایک تیر پیوست تھا۔ اوروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اندھیرا زہریلے تیر اگل رہا تھا اور لوگ مرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایک ساتھ اتنی لاشیں نہیں دیکھی ہوں گی جتنی اس رات میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی تھی، لوگ مر رہے تھے۔ عورتیں چیختی پھر رہی تھیں۔ جانے کتنے لوگ ..... آگ میں جل رہے تھے۔

ایک قیامت نازل ہو گئی تھی۔ اس دوران تماچی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ واگو بھی میرے قریب ہی تھا۔ ہم بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ جانے کب موت برساتے ہوئے تیر ہماری طرف رخ کر لیں۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس کچھ اور ہوا۔ ایک حیرت زدہ کرنے والا واقعہ۔ جانے کس طرف سے کچھ لوگ اندھیرے کی دیوار میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

یہ مختلف لوگ تھے۔ دراز قامت۔ میں نے ان کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھے جو تماچی کے لیے خوشبو کا تحفہ لایا کرتے تھے۔

انہوں نے بڑے احترام سے تماچی کے سامنے اپنی گردن جھکا دی۔ وہ عاجزانہ طور پر کچھ بتا رہے تھے۔ شاید اپنی صفائیاں پیش کر رہے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ تماچی یعنی سفید روح سے اس بات کی معافی مانگ رہے تھے کہ نہیں وہاں تک پہنچنے میں دیر لگ گئی اور وہ ناپاک کالا ہاتھی تماچی کو اپنی بیوی بنانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک پیغامبر نے خبر دی تھی کہ سفید روح کو اغوا کر کے سوتھو قبیلے میں لے جایا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ایک لشکر روانہ کر دیا گیا تھا اور یہ لوگ ٹھیک اس وقت پہنچے جب شادی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

ان لوگوں کے لیے شاید ایسی تبدیلی میں کوئی بھلائی ہو لیکن میرے لیے ایک جیسی بات تھی۔ یہ بھی ان سے مختلف تو نہیں ہو سکتے تھے جو ہمیں یہاں تک لے آئے تھے۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ تماچی ہمارے ساتھ تھی اور ہم میں سے کسی کو خراش تک نہیں آئی تھی اور تماچی ان آنے والوں کے درمیان کسی ملکہ کی طرح شان سے کھڑی ہوئی تھی۔ بستی اجڑ چکی تھی۔ وہاں کی عورتیں مرد اور بچے بھاگ نکلے تھے۔ ہمیں ایک بار پھر سفر کرنا پڑ گیا۔ اس سفر میں بھی واگو اور دونوں مزدور ہمارے ساتھ تھے۔ میرے لیے تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا، سب کچھ پہلے سفر کی طرح تھا۔ البتہ تماچی بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہی تھی اور اس کے اطمینان کو دیکھ کر خود مجھے بھی اطمینان ہو رہا تھا۔

اس بار بھی یہ سفر پیدل ہو رہا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ چل رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے درمیان۔ گیت گاتے اور رقص کرتے ہوئے جیسے انہیں ڈھیروں خوشیاں مل گئی ہوں اور وہ اپنی خوشیاں اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہوں۔ میں اور تماچی ایک ساتھ ہی تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ پچھلے سفر میں یہ تھا کہ جب میں تماچی کے قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ جنگلی مجھ سے ناراض ہو جاتے تھے لیکن ان لوگوں کے رویے برعکس تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔

''واگو! آخر یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی بستی۔'' واگو نے جواب دیا۔

''لیکن کیوں ..... یہ ہمیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''صاحب! آپ کے اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔'' واگو نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ پہلے والوں سے بہت بہتر ہیں۔''

جانے منزل کتنی دور تھی، بس ہم چلتے جا رہے تھے۔ میں

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksurdu.net/
http://www.urdutube.net/

نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ تماچی بہت پُرسکون تھی جیسے یہ سفر اس کی مرضی کا سفر ہو اور وہ یہ جانتی ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہم نے ایک جگہ پڑاؤ بھی کیا۔

وہ جنگلی غلاموں کی طرح ہماری خدمت میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہمارے لیے خیمے نصب کیے گئے۔ انہیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ تماچی نے اپنا ٹینٹ میرے ٹینٹ کے سامنے لگوایا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے تماچی سے کہا۔

''تماچی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ میں تو یہاں ایک این جی او کے کہنے پر آیا تھا۔ میرا کام بچوں کا علاج کرنا تھا پھر یہ کیسی کہانی شروع ہو گئی؟''

''اور بھی تو بہت کچھ ہوا ہے احمر۔'' تماچی دھیرے سے بولی۔ ''تمہیں اس پر بھی حیرت کرنی چاہیے۔ جیسے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا۔ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کچھ حیرت انگیز لوگوں کا تمہارے لیے بھی خوشبو کا تحفہ لے کر آنا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ پھر ان جنگلیوں کے رویے جیسے یہ سب ہمارے غلام ہوں۔ آخر یہ کیا اشارے ہیں۔''

''کاش میں تمہارے کسی سوال کا جواب دے سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اس بات پر بھی حیران ہوں کہ تم بالکل پُرسکون دکھائی دے رہی ہو۔''

''ہاں، یہ بھی ان واقعات کا ایک تسلسل ہے ڈاکٹر احمر۔'' تماچی نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ہمیں ایک خاص منصوبے کے تحت ان لوگوں کے ساتھ کسی طرف لے جا رہی ہے اور جیسے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارا نقصان نہیں ہوگا۔ ان اجنبی حالات کے باوجود ہم زندہ رہیں گے۔''

دوسری صبح پھر سفر شروع ہو گیا۔ واگو کے ذریعے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ہمارے قافلے کے تین افراد سانپوں کے ڈسنے سے مر گئے ہیں جنہیں راتوں رات دفن کر دیا گیا تھا۔

''صاحب! ان لوگوں کے لیے زندگی اور موت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' واگو بتا رہا تھا۔ ''آپ خود دیکھ لیں۔ تین آدمی مر چکے ہیں لیکن قافلے پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔''

''ہاں واگو سب کچھ پہلے کی طرح چل رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ سفر اس دن بھی جاری رہا۔ جانے ان لوگوں کی بستیاں اتنے فاصلوں پر کیوں ہوتی ہیں اور یہ جنگل خدا جانے کتنی دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

دوسری دوپہر کو ان لوگوں میں سے ایک نے ہمارے پاس آ کر واگو سے کچھ کہا۔ واگو کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ ''یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ ہم ہاتھیوں کے قبرستان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ نظارہ دیکھنا چاہیں تو اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔''

''ہاتھیوں کا قبرستان کیا چیز ہے واگو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت عجیب جگہ ہے ڈاکٹر صاحب۔'' واگو نے بتایا۔ ''اس عظیم الشان جنگلوں میں بے شمار ہاتھی ہیں اور وہ ہاتھی جب مرنے لگتے ہیں تو جانے انہیں کیسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ مرنے والے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے سفر کرتے ہوئے اپنے قبرستان میں آ جاتے ہیں جو میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں پہنچ کر ان کی موت ہو جاتی ہے۔''

''بہت زبردست پھر تو وہاں ہاتھی دانت بھی ہوں گے۔''

''کروڑوں ڈالرز کا خزانہ ہے وہاں۔'' واگو نے بتایا۔ ''ہاتھی کے دانتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ پوری دنیا میں نہیں ہوگا۔''

''کیا وہ دانت کوئی اٹھاتا نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب! اس کی بہت خطرناک اور حیرت انگیز داستان ہے۔'' واگو نے کہا۔ ''جانے کتنے لوگوں نے اس خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن سب کے سب ہاتھیوں کے ذریعے مارے گئے۔ بعض کو انہی ہاتھیوں نے مار ڈالا۔ ایک ڈچ کے ساتھ تو یہ ہوا تھا صاحب کہ وہ یہاں سے بہت سے ہاتھی دانت نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ہالینڈ پہنچ کر جب وہ ایک سرکس دیکھنے گیا تو سرکس کے ہاتھی نے اسے کچل کر مار ڈالا۔''

''میں وہ جگہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' تماچی نے کہا۔

اگرچہ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن تماچی کے کہنے پر میں مجبور ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا لیکن اس سفر کی ڈائریکشن ذرا تبدیل ہو گئی تھی کیونکہ ہم ہاتھیوں کے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے وقت قافلے نے پھر ایک جگہ پڑاؤ کر لیا۔ خدا جانے یہ سارے فاصلے کتنے تھے کہ سمٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

اس رات جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو تماچی میرے ٹینٹ میں آ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

اس کا چہرہ جیسے کسی اندرونی جذبے سے چمک رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر احمر!

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اب یہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہونے والا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم ابھی تک سفر ہی تو کر رہے ہیں۔ اب اصل سفر اور کیا ہوگا؟''

''یہ میں نہیں جانتی لیکن جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اصل مرحلہ اب شروع ہونے والا ہے۔ ابھی ہمیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔''

''تماچی! میرا تو خیال ہے کہ ہم کسی طرح یہاں سے نکل لیں اور بری ٹور یا پہنچ جائیں۔ جہاں سے ہم چلے تھے اور وہاں سے نئی زندگی کا آغاز کریں۔''

''نہیں احمر! اب شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب ہم بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔'' اس نے کچھ توقف کیا۔

''اپنی منزل کے۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

''لیکن منزل کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ کیونکہ ابھی مجھے خود کچھ نہیں معلوم بس ایک دھندلا سا احساس ہو رہا ہے۔''

تماچی نے ابھی اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ واگو کے ساتھ ایک دراز قامت شخص ہمارے ٹینٹ میں داخل ہو گیا۔ الاؤ کی بھڑکتی ہوئی روشنی میں وہ کچھ عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بہت احترام کے ساتھ پہلے تماچی کے سامنے پھر میرے سامنے جھکا۔ میں اور تماچی حیران ہو کر اس کو دیکھے جا رہے تھے۔

''صاحب۔'' واگو نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔ ''یہ شخص ناگانا ہے۔ یہ اس قبیلے کا سب سے بڑا پروہت ہے جہاں ہم کو لے جایا جا رہا ہے۔ یہ شخص ایک عرصہ مہذب دنیا میں گزار چکا ہے۔ اس لیے انگریزی بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ آپ دونوں کو کوئی کہانی سنانا چاہتا ہے۔''

''یہ کیا حماقت ہے۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''کیا ہم اتنی دور صرف اس کی کہانی سننے کے لیے آئے ہیں؟''

''جی ہاں جناب۔'' وہ شخص بول پڑا۔ جس کا نام ناگانا بتایا گیا تھا۔ ''آپ دونوں کے لیے یہ کہانی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق آپ دونوں کی گزشتہ اور آئندہ زندگی سے ہے۔''

میرے برعکس تماچی بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس شخص سے کہا۔ ''ٹھیک ہے سناؤ کیا ہے تمہاری کہانی۔''

''میری نہیں، آپ دونوں کی کہانی بلکہ ہم سب کی کہانی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''جو بھی ہو سنانا شروع کرو۔''

☆☆☆

''ہماری مقدس کہانی اور ہمارے بزرگ سینہ بہ سینہ روایات سے یوں بیان کرتے ہیں اور جو کچھ وہ بیان کرتے تھے وہی برسوں کے بعد میں یہاں سنا رہا ہوں۔''

ناگانا نے انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں اپنی کہانی سنانی شروع کر دی

''اب سے ہزاروں سال پہلے ہمارا دیوتا اتیس (Attis) تھا جو آج تک کئی شکل میں ہمارے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ اتیس سنہری موت اور زندگی کے بعد موت اور اس کے بعد کی زندگی کا دیوتا تھا۔ وہ پہلا انسان تھا پھر اس کو دیوتا کا درجہ حاصل ہو گیا۔ وہ چرواہا تھا لیکن محبت نے اس کو امر کر کے دیوتا کا رتبہ دے دیا۔

''اس کی محبوبہ سائی بیل دیوتاؤں کی ماں تھی۔ جو بادام یا انار سونگھنے سے حاملہ ہوئی تھی۔ اتیس کو موت کے بعد دیوتا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اتیس نے صنوبر کے درخت کے نیچے اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا۔

''رومیوں نے 204 ق م میں دیوتاؤں کی ماں کی پرستش شروع کی۔ روم نے اپنا سفیر مقدس شہر passinus روانہ کیا جہاں کی حکومت نے سفیر کو کالے رنگ کا مجسمہ تحفے میں دیا۔ جس کو اتیس اور سائی بیل کا بچہ خیال کیا جاتا تھا۔

''روم والوں نے اس مجسمے کا زبردست استقبال کیا اور اس مجسمے کو پیلاٹین کی پہاڑی پر واقع وکٹری ٹیمپل میں نصب کر دیا گیا۔ پھر ان تینوں کی پوجا شروع کر دی گئی۔ یعنی اتیس، سائی بیل اور وہ بچہ اس کے بعد نہ جانے کس طرح یہ تینوں دیوتا افریقا کے قبائل تک پہنچ گئے اور یہاں بھی ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اتیس تو اپنا کوئی نمائندہ نہیں بنا سکا لیکن اس کی محبوبہ سائی بیل کئی شکلوں میں سامنے آتی رہی۔ اب بھی یہی ہوا کرتا ہے کہ سائی بیل کی علامات جس لڑکی میں دکھائی دیتی ہیں ہم لوگ اس لڑکی کو اٹھا کر اپنے یہاں لے آتے ہیں جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سائی بیل اور اتیس دونوں ہمارے درمیان موجود ہوں۔''

وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا تھا کہ میں نے پوچھا۔

''تمہاری اس کہانی کا ہم دونوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''ابھی میری کہانی ختم نہیں ہوئی جناب۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''اس بچے کے کالے رنگ کا مجسمہ تو ہمیشہ قبائل کے ساتھ رہا جو ان دونوں کا نمائندہ تھا لیکن وہ دونوں

http://www.booksurdu.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

غائب ہوتے رہے پھر برسوں کے بعد واپس آتے رہے کبھی اتیس اور کبھی سائی بیل۔''

''کیا وہ دونوں ایک ساتھ کبھی نہیں ملے؟'' تماچی نے پوچھا۔

''نہیں، کبھی نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر یہ ہوا کہ ہمارے قبیلے اور اس قبیلے کے درمیان جنگیں شروع ہوگئیں جو اتیس اور سائی بیل کی پوجا کرتا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' تماچی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم لوگ پوجا نہیں کرتے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''وہی تو میں بتانے جا رہا ہوں پھر یہ ہوا کہ صدیوں کے بعد ہمارے درمیان صلح کی ایک صورت نکل آئی اور وہ یہ تھی کہ دونوں یعنی اتیس اور سائی بیل نے ہمارے معزز لوگوں کے خوابوں میں آ کر یہ بتانا شروع کر دیا کہ ہم بہت جلد ایک ساتھ واپس آ رہے ہیں اور سائی بیل کو شہر جا کر تلاش کیا جائے لیکن اس کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے۔ حالات ایسے پیدا ہو جائیں گے کہ وہ خود ہی سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ شاید یہاں سے اس کی اصل کہانی سامنے آنے والی تھی۔ اب تک اس نے جو کچھ کہا تھا، اس کا تعلق ہم سے نہیں تھا لیکن اب.....

''پھر یہ ہوا جناب کہ چونکہ ان دونوں نے تلاش کرنے کی ذمے داری ہمارے قبیلے کو سونپ دی تھی اس لیے ہمارے آدمی شہر جا کر تلاش کرنے لگے اور دیوی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔''

''کون ہے وہ دیوی؟'' تماچی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''ظاہر ہے، آپ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔'' ناگانا نے کہا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' میں بھڑک اٹھا۔ ''تماچی تمہاری دیوی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''دیوی کی علامتوں نے ہمیں اس کی طرف بھیجا تھا صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے ہم ان کے لیے خوشبو کا تحفہ بھیجا کرتے تھے۔''

''اور میں..... میں کون ہوں؟''

''ظاہر ہے کہ آپ اتیس ہیں۔'' اس نے کہا۔

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' میں نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''میں ایک عام سا انسان ہوں۔ میرا کوئی تعلق تمہارے دیوی دیوتاؤں سے نہیں، میں مسلمان ہوں۔ ایک خدا کی عبادت کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اتیس کون ہے اور سائی بیل کس بلا کا نام ہے۔''

ناگانا بہت تحمل کے ساتھ میری باتیں سنتا رہا۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ آپ ابھی تک اپنے اسی جنم کی یادوں اور تجربات کے ساتھ ہیں۔ آپ کو پچھلے دور کی باتیں یاد نہیں آ رہی ہیں اسی لیے آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ آپ کی ناراضگی بھی بالکل برحق ہے لیکن جب آپ کو پچھلی باتیں یاد آئیں گی تو آپ خود کو اتیس ہی محسوس کریں گے۔''

میں برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے میں ان حماقت بھری باتوں پر کیا کہہ سکتا تھا۔ حالات نے کہاں لا کر پھنسایا تھا۔ کیسے واقعات میرے سامنے پیش آتے جا رہے تھے کہ جیسے کوئی دلچسپ کہانی پڑھتے، پڑھتے میں خود اس کہانی کا ایک کردار بن گیا ہوں۔

''تم یہ بتاؤ کہ اس قبیلے سے تمہاری صلح کیسے ہوئی؟'' تماچی نے پوچھا۔

''صلح اس طرح ہوئی کہ اس قبیلے نے بھی خواب میں دونوں کی زیارت کی۔ جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے تلاش کا کام ہمارے قبیلے کے سپرد کر دیا ہے۔ اسی لیے اس قبیلے سے جنگ ختم کر دی جائے اور جب ہم دونوں مل جائیں تو پھر ہمیں ہمارے بچے کے پاس پہنچا دیا جائے۔''

''اور وہ بچہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس قبیلے کے پاس جہاں آپ دونوں کو جانا ہے۔'' ناگانا نے بتایا۔ ''آپ کا اصل سفر تو اسی قبیلے کے لیے ہے۔''

''اب برداشت کی حد ہوگئی ہے تماچی۔'' میں نے کہا۔ ''ہم کیا کھلونے بن کر ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جاتے رہیں گے؟ کیا ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے؟''

''حیثیت تو ہے مقدس دیوتا۔'' ناگانا بول پڑا۔ ''آپ اتیس دیوتا ہیں۔ دونوں قبیلوں پر آپ کا حق ہے۔ آپ کا حکم چلے گا۔ آپ چاہیں جس کی گردن اڑا دیں، آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ چاہیں تو دونوں قبیلوں کی ہر عورت سے شادی کر لیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ تماچی، آخر تم کیوں خاموش ہو کر یہ سن رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔'' تماچی نے کہا۔ ''میں اس سفر کے لیے برسوں سے خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔''

''تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔'' میں غصے سے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بولا۔ ''تم یہ کوشش کرو کہ میں کسی طرح یہاں سے چلا جاؤں۔''

''نہیں آقا۔'' میری بات سن کر ناگانا بول اٹھا۔ ''ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم آپ کا راستہ روکیں گے یا آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ آپ کا راستہ روک سکیں لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔ آپ جنگلوں میں بھٹکتے رہیں گے پھر آپ کو معلوم ہے کہ یہاں بہت سے قبائل ایسے بھی ہیں جو آئیس دیوتا اور سائی بیل دیوی کی پوجا نہیں کرتے اور ان کے تیر زہر میں بجھے ہوئے ہوتے ہیں۔''

میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کم بخت نے کوئی دھمکی تو نہیں دی تھی لیکن جو کچھ کہہ گیا تھا، وہ دھمکی سے کم بھی نہیں تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''آقا! آپ کو ہمارے قبیلے کا ساتھ چھوڑ کر اپنے لوگوں میں جانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یعنی ان کے درمیان جو آپ دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔''

''اور اگر ہم نہ جانا چاہیں تو؟'' تماچی جلدی سے بولی۔

''نہیں دیوی۔ آپ مذاق کر رہی ہیں۔'' ناگانا نے کہا۔ ''آپ کو تو وہاں جانا ہی ہے کیونکہ آپ نے اتنی دور کا سفر اسی لیے تو کیا ہے۔''

☆☆☆

پھر ایک سفر۔

اب تک کا ہر سفر پراسرار تھا لیکن اتنا نہیں، جتنا یہ سفر ثابت ہو رہا تھا۔ ناگانا کے قبیلے والوں نے ہمیں ایک جگہ لاکر چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ریگستان تھا۔ ''آقا اور دیوی۔'' ناگانا نے ہمیں مخاطب کیا۔ ''اب یہاں سے ہم آپ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ واگو بھی ہمارے ساتھ واپس جائے گا۔''

''کیا مذاق ہے؟ ہم یہاں سے کیسے جائیں گے؟ کہاں جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''آقا! اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ناگانا نے کہا۔ ''وہ لوگ خود آکر آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے مہمان آچکے ہیں اور وہ آپ کے استقبال کے لیے اپنے گھروں سے چل پڑے ہیں۔''

''اور وہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟''

''اس ریت کے دریا کے اس پار۔'' ناگانا نے کہا۔

''وہ بہت جلد اپنے ان شیطانی جانوروں کے ساتھ آجائیں گے جن کی ٹانگیں اور گردنیں بہت لانبی لانبی ہیں۔ جو اپنی پشت پر آدمیوں کو بٹھا کر ریت کے دریا میں بغیر تھکے ہوئے گھنٹوں دوڑتے رہتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اونٹوں کی طرف ہو سکتا ہے لیکن یہ حیرت کی بات تھی کہ ان قبیلوں میں اونٹ کہاں سے آگئے تھے۔ یہ تو عرب کے ریگستانی جانور تھے۔

''کم از کم اس وقت تو رک جاؤ جب تک وہ لوگ نہ آجائیں۔'' تماچی نے کہا۔

''ہاں دیوی، یہ تو ہمارا فرض ہے۔'' ناگانا سر جھکا کر بولا۔ ''ہم آپ دونوں کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' ہم نے اس رات پھر پڑاؤ کیا۔ صحرا کی رات بہت ٹھنڈی ہو گئی تھی لیکن یہ لوگ الاؤ روشن کرنے کے لیے ڈھیر ساری لکڑیاں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ الاؤ روشن کر دیے گئے۔ واگو بہت اداس ہو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ پھر آپ دونوں سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔''

''واگو! ہم نے بہت بڑی غلطی کی۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں یہ لعنتی سفر کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''لیکن مقدر بھی تو کوئی چیز ہے صاحب! وہ تو ہر حال میں اسی راستے پر لے جاتا ہے جو راستہ ہمارے لیے آسمانوں پر لکھ دیا گیا ہے۔''

''واگو! تم تو واپس چلے جاؤ گے اپنے لوگوں کے درمیان لیکن خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوگا۔''

تماچی جو اب تک پرجوش دکھ رہی تھی، وہ بھی اس وقت خاموش تھی۔ شاید اس پراسرار ماحول اور آئندہ کے انجانے سفر کے تصور نے اسے اداس کر دیا تھا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یعنی میں تماچی اور واگو۔ شہروں کی باتیں، وہاں کی زندگی اور مصروفیت کی باتیں۔ ہم نے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جیسے فراموش کر دیا تھا۔

پھر ہمیں نیند آ گئی۔

بہت سویرے میری آنکھ کھلی۔ تماچی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں اپنے ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور صحرا میں دور دور تک ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں جو کچھ مجھے دکھائی دیا، وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ تقریباً چار پانچ سو گز کے فاصلے پر اونٹوں کی پوری قطار کھڑی ہوئی تھی اور ہر اونٹ کی پشت پر ایک سوار اپنے ہاتھ میں ایک نیزہ لیے موجود تھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ وہی لوگ تھے جن

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے ساتھ ہمیں ایک اجنبی سفر پر جانا تھا۔ اس دوران واگو، ناگانا، تماچی اور دوسرے لوگ بھی ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ اونٹ سوار مجسموں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ یہ ایک مرعوب کرنے اور پریشان کردینے والا منظر تھا۔

''آقا۔'' ناگانا نے ہمیں مخاطب کیا۔ ''تمہیں لینے والے آپہنچے ہیں۔ اب تمہیں اپنا اگلا سفر ان کے ساتھ کرنا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ تم دونوں کی رحمتیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہمارے کھیت سرسبز رہیں گے اور ہماری عورتوں کی کوکھ بہادروں کو جنم دیا کریں گی۔''

واگو ہمارے پاس آ گیا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے لپٹا لیا۔ اس وقت ہم سب غم زدہ تھے اور اپنی اگلی یا شاید آخری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس قبیلے کے افراد ہم دونوں کے سامنے آ کر ہمیں تعظیم دیتے ہوئے الٹے قدموں واپس ہوتے رہے اور پھر وہ سب نگاہوں سے اوجھل ہوتے گئے۔ اب صحرا میں ہم دونوں رہ گئے تھے یا پھر وہ لوگ تھے جو اب تک اپنے اونٹوں پر سوار تھے۔ ان کے اونٹ اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔

اس وقت تماچی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ شروع سے اب تک وہ پرجوش، ثابت قدم اور حوصلہ مند رہی تھی لیکن اس وقت وہ پریشان ہو رہی تھی۔ ''احمر۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''میں پہلی بار خوف محسوس کر رہی ہوں، ورنہ اب تک جو کچھ ہو رہا تھا، وہ شاید میرے لیے کسی ایڈونچر کی طرح تھا۔''

''ہاں تماچی۔'' میں نے بھی اعتراف کیا۔ ''اس لشکر کی یہ خاموشی ہمیں بے چین کر رہی ہے۔''

اچانک اونٹوں کی قطار میں ایک ہلچل سی برپا ہوئی۔ سواروں نے اپنے اپنے اونٹ کو مہمیز کیا اور اونٹوں کی ایک دوڑ سی شروع ہو گئی۔ وہ اونٹ اس طرح ہماری طرف بڑھ رہے تھے جیسے ہمیں کچل کر رکھ دیں گے۔

ہم دونوں پتھر بنے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ خوف کا ایسا عالم تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ ہم بھاگنا بھی چاہتے تو بھاگ نہیں سکتے تھے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا تھا کہ میرے پاؤں اچانک وزنی ہو گئے ہیں۔

اونٹ ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ ہمیں کچل کر رکھ دیتے، وہ ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر اس طرح رک گئے جیسے گاڑیوں کو بریک لگا دیا گیا ہو۔

یہ ایک حیرت زدہ کرنے والا منظر تھا۔

پھر وہ سب اپنے اپنے اونٹوں کو بٹھا کر ان پر سے نیچے اتر آئے اور ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اب تک ملنے والے جنگلیوں سے بہت مختلف تھے۔ ان سب نے سفید لبادے پہن رکھے تھے۔ ان کے رنگ بھی سیاہ نہیں تھے بلکہ گندمی تھے۔ وہ طویل قامت اور کھڑے نقش و نگار رکھنے والے لوگ تھے۔ شاید ان میں عربی خون کی آمیزش تھی۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے چار پانچ قدم آگے آیا۔ اپنا نیزہ بلند کیا اور پوری فضا کسی نعرے سے گونج اٹھی۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ ہمیں سلام پیش کر رہے تھے۔ شاہی سلام۔ یہ لوگ دوسرے جنگلیوں کی طرح بے ترتیب نہیں تھے بلکہ ان میں ایک نظم تھا۔ ڈسپلن تھا۔ پھر وہی آدمی آگے بڑھا اور اس نے اپنا نیزہ تماچی کے قدموں میں رکھ دیا پھر سجدے کے انداز میں ہو کر سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔

''خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ اے مقدس دیوی اور اے مقدس دیوتا۔ برسوں کے بعد تم خوشحالی کی خبر بن کر اپنے لوگوں میں واپس آئے ہو۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ہم بے سہارا ہو کر رہ گئے تھے۔ ہمارے مرد کاہل اور ہماری عورتیں بنجر ہوتی جا رہی تھیں۔ تمہارا بچہ تمہارے انتظار میں اداس ہو رہا تھا لیکن اب تم واپس آ گئے ہو۔ اب ہمارے پاس سب کچھ ہوگا۔ ہم پہلے سے زیادہ خوش حال اور طاقت ور ہو جائیں گے۔''

اس نے یہ ساری باتیں انگریزی میں کی تھیں۔ یہ بھی ایک حیرت کی بات تھی کہ ان لوگوں نے یہ زبان کہاں سے سیکھ لی تھی۔ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''اب تم دونوں ہمارے ساتھ اپنے شہر کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہم نے تمہاری سواریوں کے لیے سب سے شاندار اونٹوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس سفر میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ ہم تم دونوں پر جان دینے والے تمہارے ساتھ ہیں۔''

کاش۔ اس وقت ہی کوئی راستہ ہوتا۔ کوئی تدبیر نکلتی تو میں تماچی کو لے کر وہاں سے فرار ہو جاتا۔ پری ٹوریا سے نکلتے ہی بھیانک خوابوں کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے واقعات عام زندگی میں کہاں پیش آتے ہیں لیکن پیش آ رہے تھے اور ہمیں ان مراحل سے گزرنا بھی تھا۔

اس آدمی نے پھر ہماری طرف دیکھا۔ ''تمہارا یہ خادم تمہارے شہر کا حاکم کہلاتا ہے اور اس کا نام البارا ہے۔ البارا صرف نام کا حاکم ہوگا جبکہ اصل حاکمیت تم دونوں کی ہوگی۔''

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس کے نام نے بھی حیران کر دیا تھا۔ ال... عام طور پر عربی زبان میں لاحقہ کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق ہوتی جارہی تھی کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد عربی النسل ضرور ہوں گے۔ اب تماچی نے اپنی صاف اور شیریں آواز میں بولنا شروع کیا۔ چونکہ اس آدمی نے انگریزی میں تقریر کی تھی، اس لیے تماچی بھی انگریزی میں بول رہی تھی۔

''میرے اپنے لوگو۔ ہاں ہم بہت دور کے سفر کے بعد تمہارے پاس پہنچے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں ہر دور میں ہر طرح کے روپ میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ آسمانوں کی یہی مرضی ہوتی ہے اسی لیے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پچھلے دور میں ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہم کن لوگوں کے درمیان تھے اور کیسی زندگی گزار رہے تھے۔''

''ہم جانتے ہیں دیوی۔'' البارا نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ تم خود کو اجنبی محسوس کرو گی اسی لیے ہم نے تمہارے لیے اور تمہارے دیوتا شوہر اتیس کے لیے وہ زبان سیکھی جو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا صرف اس لیے کہ تم دونوں کو کوئی پریشانی نہ ہو۔''

میں نے اس وقت دل ہی دل میں تماچی کی ذہانت کو سراہا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ بتا دیا کہ ہم ان کے دیوی اور دیوتا تو ہیں لیکن ہم بھول چکے ہیں کہ ہمیں کرنا کیا ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہی تھا کہ آخر کیوں؟ ان لوگوں سے ہمارا واسطہ کیا تھا؟ ہمیں ان کے ساتھ کیوں رہنا تھا؟ ہم نے تو یہ سفر کسی اور مقصد سے کیا تھا۔ پھر ہم اس چکر میں کیوں پھنس گئے تھے؟ لیکن بات پھر وہی تھی۔ تقدیر جس سے فرار انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

دونوں اونٹ ہمارے سامنے لا کر بٹھا دیے گئے۔ واقعی بہت شاندار اونٹ تھے اور ہمارے آرام کے لیے ان پر نرم گدیاں وغیرہ بچھا دی گئی تھیں۔ دو ساربان بھی اونٹوں کے ساتھ تھے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی تھی کہ یہ سفر طویل بھی ہو سکتا ہے ورنہ اتنے انتظامات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک اونٹ پر مجھے بٹھایا گیا تھا، دوسرے پر تماچی تھی جبکہ البارا کا اونٹ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ایک مہذب آدمی ثابت ہو رہا تھا۔

''آقا۔ معاف کرنا ہمیں اونٹوں کی رفتار تیز رکھنی ہو گی۔'' اس نے کہا۔ ''تاکہ ہم اپنے دشمنوں سے بچتے ہوئے جلد از جلد اپنے شہر تک پہنچ جائیں۔''

''دشمنوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ریگستان میں تم سے کون دشمنی کرنے آئے گا؟''

''کئی دشمن ہیں آقا۔'' اس نے کہا۔ ''سورج کی تیز دھوپ، بے پناہ گرمی دور تک پھیلا ہوا ریت کا دریا اور ریگستان سے آتی ہوئی پاگل ہوائیں۔ یہ سب دشمن ہیں اور ہمیں ان سے بچ کر نکلنا ہے۔''

''البارا! ہمارا یہ سفر کتنی دیر کا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ہم معمول کے مطابق چلتے رہے تو پرسوں شام تک اپنے شہر پہنچ جائیں گے۔'' اس نے بتایا۔

میں کراہ کر رہ گیا۔ ایک اور موذی سفر ہمیں درپیش تھا۔

میرے اندازے کے مطابق کم از کم سو اونٹ سوار تو ضرور ہوں گے یعنی ہمارے استقبال کے لیے سو جوانوں کو اس ریگستان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ افریقا کو تاریک براعظم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے بے شمار بھید ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ مہذب دنیا ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کتنے قبائل ہوں گے اور ان کے عقائد کیا ہیں۔ وہ کن دیوی دیوتاؤں کی عبادتیں کیا کرتے ہیں۔

ہم بہت دیر تک سفر کرتے رہے۔

مجھے خود سے زیادہ تماچی کی فکر تھی۔ جانے وہ اونٹ کا یہ تکلیف دہ سفر کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ جن لوگوں کو ریگستان کے سفر کا تجربہ ہو چکا ہے، وہ یہ جانتے ہوں گے کہ یہ کتنا تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔

میں اس مکمل سفر کی روداد نہیں لکھ رہا ہوں۔ راستے میں بہت کچھ ہوتا رہا۔ جیسے گرد و غبار کا طوفان۔ بے پناہ گرمی، دو چار آدمیوں کی موت وغیرہ۔

میں ان سب کو نظر انداز کر کے اب وہاں سے اپنا حال شروع کرتا ہوں جب ہمارا یہ قافلہ اس شہر میں داخل ہوا جس کے بارے میں البارا نے بتایا تھا کہ اس کا نام مادن ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ مادن مدینہ سے لیا گیا ہو جس کا مطلب بستی ہوا کرتا ہے اور مدنیات اسی میں سے نکلا ہے۔ یعنی شہری علوم۔ ممکن ہے کہ مادن کا نام پہلے کچھ اور ہو لیکن اب یہ مادن کہلایا کرتا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک عظیم الشان شہر تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی آبادی دس بارہ لاکھ سے کسی طرح کم نہیں ہوگی اور یہ باقاعدہ شہر تھا۔ افریقی لوگوں کے شہروں کی طرح صرف جھونپڑیاں نہیں بنی ہوئی تھیں بلکہ باقاعدہ مکانات تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلبہری

قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر

ماہر جلد امجد زیدی

کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

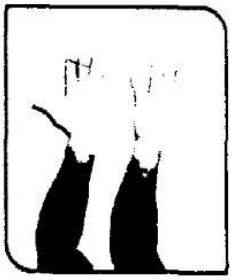

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سرینا کے قریب، اسلام آباد
فون (051) 2854595 - 2255880
موبائل 0300-8566188
فیکس 2261636

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

ہوٹل لنہ

جی ٹی روڈ نزد بشقری چوک پشاور
فون 9-2218215 (0521)
موبائل 0300-8566188

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

گلف سینٹر

آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ، مزنگ چونگی
نزد شمع مارکیٹ، لاہور
موبائل: 0300-8566188

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

نور جہاں سینٹر

آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری بس سٹاپ جلد تل K.F.C کراچی
فون 9-7012068-021
موبائل 0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

ہوٹل سلور سینڈ

ریلوے سٹیشن روڈ نزد چوک حرم گیٹ ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

email: drabjmalzeid@hotmail.com syedajmalzeid.sitesplat.com

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

طرزِ تعمیر بہت مختلف تھی۔

یہ مخروطی طرز کے مکانات تھے جن کی چھتیں ڈھلوانی تھیں۔ ہر مکان میں نیچے کا حصہ مویشیوں کے لیے مخصوص تھا جبکہ اوپری حصے میں جانے کے لیے پتھروں کی سیڑھیاں تھیں۔

اونٹوں کے لیے باقاعدہ گزرگاہیں تھیں۔ جیسے ہمارے یہاں کی سڑکیں ہوتی ہیں اور دونوں طرف دکانیں ہوا کرتی ہیں، وہاں بھی دکانیں تھیں۔

ہزاروں کی تعداد میں مرد اور عورتیں ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے جو ہم پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔

مذہبی گیت گائے جا رہے تھے۔ ان کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ جگہ جگہ مسلح اونٹ سوار ہمیں سلام پیش کر رہے تھے۔

ہم بہت دیر تک چلتے رہے.... بالآخر ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ کر یہ قافلہ روک دیا گیا۔ وہ عمارت سب سے بڑی تھی۔

ہم اونٹوں سے اتر آئے۔ تماچی بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اونٹ کی پشت پر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی تھی۔ میں نے اسے اپنے ایک بازو کا سہارا دے دیا تھا۔

البارا ہمارے پاس آ گیا۔ ''معزز مہمانو۔'' اس نے بڑے ادب سے کہا۔ ''تمہاری منزل آ گئی ہے۔ یہ تمہارا محل ہے۔ تم کو یہیں رہنا ہے۔ تمہارا مقدس بچہ بھی اسی محل میں ہے لیکن روایات کے مطابق وہ اس وقت تک تمہارے حوالے نہیں ہو سکتا جب تک تم دونوں اس جنم کی شادی نہ کر لو۔''

''اے البارا! کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ اس جنم کی شادی سے کیا مراد ہے؟'' تماچی نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' البارا نے کہا۔ ''البارا جانتا ہے کہ تم دونوں اپنے پچھلے جنموں کی باتیں بھول چکے ہو۔ تم یہ نہیں جانتے ہو کہ ہر جنم میں تم ایک دوسرے سے شادی کرتے ہو اس کے بعد اگلے جنم کے لیے آسمانوں کی طرف چلے جاتے ہو۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ اس جنم میں تمہاری شادی ہمارے شہر میں ہونے والی ہے۔''

میرے لیے یہ تصور تو بہت خوش گوار تھا کہ تماچی سے میری شادی ہونے والی ہے لیکن میں اپنے مذہبی رسوم و رواج کے خلاف شادی کیسے کر سکتا تھا۔ جانے تماچی اس موقع پر کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تماچی! تم نے اس کی بات سن لی؟''

''ہاں سن لی۔'' تماچی نے کہا۔ ''لیکن کیا ہو سکتا ہے۔ میں یہ جانتی ہوں کہ ہمارے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، وہ بہرحال ہو کر رہے گا۔''

کچھ عورتیں آگے آ گئیں۔ یہ عورتیں بے مثال حسن کی مالکہ تھیں۔ ان عورتوں کے خدوخال میں عربی ملاحت نمایاں تھی۔ البارا نے ان کے بارے میں بتایا کہ یہ ہماری خاص کنیزیں تھیں اور ہم دونوں کو الگ الگ لے جانے کے لیے آئی تھیں۔

البارا نے میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ''آقا! اب آپ دونوں کو چند دنوں کے لیے ایک دوسرے سے الگ رہنا ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا آقا کہ صدیوں پہلے اسی طرح آپ کی محبوبہ اور بیوی سائی بیل بھی آپ سے زبردستی الگ کر دی گئی تھی اور آپ نے صنوبر کے درخت کے نیچے جا کر اپنی جان دے دی تھی۔ اس کے بعد اگلے جنم میں آپ دونوں پھر ایک دوسرے سے ملے اور آپ کی شادی ہو گئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں کے لیے آپ الگ رہیں گے۔ اس کے بعد آپ ملیں گے، آپ کی شادی ہوگی اور کم از کم اس جنم میں تو آپ ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں گے۔''

''تماچی! تم نے سن لی اس کی باتیں؟''

''ہاں۔'' تماچی کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔ ''میں نے سن لی اور اب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم وہی کریں جو یہ کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ جدائی ہے تو پھر یقیناً عارضی ہوگی۔''

میں خاموش رہا.... کیونکہ میرے بس میں سوائے خاموشی کے اور کیا تھا۔

کچھ عورتیں تماچی کو اپنے ساتھ ایک طرف لے گئیں اور کچھ مرد مجھے ایک اور کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرا شاہانہ انداز سے سجایا گیا تھا۔

پتھر کا ایک بڑا سا تخت تھا جس پر اونٹوں کی کھالوں کا نرم بستر تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ اتیس دیوتا اور سائی بیل دیوی کے مجسمے تھے (یعنی میرے اور تماچی کے) اور اور اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میں جیسے مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔

خدا کی پناہ! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی تھیں۔

اتیس کے مجسمے کی مشابہت مجھ سے ہو یا نہ ہو لیکن سائی بیل کا مجسمہ ایسا تھا جیسے تماچی کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ وہی نقش و نگار، وہی آنکھیں، وہی متناسب جسم، سب کچھ وہی تھا۔

اگر یہ محض اتفاق تھا تو پھر ایسا اتفاق کم ہی دیکھنے میں آتا ہوگا۔ مجسمہ ساز نے سائی بیل کا مجسمہ تراشنے میں اپنی مہارت دکھا دی تھی۔ اس کا ہنر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لگ رہا تھا جیسے ابھی مجسمہ بول پڑے گا اور پورے کمرے میں تماچی کی آواز گونج جائے گی۔

البارا ابھی میرے ساتھ ہی اس کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اس مجسمے میں میری محویت محسوس کر لی تھی۔ ''دیوتا! کیا تم دیوی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟''

''ہاں البارا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ تماچی کے علاوہ اور کسی کا مجسمہ نہیں ہو سکتا۔''

''یہی تو بات ہے آقا۔'' اس نے کہا۔ ''اب تو تمہیں یقین آ گیا نا کہ تم دونوں ہی اتیس اور سائی بیل ہو۔''

''لیکن تمہارا اتیس تو مجھ سے نہیں ملتا۔''

''ملتا ہے آقا! تم ذرا غور سے دیکھو۔ اس کے نقش و نگار تمہارے جیسے ہیں یہ اور بات ہے کہ صدیوں کی مسافت نے تمہارے مجسمے کو گرد آلود کر دیا ہے لیکن یہ مجسمہ تمہارے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ تم اور سائی بیل ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہو اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھی رہو گے۔''

کچھ کنیزیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ میرے لیے نیا لباس لے کر آئی تھیں۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانہ تھا جہاں پتھروں کے ٹب میں پانی بھرا ہوا تھا۔

کنیزیں یہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے سامنے بے لباس ہو کر نہانا شروع کر دوں لیکن میں نے انہیں کمرے سے باہر کر دیا تھا جس پر وہ سخت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ شاید ان کا یہ خیال تھا کہ میں کسی بات پر ان سے ناراض ہو گیا ہوں۔

میرے لیے کھانے کا انتظام بھی بہت شاندار تھا۔ اگرچہ گوشت بھی تھا لیکن میں نے اونٹنی کے دودھ اور سبزیوں پر اکتفا کیا تھا۔ میں گوشت اس لیے نہیں کھا سکتا تھا کہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کس طرح جانوروں کو ذبح کرتے ہوں گے۔ کھانے سے فارغ ہوا تو البارا نے کہا۔ ''آقا! اگر کہو تو دل بہلانے کے لیے کسی کو تمہارے پاس بھیج دیا جائے کیونکہ میں تو جا رہا ہوں۔''

''البارا! تم کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا کیونکہ اب میں البارا سے مانوس ہو چلا تھا۔

''گھبراؤ نہیں آقا۔ میں تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں مادن کے دیگر معاملات دیکھنے جا رہا ہوں تم جانتے ہو کہ جب ذمے داری آتی ہے تو انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا اور میں تو ویسے بھی اپنے عوام اور اپنی رعایا کا خادم ہوں۔''

میں اس شخص کی باتیں سن کر حیران رہ گیا تھا۔ مہذب دنیا سے ہزاروں میل دور ایک جنگلی قبیلے کے حکمران کا اپنے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ہاکر سے آج ہی ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

بارے میں یہ خیال تھا جبکہ ہمارے حکمران خود کو جانے کیا سمجھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو تو اس جنگلی سے سبق لینا چاہیے تھا۔ ویسے بھی البارا مجھے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ اس کا صاف چہرہ اس کے اندر کا حال بتا رہا تھا۔

''آقا! میں تمہارے پاس ایک ایسے آدمی کو بھیج رہا ہوں جس کی عقل کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اس کی عمر اسّی سال کے قریب ہے لیکن اس کے پاس تجربہ آٹھ سو برسوں کا ہے۔ وہ تمہیں ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ وہ دنیا کی کئی زبانیں جانتا ہے۔''

''ٹھیک ہے البارا کل صبح اس آدمی کو میرے پاس بھیج دینا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ آج تو میں تھک چکا ہوں اور اس کی صحبت سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا۔''

البارا کے جانے کے بعد میں ہزاروں خدشات اور اندیشوں کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا اور یہ محاورہ سچ ہو گیا کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔ ایک گہری اور بے خود کر دینے والی نیند۔

میری آنکھ کسی کے آواز دینے پر کھلی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ ''آقا! اٹھ جائیں، آپ بہت دیر تک سوتے رہے ہیں۔''

اور اٹھانے والے نے مجھے انگریزی یا افریقی زبان میں مخاطب نہیں کیا تھا بلکہ وہ اردو بول رہا تھا۔ خالص اردو دھلی ہوئی اردو۔

☆☆☆

اس نے اپنا نام برہام بتایا تھا۔

وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ اس کی عمر اسّی اور پچاسی کے درمیان ہو گی لیکن اس کے قویٰ مضبوط تھے۔ اس کے جسم پر بھی سفید لبادہ تھا۔ اس کے شکن آلود ماتھے کی ہر لکیر یہ بتا رہی تھی کہ وہ شخص اپنے پاس تجربات کا خزانہ رکھتا ہے۔

جب میں نے اس ماحول میں اپنی زبان اردو سنی تو میں اچھل پڑا۔ البارا نے بتا دیا تھا کہ وہ بوڑھا کئی زبانیں جانتا ہے لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ وہ اردو بھی بول سکتا ہو گا۔

مجھے حیران دیکھ کر اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''آقا! اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''جبکہ آقا یہ جانتے ہیں کہ دیوی سائی بیل نے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے کہ اس جنم میں آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کی زبان کیا ہے اور آپ کہاں سے آئے ہیں۔''

''برہام! مجھے تم سے مل کر بے پناہ خوشی ہو رہی ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں کوئی میری زبان جاننے والا بھی مل جائے گا۔ خوشی کے ساتھ اس بات کی حیرت ہے کہ تم نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی۔''

''ہندوستان میں سیکھی ہے۔'' برہام نے بتایا۔ ''آقا! یہ ایک بہت طویل داستان ہے۔ میں آہستہ آہستہ آپ کو سب بتا دوں گا۔ اس وقت تو آپ کو یہ اطمینان دلانے آیا ہوں کہ یہاں آپ آرام سے رہ سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی حیثیت ایک دیوتا جیسی ہے۔''

''برہام! میرے بزرگ۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں عذاب میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں زبردستی دیوتا بنا دیا گیا ہوں جب کہ میرا ایسی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں آقا بس آپ خاموش رہیں اور اپنی شادی کا انتظار کریں۔ دیوی سائی بیل بھی بہت آرام سے ہیں۔''

''برہام میرے بزرگ! تم نے مہذب دنیا دیکھی ہے۔ تم کئی زبانوں سے واقف ہو، کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

''میری بات نہ کریں آقا۔ ان بوڑھی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا چلو کم از کم یہ بتا دو کہ کیا ہم یہاں سے جا سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں اپنے لوگوں میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''آقا! اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں کے معاملات ایسے ہیں کہ آپ مکھی کی طرح مکڑے کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ آپ دیوتا ہیں اور صدیوں کے بعد واپس آئے ہیں۔ صدیوں کے اس مسافر کو اب کون یہاں سے جانے دے گا۔''

''تو کیا میں ساری زندگی یہاں گزار دوں گا؟''

''میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت آپ اپنے آپ پر بوجھ نہ لیں اور آسمان کے ستاروں کو دیکھتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ستارے کچھ اور کہہ رہے ہوں اور وہ ہو جائے جو آپ چاہتے ہیں۔''

''برہام! تم یہ بتاؤ کہ تماچی سے میری شادی کس طرح ہو گی؟'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''بہت ہی خاص قسم کی رسومات ادا کی جائیں گی۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ دونوں بہت معزز ہیں۔ آسمانوں سے اتر کر ہمارے پاس آئے ہیں۔''

''برہام! میں یہاں کے ماحول میں پاگل ہوتا جا رہا

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دم گھٹ رہا ہے میرا۔''

''اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے رہیں آقا۔'' اس نے کہا۔ ''اگرچہ آپ کی حیثیت دیوتا کی سی ہے لیکن بہت سے راستے خود آپ کو بھی نہیں معلوم ہوں گے۔ ہم سب ان مسافروں کی طرح ہیں جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر کسی راستے پر ڈال دیا گیا ہے۔ کون جانے یہ راستہ ہمیں کہاں لے کر جا رہا ہے۔''

''برہام! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم سے مل کر بہت حوصلہ ملا ہے مجھے۔''

''میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ آقا مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں میں آپ کے ساتھ ہی ہوں آقا۔''

دوسرے دن ہی سے ہماری شادی کی تقریبات کا آغاز ہوگیا۔

جانے یہ کیسی شادی ہو رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسے دیکھتے ہی میں اس کا اسیر ہوگیا تھا۔ وہ سیدھی میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے اسے حاصل کرنے اور اسے اپنا بنانے کے خواب دیکھے تھے لیکن اس انداز سے ملاپ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میں ایسی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ خود تماچی کا بھی یہی حال ہوگا۔ اس کی بھی یہی سوچ ہوگی۔

☆☆☆

بہت ہی الجھی ہوئی اور حیران کر دینے والی رسومات کا آغاز ہوگیا تھا۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ان لوگوں کی خوشبویات بے مثال ہوتی تھیں۔ جانے وہ کون سی جڑی بوٹیوں سے کشید کیا کرتے تھے اور کیا تکنیک ہوتی تھی۔

لیکن یہ جو کچھ بھی بناتے، وہ شاید کہیں اور نہیں بنتا ہوگا۔ پاگل اور مدہوش کر دینے والی پراسرار خوشبوئیں۔ نہلانے کے بعد مجھے سفید لبادہ پہنا دیا گیا۔ میرے سر پر ایک تاج بھی رکھ دیا گیا۔ یہ تاج سونے کا تھا۔ اس میں کئی قیمتی پتھر بھی تھے۔ اس نئے لباس میں جب میں بڑے کمرے میں پہنچا تو وہاں موجود لوگ اتیس دیوتا کا نعرہ لگاتے ہوئے سجدے میں چلے گئے تھے۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ خدا کی پناہ یہ لوگ مجھے سجدہ کر رہے تھے۔ ایک حقیر انسان کو جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ جو کسی پتھر کی طرح لڑھکتا پھر رہا تھا۔ یہ جاہل لوگ اس کو سجدہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں منع کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ اسی وقت میری نگاہ برہام پر پڑی جو اس کمرے کے ایک کونے میں کھڑا ہو اشارے سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اشارہ کچھ دیر بعد سمجھ میں آسکا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے میں اسے ہونے دوں ورنہ یہ لوگ بھڑک اٹھیں گے۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ باہر چلے گئے، میرے لیے ناشتا لایا گیا۔ اس وقت صرف برہام میرے پاس تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''برہام! تم نے مجھے اشارہ کیوں کیا تھا؟''

''آقا! میں نے آپ کے تیور سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ کو ان لوگوں کا سجدہ کرنا ناگوار گزر رہا ہے۔''

''ہاں میرے بزرگ۔ میں ایک مسلمان ہوں جیسا کہ تم کو معلوم ہوگیا ہوگا اور ہمارا معبود صرف ایک ہے۔ ہم صرف اسی کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ نہ خود کسی اور کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی اور ہمیں سجدہ کرے۔''

''یہ بات میں جانتا ہوں آقا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن آپ یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ اپنی مرضی سے نہیں کر رہے ہیں۔ ایک جبر کے تحت کر رہے ہیں۔ آپ کی مرضی شامل نہیں ہے۔ اسی لیے اس عمل سے، آپ کا خدا آپ سے ناراض نہیں ہوگا۔''

''پتا نہیں میرے محترم بزرگ۔ میرا تو یہ حال ہے کہ میں خود کو انتہائی گناہ گار محسوس کر رہا ہوں۔''

''اطمینان رکھیں میرے آقا..... جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے آپ اپنے خدا کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بس یہاں خود پر قابو رکھیے صرف آنکھیں بند جائیں، صرف آنکھیں..... اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ دیکھتے رہیں۔''

ناشتے کے بعد البارا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے تعظیم دیتے ہوئے بتایا۔ ''آقا! آج سے آپ اپنے دیوتا والے منصب پر بحال ہو چکے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ایک رسم ادا کرنی ہوگی۔ اس کے بعد آپ پوری شان و شوکت کے ساتھ دیوتا بن جائیں گے۔''

''اچھا وہ رسم کیا ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت چھوٹی سی رسم ہے آقا۔'' اس نے بتایا۔ ''اور آپ جب بھی نیا جنم لیتے ہیں، آپ کو یہ رسم ادا کرنی پڑتی ہے۔''

میں نے پھر کچھ... نہیں کہا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس عمل کا ایک بڑے کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ کمرے میں آتش اور سائی بیل کے بڑے بڑے مجسمے تھے۔ ان دیوہیکل مجسموں کے قدموں کے پاس ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اس کا اوپری جسم عریاں تھا جب کہ کمر سے نیچے اس نے سفید سا کوئی لباس پہن رکھا تھا۔

اس ہال میں بہت سے لوگ تھے۔ البارا آگے بڑھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ایک نیزہ تھما دیا۔ ''آقا! تم کو یہ نیزہ اس طرح اس لڑکی کے سینے میں اتارنا ہے کہ ایک ہی وار میں آر پار ہو جائے۔''

''کیا؟'' میں کانپ کر رہ گیا۔ ''البارا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ بہت ضروری رسم ہے آقا۔'' اس نے کہا۔ ''تم شاید بھول رہے ہو، پچھلے جنم میں تم یہی کیا کرتے تھے۔ اس لڑکی کے خون سے تمہارے مجسمے کو غسل دیا جائے گا اس رسم کے بعد تم امر ہو جاؤ گے..... لو نیزہ۔''

مجھ پر پہلی بار اتنا کڑا وقت آیا تھا۔

وہ بے گناہ معصوم لڑکی عجب انداز سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کا کرب تھا۔ وہ رونا چاہتی ہو گی لیکن اس کے آنسو خوف سے خشک ہو گئے ہوں گے۔ وہ بھاگنا چاہتی ہو گی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی۔ نیزہ میرے ہاتھ میں تھا لیکن اس نیزے پر میری گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ میں یہ مکروہ اور ظالمانہ رسم انجام نہیں دے سکتا تھا۔

برہام نے میری یہ کیفیت محسوس کر لی۔ وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ''آقا! آپ کو یہ کرنا ہو گا ورنہ یہ لوگ آپ کو، سائی بیل اور لڑکی کو مار دیں گے۔ کیونکہ پھر یہ خیال کریں گے کہ آپ مصنوعی دیوتا ہیں۔''

برہام نے یہ بات اردو میں کہی تھی۔ میں نے بھی اردو میں جواب دیا۔ ''محترم برہام! تم ہی بتاؤ میں اس ..... بے گناہ کی جان کیسے لے لوں۔ اور ان سے کہہ دو کہ ہمیں جانے دیں یہاں سے..... ہم دیوتا نہیں ہیں۔''

''قیامت آ جائے گی آقا۔'' برہام نے کہا۔ ''یہ لوگ برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپ یہ نہیں کہ آپ یہ رسم دن میں نہیں بلکہ رات کے اندھیرے میں انجام دیں گے کیونکہ پہلے بھی آپ نے ایسا ہی کیا تھا۔''

''اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''اسی وقت دیکھا جائے گا۔'' برہام نے کہا۔ ''اس وقت تو اپنی جان چھڑائیں۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ نیزہ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے میں نے البارا اور دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور انگریزی میں بولنا شروع کر دیا۔ ''اے مقدس شہر کے مقدس باسیو! کیا تم یہ بھول گئے کہ تمہارے دیوتا کی روایات کیا رہی ہیں؟ ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں یہ سب کچھ ضرور کیا کرتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں تاکہ شیطانی قوتیں ہمیں نہ دیکھ پائیں اور تم اس روایت کے لیے مجھے دن کے اجالے میں یہاں لے کر آ گئے ہو؟ جاؤ اس لڑکی کو ابھی لے جاؤ یہاں سے اور رات کے اندھیرے میں لے کر آنا۔ تاکہ یہ موت کے دیوتا کو اپنی طرف آتا ہوا نہ دیکھ سکے۔''

میرے اس خطاب کا ترجمہ البارا نے کر دیا تھا۔ پہلی بار چونکہ میں دیوتا کی شان اور انداز سے بول رہا تھا اس لیے وہ سب بہت خوش تھے۔ خود البارا بھی اس بات پر پشیمان ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کو اس رسم کا وقت یاد کیوں نہیں رہا۔

معاملہ رات تک کے لیے ٹل گیا تھا لیکن پھر رات کے بعد کیا ہوتا۔

☆☆☆

اس شام اور پھر اس رات کئی واقعات پیش آئے۔ جیسے خوابوں کے تسلسل میں شدت آ گئی ہو۔ مناظر بہت جلدی جلدی تبدیل ہونے لگے تھے۔ مجھے میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھے برہام کا انتظار تھا، اس سے یہ پوچھنا تھا کہ رات میں کیا ہو گا۔ جو کچھ اس وقت ہونے والا تھا وہ تو رات کو بھی ہو جاتا پھر اتنی مہلت کیوں لی گئی تھی؟

برہام اندھیرا ہونے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''آقا اب یہ رسم رات دیر سے ہو گی لیکن اس سے پہلے کچھ اور بھی ہونا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو اور سائی بیل کو یہاں سے نکل جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین ہوں۔ ہمارا مذہب ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

''کس مذہب کی بات کر رہے ہو محترم بزرگ؟''

''آقا! وہی مذہب جو تمہارا ہے۔'' اس نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/

''کیا!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''برہام! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں آقا! ہندوستان میں رہ کر میں نے نہ صرف اردو سیکھی بلکہ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''اسی لیے میرا نام برہام یعنی ابراہیم ہے۔''

''او خدا، میرے بزرگ۔'' میں نے فرطِ جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ کیسے ہو گیا؟''

''یہ بہت طویل کہانی ہے میرے آقا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں مختصر کر کے آپ کو سنا رہا ہوں۔''

''میرے محترم بزرگ۔ تمہاری عزت میرے دل میں اب اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بتاؤ مجھے۔''

''مجھے ایک بار پری ٹوریا جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔'' برہام نے بتایا۔ ''میں وہاں اپنے قبیلے سے اپنی جان بچا کر گیا تھا۔ یہ لوگ کسی بات پر دشمن ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو کہ قبیلے کا بادشاہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ لڑکی میری محبت تھی اور میں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ یہ اب سے چالیس پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس زمانے میں جوان ہوا کرتا تھا اور ولولوں سے بھرپور تھا۔

''پری ٹوریا میں اس زمانے میں گورے ہی سب کچھ تھے اور وہ ہمیں بہت حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے۔ میں نے وہاں مزدوری کی اور اپنی گزر بسر کرتا رہا پھر یہ ہوا کہ ایک ہندو کاروباری شخص نے مجھے اپنا ملازم رکھ لیا۔ دو چار برسوں کے بعد وہ مجھے ہندوستان لے گیا جہاں میں نے کئی زبانیں سیکھیں۔ ان میں ایک اردو بھی تھی اور وہیں جامع مسجد دہلی کے امام صاحب کے ہاتھوں مسلمان بھی ہو گیا۔

''مسلمان ہو جانے کے بعد تو میری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب سارے دیوی دیوتا اور اپنے رسوم و رواج مجھے احمقانہ دکھائی دینے لگے اور میں نے ایک نئی زندگی شروع کر دی۔ میرا نام پہلے کچھ اور تھا اور پھر میں نے اپنا نام برہام رکھ لیا۔''

''محترم! یہ بتاؤ کہ تم دوبارہ یہاں کیسے آ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا مقدر مجھے یہاں لے آیا۔'' اس نے کہا۔ ''یا شاید اسی دن کے لیے خدا نے مجھے یہاں بلایا تھا تاکہ تمہاری اور اس لڑکی کی مدد کروں جس کی یہ لوگ دیوی سمجھ کر پوجا کر رہے ہیں۔''

''بے شک یہی بات ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایک بار پھر کسی کام سے افریقا آنا پڑ گیا تھا۔'' اس نے آگے بتایا۔ ''یہاں آنے کے بعد پتا چلا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہر قبیلے میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ میری واپسی بھی پچیس تیس سال بعد ہوئی تھی۔ تم جانو آقا کہ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اس جگہ کی محبت ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے اور جن لوگوں کے درمیان اس نے بچپن گزارا ہوتا ہے ان کی محبت اسے باندھ کر رکھ دیتی ہے۔ بس میں اپنی مٹی کی زیارت کرنے اپنے قبیلے میں آ گیا۔ یہاں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ میرے دشمن بادشاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور جو نیا بادشاہ تھا اس نے میری بہت عزت کی۔ مجھے حکومت میں ایک اہم مقام دے دیا گیا کیونکہ میں ان کے خیال میں اپنے ساتھ ڈھیر سا علم لے کر واپس آیا تھا۔ اس وقت سے اب تک میں یہیں ہوں۔ تو یہ ہے میری کہانی۔''

''میرے بزرگ! تم یہ بتاؤ تم نے کس طرح اپنا مذہب چھپایا ہو گا؟''

''بہت مشکلوں سے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں یہاں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتا ہوں۔ میں نے اسی خوف سے شادی بھی نہیں کی کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہو جائے۔''

''تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے جنوبی افریقا میں تو بہت سے مسلمان ہیں۔ تم ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟''

''آقا! تم اسے میرا پاگل پن کہہ لو کہ میں اپنے وطن کی مٹی کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس لڑکی کی قبر بھی یہیں ہے جس سے میں نے محبت کی تھی۔'' اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''ہاں، میں نے اس کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں، اس کا کیا ہوا تھا؟''

''اس نے اپنی جان دے دی تھی آقا۔'' برہام نے بتایا۔ ''وہ اس بادشاہ کی دلہن نہیں بنی تھی۔ شادی کی رات اس نے اپنے سینے میں نیزہ اتار کر اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا۔ خیر ہم پھر بھی باتیں کر سکتے ہیں، اس وقت تو یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔''

''مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

''البارا ہمیں پہنچائے گا۔'' برہام نے بتایا۔

''البارا۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''برہام! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ البارا ہمیں کیوں پہنچائے گا؟''

''میرے آقا! اب تو یہ کہانی کچھ اور ہوگئی ہے۔'' برہام نے کہا۔ ''ایسا کرو میں سائی بیل سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کروا دیتا ہوں۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔''

برہام مجھے الجھن میں مبتلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ آخر البارا ہمارا ساتھ دینے کے لیے کیوں رضامند ہوگیا تھا جبکہ وہ تو ہمیں بڑی مشکلوں سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

میں انتظار کرتا رہا۔ سائی بیل یعنی تماچی آنے والی تھی۔ وہ لڑکی جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جس نے مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ ہوئی اور تماچی میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر واقعی کسی دیوی جیسا تقدس پیدا ہوگیا تھا۔

''ڈاکٹر احمر۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''سفر مبارک ہو۔ تم واپس جا رہے ہو۔ برہام نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''صرف میں نہیں تماچی! تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو۔''

''نہیں ڈاکٹر احمر۔ میں یہاں سے نہیں جا سکوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''میری منزل تو یہی تھی اور اندھیرے راستوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔''

''تماچی! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔'' میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ''تم مہذب دنیا کو چھوڑ کر ان لوگوں کے درمیان رہو گی؟''

''ہاں ڈاکٹر احمر کیونکہ یہ لوگ مجھے دیوی سمجھتے ہیں۔''

''لیکن تم دیوی تو نہیں ہو۔''

''میں جانتی ہوں کہ میں دیوی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ان لوگوں کے لیے خوشی نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں نہیں ہے۔ یہ بہت اداس اور مرجھائے ہوئے لوگ تھے لیکن تم خود دیکھو، ہمارے آنے کے بعد ان میں کیسی ترنگ آ گئی ہے۔ یہ کتنے خوش دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہ مجھے اپنی ماں سمجھتے ہیں ڈاکٹر احمر اور ایک ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے..... کیسے جا سکتی ہے۔''

میں اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ کیسی تھی وہ۔ کیسا تھا اس کا دل، کتنا مہربان، کتنا محبت کرنے والا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ان لوگوں کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

''ڈاکٹر احمر! شاید میرے نصیب میں یہی تھا۔ اسی لیے شروع ہی سے مجھے اس قسم کے خواب دکھائی دیتے تھے۔ میں شروع ہی سے اپنے ماحول سے اکھڑی اکھڑی رہی ہوں لیکن یہاں مجھے سب کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا ہے۔ جانے انسان کیا ہے، اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔''

''تو میں یہاں سے مایوس چلا جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، مایوس نہیں، میری یادیں اپنے ساتھ لے کر۔'' اس نے کہا۔ ''یادیں ہی تو سہارا ہوتی ہیں۔ تم جب آواز دو گے میں تمہاری یادوں میں آ جایا کروں گی۔''

''یہ البارا میرا اتنا ہمدرد کیسے ہوگیا ہے کہ مجھے واپس پہنچانا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری وجہ سے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اس سے سودے بازی کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ اتیس کو جانے دو۔ تمہاری دیوی سائی بیل تمہارے ساتھ رہے گی۔ اس پر وہ رضامند ہوگیا۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خود سائی بیل بھی اداس تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کی تقدیر نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ اس کا سفر تمام ہو چکا تھا لیکن مجھے ابھی کہیں اور جانا تھا۔ میری منزل کہیں اور تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد بیان کرنے کے لیے رہ کیا جاتا ہے۔

برہام اور البارا نے مجھے مہذب دنیا تک پہنچا دیا۔ میرا این جی او والا مشن ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔

میری واپسی پر بہت ہلچل مچ گئی تھی۔ جنوبی افریقا کے اخبارات اور ٹی وی چینلز نے میرے انٹرویوز لیے تھے۔ میں نے بہت کچھ بتایا بھی اور بہت کچھ چھپا بھی لیا تھا۔

میں نے یہاں تک بتایا تھا کہ تماچی ہمارے ساتھ گئی تھی اور ایک دن جنگلی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے لیکن انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ ایک دیوی بن کر ایک قبیلے پر حکمرانی کر رہی ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ میں اس کی محبت کی یادیں اپنے ساتھ لے کر اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔

میں اب پاکستان واپس آ چکا ہوں اور میرے پاس سوائے یادوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ یادیں آنکھوں میں آنسو بھی لے آتی ہیں اور کبھی کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آ جاتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material
http://www.urdutube.net/
http://www.booksfree.net/